

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK





169 مصروف لاش اثر نعمانی لاشوں کا کھیل تماشا..... ایک عجیب پر اسرار کہانی	155 بھیدی نظارت نصر کھوکھلی بنیادوں پر تلے تعمیر کرنے والے مندرجی کا ماحبرا	152 مخفل شعروں قارئین آپ کے ہاتھوں ہی ایک نئے نئے رنگ آپ کی پسند آپ کے ذوق کے آہنگ
219 حضرت داؤد رضوانہ ساجد حالات اور حبالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا احوال	215 بمقابلہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی اتار کی اور بے چارگی کا سنگین منظر نامہ	176 مسافر ناصر ملک گل و گلزار سے راہ پر حنا رنگ ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات
000 کترنیں انارہ دنیا بھر سے ادھر ادھر سے لطیفے چٹکے اقبال سہرا میں اور قہقہے بکھڑے آگے	242 اچھوتی محبت ایچ اقبال دشت اور لذت آزار سے بے پروا..... ایک سرکش حینک دیوانگی	229 شیریں زہر محمد عفان بے زہر نظر آنے والے پھولوں میسے انسانوں کا مندرجی

20 فصل اجر گئی ڈاکٹر ساجد امجد خامی کا آئینہ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات	12 آپ کے خط مدیر اعلیٰ سپنس کی مجلس شادیت قارئین کی تلخو شیریں باتیں مکے شکوے اور پر خلوص مشورے	11 انشائیہ جون ایلیا دور حاضر کے مصائب والام کا دلخیز اشش تذکرہ
68 کشکول انوار صدیقی اسرار اور تحیر کے پردے میں پٹنا ایک منفرد طویل سلسلہ	61 دوراہا طاہر جاوید مغل سلگتے جذبوں اور بک لمحہ کی ادھوری داستان	47 شوق مردانگی مختار آزاد زندگی سے لطف اندوز ہونے والے ایک بے حس سچا کرداد
143 رقیب سلیم انور گمان اور بدگمانی کے مٹیانی ڈگر گاتی ہوئی ایک نثر انگیز نیم سنی کہانی	116 مجرمانہ ذہن مرزا امجد بیگ بھری عدالت میں مدلل جرح..... کامیاب وکیل کا دلچسپ انداز	99 دادا پوتا عائشہ فاطمہ ایک وٹا شعرا پوری اور..... ایک ماں کی مت کا امتحان

آخری المیہ

جون ایلیا

انشائیہ

شام ہے، اقیانوسِ قلم سے اور فضا سے کلام ہے مگر چند لمحے سے میں، میرا ہنر اور میرا انشا پرداز بھائی معراج رسول ساکت اور صامت بیٹھے ہیں۔ ہم ابھی چند لمحے پہلے بیسویں صدی اور خاص طور پر بیسویں صدی کے اس دوسرے آدمے جسے کٹھن و نقصان کا حساب لگا رہے تھے اور اس کی سیاسی، اخلاقی، نفسیاتی اور عمرانی صورت حال کو معرض گفتگو میں لا رہے تھے۔ ہم تینوں اس دور کے ایک غالب رجحان اور میلان کے باعث بہت ہمت شکن تشویش اور بہت مایوس کن خدشوں میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ارد گرد سانس لینے والے جاندار ہماری تشویش اور خدشوں کو شاید وہم اور مایوس خیال کریں لیکن ان کے کسی خیال سے ہمارے مسئلے اور معاملے کی سنگینی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جو کچھ ہے وہ ہے۔

انسان نے گزشتہ چند صدیوں کے دوران میں، خاص طور پر گزشتہ چار صدیوں کے دوران میں علمی اور فنی (تکنیکی) ارتقا کا جو عالی شان سفر طے کیا ہے وہ نوعِ انسانی کے ذہنی اعجاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صدیاں علم اور فن (ٹیکنالوجی) کے درجہ بہ درجہ اوج اور عروج، حیران کن اوج اور عروج کی صدیاں رہی ہیں اور بیسویں صدی کا یہ دوسرا حصہ تو ان روشن سے روشن تر اور روشن ترین صدیوں کا حاصل ہے۔

اس دور کو خیر و جمال اور شگفتگی اور شگفتگی کا سب سے زیادہ زریں دور ثابت ہونا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت کس قدر اذیت ناک حقیقت ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس برعکس حقیقت کے ذمے دار وہ لوگ ہیں جنہیں صاحبانِ امر و قدرت کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے ان صاحبانِ امر و قدرت نے اپنے آپ کو بڑے بھونڈے انداز میں نا امل، ناخوار اور نابکار ثابت کیا ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے معراج رسول کہہ رہے تھے اور بجا کہہ رہے تھے کہ پتھر کے دور کے انسانوں کا کوئی ایک غول کسی دوسرے غول کے حق میں اتنا مہیب، مدہش اور مہلک نہیں رہا جتنا مہیب، مدہش اور مہلک بیسویں صدی میں رہا ہے۔ تاریخ کی جتنی تباہ کن لڑائیاں علم اور فن کی اس سب سے پُر مایہ صدی میں لڑی گئی ہیں، اتنی تباہ کن لڑائیاں وحشت، ہیبت اور بربریت کے بدترین دور میں بھی نہیں لڑی گئیں۔

بیسویں صدی کا کیا مطلب ہے؟ بیسویں صدی کا مطلب ہے لاکھوں برس کی انسانی ریاضت، علم، تحقیق، ہنرمندی، کارگیری (ٹیکنالوجی) اور مہارت کے کمال کی سب سے تابندہ، درخشندہ اور درخشندہ صدی۔ اس صدی کو تو انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ سکون بخش، فرحت ناک اور جاں فزا صدی ہونا چاہیے تھا، اس صدی کے انسانوں کو گزشتہ تمام صدیوں کے انسانوں سے کہیں زیادہ انسانیت دوست انسانوں، انیس انسانوں کی حیثیت سے سامنے آنا چاہیے تھا۔

تاریخ کے شریف اور لطیف انسان لاکھوں برس سے انسانیت کی شگفتگی، فیروز مندی اور خرمندی کے جو خواب دیکھتے چلے آئے ہیں، اس صدی کو ان خوابوں کی روح پرور ترین تعبیر ثابت ہونا تھا لیکن کیا ایسا ہوا؟ یہ شرمناک ترین اور اشتعال انگیز ترین حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

میں نے بیسویں صدی کے اس آخری دور کی بات کی تھی۔ بیسویں صدی کا یہ آخری عشرہ اپنے مزاج میں انتہائی وحشیانہ دور ثابت ہو رہا ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ نسلی، لسانی، سیاسی اور مذہبی تعصبات ہیں جو مشرق و مغرب کے اعصاب پر بری طرح طاری ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس صورت حال کے ذمے دار مہذب انسانیت کے سردھرے ہیں۔ ان اور چند سردھروں نے ذہنی توازن کھو دیا ہے، بری طرح کھو دیا ہے۔ ان کا وجود تاریخ کی انتہائی بیہودہ مسخرگی ثابت ہو رہا ہے۔ یہ عالمی ٹولہ، صحت مند انسانیت کے حق میں ایک زہریلی گند کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عہد کے شائنات اور شریف ذہنوں کا جو سب سے بڑا فرض ہے وہ تعصبات کے عالمی رجحان کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ یہ جنگ بہ یک وقت شعور اور جذبے کے ساتھ کی جانی چاہیے۔ اگر یہ جنگ نہ کی گئی تو انسانیت کا تمام تر سرمایہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ انسان کی لاکھوں برس کی علمی، فنی اور تہذیبی کمائی نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی اور یہ کھکشاؤں کا، کائنات کا شاید سب سے بڑا حادثہ، سب سے بڑا اور آخری المیہ ہوگا۔

وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا
اب اس کا حال بتائیں کیا

مگر ہم آپ کو بتائیں گے اور خوب بتائیں گے۔

جی ہاں..... مہاجر گزشتہ کا ایک اور معرکتہ آرا خاص نمبر

عشق ناکا کا نمبر

عشق..... جس میں مہر بھی ہے اور قہر بھی، وصل بھی ہے اور فراق بھی..... عشق، انسان سے کیا کچھ نہیں کراتا انہوں نے بھی اپنی شہرت و ناموری کو داؤ پر لگا دیا۔

مشہور و معروف ہستیوں، تاریخ ساز افراد کے ناکام عشق کی داستانیں..... دل پراثر کرنے والی سچ بیانیاں، ایسی دلچسپ سچی کہانیاں جو آپ کو چونکا دیں گی۔

بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ہر صاف

علم کے لیے

تحفہ خاص

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ محفوظ رکھنا ضروری سمجھیں گے



دلوائے (آمین) سجدہ بخاری صاحب زیادہ دوڑیں لگنے اور لپٹنا مارنے سے نوبال بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی آپ کی دوزخ کی عمر ختم ہو چکی ہے۔ طاہرہ نگار باجی آپ کو اعداد و شمار بہت یاد دہندے ہیں۔ ہمایوں سعید راج بھائی کرایہ کی گاڑیاں ایندھن مہنگا ہونے کی وجہ سے بہت جلد رک جاتی ہیں۔ راجا ثاقب آپ کی سز قمر فیاضے رشتہ داری ہے؟ تفسیر عباس مجھے کوئی بھی دوست آپ کا نمبر نہیں دے رہا۔ خلوط کی محفل کے بعد کہانیوں کی محفل میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب اس دفعہ خوب اچھی کہانی لے کر آئے اور دہلی کی سیاست کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہی حاصل ہوئی۔ جرم محبت حقیقی طور پر اپنے قاتل پر پورا اترتی۔ سکھول میں اب افضل خان کے کردار میں جان پڑ چکی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ نئے کرداروں اور رنگ باس کا کس انداز میں نا کر اہوتا ہے اور لیاقت حسین کا کردار ڈیٹس میں ہوگا یا دوبارہ جاعدار بنے گا۔ بخارا آزاد نے بہت مردانہ دھندلے کی صحیح تصویر کشی کرنی ہے۔ مرقان نے جس طرح زکس کو پالینے کا طریقہ اختیار کیا، اس سے چار بندوں کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔ مگی اپنی محبت پالینے کی خاطر بلا چوں چراں اس کی باتوں پر عمل کرتی رہی مگر سلی لا حاصل اور انجام بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ محفل شعرو سخن میں راشدہ اینڈ زاہدہ، ڈاکٹر وسیم، عظیم سید محمد رضا شاہ، ستر فیاض، طاہرہ یاسمین، سعید عباسی کے اشعار اچھے تھے۔ آپ جی کے انداز میں لکھی گئی مسافر میں معاشرے کی رنگینیوں سے بہت کچھ حقیقت پر مبنی معاشرے کے حقیقی رنگ نظر آ رہے ہیں، بہت زبردست جا رہی ہے۔ بیزل اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں خود ہی پھنس گئی۔ نجمہ مودی صاحبہ کیا ہر جاگیر دار کا بیٹا شہر یار کی طرح بغاوت کر سکتا ہے؟

بشیر احمد بھٹی، بہادر پور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ اس دفعہ نائٹل میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ سر سبز لہو ترے چوں سے جھانکنا حسینہ، جینو کا چہرہ۔ ایک پریشان سوچوں میں گم مرد کا چہرہ۔ ڈاکٹر صاحب کے فن میں نکھار آ رہا ہے۔ سب سے پہلے آخری صفحات میں نجمہ مودی صاحبہ کی طویل کہانی دشت تہائی پڑی۔ دیہاتی ماحول کے پروردہ ایک امیر بگڑے ہوئے زمیندار کی کہانی۔ ایک ایسا فرعون جس کا بیٹا باپ کے رنگ میں بھگ بنا رہا۔ مسافر کی دوسری قسط نے تھلکہ آمیز تاثر چھوڑا۔ اس کہانی کا کینچہ بھی بڑا خوبصورت ہے۔ مسور نے کرداروں کی خوب عکاسی کی ہے (مسور شاہد کی جانب سے آپ کا شکریہ) ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی تاریخی کہانی ”گھر کے چراغ سے“ اچھی کاوش ہے۔ تاریخی کہانی سے قارئین تصور ہی تصور میں ماضی کی سیر کر لیتے ہیں۔ ایک مرمضہ سے الیاس بیٹا پوری صاحب کی کوئی کہانی شائع نہیں ہوئی۔ ان کا انداز بھی خوب تھا۔ انہوں نے لکھنے لکھانے سے قطع تعلق کر لیا ہے؟ (الیاس بیٹا پوری صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تاہم ہم کوشش کریں گے کہ ان کی کوئی منتخب کہانی دوبارہ پیش کریں) نواب صاحب، لکھا ہے کسی نئی کہانی کی قسطوں کو ذخیرہ کرنے کے لیے آپ سے کچھ مدت مانگ بیٹھے ہیں (جی آپ کا اندازہ صحیح ہے لیکن وہ جلد سسٹنس کے آخری صفحات کے لیے کچھ تحریر کریں گے) سکھول کی قسط نمبر 9 پڑی۔ انوار صدیقی صاحب بہت کم لکھتے ہیں مگر اچھا لکھتے ہیں۔ کم لکھنا بھی ایک لحاظ سے اچھا ہوتا ہے۔ کہانی میں غلطیوں کا احتمال نہیں ہوتا۔ زیادہ لکھنے والے مصنفین کی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس دفعہ مغربی کہانیوں میں بھی خوب چاشنی رہی۔

جعفر حسین، بجوانہ سے محفل میں آ رہے ہیں۔ ”سردرق اچھا تھا، ظاہر ہے اچھا نہ ہوتا تو سردرق کیوں ہوتا۔“ جرم کے بارے میں انشائیہ پڑھا، ایک حالیہ گیلیپ سروے کے مطابق پاکستان اور اس میں ممالک میں جو تھے نمبر پہ آ گیا ہے۔ فنون لطیفہ اور تفریح کے مواقع کی فراہمی، انصاف، روزگار، شخصی اور مصلحتوں کے اظہار کی آزادی جہاں پہ ہوتی ہے وہاں پہنچنا ادا ہی ہوتی ہے اور نہ جرم۔ ایک دانشور کا قول ہے ”اگر تمہارے پاس دو نوٹیاں ہیں تو ایک مانگنے سے پہلے بھوکے کو دے دو، ورنہ نہ تم بچو گے اور نہ وہ نوٹیاں۔“ (کیا خوب بات کہی) ادارہ جہاں پہ انفرشائی کے کارنامے ہمارے ہاتھ آ رہے ہیں پاکستانی نژاد برطانوی ڈاکٹر جواد کینیڈین ہدایت کار اور شرمین عید چٹائے کی مشترکہ کاوش Saving Face کے ذریعے شرمین کے الفاظ میں ”خواب دیکھنا مت چھوڑیں“ کا پیغام بھی دے رہا تھا۔ ہم دو تین ماہ اور نہ خط لکھتے مگر دو تین باتوں نے طاق نسیاں پر رکھے گرد آلود قلم کو اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ خط نہ لکھنے کی وجہ ظاہرہ یاسمین صاحبہ تھیں جنہوں نے ہمارے بارے میں انکشاف کر کے ہمیں عمران، شرلاک، ہوز اور جینز بانڈ کی مدد حاصل کر کے ان کے بارے میں جاسوسی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق محترمہ ڈاکٹر جواد کے نظریہ ارتقا کی رو سے ہماری کچھ نہ کچھ لگتی ہیں۔ ماما ایمان کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر آپ سسٹنس کے دوستوں سے بھی اپنی خوب صورت سی مصروفیت کا ذکر کر دیتیں۔ اگرچہ عمیرہ احمد کی تحریروں میں ایک سوچ، ایک نظریہ ہوتا ہے جو ہر ایک باشعور انسان پر فہم اور آگ کی کٹی ٹی جہتیں کھولتا ہے، جبکہ نمبرہ احمد باوجود اپنی تمام تر تعلیمی مصروفیت کے ہر کہانی کو طویل ریسرچ اور محمل ہوم ورک کر کے لکھتی ہیں مگر ہم بھی کیا کریں۔ گرداب پڑھنے کے بعد مومن کا دل نہیں چاہتا کہ وہ دوسری یا تیسری بار ڈسا جائے۔ امین تاجب مقبول صدیقی صاحب آپ کا محاورہ والا خط پڑھ کر بھی محسوس ہوا کہ یہ محترم انتظار حسین اور شان الحق حقی کی مدد سے مکمل کیا گیا ہے۔ محبت کے ان نکت پہلوؤں میں سے ایک پہلو سے روشناس کرائی جرم محبت نے متاثر کیا۔ محبت، مستقل مزاجی، محبت اور اعتقاد کا مجموعہ فیملی بزنس ہر اس شخص کو امید دلا رہی تھی جو زندگی میں کچھ کرنا چاہتا ہو۔ لا حاصل کا حاصل بھی رہا کہ محبت اعمی ہوتی ہے، عاشق نہیں۔ چورسپاہی کافی دلچسپ رہی۔ جب تک دنیا میں ایک بھی بے وقوف موجود ہے محفل مند بھوکا نہیں مر سکتا کی عکاس نظر فریب بہترین رہی۔ انوکھی محبت عام سی تحریر کی تقدیر کے آگے بے بس معالج کا نشانہ نہایت خواب بسرائیک معیاری انتخاب رہا۔ بادشاہوں کی غلطیوں کا کفارہ کسی نہ کسی کو تو دینا پڑتا ہے۔ اسی تناظر میں لکھی گئی گھر کے چراغ پندرہ آئی۔ سکھول بھی حسب روایت شاعر اور رہی۔ یہ عشق نہیں آساں بس۔۔۔۔۔ کی غلطی تفسیر ہمارے گھوڑا میں ان عاشقوں کے لیے پیغام پنپاں تھا جو اپنی محبت کو حاصل تو کرتے ہیں مگر بعد میں بھجوں بن کر روئے اور غمخیزی آہیں بھرتے زندگی گزار دیتے ہیں۔ مسافر پر تہرہ اذکار وہاں پہلے دیکھتے ہیں کہ مصنف کے مسافر کی پرواز کہاں تک ہے (ہم آپ کے تبصرے کا انتظار کریں گے) صاحب کتاب حضرت داؤد کی زندگی کے حالات و واقعات نے بہت متاثر کیا۔



نجمہ مودی صاحبہ ایک طویل عرصے بعد واپس آئی ہیں، ان کی تحریر دشت تہائی اپنی اٹھان سے خاص توجہ کی مستثنیٰ لگ رہی ہے سوائے (صفت سے پڑھیں گے۔ محفل شعرو سخن میں انیلہ اور ہریہ ابوبکر کا انتخاب معیاری لگا۔“

محمد عزیز ترین، راولپنڈی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”کراچی کے حالات اور خبروں وغیرہ میں جب بھی ذکر ہوا آپ سب کے لیے بے اختیار سے دعا میں نکل جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو..... اسٹاف، عملہ، کارکن، کارنگر، انکسپیکٹ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین) روزنامہ ایکسپریس 19 مارچ 2012ء بروز جمعہ کو شہور کالم نگار محمد عامر خا کوئی صاحب نے اپنے کالم ”زنگار“ میں ایک خط لکھا۔ جو اس خط کے ساتھ منسلک ہے، آپ کی معلومات کے لیے۔ میری آپ حضرات سے گزارش ہے کہ آپ اس خط کو اپنے تمام ماہناموں سرگزشت، جاسوسی، سسٹنس اور پاکیزہ میں شائع کرویں۔ کیونکہ آپ کے ماہنامے دنیا بھر میں جاتے ہیں اور قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ صرف اور صرف معلومات کے لیے ہوگا جو آپ اپنے تمام قارئین تک پہنچائیں یا جسے بھی آپ کی مرضی، آپ تو حاکم ہیں۔ ہم صرف عرض، گزارش یا التماس ہی کر سکتے ہیں (آپ کا بیٹھا ہوا مضمون ہم اپنے ماہنامے ”سرگزشت“ میں مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد تفصیل سے شائع کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ جلد اس واقعے کو ”سرگزشت“ میں پڑھیں گے جو اس جیسے سچے واقعات کا مجموعہ ہے۔ بعد میں اس تحریر میں سے کوئی ٹکڑا لے کر سسٹنس اور پاکیزہ میں بھی شائع کریں گے) اس دفعہ تو سر دیوں نے بھی کافی زور دکھایا اور پھر ”مرے کو مارے شاہدار“ حکومت وقت نے بھی سوئی گیس کی سپلائی مختصر کر دی تھی۔ نتیجتاً ہم جیسے 70 سالہ نوجوان بوزھوں نے بھی کسی نہ کسی طرح دم ختم سے سر دیوں کا مقابلہ کیا۔ کوئلہ، لکڑیوں کے دام، الامان والی خط۔ آپ کراچی والے ہی اچھے رہے جو کہ جنوری جیسے سرد موسم میں بھی بچے جھلتے رہے اور ہم ادھر آپ ہی کو دیکھ کر جلتے رہے۔ کیونکہ یہ آپ حضرات ہی کا تہرہ ہے کہ ”جھلنے والے کو جلا میں گے، ملوہ پوری کھا میں گے“ اسے خانہ براعزیز کچھ ادھر بھی؟

ذیشان فیروز، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے محفل میں ملے آئے ہیں ”نٹ کھٹ محفل کے پرانے اور نئے دوستوں کو سلام عرض کرتا ہوں، امید ہے مجھے محفل میں خوش آمدید کہاجائے گا۔ (اور وہ بھی خلوص دل سے خوش آمدید آتے رہے گا کہیں حاضری لگا کر غائب نہ ہو جائے گا) اس دفعہ مجھے سسٹنس کا بڑی شدت کا انتظار تھا اور اس کی وجہ یقیناً ناصربک کی تحریر مسافر تھی۔ سردرق قدرے مختلف تھا۔ انتائیہ میں جون ایلیا کی حقیقت گوئی ہمیں بہت پسند آئی۔ ادارہ میں مدیرہ آئی نے موجودہ حالات کا بڑا خوبصورت تجزیہ کیا ہے اور یقیناً اس حال میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کا ایسا کب جیتنا ایک خوش گوار اضافہ ہو سکتا ہے (جی ہاں، یہ سچ بہت دلچسپ تھا، بس یہ نہ ہو کہ بعد میں پتا چلے کہ کس تھا) ماما ایمان صاحبہ یقیناً بہت عرصے بعد محفل میں شریک ہوئیں اور آتے ہی صدارت کی نشست پر براجمان ہوئیں اور ان کا تبصرہ اس قاتل بھی تھا۔ نعمان بیارے صاحب کا تبصرہ ہمیں بہت اچھا لگا خوشبو لگا کے۔ قصیر الحسن کی بہن کی شادی کی خبر پر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ سجدہ بخاری اس دفعہ اہل محفل پر کافی نکتہ چینی کرتی نظر آئیں۔ ہمایوں سعید راج صاحب یقیناً وہ معیاری لڑکی خوب صورت نیوٹن کے ساتھ آپ کا ہی انتظار کر رہی ہوگی۔ عمران حیدر بلوچ ہم آپ کو دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ طاہرہ یاسمین، مصیب الرحمن اور دوسروں کے تبصرے محفل میں شامل نہیں ہو سکے جبکہ شارقہ سلجوق، جاوید بلوچ اور شہزاد ٹیلہ آپ اس دفعہ کہاں غائب ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مسافر پڑی۔ اس کا آغاز جاعدار تھا اور اس قسط نے بھی، ہمیں اپنے عمر میں جکڑے رکھا۔ اس کے بعد سکھول کی طرف بڑھے، فتح حامد نے بڑی عیاری سے افضل کے ذریعے رستم علی آغا خانی کو ٹریپ کیا ہے اور اب شاید میڈم روبی اس کا اگلا شکار بننے والی ہے۔ مجموعی طور پر قسط (دوست تھی۔ ساجد احمد کی تحریر ”گھر کے چراغ سے“ میں انہوں نے ملکی دور حکومت کے اہم واقعات سے پردہ اٹھایا۔ ملک صفر حیات کی بنا گھوڑا میں عرفان کا کردار قابل غرت اور فریب ہر جتنی تھا۔ جس نے دوست اور محبوب دونوں کو بہ یک وقت دھوکا دیا۔ رضوانہ ساجد کی تحریر حضرت داؤد نے ہماری دینی معلومات میں زبردست اضافہ کیا۔ جرم محبت میں رچڑنے استہائے کامیاب منصوبہ بندی سے قانون کی گرفت سے بچتے ہوئے اپنی محبوب ہستی کو حاصل کیا۔ نجمہ مودی کی تحریر دشت تہائی نے کچھ خاص تاثر نہیں کیا۔ مختصر کہانیوں میں خواب برسر نظر فریب، چورسپاہی، لا حاصل اور فیملی بزنس بھی اچھی تحریریں تھیں۔ محفل شعرو سخن میں ساگر کوکر، ہریہ ابوبکر اور فرخ ناز کے اشعار داد کے قابل تھے۔“

شہزاد ٹیلہ (عرفان شہزاد) کشمیر، ڈن، سرکوہا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”ہاں، کا شمار 19 مارچ کی شام کو ملا۔ محفل گرل بالکل متاثر نہ کر سکی۔ پھر محفل میں پہنچے۔ مجھے تو آپ نے یوں محفل سے باہر نکال پھینکا جیسے دودھ میں سے کھٹی (ایسا نہیں ہے۔ باری باری سب کو جگہ ملی ہے۔ کیا خیال ہے؟) نعمان بیارے، شکر۔ مجھے محفل میں جی آ یاں نوں گلے لگا کر کیا اور عمران حیدر بلوچ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ نے بھی مجھے محفل میں خوش آمدید کہا۔ محمد قدوت اللہ نیازی کا تبصرہ شاعر تھا اور بانی ماما آپ کے تبصرے تو محفل ہی لوٹ لی، دوی و زبانی اور خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اہم طاہرہ کو لکھا کہ سنے میاں سے زیادتی کر رہی ہو۔ ماما سسر میرا نام اتنا اچھا ہے پر یہ بڑی ہونے کے ناتے مجھے ٹیڈ ہو سکتی ہے، اس کو سمجھاؤ یہ آپ کی بہت بڑی فہم ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑی مسافر، بہت مزہ آیا۔ یکدم کہانی ختم ہو گئی پتا ہی نہ چلا۔ سکھول بھی بہت اچھی جاری ہے۔ دینی فیملی دینی کی دو تین تحریریں پڑھی تھیں اچھی لگی تھیں، ادیدی آپ دوبارہ لکھو ناں سسٹنس میں۔ انوکھی محبت اچھی تحریر تھی، دشت تہائی اچھی پڑھ رہا ہوں۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔“

ایم چودھری، احمد پور شرقیہ سے ملے آ رہے ہیں ”ناٹل بس ٹھیک تھا، لڑکی دیکھ کر تفسیر بھائی جان کو رہی تھی لیکن پھول نکار ہا۔ راج پر برساتی تھی۔ ہاں اس کی آنکھیں بہت پیاری تھیں۔ محفل یاراں میں کرسی صدارت پر بٹیا آغا فرید احمد خان پھنس کر بیٹھے ہوئے تھے، لہ حال ہاں بہت مہارک ہو، تبصرہ اچھا لگا۔ نعمان بیارے آپ میرے چھوٹے بھائی جانی کی عمر کے ہو، آپ کو لیت لیکن پھر بھی پچی برتھ ڈے۔ اللہ تعالیٰ



آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے، آمین۔ کہانیوں میں سے ابھی صرف کھنکول پڑھی اور مسافر جو کہ بہت پسند آئی۔ تصویر العین آئی کا تبصرہ اچھا لگا۔ جاوید بھائی گاڑی میں چورے لے کر گھومتے ہو، جو شاہ چوری ہونے لگا تھا۔ ابرار وارث بھائی اللہ عزوجل آپ کو اور آپ کی فیملی کو صبر عطا فرمائے، آمین۔ عمران علی فرام جنگ جگہ جگہ کے رہنے والوں کی بولی بہت اچھی لگتی ہے۔ طاہرہ باجی اللہ آپ کی اسی جان کو صحت عطا فرمائے، آمین۔ حاجی عبدالحکیم انکل جی آپ ہمارے بزرگ ہیں پلیز ناراض ہونے بغیر تشریف ضرور لاتے رہیں۔ شہزادہ فیروز بھائی ویکم جی آیاں نون جناب۔ قمرستی جی ہواؤں میں ست اڑو رہے ہم پر کاٹا بھی جانتے ہیں۔ بھائی جان ماما آئے کی دانہیں ضرور اور پھر آپ کی خیر نہیں لیکن ماما کے آنے تک ”میں ہوں نا“ طاہر الدین بیگ بھیا لگتا ہے کہ آپ ڈکٹر ڈاکٹر ہیں جو راج کو نفسیاتی مریض کہہ رہے ہو۔ احمد خان توحیدی اور طاہرہ گلزار آپ کے خط بھی اچھے لگے۔ ارے ہاں باقی سب لوگ بارعباس، تقیر، راج، ماما، ولشین، گوئل بھائی۔ ارے بھائی کہاں گم ہو بھائی، سب لوگ شرافت سے آجاؤ۔ مسافر جو کتنی سلسلے دار کہانی ہے شروع سے ہی اچھی لگی ہے۔ امید ہے کہ کبھی مایوس نہیں ہوں گے پڑھنے والے۔“ (شکر ہے آپ کو کہانیوں پر تبصرہ بھی یاد رہا)

طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ”اپریل کا سسٹن اچھے اور دلچسپ خطوط سے آراستہ اور نوک جھوک سے بھر پور تبصروں کے ساتھ اچھا رہا۔ چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد ماما ایمان اس شان سے آگئیں کہ اول نمبر پر تشریف فرما ہوئیں۔ ان کا تبصرہ اچھا رہا۔ ماما ایمان اور تصویر العین کو سسٹن میں پا کر حیرت ہے۔ تقیر عباس بار خوب صورت تبصرے کے ساتھ اچھے رہے۔ سسٹن محاوروں کے درمیان..... مگر انیسویں کے ہم کھوج نہ لگ سکے۔ تاریخ کے جھروکوں سے ڈاکٹر صاحب کی زیروست کاوش گھر کے چراغ سے بڑا ہی مناسب اور بڑا ہی زیروست عنوان، کہانی اس سے بھی زیادہ اثر انگیز، جبریت انگیز۔ بقول ڈاکٹر صاحب کہ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ تاریخ کے اور اوراق میں چچانے بچھنے کو، بھائی نے بھائی کو بچے نے باپ کو تخت حاصل کرنے کے لیے راہ سے ہٹایا۔ مگر اس کہانی میں تو آغاز سے انجام حیرت انگیز ہے۔ سیدی مولہ کا کردار اور پھر غلطیاں اپنے آپ کو دہرائی رہیں۔ جلال الدین غلٹی اور علاؤ الدین غلٹی تاریخ کا عبرت ناک واقعہ ہے۔ مگر سیدی مولہ کا کردار ڈاکٹر صاحب، معظم علی پر بھی ایک تحریر ہو جائے۔ بے وفائیوں سے بھری یہ تحریر بہت عرصہ یاد رکھی جائے گی جہاں دل پر نشتر لگانے والے واقعات بھی ہیں اور محبت سے لبریز لمحات بھی۔ اب ذکر کچھ بدلی تحریروں کا جنہیں کاشف ذہیر، آزار صاحب اور شرماس لکھتے ہیں اور خوب ہی لکھتے ہیں۔ زیروست منظر نامے اور اصلی ماحول کے ساتھ کہانیاں دل پر اثر کرتی ہیں جیسے جرم محبت خاص طور پر اور مرتبان شہد کے درمیان کھٹی گئی ایک فیملی کی کہانی فیملی بڑے خوب رہیں۔ خوب تو سریم کے خان کی خواب بسر بھی رہی۔ جاگیر داروں کے ماحول میں مجبور اور بے کس رعایا کی کھٹا، سلطنت اس کے شوہر فاروق اور پھر ملک کے کرداروں پر جتنی تحریر دشت تنہائی بہت اچھی کہانی تھی۔ شروع سے آخر تک اس کہانی نے ہمیں اپنی گرفت میں رکھا اور چمکے اس وقت جب یہ کوچ سنائی دی۔ دشت تنہائی میں اسے..... انوار صدیقی کا کھنکول سب رفتار انداز سے رواں دواں ہے۔ آغاز ہی سے یہ کہانی اپنا اثر رکھتے ہوئے ہے۔ تمام کردار اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ دوسری طرف مسافر اپنے قدم جما چکی ہے اور امید کرتے ہیں کہ یہ مسافر سسٹن میں کتنی جگہ لگاتے ہوئے چاندوں کا اضافہ کرے گا۔ مسافر میں اس وفد ڈاکٹر صاحب شریاک ہو کر نظر آئے اور بڑی خوبصورتی سے اپنے آپ کو بچا گئے۔ ملک صفدر حیات صاحب اس مرتبہ بیمار گھوڑا لے کر آئے، محبت کو حاصل کرنے کے لیے ایک زیروست حقائق جس کا انجام بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس مرتبہ منظر نامہ صاحب کی کئی شدت سے محسوس ہوئی۔“

عمران علی، دریام جنگ سے تبصرہ کر رہے ہیں ”اس بار سسٹن 19 تاریخ کی صبح کو ملا۔ وہ بھی آمدی کے ساتھ رات کو آمدی آئی۔ دن کو سسٹن ملا۔ انکل ڈاکٹر کا شاہکار ہماری سمجھ سے بالاتر تھا جو آمدی کی طرح سر سے گزر گیا۔ کہانیوں کی لسٹ اس بار بڑی زیروست بنائی گئی تھی۔ انشا میں جرم پر ایک بہت اچھا موضوع لکھا گیا۔ اب آتے ہیں دوستوں کی محفل میں سب سے پہلے تو بہاؤ پور کے شرارتی قاری کا کھانا۔ جو ضرب الامثال پر لکھا تھا، بہت پسند آیا۔ جتنی داد دیں کم ہے، یہ کون قاری ہے جو خود کٹھن کرنا چاہتا تھا اس کا پتا تو خطوط میں چلے گا، ہم تو نئے قاری ہیں۔ تمام دوستوں کا شکریہ جنہوں نے محفل میں خوش آمد یکہا (خیک یو) آخر کار ماما بہن نے اپنی خاموشی توڑ دی کیونکہ میر کا بیٹا لبریز ہو گیا تھا۔ جی پھر اب محفل میں آتی رہے گا۔ ماما شادی کہاں گئی شاید وہ اکیلی لڑا کر بھاگ گئی ہے۔ تصویر العین، بہن کی شادی مبارک ہو۔ سدا جڑی سلامت رہے آمین۔ تصویر صاحب اگر میری عمر جانتا چاہتی ہوں تو آپ کو تاور آفس آسانی سے مل جائے گا، وہاں سے تصدیق کر لیتا اور دوسری بات میرے خط کا موضوع بھی کچھ اس طرح تھا کہ عمر کا لکھنا پڑ گیا۔ ہمارا تو دوست آپ کے حق میں ہے کہ ضرور عیبرہ احمد اور عمرہ احمد سے سسٹن کے لیے لکھوایا جائے۔ قمرستی صاحب طاہرہ یاسمین نے صحیح بات کی ہے، اچھی باتیں اور جائزہ تبصرہ لکھیں خاص ٹائم نکال کر۔ میں بھی کیلنک سے ٹائم نکال کر لکھتا ہوں بڑی مشکل سے۔ ریاض بٹ صاحب اپنی حاضریاں گنتے رہے گا یہ نہ ہو کہ کسی دن حاضریاں مکمل نہ ہونے کی وجہ سے بلیک لسٹ سے فارغ ہو جائیں۔ مرزا بیگ صاحب سوچ لیا ہے کہ صدارت کے لیے تو ایسے شمارے میں کری صدارت پر آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں بھولے گا نہیں۔ عمران حیدر بلوچ صاحب ہم بھائیوں کی ہر وقت آپ کے لیے دعا میں ہی دعا میں ہیں۔ ہمایوں صاحب اپنے ومانگ کرانے پر دیتے رہے کا تا کہ منف نازک کے تبصرے شائع ہونا بند نہ ہو جائیں۔ کسی مصور سے شادی ہوگئی تو پھر آپ تو راج کریں کہ تقیر عباس آپ تو بہت کھرائی میں جا کر تبصرہ لکھتے ہیں۔ طاہرہ گلزار کے تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعر ہیں۔ اب آتے ہیں جی خوبصورت کہانیوں کی طرف سب سے پہلے کھنکول پڑھی، اس بار تو کہانی شبنم اور انفلز کے اور گرد گھومتی رہی، کوئی خاص موز نہیں لیا۔ مسافر تو اس بار بہت اچھی رہی۔ حیات خان شاہ جی کے خلاف اور بھی قدم ضرور اٹھائے گا۔ تاریخ کے اور اوراق میں



عمری ڈاکٹر ساجد احمد کی کہانی گھر کے چراغ سے بڑی سبق آموز کہانی رہی، بادشاہ کی ایک چھوٹی سی غلطی سلسلے کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے اور خاص طور پر درویشوں کا قل بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔ ملک صفدر حیات کی کہانی بیمار گھوڑا جبریت ناک کہانی تھی۔ تارانی کی محبت اور فیملی انسان کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ تاریخ انبیاء رضوانہ ساجد کی تاریخ انبیاء میں حضرت داؤد بڑی اچھی معلومات تھی۔ سوانح اولیا کرام بھی شروع کی جائے۔ سریم کے خان کی کہانی خواب بسر زیروست کہانی تھی۔ نجمہ سودی نے دشت تنہائی کے ساتھ میدان مار لیا۔ محبت ہو اور ہجر نہ ہو تو کہانی بے معنی دکھائی دیتی ہے۔ جبروں میں محمد قدرت اللہ خان، ماما ایمان، سعد یہ بخاری اور تقیر عباس کے تبصرے اچھے لگے۔ شاعری اس بار بہت اچھی رہی۔“ (شکر ہے)

راجا ثاقب نواز ثاقب، رتی جی، ساہیوال سے تشریف لائے ہیں ”اپریل کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ اس تاخیر کی وجہ جلی کا دترین بندش اور فرینڈز کی آمد و رفت میں غیر معمولی تاخیر ہی ہو سکتی ہے۔ مسائل اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ پوری قوم اب کرکٹ کے میدانوں میں لٹنے والی فتح کی خوشی کا سماں کی خوشی سمجھنے لگی ہے (کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے..... آپ نے سنا ہی ہوگا) مگر دکھوں کا داؤد اکرانے والے تو روپے پیسے کی چکاچوند منڈی میں خریدتے اور بکتے نظر آتے ہیں۔ سرورق اب کی بار قدرے غصہ لگا۔ جون جی نے جہاں جرم کی نشاندہی کی، وہاں ساتھ ہی ساتھ سدباب کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ گھر کے چراغ سے، کئی تاریخی گھر و عود کو بچنے دیکھا۔ جرم محبت میں سریتانے اپنی منزل پائی۔ فیملی بڑے میں ہیری بڑے میں کم ہمارے روائتی و کاندراوں کی طرح ملاوٹ کرنے کے فن سے مالا مال نظر آیا۔ بیمار گھوڑا میں عرفان نے اپنے ساتھ ساتھ زکس کی بھی لٹیا ڈیوڑی۔ لاماصل کے مطالعہ کے بعد میں بے چارگی کے درجہ پر فخر دکھائی دی۔ چورسپاہی میں پولیس امر کی اصلیت کا کچھ کچھ اندازہ پہلے سے تھا۔ بہر حال کاوش اچھی تھی۔ نظر فریب مختصر ترین ثابت ہوئی۔ انوکھی محبت میں آمدی راقبت کی وجہ سے بے گناہ جولیو فائیکا کی جان گئی۔ حضرت داؤد کی داستان حقیقی ہنوز جاری و ساری ہے۔ خواب بسر کے اختتام نے حقیقت میں چوٹا دیا۔ دشت تنہائی میں سلطانہ کے بے درپے جذباتی فیصلوں کی وجہ سے شہر یار ملک دھوڑے کی سولی پہ ہمیشہ ہمیش کے لیے جمول کیا۔ کترنوں کے معیار میں مزید بہتری نظر آئی، مگر ان کی تعداد میں اضافہ ناگزیر ہے۔ اشعار معیاری تھے۔“

طاہرہ گلزار، پشاور سے محفل میں حاضر ہوئی ہیں ”ماما ایمان جی نے ویکم کیا اچھا لگا۔ تصویر العین! عمن عباس، تقیر عباس کے بڑے بچے کا نام ہے جو دو ڈھائی سال کا ہے۔ عمران علی آپ نے صحیح فرمایا کہ ہمایوں سعید کا سدھر جانا اس سال کا لطیفہ ہے۔ قمرستی صاحب بھائی کو، بھائی کہنا کوئی بڑی بات تو نہیں۔ ملک بشری ٹکو کرانڈ تانی ٹکو کرکرا آپ کا دل شاد ہوا کہ کسی نے یہ نہیں کہا کہ گمیا دو توں بہنیں ہو۔ ڈاکٹر ویم آپ اتنے تنجیدی سے نہ سوچا کریں کہ سرورق کی حیرت آپ کو دیکھ رہی تھی، آپ میں ایسا کیا ہے؟ قدرت اللہ بڑی بات آپ آغا فریہ خان کو کن منوں میں بزرگ کہہ رہے ہیں؟ قدرت اللہ صاحب سازشی مرد ہوتا ہے اور عالم بھی کیونکہ معاشرہ جو آپ لوگوں کا ہے تو پھر عورت کو کیوں بدنام کرتے ہو۔ شیر علی خان کیا آپ خود بچے ہیں مگر آپ دوسروں کے اکسانے پر ہر کام کرتے ہیں۔ ماہ تاب گل رانا یہ کیا بات ہوئی کہ ایک نظر میں کوئی چیز دل کو چھو جائے اور دوسری نظر میں اتر بھی جائے۔ انکل مرزا طاہر الدین بیگ کے خط میں ایک جملہ ایسا لگا کہ یہ تو میرے خط سے کاٹ کے شائع کیا ہے۔ فیچ سلطان کی شہادت کا منظر بڑھ کر آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انکل یہ اچھی بات نہیں ہے۔ شکر یہ سعید عباسی میں ہوں بھی بہت اچھی۔ عمران حیدر بلوچ اور حسین بلوچ ہم تو آپ سب کو یاد کرتے ہیں۔ سعد یہ بخاری جی۔ تبصروں پر سسٹن، دوسرے نمبر پر جاسوسی اور تیسرے نمبر پر سرگزشت ہے۔ ہر جگہ موجود ہوتی ہوں۔ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ جی محبت واقعی کسی وقت، ملک اور قوم کی محتاج نہیں، جی محبت ہمیشہ جیتی ہے جی کاشف ذہیر کی کہانی جرم محبت، جس میں رچڑنے آخر مرنا کو پالنا۔ کھنکول کی یہ قسط کچھ خاص نہیں تھی۔ مسافر بہت تیز دوڑ میں ہے۔ دبی جاگیر داروں اور دوڑیروں کی بے غیرتی اور ڈھیٹ پن کی شاہکار کہ خود کو بڑے اور طاقتور کہنے والے اپنے طاقت کے نتیجے میں بھول جاتے ہیں کہ وہ ایسی بچ کر کرکھیں کر کے پستی کے کس کھرائی میں جا کر رہے ہیں۔ سرورق کو حسین کو ماما ایمان کی طرح تھوڑی اور اس لگی۔ کیوں ماما جی خوش رہا کریں۔ انکل آپ کو نہیں پتا کہ تقیر عباس باری کی ایک شاعری کی کتاب شائع ہوئی ہے اس کا نام ہے ”بہت کچھ تم سے کہنا تھا“ (ہم نے پوچھا تھا کہ کتاب کہاں ہے؟) لگتا ہے ہمایوں سعید راج کے دل و دماغ پر کچھ زیادہ اثر ہوا ہے۔ تقیر عباس یہ آپ رورق کی حسین کی تحریف کر رہے ہیں ماما ایمان کی۔ مامی آئینہ یا اختیار میں اس بار جلال الدین کے بارے میں لکھا گیا اور شاندار لکھا گیا۔ یہ جملہ ویر حباب میں رہا کہ ”جو تلواریں سے قتل کرتا ہے، وہ تلواریں سے قتل ہوتا ہے“ اور یہی ازل سے ہوتا آیا ہے۔ ان مسلمان بادشاہوں کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ مسلمان ہونے پر شرم آتی ہے۔“

ماما ایمان، حافظ آباد سے تشریف لائی ہیں ”اللہ رب العزت آپ کو ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آپ سے درخواست ہے کہ معراج انکل کی خیریت سے بھی ضرور آگاہ کیجیے۔ اللہ انہیں بھی اپنے سایہ رحمت میں رکھے (آمین) اپریل کا شمارہ حسب معمول مجھے دیر سے موصول ہوا، جس میں ہماری تحقیق کے مطابق تصویر اور سراسر ہمارے ہاں صاحب ضمیر تھے۔ سرورق پہلی نگاہ میں جاسوسی کا لگا جس کی وجہ خلاف معمول اپریل امیٹا سٹاک کی حسینہ اور ایک چاکلیٹی ہیر کی موجودگی تھی۔ محفل اس وفد واقعی گریک نظر آئی کیونکہ مبادلت نے اول آکر صفحہ نمبر 12 کو آٹھ ماہ گالے میں کوئی کسر جو نہیں چھوڑی۔ باقی خطوط میں کشش مروج پر تھی سب اپنے اپنے بدلے چکا رہے تھے۔ بہاؤ پور سے جس شرارتی قاری نے ”میں ضرب الامثال اور محاورات کی مار ماری ہے وہ یقیناً ایسا انصاری فرام بہاؤ پور ہیں (جی شرارتی قاری جلد بتاؤ بھی کہ کیا یہ پہلی بوجھ لگی گئی ہے؟) راجا ثاقب نواز بھائی آپ واقعی اتنے شریف ہیں یا میرا گمان ہے۔ سعد یہ بخاری ڈیر آپ کا قلع کیا زمانہ پنجاب پولیس سے ہے، لگتا ہے



دوڑیں لگانے کی کافی پریکٹس ہے آپ کی۔ مرزا طاہر الدین بیگ صاحب سب سے پہلے نمبر پر آنے کے لیے سب سے ضروری ہے کہ آپ کا خط پڑھتے وقت آغوشی کا سوڈو خوشگوار ہو (خراب موڈ میں بھی فیصلہ اچھا کیا جاسکتا ہے) محمد قدرت اللہ قدرت صاحب آپ کی باتیں آپ ہی کی طرح عمر رسیدہ لگیں۔ ڈاکٹر وسیم خالق ایسی شکل و اداس کی باتیں ہمارے سیدراج کو بھی کرنا سکھا دیجیے۔ دعائیں دے گا آپ کو۔ تصویر الحسن ڈیرہ، یمن کی شادی مبارک ہو۔ عمران حیدر بلوچ بہت شکر ہے آپ کی پر غلوس پکارا۔ تفسیر عباس بارہ انگل اس ماہ آپ کو عام سحانی ہے، تبصرہ آپ کا بہت اچھا تھا۔ لگتا ہے آپ کی وائف آپ کے لیے دوائے دل ثابت ہوئی ہیں۔ قمری آپ نے اندھیرے میں تیر چمکا ہے جو یمن نشا نے پر لگا ہے۔ ماہ تاب گل اور طاہرہ مگر خوش رہو آپ کے خط میں منف نازک کی کئی کا خوب پورا کیا ہے تم دونوں نے آکر۔ سویت آغوشی عمران علی کے خط میں کی گئی آپ کی وضاحت کے ہم پہلے ہی قدردان ہیں اور عیرہ احمد تو ہماری آل غام فیورٹ ہیں اور خدا ان سے سسپنس و جاسوسی کے لیے ضرور دکھوائے تاکہ جنہوں نے ابھی تک عیرہ کو نہیں پڑھا وہ بھی ان کی صلاحیتوں کے معترف ہو سکیں کیونکہ میرا ماننا تو یہ ہے کہ جس نے عیرہ احمد کی تحریروں کو نہیں پڑھا، اس نے کچھ نہیں پڑھا۔ سو پلیز پلیز درخواست پر ہمدردانہ غور کیجیے گا (آپ سب کی فرمائش ہم نے نوٹ کر لی ہے) محفل شعروطن خوش ذوق قارئین کے عہدہ ذوق کی آئینہ دار ہے۔ اس ماہ سب سے بہترین انتخاب جن آرا خان کا ہے۔ کہانیاں پڑھنے کی ابتدا مسافر سے کی۔ ڈاکٹر شاہ نے اپنے خلاف ہونے والی سازش کا بڑی خوبی سے توڑ کیا۔ زبان تو نہیں لیکن کہانی کا ماحول بہت مانوس سا ہے۔ شہر یار اور خالد کی یکسر ہی بھی زبردست ہے، مجموعی طور پر مسافر سسپنس کی دنیا میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کے بعد باری آتی ہے مشکول کی۔ اس واقعہ کہانی میں افضل اور شبنم چھائے رہے۔ مکالمے بہت جامعہ اور ہوتے ہیں لیکن پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے تنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ یہ تحریر بھی ذاتی دشمنیوں پر مبنی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ کوئی ملک دشمن عناصر کی سرکوبی پر مشتمل طویل تحریر پڑھنے کو ملے تاکہ ہم حقیقت میں نہ سبھی تصورات میں ہی خوش ہو سکیں۔ نجمہ سودی صاحبہ بھی بڑی موڈی ہیں کافی عرصے بعد تشریف لائی ہیں، دشت تہائی کسی حد تک جھلک اور عجیبہ استوری تھی۔ انسان چاہے دنیا کی ہر آسائش پر دسترس رکھتا ہو لیکن اپنی قسمت کو بدلنا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ تحریر دل گرفتگی کے عالم میں دیر ان دہائیوں پر ایک تنہا مسافر اور نا آسودہ خواہشوں کا عمدہ غلاب تھی۔ ملک صفدر حیات کی تیار گھوڑا میں مجھے سب سے زیادہ نرمس کی بے وقوفی پر غصہ آیا جسے مصنف نے جھوٹ دینے کی کوشش کی ہے۔ بخارا آزادی مختصر ترجمہ تحریر نیلی پرنس عزم دھولے کے ساتھ ساتھ تھوڑے سے دھوکے پر مشتمل تھی۔ کاشف ذہیر کی جرم محبت رچرڈ کی چالاکی اور سریتا کی کسی حد تک بے وقوفی پر مشتمل تھی۔ میں توقع نہیں کر رہی تھی کہ لڑکی اینڈ پر چڑھ کر اپنی بیٹی نکلتی گی۔ عابدہ زہرا کی لا حاصل میں جلدی ہی مگی کی بیک سے جان جھوٹ گئی حالانکہ میں سمجھ رہی تھی اب پوکی، مگی کو اپنے اشاروں پر مچائے گا۔ شرمیاس کی چور سپاہی نے تو اینڈ تک ہمیں حیران کیے رکھا۔ آر تھر اور چیڈ بڑی عمدگی سے دوسری جوڑی کو ڈانچ دینے میں کامیاب رہے۔ سلیم انور کی نظر فریب میں ہیزل اب اپنی جہیز زندگی زمناں میں گزار رہی گی۔

طاہرہ یاسمین، سر کو دھاسے چلی آ رہی ہیں اس ماہ کا شمار 18 مارچ کی شام کو شہر اڈیشا نے لا کر دیا۔ بجلی نہ تھی، میں نے چارج لائن جلا کر بے تابی سے شمارہ نکھولا اور اپنا خط نہ پا کر چہرہ ایک دم پھرا کر گیا۔ بلیک لسٹ میں (جسے ہم حاضری رجسٹر کہتے ہیں) اپنا محبت نامہ دیکھا تو دل کو تھوڑا سکون ملا کہ پلو خط پہنچ تو کیا ورنہ میں نے جس کو خط پوسٹ کرنے کو دیا تھا پھر اس کی خبر نہ تھی۔ ماہی شکر ہے آپ محفل میں آئیں آپ کے آنے سے جان میں جان آئی، مبارک ہو کرسی صدارت کی۔ آپ کی بات پر سب گھروا لے بہت ہنسے تھے جو آپ نے لکھا تھا کہ بڑی زیادتی کی سنے بھائی سے۔ شہزاد نیلو نے کہا باجی ماہانے ٹھیک لکھا ہے تم مجھے نیلو مت کہا کرو میرا سید چا پورا نام لیا کرو مرغان شہزاد چودھری۔ آپ کا تبصرہ بیٹ، خبروں تھا ماہی۔ نعمان پیارے دہی بھائی کیا حال ہے آپ کا؟ تصویر الحسن، بہت شکر ہے کہ آپ نے میری ای کا حال پوچھا اب وہ آپ سب کی دعاؤں سے ٹھیک ہیں۔ نمرہ احمد اور عیرہ احمد اگر شمارے سسپنس میں لگیں تو شمارے کو چار چاند لگ جائیں گے۔ محمد قدرت اللہ نیازی، صاحب مان گئے بھی آپ کے تبصرے کو اور اتنا طویل اور خوبصورت تبصرہ، ویلڈن۔ عمران حیدر بلوچ، مجھے آپ کی اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ جیل میں بندہ کس طرح چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے دوسروں کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔ سعدیہ بخاری کا تبصرہ بھی دلچسپ تھا۔ طاہرہ گلزار بھی کیا حال ہے؟ سسٹر پشاور میں میری تمہیال بھی رہتی ہے۔ ہمایوں سعید راج آپ بڑے دن بعد محفل میں آئے۔ تفسیر عباس بارہ، مجھے آپ کے تبصرے نے تو محفل میں پانچ چاند لگا دیے۔ شعروں کی محفل میں بیٹ، خبروں شعر تھا۔ زویب احمد ملک، محمد قاسم علی عمران اور قدرت اللہ کے اشعار بھی زبردست تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے پڑھی، مسافر۔ شاندار تھی لگتا ہے راجا اور رفیق اناڑی دالے کردار اب مسافر میں خالا خالد اور شہر یار بھاد ہے ہیں۔ مسافر کی آئندہ قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ مشکول تو ہر ماہ ہی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے اور جرم محبت کاشف ذہیر کی اچھی تحریر تھی۔ نجمہ سودی کی دشت تہائی پڑھی، بہت پر اثر تحریر تھی۔ مدتوں یاد رہے گی۔ پیار گھوڑا، ملک صفدر حیات کی تحریر ہو اور میں پسند نہ آئے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ملک صاحب تو میرے فیورٹ ہیں کاش آج کے دور میں بھی کوئی ملک صاحب جیسا ایماندار ہوتا۔

مقصود الحسن طاہر، پتو کی قصور سے محفل میں تشریف لائے ہیں اپریل کا خوبصورت شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ بائبل پر تبصرہ کروں کہ نہ کروں۔ گچی بات بتاؤں کہ اس واقعہ کا سرورق بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ پیاری محفل میں چلا تک لگا تو کیا دیکھتے ہیں، ماہا ایمان صاحبہ کرسی صدارت صدر پاکستان کی طرح سنبھالے ہوئے بیٹھی تھی۔ ماہا ایمان جی بھوتوں کی محفل میں چیلوں کا کیا کام؟ آپ کے آنے سے خوشیاں تو بکھر گئیں گی۔ محمد نعمان پیارے مفردی کی سرورق اور اوپر سے سسپنس کا دیدار آپ نے ہمیں بھی سسپنس میں ڈال دیا ہے، خوشبو لگا کے۔ اور آپ کی

ملارٹ کے بھی کیا ہی کہتے؟ ہماری بھی تھوڑی سی کرویں پیاری عذر ماہی سے کہ وہ ہمیں بھی محفل میں دوبارہ سے جگہ دے دیں۔ (جناب آپ کو سفارش کی کیا ضرورت ہے) تصویر الحسن آپ کی خوشی میں بالکل ذہول بھا کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کو شادی کی اجازت خوشیاں عطا فرمائے، آمین۔ قمری صاحبہ تصویر الحسن اور ماہا ایمان ایک ہی صورت کے دو نام ہیں۔ کمال ہے آپ کو اتنی دیر بعد پتا چلا، خیرانی والی بات ہے۔ ریاض بیٹ جی دل کے چراغ روشن رکھا کریں۔ انہیں بچنے مت دیں یہی زندگی ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی آپ کون سے محبت نامے لکھتے رہے ہیں جو آپ اتنے اداس ہو گئے۔ اپنی عمر بھر کا کالج لائف والی بتائی جاتی ہے۔ ماہ تاب گل رانانی آپ نے پہلی دفعہ کیا ذاتی سرورق ہی دیکھا تھا؟ جو دوسری نظر مور کے پاؤں پر ڈال لی۔ چلیں آپ کی مصومیت کو دیکھتے ہوئے عذر ماہی نے آپ کو محفل میں شامل کر لی لیا آخر ان کی صنف کی جو ہوگی آپ۔ مرزا طاہر الدین بیگ پہلے نمبر پر آنے کے لیے بہت ہی خوبصورت تبصرہ لکھا ضروری ہے۔ سعید عباسی بھائی جاوید بلوچ نے ماہا ایمان سے تو بڑا تبصرہ نہیں لکھا تھا جو آپ ان سے مل کر کرتے۔ سعدیہ بخاری آپ سے کس نے کہا تھا کہ بی کو پکڑنا چاہیے۔ یمن طاہرہ گلزار آپ اب بھی خوش نہیں کہ آپ کے سارے خط شامل ہو رہے ہیں اور ہمارا ایک بھی نہیں۔ آتی رہا کریں اچھا لگتا ہے۔ ہمایوں سعید راج کمال ہے آپ معیاری لڑکی کے چکر میں اچھے رہے اور یہاں ماہا ایمان حیدان مار گئی۔ ویسے آپ کو ابھی تک آپ کی مصورہ ملی ہے یا کہ نہیں؟ راجا ثاقب نواز شکر کریں کہ طاہرہ گلزار نے آپ کو آپ کا بچپن کا زمانہ یاد کر دیا۔ تفسیر عباس بارہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو بھی لکھا وہ واقعی معاشرے کی کج عکاسی کرتا ہے۔ آپ نے اس محفل کی سب سے بڑی ہوگی کا نام سنا ہے۔ یہ محادروں کے درمیان والا جو خط تھا وہ ای ہوگی کا تو تھا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے تو مشکول پڑھی، حسب روایت بہت مزہ دیا۔ ملک صفدر حیات نے اپنی کاوش کو احسن طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ذاتی نرمس سے بھول تو ہوئی لیکن آخر کار اس کا اسے اور اک بھی ہو گیا۔ ناصر ملک کی مسافر کی جتنی بھی تعریف کی جائے اتنی ہی کم ہے۔ جتنی بھی کہانیاں ہٹ ہوتی ہیں وہ ساری گاؤں کے ماحول میں ہی ہوتی ہیں اور نجمہ سودی صاحبہ کی آخری صفحات پر دشت تہائی، اس بار سسپنس کی جان تھی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ سے دل بس یہی کہہ رہا ہے کہ دشت تہائی میں اسے جان جہاں لرزاں ہیں۔ تیری آواز کے سارے۔ اور کچھ نہیں لکھا جا رہا ای لیے اب ختم کرتا ہوں۔ (کہانیوں پر مختصر تبصرہ کرنے کا شکر ہے)

احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تشریف لائے ہیں۔ جون ایلیا آپ کے چند الفاظ بہت گہرے ہوتے ہیں۔ جرم کی جڑ، لاؤ اور حکومت کرو اے عیاش لیزر ہیں۔ محفل خطوط۔ ارے ماہا ایمان پردہ اٹھا کر کرسی صدارت پر مبارک ہو۔ نعمان پیارے، میں نے تبصرہ 23 فردی کو کو الا ڈاک کیا تھا، دیکھ لیں نام و نشان نہیں ہے۔ ماہا ایمان، تفسیر عباس ادا کا وہ، قدرت اللہ نیازی کے طویل تبصرے میرا نصیب رو کی نوکری۔ تصویر الحسن پاکیزہ کے بارے میں سب کو کہیں ایک بار پڑھ کر دیکھیں۔ نمرہ احمد، عیرہ احمد شامل کرنا اجازت کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ سسپنس میں نادل کے بجائے حقیقی کہانی ہوتی ہے۔ قمری کھوش، پاکستان کی سیاست ایماندار کے پس کی بات نہیں ہے۔ سعید عباسی بہاد پور 40 سال والی بات 1972ء میں 7 ویں میں پڑھتا تھا، پرانا رسالہ پڑھا سسپنس یا کوئی اور یاد نہیں۔ عمران بلوچ، اللہ آپ کو جلد رہائی نصیب کریں۔ گھر کے چراغ سے ڈاکٹر ساجد احمد صاحب تاریخی تحریر کا شکر ہے، پلیز شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے بارے میں لکھیں۔ مشکول ابھی پڑھی نہیں ہے۔ پیار گھوڑا، مرغان اور نرمس نے فرید کے ساتھ دھوکا کیا۔ یہی انجام ہوتا تھا۔ جرم محبت کاشف ذہیر، پرنس نیلی عیاد آزاد، لا حاصل عابدہ زہرا، چور سپاہی ابھی کہانیاں ہیں اردو میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ اشعار میں پہلا نمبر میرا، شکر ہے۔ دیگر اچھے ہیں۔ مسافر بہت خوب، دور بین کی چوری بری بات، شاہ جی جیسے لوگوں کو وقت کے لرحون کب برداشت کرتے ہیں۔ صدف کی اطلاع پر شہر یار اور کھالے کی بروقت کارروائی بہت اچھی لگی۔ نظر فریب، چور کی تو قابو آئی جاتا ہے۔ انوکھی محبت میں بے گناہ قتل ہوا۔ دشت تہائی شاہ زیب جیسے فرعونوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ شہر یار نے اچھی روش اختیار کی۔ انفس، سلطانہ سے شادی نہ کر سکا۔ ابھی لڑکیاں بہت ہیں۔ شہر یار جلد شادی کر لیں۔

ساکر ملک، چشمہ راج، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ سسپنس 14 مارچ کو ملا۔ بائبل اس مرتبہ معمول سے ہٹ کر لگا۔ جون ایلیا مرحوم کا جرم پڑھا۔ جون صاحب ہمیشہ کڑے سچ لکھتے رہے۔ ادارے میں ملک کے خراب حالات کا رونا رونا تھا، اب تو یہ معمول کی بات بن گئی ہے۔ شرمین نے پاکستان کا ذاتی نام روشن کر دیا ہے۔ باجی ماہا آئیں اور آتے ہی کرسی صدارت سے لگیں۔ مبارک ہو سسٹر۔ تصویر الحسن ہماری دعا ہے کہ ہماری بہن ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزاریں، آمین۔ جی آغوشی ضرور عیرہ احمد، نمرہ احمد سے سسپنس کے لیے بہت جلد لکھوایا جائے اور ساتھ ہی ماہا 10 ناقادری کو بھی اب پکڑ لائیں۔ قدرت اللہ ماہ تاب، سعدیہ بخاری، ہمایوں سعید اور تفسیر عباس بارہ کے خط بہت اچھے تھے۔ عمران حیدر بلوچ کو سلام 11ء ان کے لیے دعا، وہ جلد رہا ہو جائیں (آمین) مشکول بہت اچھی جا رہی ہے۔ افضل نے پھر کامیابی حاصل کر لی ہے، آگے خدا خیر کرے۔ مسافر لگتا ہے کہ یہ کہانی بہت اچھی بنے گی۔ آخری صفحات پر نجمہ سودی کو کچھ محمود سودی کی آرزو کے مراحل یاد آ گئی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ حضرت داؤد ماہا السلام پڑھ کر ایمان اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
حسن علی سوم، بالا کوٹ۔ دعا چوہدری، ساہیوال۔ محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور۔ رحمانہ اسلم، ابراہ وارت، وادی سندھ لیا نوالی۔ محمد خواجہ، کوٹلی، رانی۔ حاجی عبدالکیم، خانہوال۔ ملک بشری تلکرا ایڈیٹوری، تلکرا، میانوالی۔ عصمت علی، عالم جہ سوات۔ حسنین خان بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرکودھا۔ ملک عثمان تلکرا، ہالوالی۔ محمد شہزاد اقبال، کوٹ ادو، ضلع مظفر۔



فصل اجڑ گئی

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ ہمیشہ صفحہ قرطاس پر صرف محبت کے رنگیں حیات کو نہیں بلکہ سنگین واقعات کو بھی رقم کرتی ہے... خواہ یہ واقعات ہجر و وصل سے معمور ہوں یا لرزہ خیز حالات سے۔ یہ بھی چچا بھتیجے کی محبت اور خونیں معرکوں کا ایک ایسا تسلسل ہے... جس میں کبھی جمال الدین خلجی کی نرم طبیعت نے اسے شقیق الغلب مگر بہ ظاہر غم گساروں کے درمیان تنہا کر ڈالا تو کبھی علاؤ الدین خلجی کی سخت فطرت اور احتیاط پسندی نے اسی رشتے اور محبت یا پھر سفاکی کو پھر سے دہرایا... اور تاریخ تو نام ہی کتاب کے بار بار کھلنے اور بند ہونے کا ہے۔ سلطان بدلتے ہیں مگر تخت وہی رہتا ہے۔ علاؤ الدین خلجی... جس نے سکندر کی طرح دنیا کو فتح کرنے کا عزم کیا تھا... اور جو کچھ اس نے چاہا وہ پاس ہی لیا اس کے باوجود اس نے اپنی ذہانت اور سفاکی سے کوئی سبق نہ سیکھا اور جب تاریخ نے خود کو دہرایا تو فصل اجڑتی چلی گئی، اور ایک بار پھر وہی منظر تھا۔ وہی پیش گوئی گردش میں تھی... جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار سے قتل ہوتا ہے... وہی چچا بھتیجے کی محبت اور وہی اقتدار کی جگہ... بھر نتیجہ کیسے کوئی اور نکلتا۔

مانی کا آئینہ۔ اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



”جب جنگ ہوتی ہے تو شکست و فتح دونوں ہی ممکن ہوتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہے مقابلے سے گریز کر کے کوئی درمیانی راستہ نکالا جائے۔“

”بادشاہوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ جنگ سے خوف زدہ ہوں۔ میں باہر کل کر مغلوں کا مقابلہ کروں گا۔“

امرا کے مشورے کے باوجود علاؤ الدین نے مقابلے کا ارادہ کر لیا۔ بدایوں دروازے کے سوا تمام دروازے بند کر دیے، تین لاکھ سواروں اور ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے شہر سے باہر نکلا۔

علاؤ الدین نے اپنے لشکر کو اس طور پر ترتیب دیا کہ مینہ پر اپنے لشکر کے بہادر ترین سپاہیوں کو نشین کیا۔ میسرہ میں الماس بیگ اپنی جمیعت کے ساتھ کھڑا ہوا اور ملک نصرت خاں جری سواروں اور مست ہاتھیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ قلب لشکر میں کھڑا ہوا۔

ایسے دو عظیم الشان لشکر بھی ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئے ہوں گے۔

سب سے پہلے ظفر خاں نے دشمن لشکر کے سامنے والے حصے پر حملہ کیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مست ہاتھیوں نے غنیم کو چل کر رکھ دیا۔ ظفر خاں کی دلیری نے مغلوں کو ششدر کر دیا۔ ظفر خاں کی دلیری کو دیکھ کر دیگر علاقائی امیروں نے بھی ایک ساتھ بلہ بول دیا۔ جب چاروں طرف سے تلواریں چمکیں تو مغلوں کا لشکر حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ظفر خاں نے بھاگتے ہوئے مغلوں کا تعاقب شروع کر دیا۔ الماس بیگ بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ ظفر خاں سے دشمنی کے جذبات رکھتا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد خاموشی سے پیچھے رک گیا اور ظفر خاں کو آگے جانے دیا۔

مغلوں کا ایک سردار گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ ظفر خاں اکیلا ہے اور اس کے پیچھے کوئی امدادی لشکر نہیں تو اس نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اپنی کمیں گاہ سے نکلا اور ظفر خاں کے گھوڑے کے پاؤں کاٹ ڈالے۔

ظفر خاں زمین پر آکھیا اور تیر چلا چلا کر اپنا دفاع کرنے لگا۔ اس وقت بھی اس کی بہادری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو خود کو دشمن کے حوالے کر دیتا لیکن وہ برابر تیر اندازی کر رہا تھا اور مغلوں کو قریب آنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

مغلوں کے سردار قنق خواجه نے ظفر خاں کو پیغام

المدین اولیٰ و دیگر بزرگان دین بادشاہ کے لیے ان شیطانی عملات سے نجات پانے اور مذہب اسلام پر ثابت قدم رہنے کی دعا بھی مانگا کرتے تھے۔

کہتے ہیں دہلی کے کسی بزرگ نے یہ دعا بھی کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ کچھ دن کے لیے بادشاہ کو کسی ایسے مسئلے میں الجھا دے کہ اس کا وہیمان اس فاسد خیال کی طرف جانے ہی نہ پائے۔

یہ دعا مقبول ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان دہلی پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔

ماوراء النہر کے حاکم دواخان کا بیٹا قنق خواجه بیس ٹمن یعنی دو لاکھ وحشی مغل سواروں کو ساتھ لے کر ہندوستان فتح کرنے کے ارادے سے نکلا۔ رفتار کیا تھی آمدھی کا پھیلاؤ تھا۔ ابھی رواج کی خبر آئی تھی، ابھی معلوم ہوا درپائے جتنا کے کنارے جا پہنچا اور خیمہ زن ہوا ہے۔

مغلوں کے خوف نے ایسا خوف زدہ کیا کہ دہلی کے آس پاس کے لوگ دہلی میں آ کر پناہ گزیں ہونے لگے۔ کئی کوچے اور مسجدیں باہر سے آنے والوں سے بھر گئیں۔

مغلوں نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ آنے جانے اور رسد رسانی کے راستے بند ہو گئے۔ اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دنوں یہی حالت رہی تو قحط پڑ جائے گا۔

لوگ یہ کہتے سنائی دے رہے تھے کہ علاؤ الدین کے فاسد خیالات نے یہ دن عذاب کے طور پر دکھایا ہے۔ فقیر کی دعا پوری ہوئی، بادشاہ ایسے مسئلے میں الجھ گیا ہے کہ آخر میں توبہ ہی کرتے بنے گی۔

جب محاصرہ طویل ہونے لگا تو علاؤ الدین نے امرا و اراکین سلطنت کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔

”مغلوں کے لشکر کا کچھ احوال معلوم ہوا؟“

”دولاکھ سے زیادہ کا لشکر ان کے ساتھ ہے اور سب کے سب سوار ہیں۔ لڑنے میں بھی یہ قوم جیسی مہارت رکھتی ہے وہ حضور کے علم میں ہے۔“

”وہ کب تک محاصرہ کر سکتے ہیں؟“

”آس پاس کے علاقے سے ان کو برابر رسد مل رہی ہے۔ ہیکہ الم دہلی کا برا حال ہے۔“

”ہمارے لشکر کا احوال کیا ہے؟“

”اشیائے صرف کی قیمتوں کا اثر لشکر پر بھی پڑا ہے۔“

”ان کمزوریوں سے قطع نظر آپ لوگوں کا کیا مشورہ ہے۔“

”میں باہر کل کر مقابلہ کرنا چاہیے؟“

نے اپنی قوت و شوکت سے شریعت قائم کی اور ان کے چاروں خلفائے اس شریعت کو مضبوط بنایا۔“

چاروں طرف سے داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خوشامدی امرا اور کیا کر سکتے تھے۔ بعض نے سرگوشیوں میں یہ بھی کہا کہ شکر ہے اس جاہل کو اتنا تو معلوم ہے۔

اب وہ اصل مطلب پر آیا۔ ”اسی طرح اگر میں بھی اپنے چاروں امرا الماس بیگ، ظفر خان، ملک نصرت خاں اور الب خاں کی قوت اور بل پر ایک نیا مذہب جاری کروں تو پھر یقیناً روز قیامت تک میرا نام دنیا میں باقی رہے گا۔“

یہ سنتے ہی جس کا منہ جس طرف تھا اسی طرف رہ گیا۔ زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ سلطان وقت کو اتنی تاب کہاں کہ وہ کچھ کہے اور جواب میں خاموشی ملے۔ اس نے گرج کر کہا۔

”کیا تم سب مر گئے جو میری بات کا جواب نہیں دیتے؟“

اب امیروں کو ہوش آیا کہ وہ کیا غلطی کر رہے ہیں۔ ان سب نے یہ ایک آواز سلطان کے خیال فاسد کی تائید کی۔

”حضور، ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ ایسے اعلیٰ خیالات آپ کے دماغ مبارک میں آئے کیسے؟“

”اچھا تو پھر یہ بتاؤ کہ میں کیا طریقہ اختیار کروں کہ میرا جاری کیا ہوا نیا مذہب اہل علم کی نگاہوں میں وقار پائے اور ان کے حلقے میں مروج ہو۔“

”حضور ہمیں نکو اردوں سے کام ہے۔ جنگ کے داؤ بیچ تو جانتے ہیں۔ ان علمی باتوں کا ہمارے پاس کیا جواب؟“

یہ محفل تقریباً بد مزگی پر ختم ہوئی۔ کیونکہ علاؤ الدین کو اس کی باتوں کا خاطر خواہ جواب نہیں مل سکا تھا۔ لوگ بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ بادشاہ نے نشے میں یہ خرافات بک دی ہیں۔ اب رات گئی بات گئی کا معاملہ ہوگا۔ نشہ اترتے ہی بادشاہ کو خود احساس ہوگا کہ اس نے نشے کے عالم میں کیا کہہ دیا تھا۔

اس کے امرا اسے دینی خرافات سمجھ رہے تھے لیکن علاؤ الدین اتنا سنجیدہ ہو گیا تھا کہ ہر محفل میں یہی تذکرہ چھیڑ دیتا تھا۔ وہ بعینہ تھا کہ نیا مذہب جاری کرے گا اور اس کے چار امیر اس کے چار خلفاء ہوں گے۔ لوگ اس کے ڈر سے خاموش رہتے تھے اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے تھے۔ اس پر اسے مزید یقین ہو گیا کہ اس کا خیال بالکل درست ہے۔

جب یہ چرچے مجالس امرا سے باہر نکلے اور عام مسلمانوں تک پہنچے تو سخت شورش مچ گئی۔ لوگوں نے بزرگان دین کی خانقاہوں کا رخ کیا۔ بادشاہ کی شکایتیں جمع ہونے لگیں۔

یہ سب لوگ اور خاص طور پر حضرت سلطان نظام

جب علاؤ الدین غلطی اپنے چچا جلال الدین غلطی کو قتل کرنے کے بعد حالات کے دھارے پر بہتا ہوا دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا تو اسے خود بھی یہ امید نہیں تھی کہ معاملات اتنی آسانی سے اس کے حق میں پلٹا کھائیں گے۔ ایک جلال الدین ہی تو قتل ہوا تھا باقی سب تو نہیں مر گئے تھے۔ اگر اسے کچھ امید تھی تو اپنے ساتھ لائی ہوئی دولت کے انبار سے بھی جس سے وہ راستے بھر لوگوں کو خریدتا ہوا چلا آیا تھا۔

ایک غلطی دس غلطیوں کو جنم دیتی ہے۔ جلال الدین کی بیوی ملکہ جہاں سے غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے دلی مہم سلطنت اردلی خاں کو بروقت مطلع نہیں کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے کو تخت پر بٹھا کر باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مشیروں اور امرا کے مشوروں کے خلاف عمل کر کے علاؤ الدین کو روکنے کی کوشش تک نہیں کی گئی۔ امرا علاؤ الدین سے مل گئے اور خانوادہ، شاہی کوفرا ہونا پڑا۔ علاؤ الدین نے اس فرار کو برداشت نہیں کیا اور جن جن کرا ایک ایک فرد کو قتل کر دیا۔ کچھ کو ہمیشہ کے لیے کال کوٹھریوں میں بند کر دیا۔

انتقام کی اس لہر نے اچھے اچھوں کو دھلا دیا۔ جو جہاں تھا بت بن کر خاموش ہو گیا۔ ارد گرد کے حکمران اس کے قدموں کی دھول چاٹنے لگے۔

تخت نشینی کو صرف تین سال ہوئے تھے کہ اس نے جو چاہا وہ کر لیا۔ اس کی سلطنت گجرات تک وسیع ہو گئی۔ سارا ملک دشمنوں اور مدعیان سلطنت سے پاک ہو گیا۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے خلاف آواز اٹھاتا۔

وہ جاہل محض تھا۔ اجڑ پن اور حیوانیت اس کی طبیعت کے خاص جوہر تھے۔ ایسے میں اتنی کامیابیاں نصیب ہوئیں تو اس کا ذہن فاسد خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

ایک روز محفل شراب بھی ہوئی تھی۔ نشے نے زور پکڑا تو دل کا زہر زبان پر آ گیا۔ زہر بھی ایسا کہ جس نے سنا مردے کی طرح خاموش ہو گیا۔

”تم سب زہرے جاہل تو ہو لیکن یہ تو معلوم ہوگا کہ جسے تم لوگ شریعت کہتے ہو وہ کیسے پھیلی۔ مجھے معلوم ہے تم نہیں بتا سکتے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ٹھہرو، میں یہ آخری گھونٹ ختم کر لوں اس کے بعد بتاتا ہوں کیونکہ جو بات میں کہنے والا ہوں اس کے لیے ہوش میں رہنا ضروری ہے۔“

اس نے گلاس خالی کر دیا۔ باقی لوگوں نے بھی اس کے احترام میں جلدی جلدی گلاس خالی کیے اور سراپا گوش ہو کر بیٹھ گئے کہ دیکھیے ارشاد عالی کیا ہوتا ہے۔

علاؤ الدین نے کہنا شروع کیا۔ ”حضرت محمد ﷺ

”یہ وہ جسارت ہے جو حضور نے مجھے عنایت کی ہے ورنہ یہ غلام کسی قابل نہیں۔“

”کچھ اور کہنا چاہتا ہے یا تو نے بات ختم کر لی؟“ ایک گزارش اور ہے۔ ”کو تو ال نے کہا۔“ یہ مقاصد اسی وقت حاصل کیے جاسکتے ہیں جب حضور شراب نوشی، بیش کوشی اور میرد شکار وغیرہ کی طرف کم توجہ فرمائیں اور تمام مہمات کی خود گمرانی کریں۔“

علاء الدین خلاف معمول اس کی باتیں نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔ پھر اس کی زبان سے کو تو ال کے لیے حسین آمیز کلمات ادا ہوئے اور انعامات سے سرفراز کیا۔ جامہ زردوزی جس پر شیر کی صورت نقش تھی، دس ہزار تھکے اور دو عدد مرغ زین لگام کے گھوڑے عطا کیے اور یہ عہد بھی کیا کہ وہ اس کے مشوروں پر عمل کرے گا۔

اس نے واقعی اپنے کو تو ال کے مشورے پر عمل کیا اور رن تھنور کے قلعے پر حملے کی تیاری کرنے لگا۔ اس قلعے کی مضبوطی ہر بادشاہ کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے اپنے بھائی الماس بیگ اور نصرت خاں کو ایک عظیم الشان فوج کے ہمراہ رن تھنور کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ اس قلعے کی تسخیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علاؤ الدین کے بہت سے مخالفین رن تھنور کے راجا رانا ہمیر کے پاس پناہ گزیں ہو گئے تھے اور وہ کسی قیمت پر ان کو علاؤ الدین کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھا۔

نصرت خاں اور الماس بیگ لشکر لے کر روانہ ہوئے اور رن تھنور کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ ”رن“ اور تھنور نامی دو پہاڑوں کے درمیان تھا اور یہی اس کی مضبوطی کا سبب تھے۔ ایک پہاڑ تو ایسا تھا جو اس قلعے کے لیے مورچے کا کام کرتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھے بغیر اس مورچے کو منہدم کرنا آسان نہیں تھا جبکہ اوپر سے پتھر بھی آتے تھے تو ان سے بچاؤ ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جلال الدین غلی بھی اسے تسخیر کیے بغیر واپس چلا گیا تھا اور اب علاؤ الدین کا لشکر اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔

اس قدر مضبوطی کے باوجود رانا ہمیر کے سپاہیوں پر سلطانی رعب ایسا تھا کہ وہ راجا کو مشورے دے رہے تھے کہ سلطان کے پناہ گزیں امرا کو سلطان کے حوالے کر دے اور لڑائی سے گریز کرے لیکن راجا کو قلعے کی مضبوطی پر گھمبڑ تھا اس لیے وہ ان کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بعد تھا کہ راجپوت جسے اپنی پناہ میں لے لیتے ہیں پھر اس کے سر سے حفاظت کا ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

”وہ آپ کے خوف سے آپ کو نہیں جھٹلاتے۔ ان کے مفاد آپ سے وابستہ ہیں ورنہ عام مسلمان دین کی حرمت کے لیے جان دے دے گا لیکن کسی خود ساختہ دین کو قبول نہیں کرے گا۔“

”اچھا یہ تو ہو گیا۔ میں نے تیری باتیں سن لیں۔ اب یہ بتا کہ میرے دوسرے خیال کے متعلق تیرا کیا خیال ہے؟“ ”آپ کے دوسرے خیال کی میں مخالفت نہیں کروں گا لیکن اس میں میری ایک رائے ہے اس پر بھی غور فرمائیں۔ آج کا زمانہ سکندر کے زمانے سے مختلف ہے۔ اس وقت عہد فتنی اور مکاری کا عام رواج نہیں تھا۔ سکندر کا کل 32 سال تک اپنے ملک سے باہر رہ کر اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کرتا رہا اور اس کے نظام سلطنت میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ جب فتوحات سے فارغ ہو کر اپنے ملک واپس پہنچا تو ہر شخص کو اسی طرح سچا اطاعت گزار پایا۔ اگر آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی عدم موجودگی میں نظام سلطنت چلتا رہے گا اور آپ کے لوگ آپ سے منحرف نہیں ہو جائیں گے تو حضور اپنے ارادے میں حق بجانب ہیں۔“

علاء الدین نے کو تو ال کی تقریر کو بڑے غور سے سنا۔ ”تیرا مشورہ یہ ہے کہ میں دنیا کی فتح کا ارادہ منسوخ کر دوں اور صرف دہلی کی بادشاہت پر قناعت کر کے بیٹھ جاؤں۔ اپنے خزانے بھرے رکھوں اور ان سے کوئی کام نہ لوں۔“

”حضور کے شوق فتح کی پھیل کے لیے ہندوستان میں بھی کئی میدان ہیں جہاں آپ کے خزانے اور دینی کام آسکتے ہیں اور آپ وہ کام کر سکتے ہیں جو دوسرے بادشاہوں نے نہیں کیے۔“

”تیرے خیال میں وہ کون سی مہمات ہیں؟“ ”پہلی مہم تو یہ ہے کہ ہندوستان کے سرحدی علاقوں کے بعض شہروں کو فتح کیا جائے۔ رن تھنور، جالور اور پندرہری ہیں جو فتح کے خطر ہیں۔ مشرق میں دریائے گنجد تک کا علاقہ اور شمال میں بلقان اور کامل تک کے خطے کو فتح کر کے یہ مہم سر کی جاسکتی ہے۔“

مغل جیسے بار بار ہندوستان پر حملہ آور ہوتے ہیں، ان کی گومالی کے لیے دیپال پور اور ملتان جیسے شہروں کے قلعوں کو قائم کر کے مغلوں کی سرکوبی کی جاسکتی ہے۔ ان انتظامات کے بعد اگر حضور دنیا کی فتح کے لیے نکل بھی جائیں تو کوئی ہلکا نہیں۔“

”کیا تو اتنی عقل مند ہے جتنی تیری باتیں ہیں۔“

دے لیکن پھر اس کے دل میں خوف خدا غالب ہوا۔ اس نے سوچا چند روزہ زندگی کے لیے حقائق پر پردہ ڈال کر کتنا گار ہونے کا کیا فائدہ۔ مجھے خدا کا خوف ہونا چاہیے نہ کہ بادشاہ کے عتاب کا۔ اگر سچی بات کہہ دینے میں شہادت بھی نصیب ہو جائے تو پروا نہیں۔ اس نے بے خوف ہو کر بادشاہ سے کہا کہ اگر کچھ دیر کے لیے بادہ نوشی موقوف کر دی جائے اور تمام لوگوں کو باہر نکال دیا جائے تو وہ اکیلے میں اس کے سوالوں کا جواب دے سکے گا۔ یہ بات سن کر پہلے تو بادشاہ کی تیوری پر بل پڑ گئے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے تمام لوگوں کو باہر نکال دیا۔

کو تو ال نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ”کچھ کہنے سے پہلے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر میری گزارش طبع نازک پر گراں گزرے تو اس غلام کو معاف فرمادیجئے گا۔“

”میں نے تمہاری درخواست قبول کی۔ جو کچھ کہنا ہے بے تکلف کہو۔“

کو تو ال نے دل ہی دل میں کلمہ پڑھا کہ بادشاہوں کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اگر اس درخواست کی قبولیت کے بعد بھی میری گردن مار دی جائے تو مجھے پروا نہیں۔ کو تو ال نے کہا۔ ”حضور، سوچتے کو انسان کچھ بھی سوچ لے لیکن حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ شریعت کا تعلق انبیائے کرام سے ہے۔ انبیائے کرام کی نبوت وحی آسمانی سے تعلق رکھتی ہے۔ کوئی شخص اپنے خیالات کو شریعت میں کہہ سکتا اور نہ کوئی نیا مذہب جاری کر سکتا ہے۔ نبوت کا منصب حضرت محمد ﷺ پر ختم ہو چکا۔ اب کوئی نئی شریعت نہیں آئے گی۔ اگر آپ نے کسی نئے مذہب کا اجرا کیا تو کوئی مسلمان اسے قبول نہیں کرے گا۔ فساد کا ایسا دروازہ کھل جائے گا کہ آپ اسے بند نہیں کر سکیں گے۔ آپ سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے یہ جسارت کرنے کی کوشش کی لیکن کیا وہ کامیاب ہوئے؟ اگر آپ نے اپنے ارادے پر عمل کیا تو مسلمانوں کے غضب کا نشانہ بھی بنیں گے اور خدا کے عذاب کے حق دار بھی کہ جس نے یہ منصب شای آپ کو عطا کیا ہے۔“

”آج تک میرے کسی امیر نے یہ جسارت نہیں کی، تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی؟“

”شاید خدا کو مجھ سے یہ کام لینا ہو کہ آپ کے سامنے سچ بول سکوں۔ اب آپ چاہیں تو میری گردن اتار لیں۔“

”کیا میرے امیروں میں اتنی عقل نہیں جو تجھ میں ہے؟“

دیا۔ ”تو اپنے حیرد کو ترشش میں رکھ اور میرے پاس آجا۔ میں تجھے تیرے موجودہ عہدے سے کہیں زیادہ بڑا عہدہ عطا کروں گا۔“

ظفر خاں نے اس پیغام کو کوئی اہمیت نہیں دی اور برابر تیر برساتا رہا۔ مغل جب اس کی وفاداریاں خریدنے میں ناکام ہوئے تو انہوں نے بھی ظفر خاں پر تیر چلانے شروع کر دیے اور اسی طرح اسے ختم کر دیا۔ اس کے چند دہلوی امیر بھی مغلوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

فتنی خواجہ پر اب بھی ہندوستانیوں کا ایسا خوف تھا کہ تیس کوس تک سانس لیے بغیر چلتا رہا اور منزلیں طے کرتا ہوا اپنے ملک پہنچ گیا۔

اس عظیم الشان کامیابی نے علاؤ الدین کے تکبر میں مزید اضافہ کر دیا۔ اب تک تو وہ ان خیالات کا اظہار کرتا رہا تھا کہ ایک نیا مذہب جاری کرے گا مگر اب اس میں ایک اور ارادہ بھی شامل ہو گیا کہ دہلی کی حکومت کسی قابل اعتبار شخص کے حوالے کر کے خود سکندر کی طرح دنیا فتح کرنے کے لیے نکل جائے۔ خراسان، ترکستان وغیرہ فتح کرے اور وہاں اپنے مذہب کو رائج کرے۔ دنیا میں جہاں جہاں اس کے قدم پہنچیں اس کا مذہب بھی وہاں پہنچے۔

اس نے مغل سردار فتنی خواجہ کو شکست دی تھی لہذا اس کا دماغ عرش مصلیٰ پر پہنچا ہوا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے خیالات سے اختلاف کرتا۔ امرا کی شامت آتی تھی کہ اسے سمجھاتے۔ سب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے بلکہ اس کا حوصلہ بڑھاتے کہ اس وقت روئے زمین پر اس جیسا کوئی بادشاہ نہیں۔ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے بالکل درست سوچ رہا ہے۔ ایک دن آئے گا کہ ساری دنیا میں اس کی فتح کے جھنڈے گڑے ہوں گے۔

اس نے جب امیروں کو اپنا ہم خیال دیکھا تو حکم جاری کر دیا کہ خطبوں میں اس کے نام کے ساتھ ”سکندر ثانی“ کے لقب کا اضافہ کیا جائے۔ سکوں پر بھی یہ نقش کر دیا۔ شاید اللہ تعالیٰ کو اس کی اصلاح منظور بھی کہ کو تو ال شہر علاء الملک کے دل میں یہ جرأت پیدا ہوئی کہ وہ بادشاہ کو اس کے ان فاسد خیالات پر ٹوک سکے۔

علاء الملک بادشاہ کی طرف سے برپا ہونے والی مجالس بادہ نوشی میں بہت کم شریک ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جو وہ شریک ہوا تو بادشاہ نے اپنے خیالات کے بارے میں اس کی رائے طلب کی۔ علاء الملک کے دل میں پہلے تو یہ خیال آیا کہ دوسرے امرا کی طرح وہ بھی بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا

علاء الدین وقتی طور پر بے ہوش ہوا تھا یا پھر جان بوجھ کر خود کو مردہ ظاہر کیا تھا۔ وہ اٹھا تو اپنے ساتھیوں کو حیران پریشان دیکھا۔ قریب ہی مقرب خاص ملک حمید الدین گھڑے تھے جنہیں دیکھ کر سلطان کی ڈھارس بندھی۔

”جناب حمید الملک۔ یہ سب کیا ہے، کیا ہو رہا ہے یہ؟“
”حضور آپ کے پیچھے سلیمان شاہ پر بادشاہ بننے کا خط سوار ہوا ہے۔“

”نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“

”وہ ایسا کر گزرا ہے۔“

”اگر یہ سب اس نے کیا ہے تو امرا کی اعانت اس میں ضرور شامل ہوگی۔ اس لیے اب میرا یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں الماس بیگ کے پاس جہاں پہنچتا ہوں پھر وہی کروں گا جو الماس بیگ کہے گا۔“

”غلام کا مشورہ اس کے برعکس ہے۔“

”آپ کیا کہتے ہیں؟“

”حضور، ابھی سلیمان شاہ کا رنگ پوری طرح جمنا نہیں ہے۔ آپ کی موت کا کسی کو یقین ہے کسی کو نہیں بلکہ میں تو یہ دیکھ کر آ رہا ہوں کہ سلیمان شاہ نے جب حرم شاهی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو خواجہ سراؤں کے سردار ملک دینار حری اور اس کی مسلح جماعت نے سلیمان شاہ کو روک دیا کہ جب تک ہم بادشاہ کا کٹنا ہوا سر نہ دیکھ لیں کسی کو حرم میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اگر آپ جہاں چلے گئے تو سلیمان شاہ کو حالات پر قابو پانے کا موقع مل جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ حضور اسی وقت سراپردہ کی طرف چلیں۔ آپ کو دیکھ کر پورا لشکر آپ کے ساتھ ہو جائے گا۔“

سلطان کو یہ تجویز پسند آئی۔ چتر شاهی تلاش کیا گیا جو جنگل میں پڑا ہوا تھا۔ علاؤ الدین چتر شاهی لے کر سکون کے ساتھ سراپردہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں جس سوار کی نظر پڑی تھی وہ اس کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ وہ خیمہ شاهی تک پہنچا تو پانچ سو سوار اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ایک بلند مقام پر گھڑے ہو کر چتر شاهی کو بلند کیا۔ اس کو دیکھتے ہی سارا لشکر علاؤ الدین کی طرف آ گیا۔ وہ تمام لوگ جو سلیمان شاہ کے ساتھ ہو گئے تھے، علاؤ الدین کے گرد جمع ہو گئے۔ سلیمان شاہ کے اپنے ملازمین بھی اسے لعنت ملامت کر رہے تھے کہ اس نے بادشاہ کا سر کیوں نہیں اتارا۔ اب بادشاہ کے غضب سے انہیں کون بچائے گا۔ سلیمان شاہ بھی ایسا حواس باختہ ہوا کہ راہ فرار اختیار کی اور دہلی کے قریب افغان پور میں جا کر روپوش ہو گیا۔

ہما حلال الدین کو قتل کر کے عتاق حکومت سنبھالی ہے۔ علاؤ الدین میرا بچا ہے۔ اگر میں بھی اسے قتل کر دوں تو تخت شاهی پر بیٹھ سکتا ہوں۔ اس میں کوئی جرم بھی نہیں ہوگا کیونکہ علاؤ الدین خود بھی حرکت کر چکا ہے۔

اس نے اپنے ملازموں سے پہلے ہی ساز باز کر رکھی تھی۔ یہ موقع غنیمت تھا کہ بادشاہ لشکر سے دور تھا۔ اس نے اپنے ایک سو قدیم نو مسلم ملازموں کو ساتھ لیا اور اس بلند جگہ پر پہنچ گیا جہاں سلطان شکار کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ملازموں نے ”شیر آ یا شیر آ یا“ کا شور مچانا شروع کر دیا اور ساتھ تیر برسانے لگے۔ ان تیروں کا نشانہ سلطان تھا۔ تیر جنگل کی طرف سے آرہے تھے۔ یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ تیر کون چلا رہا ہے لیکن اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ کوئی ہے جو بادشاہ کو نشانہ بنا رہا ہے۔ بادشاہ کے ہمراہوں نے بادشاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تلواریں سونت لیں۔

انہوں نے بادشاہ کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن پھر بھی دو تیر بادشاہ کے بازو میں پیوست ہو گئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ سلطان نے روٹی کا موٹا دنگہ پہنا ہوا تھا اسی لیے زخم زیادہ کاری نہیں تھے۔ بادشاہ نے ایک ہوشیاری یہ کی کہ زمین پر گر گیا اور اس طرح پڑا رہا جیسے مر گیا ہو۔ یہ دیکھ کر اس کے ہمراہی چیخنے چلانے لگے۔ سلیمان شاہ سلطان کا سر کاٹنے کے لیے گھوڑے سے اترتا تھا لیکن یہ سن کر کہ سلطان مر چکا اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ سلطان کے ہمراہی اگر مقابلے پر اتر آئے تو انہیں ٹھکانے لگانے میں مزید وقت لگ جائے گا۔

سلیمان شاہ نے ان آوازوں پر اعتبار کر لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کی طرف دوڑا۔ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے جو چیخ چیخ کر اعلان کرتے جا رہے تھے کہ سلیمان شاہ نے سلطان کو قتل کر دیا ہے اور اب وہی تاج و تخت کا مالک ہے۔ تم سب اطاعت کرو۔

سلیمان شاہ، شاهی خیمے میں داخل ہوا تو کسی نے بھی اسے نہیں روکا بلکہ فوجی سرداروں نے مبارک باد دینے کے لیے قتل شاهی کا رخ کیا جس پر اب سلیمان شاہ براجمان تھا۔ ہر شخص نے اپنے مرتبے کے مطابق سلیمان کی خدمت میں حاضر ہو کر مبارک باد دی اور اس کی بیعت کے لیے اٹھ بڑھایا۔

لوہوں نے مبارک سلامت کا شور بلند کیا۔ قاریوں نے کامیابی کی تلاوت شروع کی اور مطربوں نے طرب و سرور کے نغمے گانے شروع کیے۔

راجا کے مشیروں نے راجا کو مشورہ دیا کہ اس وقت سلطانی لشکر ایک سانچے سے گزرا ہے۔ ان کا ایک اہم سپہ سالار مارا گیا ہے لہذا ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور باہر نکل کر بھرپور حملہ کر دینا چاہیے۔

راجا جو اب تک سلطانی لشکر سے خائف تھا اسے یہ مشورہ پسند آیا۔ وہ قلعے سے باہر نکلا اور سلطانی لشکر پر حملہ آور ہو گیا۔

نصرت خاں کی موت واقعی ایسی افتاد تھی کہ سلطانی لشکر کے دل اکھڑ گئے تھے۔ خود الماس بیگ بوکھلایا ہوا تھا، اس کے لشکر نے کچھ دیر تو مقابلہ کیا لیکن پھر الماس بیگ لشکر کو لے کر پیچھے ہٹنے لگا اور بالآخر محاصرے سے دستبردار ہو کر ”جہاٹن“ کے قلعے میں مقیم ہو گیا۔ دن ٹھنبرہ آنے سے پہلے نصرت خاں اور الماس بیگ نے یہ قلعہ فتح کر لیا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب اس کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے علاؤ الدین کو تمام حالات تفصیل سے لکھ کر روانہ کیے۔

نصرت خاں کی بے وقت موت اور الماس بیگ کی پسپائی نے سلطان کو سخت برا فروختہ کر دیا۔

”دن ٹھنبرہ کی فتح اس سے پہلے اتنی ضروری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ گستاخ رانا ہیر کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ کوچ کی تیاری کی جائے۔ اس مرتبہ ہم خود جائیں گے۔“

فوج نے تیاری پکڑی اور سلطان علاؤ الدین خلجی تزک و احتشام کے ساتھ دہلی سے جہاٹن کی طرف روانہ ہوا جہاں الماس بیگ قلعہ بند تھا۔

دہلی سے چھتیس میل دور ٹکٹ نامی مقام پر سلطان نے پہلا پڑاؤ کیا اور عارضی قیام کے لیے چند روز گھبرنے کا حکم دیا۔

سلطان نے فوج کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے شکار کا اہتمام کیا۔ ہانکا لگانے والے شور مچاتے ہوئے جنگل کی طرف نکل گئے تاکہ جنگل کے جانور شورش کر آئیں کی طرف بھاگیں۔ سلطان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک اونچی جگہ بیٹھ گیا کہ ہانکے کا شور سن کر جب جانور اس طرف آئیں تو وہ ان پر تیر چلائے۔

سلیمان شاہ، علاؤ الدین خلجی کا بھیجا تھا۔ اسے راکٹ خاں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ وہ راستے بھر کسی خیال میں ڈوبا ہوا چلا آ رہا تھا۔ سلطان کو چند ہمراہیوں کے ساتھ پیشادیکھ کر اس خیال نے سراپا ہارا اور سمجھنے لگا کہ قدرت نے یہ موقع خود بخود عطا کر دیا ہے۔

وہ راستے بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ علاؤ الدین نے اپنے

راجا اور اس کے خاص آدمیوں کے درمیان یہ مباحثے جاری تھے لیکن وہ محاصرے کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ فصیلوں پر رانا کے سپاہی تعینات تھے۔ سلطانی فوجیوں کو جب بھی حرکت میں دیکھتے ان پر تیروں سے حملے کرتے یا بڑے بڑے پتھر لڑھکاتے جو نشیب تک آتے ہوئے نہایت خطرناک ہو جاتے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ نیچے سے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جاسکتی تھی۔ تیروں کا فصیل تک اول تو پہنچنا محال تھا، دوسرے پہاڑ کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے فصیل پر کوئی نظر بھی نہیں آتا تھا جس کا نشانہ لیا جاسکے۔

الماس بیگ اور نصرت خاں برابر گھوڑے دوڑاتے رہتے تھے کہ کسی طرح پہاڑ پر چڑھ سکیں اور کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سے دھم سے لگا کر فصیل کو اڑا دیا جائے اور اندر پہنچنے میں کامیابی ہو۔ لیکن وہ جب بھی آگے بڑھتے تھے تو رانا کے سپاہیوں کو خبر ہو جاتی تھی اور وہ زد میں آئے بغیر تیر برسانا شروع کر دیتے تھے بالآخر ایک رات وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں فصیل کی بنیادیں ڈھلوان پر قائم تھیں۔

وہ اس فصیل میں ایسی جگہ تلاش کرتے رہے جہاں بہ آسانی دھم سے لگائے جاسکیں۔ اسی میں رات گزرتی اور کچھ کچھ روشنی نمودار ہونے لگی۔ روشنی میں شاید وہ دونوں فصیل پر بیٹھے ہوئے سپاہیوں کو نظر آنے لگے۔ اوپر سے تنگ باری شروع ہو گئی۔ جگہ ایسی تھی کہ لیٹ کر بھی اپنی جان نہیں بچا سکتی تھی۔ پھر بھی وہ دونوں اپنے آپ کو بچاتے ہوئے نیچے اترتے رہے۔ ایک پتھر اچانک نصرت خاں کی کمر میں لگا۔ اس کی ضرب سے وہ لڑھکتا ہوا کافی دور تک چلا گیا۔ الماس بیگ بھی اس کے پیچھے دور تک گیا۔ اتفاق سے وہ دونوں ایک ایسی جگہ جا کر رہ گئے کہ فصیلوں پر بیٹھے ہوئے لوگ انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ دونوں پہاڑ سے نیچے اتر گئے لہذا تنگ باری بند ہو گئی۔

اس تنگ باری کی خبر لشکر تک بھی پہنچ گئی تھی لہذا بہت سے لوگ وہاں پہنچ گئے اور زخمی نصرت خاں کو اٹھا کر الماس بیگ کے خیمے میں لے آئے جہاں جراح اور طبیب اس کی جان بچانے کی کوششیں کرنے لگے۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ زخم معمولی ہیں اور نصرت خاں جیسا بہادر آدمی ان زخموں کو بہ آسانی جھیل جائے گا۔ دو تین دن بعد وہ باتیں کرنے کے لائق بھی ہو گیا لیکن پھر اچانک اس کی حالت بگڑ گئی۔ شاید کچھ اندرونی چوٹیں ایسی آئی تھیں کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

الماس بیگ نے بہت چاہا کہ اس کی موت کی خبر عام نہ ہو لیکن راجا کے جاسوسوں نے یہ خبر قلعے کے اندر پہنچا دی۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے جواب میں صرف یہ کہلوا بھیجا کہ اللہ سے نجات کی امید رکھو۔ اس حوصلہ افزا جواب نے علاؤ الدین کو دہلی کی طرف سے مطمئن کر دیا اور اس نے ایک سو ہو کر رن تھنور کی فتح کے لیے کوشش مزید تیز کر دی۔

بزرگوں کی دعائیں اثر ہوتا ہے۔ حاجی مولیٰ نے کوتوال دہلی کو قتل کر کے علوی کو تخت نشین کر دیا تھا اور شہر کے دروازے بند کر دیے تھے کہ کوئی اندر سے باہر نہ جاسکے۔ ملک حمید الدین کو کا بدایوں دروازہ کھول کر شہر کے باہر نکل گیا۔ اس کے بہادر بیٹے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اس نے ارد گرد کے علاقوں سے لشکر جمع کیا اور غزنی دروازے سے شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ کر نھند دروازے تک پہنچا تھا کہ حاجی مولیٰ اور اس کے ساتھیوں سے آمناسامنا ہو گیا۔ دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں۔ لڑائی کا بازار گرم ہو گیا۔ ملک حمید الدین اپنے گھوڑے سے اترا اور اچک کر گھوڑے پر بیٹھے حاجی مولیٰ کو گرفت میں لے لیا اور گھوڑے سے اتار کر زمین پر گر دیا اور سینے پر چڑھ بیٹھا۔ حاجی مولیٰ کے ساتھی اس کی طرف دوڑے اور اسے چھڑانے کے لیے ملک حمید الدین پر حملہ کیا۔ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح حاجی مولیٰ کو چھڑالیں۔ ملک حمید الدین اس کے سینے پر بیٹھے بیٹھے اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کرتا رہا اور موقع دیکھ کر حاجی مولیٰ کا سر کاٹ لیا۔ اس کے مرتے ہی اس کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ملک حمید الدین کو کھٹک لعل میں آیا اور اس کا سر ایک نیزے پر لٹکا کر سارے شہر کے گلی کوچوں میں پھرایا۔

حمید الدین نے علوی کا سر علاؤ الدین کی خدمت میں رن تھنور روانہ کر دیا۔

علاؤ الدین کو پہلے پریشانی نہیں تھی لیکن اب وہ ضرور پریشان تھا کہ دہلی کا نظم و نسق کون سنبھالے گا۔ رن تھنور فتح نہیں ہوا تھا اور دہلی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی، کیا میں اس دیرانے تک محض دو ہو کر رہ جاؤں گا؟ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ رن تھنور کا محاصرہ اٹھا کر چل دیتا لیکن اس کا بھائی الماس بیگ جسے اس نے انج خاں کا خطاب دیا تھا۔ اس کے سامنے آ گیا۔ ”جب آپ بہ نفس نفیس یہاں موجود ہیں تو میرا یہاں رہنا فضول ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو میں دہلی جا کر وہاں کا نظم و نسق سنبھال لوں؟“

علاؤ الدین کو یہ مشورہ پسند آیا لیکن اس کے خبروں نے بروقت اسے ٹوکا۔

فہر میں آنے لگیں۔ وہاں حاجی مولیٰ نای ایک شخص نے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ حاجی مولیٰ سلطان جلال الدین خلجی کے رمالے میں دہلی کا داروغہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ علاؤ الدین ایک مدت سے رن تھنور کے محاصرے میں مصروف ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

کوتوال شہر علاء الملک کو بادشاہ اپنے ساتھ رن تھنور لے گیا تھا۔ اس کی نیابت بایزید نای ایک شخص کر رہا تھا جس سے اہل دہلی خوش نہیں تھے۔

حاجی مولیٰ نے پورا منصوبہ تیار کیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دو پہر کی گرمی اپنے عروج پر تھی۔ چہل پہل بہت کم تھی۔ سخت گرمی اور لو سے بچنے کے لیے لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ حاجی مولیٰ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ بایزید کو کوتوال کے گھر گیا۔ اس کے ساتھی کی جگہ جیسے رہے۔

حاجی مولیٰ نے ٹھہرایا کہ بادشاہ کا ایک پیغام آیا ہے وہ آ کر لے۔ بایزید یہ سنتے ہی گھر سے باہر آیا، حاجی مولیٰ نے اسے دیکھتے ہی اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ان لوگوں نے فوراً بایزید پر حملہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے پہلے کہ شورش بڑھتی، حاجی مولیٰ نے مشہور کر دیا کہ بایزید کو شاہی حکم کے مطابق قتل کیا گیا ہے۔ دہلی کے تمام دروازوں کے دربانوں کو حکم دیا کہ شہر کے دروازے بند کر دیے جائیں۔

اس کے بعد حاجی مولیٰ کو کھٹک لعل میں گیا۔ اس نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ یہ قیدی بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اسلحہ، گھوڑے اور خزانہ وغیرہ بھی اس کے ساتھ لگ گیا۔ حاجی مولیٰ نے علوی نای ایک شخص کو جبراً کو کھٹک لعل میں شاہی تخت پر بٹھا دیا۔ یہ شخص سلطان انش کی اولاد میں سے تھا۔

ہوتا یہی تھا کہ جس کے ہاتھ میں طاقت اس کے ہاتھ میں سب کچھ۔ تمام امرا و روسا نے بیعت کر لی۔

رن تھنور میں علاؤ الدین کو یہ خبریں پہنچیں تو اس نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لشکر میں کسی کو خبر نہ لے دی۔ امرا تک کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ بس اتنا کیا کہ ایک قاصد حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں دہلی روانہ کیا اور ان سے دعا کی درخواست کی اور لکھا کہ میں یہاں تاج سے دور اسلام کی سربلندی کے لیے دیار غیر میں ہوں۔ ہر قسم کی صعوبتیں جھیل رہا ہوں اور وہاں میری امانت پر فیروں کی نظر ہے۔

الذین مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔ کیا بلکہ محاصرے کو شدید سے شدید تر کرتا رہا۔ کئی ایسی جگہیں بھی تلاش کر لیں جنہیں خندق کے طور پر کام میں لایا جاسکتا تھا۔

راجپوت قلعے پر سے پتھر اور آگ پھینکتے تھے۔ مسلمانوں کا لشکر نقب زنی وغیرہ کے ذریعے اہل قلعہ پر مزید سختیاں کرتا رہا۔

مسلمانوں کے لشکر کے سردار راجپوتوں کے ملک میں جا جا کر تباہی و غارت گری کا بازار گرم کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ان اقدامات سے راجپوتوں کی حالت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

حالت مسلمانوں کی بھی خراب تھی، محاصرہ اتنا طویل ہو گیا تھا کہ فوج میں بددلی پھیلنے لگی تھی۔ ہر سپاہی اپنے گھر جانے کی فکر میں تھا اور یہاں محاصرہ ختم ہونے کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ علاؤ الدین نے اپنا پرانا حربہ یہاں بھی استعمال کیا۔ لشکر میں وافر مقدار میں سونا چاندی تقسیم کر کے سپاہیوں کے دل بڑھائے۔

وہ ان کوششوں میں مصروف تھا کہ اودھ اور بدایوں سے ایسی خطرناک خبریں پہنچیں کہ دور ہونے کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہو گیا۔ اس کے دو بھانجوں امیر عمر اور منگو خاں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ یہ دونوں اودھ اور بدایوں کے حکمران تھے۔

یہ دونوں اس کے بھانجے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دونوں اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دیں گے۔

اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو دہلی تک انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ علاؤ الدین نے ان علاقوں کے امرا کے نام فراہم جاری کیے کہ ان کی بغاوت کو کچل دو اور انہیں گرفتار کر کے فوراً میرے پاس روانہ کر دو۔

ان امیروں نے بادشاہی حکم کی تعمیل کی۔ ان حکمرانوں نے بھی یونہی بغاوت نہیں کر دی تھی۔ باغیوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی۔

ان امیروں نے حق ٹمک ادا کیا اور باغیوں کو کھٹک لعل میں لے دی۔ ان کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان دونوں کو گرفتار کر کے رن تھنور علاؤ الدین کے پاس بھیج دیا۔

رن تھنور کے قلعے کے نیچے عمر اور منگو کو سزا دی گئی۔ پہلے آنکھیں نکالی گئیں اور پھر آتشیں دے دے کر دونوں کو قتل کر دیا گیا۔

ابھی یہ فساد کم نہیں ہوا تھا کہ دہلی سے وحشت ناک

علاؤ الدین پوری شان و شوکت سے اپنے خیمے میں داخل ہوا۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو معلوم ہوا کہ سلیمان شاہ کہیں بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے سپاہیوں کی ایک جماعت سلیمان شاہ کے تعاقب میں روانہ کی۔ دیہاتوں نے بتایا کہ ایک سوار کو دہلی کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ افغان پور تک پہنچ کر خبری ہو گئی کہ سلیمان شاہ اسی گاؤں میں چھپا ہوا ہے۔ سپاہیوں نے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ گاؤں کے کھیا کی گردن پر تلوار رکھی گئی تو اس نے اگل دیا کہ وہ سپاہیوں کی آمد کا سن کر قریب کے کھیتوں میں چھپا ہوا ہے۔ سپاہیوں نے کھیتوں میں تلاش کر کے اسے گرفتار کر لیا اور پھر اس کا سر قلم کر کے علاؤ الدین کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ علاؤ الدین کے حکم سے یہ سارے شہر میں پھرایا گیا۔ اس قصبے سے نمٹنے کے بعد سلطان نے کچھ دن اپنے زخموں کے بھرنے کا انتہار کیا اور پھر اپنی فوج کے ساتھ جہان پور پہنچ گیا۔ الماس بیگ سے ملاقات کی اور تمام حالات معلوم کئے۔ نصرت خاں کی موت واقعی ایسا صدمہ تھا جس پر سلطان بھی غمگین تھا۔ پہلے اس کے امیر ظفر خاں کی ہلاکت ہوئی اور اب نصرت خاں بھی چل بسا۔ یہ دونوں وہ قابل اعتبار امرا تھے جن کو وہ اپنے نئے مذہب کے لیے اپنے خلفا کہا کرتا تھا۔ نئے مذہب سے تو تائب ہو چکا تھا لیکن خلفا کی محبت تو اب بھی اس کے دل میں تھی۔ ان خلفا میں ایک الماس بیگ بھی تھا جو اب تک اس کا وقادار تھا۔ سلطان نے الماس بیگ اور اپنے لشکر کو ساتھ لایا اور رن تھنور کی طرف روانہ ہوا۔

رن تھنور پہنچ کر اس نے رانا ہمیر کے پاس قاصد بھیجا اور اس سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ سلطان کے باغی امیروں کو حوالے کر دے تو وہ محاصرہ اٹھا کر جانے کو تیار ہے۔

رانا ہمیر دیکھ چکا تھا کہ جلال الدین خلجی بھی ناکام واپس چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے محاصرے میں نصرت خاں مارا گیا۔ اسے اپنے قلعے کی مضبوطی پر اتنا ٹھنڈ تھا کہ علاؤ الدین بھی کو بھی اس نے رعونت سے جواب دیا۔

”میں کسی پناہ گزین کو حوالے کرنے کو تیار نہیں۔ تم محاصرہ اٹھاؤ اور چلے جاؤ ورنہ یہیں دفن ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

علاؤ الدین کو طیش تو بہت آیا لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ راجا کو مزید راضی کرنے کی کوشش کی جائے اس طرح وہ مزید وقت لینا چاہتا تھا تا کہ تحصیل کا کوئی کمزور اور پوشیدہ حصہ تلاش کر سکے۔ وہ بار بار قاصدوں کو بھیجتا رہا اور راجا ہر مرتبہ سخت سے سخت جواب بھجواتا رہا۔ اس عرصے میں علاؤ

وہ تینوں امیر جو سلطان علاؤ الدین سے مل کر آئے تھے یہ سوچ رہے تھے کہ رانا کی فوج کو درے کے پاس سے کیسے ہٹایا جائے۔

اس نے راجا سے یہ کہنا شروع کیا کہ مسلمان دکھاوے کے لیے درے کو پاٹ رہے ہیں تاکہ آپ کی ساری توجہ اسی طرف رہے ورنہ وہ تو فیصل کے دوسرے حصوں کی تلاش میں ہیں جہاں سے وہ اوپر چڑھ سکیں۔

بہر حال یہ سننے ہی راجا سہم گیا۔ اس نے بہت معمولی سی فوج چھوڑ کر باقی فیصل کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلا دی۔ اسی روز یہ ہوا کہ غلے کے گودام میں آگ لگ گئی۔ ایک بجھکڑی بج گئی۔ اسی بجھکڑا کا فائدہ اٹھا کر وہ تینوں امیر قلعے سے نکل کر سلطانی کیمپ میں پہنچ گئے۔ قلعے میں افراتفری مچ چکی ہوئی تھی کہ علاقائی فوجی فیصل پر چڑھ گئے اور اندر جا کر دروازہ کھول دیا۔

میر محمد شاہ راجا کے پاس آیا۔ ”اب وقت آگیا ہے کہ میں آپ کے احسانات کا حق ادا کروں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سلطان کی فوج سے مقابلہ کروں اور لڑتے لڑتے اپنی جان دے دوں۔“ اب رانا ہمیر دیو کے پاس بھی اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا کہ اپنی بچی مٹی طاقت سلطان کے مقابلے میں جھونک دے۔

سلطانی فوجوں نے قلعے میں گھسے ہی قتل عام شروع کر دیا تھا۔ رانا کے سپاہی بے دلی سے مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک سال اور بعض مورخین کے نزدیک تین سال بعد علاؤ الدین کی فوجوں کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ قلعے کے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قلعے کے اندر لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ رانا ہمیر دیو بھی مع اہل و عیال قتل ہو چکا تھا۔

الماس بیگ کو میر محمد شاہ کی تلاش تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے اسی قلعے میں پناہ لی ہوئی تھی۔ وہ یا تو قتل ہوا ہوگا یا کہیں زخمی پڑا ہوگا۔ وہ لاشوں کو دیکھتا پھر رہا تھا کہ اس کی نظر محمد شاہ پر پڑ گئی۔ وہ زخمی تھا اور لاشوں کے درمیان ایک جگہ پڑا ہوا تھا۔ الماس بیگ نے فوراً علاؤ الدین کو خبر کی۔ محمد شاہ کو اٹھا کر علاؤ الدین کے روپر و پیش کیا گیا۔

علاؤ الدین نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”محمد شاہ! اگر ہم علاج کروا کے تمہیں موت کے منہ سے بچالیں تو صحت یاب ہو کر تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟“ محمد شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر میں ان زخموں سے نجات پالوں تو سب سے پہلے تجھے قتل کروں گا۔“

”رانا ہمیر کے خاتمے کے بعد یہاں کی حکومت ہمیں ملنی چاہیے۔ ہم آپ کو خراج ادا کرتے رہیں گے۔“

”کیا ایک مملکت کے تین راجا ہوں گے؟“

”یہ ہمارا کام ہے کہ ہم تینوں میں سے کون راجا ہوتا ہے۔ آپ صرف قلعے پر قبضہ کریں اور اپنی فوج کو حکم دیں کہ ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو قتل نہ کیا جائے۔“

”یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے لشکر کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ تم ہو اور یہ تمہارے اہل و عیال؟“

”سلطان آپ بھی بس تمہارے دشمن ہیں، چالوں کے بادشاہ نہیں۔ ہم نے اپنے اہل و عیال کو پہلے ہی یہاں سے نکال دیا ہے ہم تو آپ سے یہ وعدہ اس لیے لے رہے ہیں کہ اگر معاہدے کے بعد بھی آپ نے ہمیں قتل کیا تو ہمارے اہل و عیال کو بھی ڈھونڈ ہی لیں گے۔ ان کی جاں بخشی کا مطلب ہماری جاں بخشی ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہارے اہل و عیال کو قتل نہیں کروں گا۔“

”تو پھر ہم فیصل کے اس حصے سے فوج ہٹالیں گے جہاں سے اوپر آنے کی آپ لوگ کوشش کر رہے ہیں۔“

”یہ کام کب تک ہوگا؟“

”یہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ کام جب بھی ہوگا ہم قلعے سے نکل کر آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔“

سلطان نے ان سے معاہدہ کر لیا اور انہیں پابند کیا کہ وہ قلعے کے اندر داخلے میں مسلمانوں کی مدد کریں گے۔

اس حصے پر پہنچا جہاں ریت کے بورے ڈالے جا رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان جس تندہی سے کام کر رہے ہیں اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فیصل پر چڑھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس نے اپنے سپاہیوں کو آگ کے گولے اور تیر برسانے کا حکم دیا لیکن مسلمان ایسی جگہ تھے جہاں یہ حربے بہت کم کامیاب ہو رہے تھے۔

قلعے کے اندر کھلی جگہ ہوئی تھی۔ الماس بیگ کے دھاوے بھی کامیاب ہو رہے تھے۔ راجپوت بستیوں میں خوب لوٹ مار ہو رہی تھی۔ رائے عامہ تیزی سے راجا کے خلاف ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر راجا کے امیروں نے اسے مجبور کیا کہ وہ صبح کے لیے قاصد روانہ کرے۔ راجا نے یہ مشورہ حقارت سے ٹھکرا دیا۔

ایک رات راجا کے تین قابل ذکر امیر کسی نہ کسی طرح قلعے سے نکلے اور اس جگہ پہنچے جہاں خندق کو پاٹا جا رہا تھا۔ سلطان خود اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے بتایا گیا کہ راجا کے تین امیر غالباً شرائط صلح طے کرنے لشکر میں آئے ہیں۔ سلطان کو تعجب ضرور ہوا کہ راجا صلح پر کیسے تیار ہو گیا جبکہ اس کا ایک بھی آدمی گھائل تک نہیں ہوا ہے۔ اس کے پاس اناج کے ذخیرے بھی اتنے ہیں کہ وہ جھگڑنے پر تیار نہیں ہوگا۔ پہاڑوں کے درمیان ایسے راستے ہیں جہاں سے رسد فراہم ہو رہی ہے۔ ان خیالات کے باوجود وہ اپنے خیمے میں آگیا تاکہ ان تینوں سے مل سکے۔

سلطان نے ان تینوں سے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ سوچتا رہا تھا۔ اس کے جواب میں جو کچھ معلوم ہوا، اس سے حقیقت کھل گئی۔

”اب اگر صلح ہوگی تو میری شرائط پر ہوگی۔“ سلطان نے ان پر واضح کیا۔

”سلطان! ہم یہ صلح راجا کے لیے نہیں اپنے لیے کرنے آئے ہیں۔“

”اپنے لیے؟“

”ہاں اپنے لیے۔ راجا کو ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا۔ اب صلح کے لیے آپ کی طرف ہم ہاتھ بڑھاتے ہیں۔“

”بغاوتوں کے اس موسم میں آپ کو الماس بیگ کو دہلی روانہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔“

”کیا تم میرے بھائی پر بھی شبہ کرو گے؟“

”حضور، اس سے پہلے آپ کے دو بھانجے بغاوت کرتے چکے ہیں۔“

”ہمارے رعب شامی نے کتنی جلدی ان کے سران کے جسوں سے الگ کرادیے۔“

”حضور، گستاخی معاف! ان میں اور الماس بیگ میں بہت فرق ہے۔ الماس ایک تجربہ کار اور بہادر امیر ہے۔ اس کے پاس اپنی فوج ہے۔ وہ چاہے تو نئے فوجی بھی بھرتی کر سکتا ہے۔ ہم شبہ نہیں کرتے اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی ثبوت ہے لیکن اگر اس نے آپ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر لیا تو کوئی اسے روکنے والا نہیں ہوگا۔“

علاؤ الدین نے دکھاوے کے طور پر خبروں کو ڈانٹ دیا لیکن اس کے دل میں بال آگیا۔ اس نے یہ کہہ کر الماس بیگ کو اپنے پاس ہی روک لیا کہ بادشاہ کو اس کی ضرورت ہے۔ اب اسے جلد سے جلد رن جھنڈور کا قلعہ تسخیر کر کے دہلی واپس لوٹنا تھا۔ ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا کہ اس ویرانے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے الماس بیگ کو حکم دیا کہ قریب کے علاقوں میں جا کر خوب لوٹ مار مچاؤ تاکہ یہاں کے لوگ راجپوت راجا کے خلاف ہو جائیں اور راجا پر وباؤ ڈالیں کہ وہ ہم سے صلح کرنے پر مجبور ہو جائے۔

”الماس بیگ، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یا تو اس قلعے کو تسخیر کروں گا یا راجا کو سر جھکا کر صلح کرنے پر مجبور کروں گا۔“

”آپ فرمائیں تو میں لشکر کو لے کر پہاڑ پر چڑھ جاؤں؟“

”مجھے یہ کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا لیکن اس طرح ہمارے لاتعداد سپاہی مارے جائیں گے۔ میں اپنے سپاہیوں کی جانیں یوں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

”پھر کیا تدبیر سوچی؟“

ذہانت

سکہ سلطنت کے مشہور مہاراجا رنجیت سنگھ کے بچپن ہی میں ان کی ایک آنکھ چچک سے ضائع ہو گئی تھی۔ ایک دن مہاراجا نے شاہی مصور کو اپنی حسین و جمیل تصویر بنانے کے لیے کہا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا "اگر تصویر پسند نہ آئی تو مصور کو قتل کر دیا جائے گا۔"

مصور نے ہر زاویے سے تصویر بنا کر دیکھی لیکن کانے پن کے باعث خوبصورت نہ بن سکی۔

مصور نے آخر کار ایک تصویر مہاراجا کو پیش کی جو رنجیت سنگھ کو اتنی پسند آئی کہ اس نے مصور کو مالامال کر دیا۔ تصویر میں مہاراجا رنجیت سنگھ تیرکمان سے ایک آنکھ بند کر کے ہرن کا نشانہ لے رہے تھے۔ اس طرح آنکھ بند کرنے سے مہاراجا کی کافی آنکھ کا نقص بھی چھپ گیا اور مصور کی ذہانت نے اس کی جان بھی بچا لی اور وہ انعام و اکرام سے لوٹا گیا۔

مرسلہ: اسرئی بنت تین، فیکس، یو ایس اے

کس ہندو کوڑی اور خراج گزار کہا جاسکتا ہے؟

قاضی مغیث نے جواب دیا۔ "علمائے مذہب اسلام نے غیر مسلموں کے متعلق یہ حکم دیا ہے کہ یا تو وہ مذہب اسلام قبول کر لیں یا قتل کر دیے جائیں لیکن حضرت امام ابوحنیفہؒ نے غیر مسلموں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے اور اس کی جگہ جزیہ وصول کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے غیر مسلموں سے سخت گیری سے جزیہ وصول کرنا چاہیے تاکہ یہ سخت گیری قتل کے قائم مقام ہو سکے۔"

بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "بے شک تم نے شریعت کی بات کی لیکن میں نے از خود جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ یہی ہے۔"

بادشاہ نے دوسرا سوال کیا۔ "بادشاہی اہل کار اگر رشوت لیتے ہیں تو کیا اسے چوری سے تعبیر کیا جائے اور ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے جو چوروں کے ساتھ ہوتا ہے یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا؟"

چوتھا مشورہ بادشاہ کو یہ دیا گیا تھا کہ عام لوگوں سے دولت واپس لے لی جائے۔ اس مشورے پر اس طرح عمل کیا گیا کہ وہ تمام قصبات جو معافی یا کسی اور وجہ سے رعایا کے قبضے میں تھے وہ شاہی تحویل میں لے لیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنے مسائل میں گرفتار ہو گئے۔ غربت کی دھوپ میں انہیں اتنی فرصت ہی نہ رہی کہ وہ قتل اور ہنگاموں کی طرف توجہ کرتے۔

Popo

سلطان علاؤ الدین غلی کے خیالات ہمیشہ سے یہ تھے کہ بادشاہت کے نظام کا صرف بادشاہ کی رائے اور اس کی مصلحتوں سے تعلق ہوتا ہے، ان سیاسی کاموں سے شریعت کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسی لیے وہ علما کو زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا اور شرعی احکام کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس کے ان خیالات سے سب ہی واقف تھے مگر اس سے واقف نہیں تھے کہ اس میں کچھ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ اس نے شاہی گماشتوں کے مراسلے پڑھنے کے لیے کچھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا جس سے اس کے خیالات میں کچھ تبدیلی آنے لگی تھی۔

قاضی مغیث الدین بیاتوی کو بادشاہ کی پوری قربت حاصل تھی لیکن ان سے بھی وہ کبھی دینی مسائل پر گفتگو نہیں کرتا تھا۔ ایک روز بادشاہ نے قاضی صاحب سے کہا۔ "میں تم سے چند مسائل کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

قاضی صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "حضور، کیا میری موت قریب ہے۔ اگر ایسا ہے تو مسائل پوچھنے کی زحمت کیوں کرتے ہیں۔ حکم فرمائیں ابھی میرا قلم ہوا جاتا ہے۔"

"بات تو دینی مسائل کی ہے۔ آپ اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟"

"خوف کی یہی وجہ ہے۔ حضور مجھ سے جو کچھ بھی دریافت فرمائیں گے میں اس کا صحیح صحیح جواب دوں گا۔ یہ جواب اگر حضور کی مرضی کے خلاف ہو تو میری موت یقینی ہے۔ اگر آپ کی خوشنودی کے لیے غلط جواب دیتا ہوں اور آپ نے دوسرے علما سے تصدیق فرمائی تو میں جھوٹا قرار پاؤں گا۔ اس صورت میں بھی میری موت یقینی ہے۔"

بادشاہ یہ سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور قاضی سے کہا۔ "ابھی تم کو کچھ بولنے کی وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"حضور فرمائیں۔ میں سچ بولنے کی پوری کوشش کروں گا کیونکہ سوالات کے جوابات نہ دینے کی صورت میں بھی تم سے میرا مقدر ہوگی۔"

بادشاہ نے پہلا سوال کیا۔ "اسلامی شریعت کی رو سے

ان کی حیثیت سے زیادہ مل جاتا ہے تو وہ اپنی حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہر چیز پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔"

علاؤ الدین نے ان تدابیر کو بہ غور سنا اور ان پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چاروں طرف معتبر جاسوسوں کا جال پھیلا دیا۔ خفیہ خبر رسائی کا حکم قائم کیا۔ اس نکلنے نے اتنی ترقی کی کہ لوگ اپنے گھروں میں جو باتیں کرتے ان کی اطلاع بھی سلطان کو ہو جاتی تھی۔ امر اتنا ڈر گئے کہ گھروں میں بھی زور سے باتیں کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جب عالم یہ ہوتا بادشاہ کے خلاف سازشیں کرنے کی ہمت کس میں تھی۔ ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

شراب نوشی کی ممانعت پر بادشاہ نے پہلے خود عمل کیا اور کھلے بندوں شراب پینی بند کر دی۔ بادہ نوشی کی محفلیں جو بادشاہ کی جانب سے منعقد ہوتی تھیں، ان کا خاتمہ ہو گیا۔ شراب پینے کے لیے جو ظروف استعمال کیے جاتے تھے۔ انہیں گلا کر سونے کے سکے ڈھال لیے گئے۔ شہر میں عام اعلان کر دیا گیا کہ بادشاہ نے شراب سے توبہ کر لی ہے۔ لہذا جو شخص شراب پیچے گا یا پیے گا، اسے سزا دی جائے گی۔

اس حکم شاہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے سڑکوں اور شاہراؤں پر شراب کے منگے بہا دیے۔ کہا جاتا ہے کہ اتنی شراب بہائی گئی کہ برسات کے موسم کی طرح ہر طرف کچھڑ ہو گئی۔

بادشاہ کو پھر بھی اطلاع ملی کہ بعض لوگ اب بھی گھروں میں بیٹھ کر ساغر دینا سے انھکیلیاں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو سزا سے دوچار کرنے کے لیے بدایوں دروازے کے پاس ایک کنواں کھودا گیا۔ ان بدست و سرشار بادہ نوشوں کو اس کنوئیں میں قید کر دیا جاتا۔ ان میں سے بعض تو اس امیری ہی میں اللہ کو پیارے ہو جاتے۔ جو رہا ہوتے ان کی حالت ایسی ہوتی کہ برسوں علاج معالجہ میں گزر جاتے۔ ان کی حالت دیکھ کر دوسروں کو ایسا خوف ہوا کہ شراب کی لعنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

تیسرے مشورے پر اس طرح عمل کیا گیا کہ امرا اور درباریوں کو بادشاہ کے حکم کے بغیر رشتے ناتے کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ پابندی بھی لگا دی گئی کہ امرا آپس میں ایک دوسرے کی دعوت نہیں کریں گے۔ مصلحت یہی تھی کہ نہ یہ آپس میں ملیں گے، نہ کوئی سازش تیار ہوگی۔ خوف اتنا طاری ہو گیا تھا کہ اگر اتفاق سے کسی امیر کے گھر کوئی مہمان آ جاتا تو وہ بارگاہ شاہی میں تمام حالات لکھ کر بھیجتا اور خوشامد اور چالوسی سے اپنا قصور معاف کراتا۔

یہ جواب ہی ایسا تھا کہ علاؤ الدین طیش میں آ گیا۔ اس نے قتل بان کو حکم دیا۔ قتل بان ہاتھی لے کر آگے بڑھا اور میر محمد کو ہاتھی کے پاؤں نے چل کر رکھ دیا۔

اس کے بعد علاؤ الدین نے راجا ہیر دیو کے ان تین امیروں کو طلب کیا جن سے معاہدہ ہوا تھا۔ وہ تینوں خوشی خوشی حاضر ہوئے کہ اب حکومت انہیں دی جائے گی۔

علاؤ الدین نے ان تینوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ "جب ان لوگوں نے اپنے آقا کے ساتھ بے وفائی کی تو ہمارے ساتھ کس طرح وفا کریں گے۔"

اس قلعے میں بے اندازہ دولت تھی۔ علاؤ الدین نے یہ دولت اور اس علاقے کی حکومت اپنے بھائی الماس بیگ کے سپرد کی اور خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

اس واقعے کے چھ مہینے بعد الماس بیگ (الغ خاں) اچانک بیمار پڑ گیا۔ اسی بیماری کے عالم میں وہ دہلی کی طرف چلا لیکن راستے ہی میں موت نے اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ الماس بیگ کو زہر دیا گیا تھا۔ علاؤ الدین اپنے خلاف ہونے والی بغاوتوں سے اتنا ڈر گیا تھا کہ اسے کسی پر بھی بھروسہ نہیں رہا تھا۔ الماس بیگ کی طرف سے بھی وہ خائف رہتا تھا۔

الماس بیگ کو اس کے مکان میں دفن کیا گیا اور سیکڑوں حفاظت بٹھادیے گئے۔

Popo

رن تصویر کے طویل ترین محرکے سے گزرنے کے بعد علاؤ الدین کو کسی بھانک خواب کی طرح وہ بغاوتیں یاد آئیں جو اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھیں۔ وہ اپنے مشیروں سے مشورہ کرتا رہتا تھا کہ وہ کون سی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں جن پر عمل کر کے بغاوتوں کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔

اس کے مخلص مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ ہنگامہ خیزی اور بغاوت کا سبب عام طور پر چار چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اگر آپ ان پر قابو پالیں تو ہر طرف امن و امان ہو جائے گا۔

بادشاہ کا رعایا سے بالکل بے خبر ہو جانا۔ ملک میں شراب نوشی کا عام رواج ہونا۔ امرا و اہلین سلطنت کا آپس میں گہرے مراسم رکھنا۔ جب امرا آپس میں شیردشک ہوتے ہیں تو جرائم میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں۔ مال و دولت کی فراوانی۔ جب کم ظرفوں اور کمینوں کو

اس نے اپنے لشکر پر غور کیا تو اس کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس خواب کی تعبیر کچھ اور ہو سکتی ہے۔ اس نے اپنے چند مقررین کو بلایا اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ ہر ایک نے مختلف رائے پیش کی۔ ایک صاحب نظریات کی یہ تک پہنچ گیا۔

”حضور عالم خواب میں جنگ کے لیے نہیں نکلے ہیں بلکہ کسی خانقاہ میں دعا کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ دہلی یعنی دہلی کی کسی خانقاہ میں جاؤ۔ تمہارا حصہ یعنی تمہاری کامیابی وہاں ہے۔ دہلی میں تو بہت سی خانقاہیں ہیں۔ اب یہ حضور کی مرضی مبارک کہ کس خانقاہ کا انتخاب فرماتے ہیں۔“

”دہلی میں سب سے بڑی سرکار تو حضرت نظام الدین اولیا کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے بارے میں اچھا لگتا رکھتے ہیں۔“

”تو پھر خواب میں انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔“

”وہ پہلے بھی ایک مقام پر میری مدد کر چکے ہیں۔“

”تو پھر انہی سے رجوع فرمائیے۔“

”عجب بات ہے کہ دہلی میں رہتے ہوئے وہ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے۔“

”بزرگان دین، بادشاہوں سے نسل جول نہیں رکھتے۔“

”مجھے بھی کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ ان سے ملاقات کو جاتا۔ اس وقت بھی میرا جانا امر محال ہے۔“

”انہیں آپ کی مجبوریوں کا علم ہوگا۔ کسی کو بھیج کر دعا کی درخواست کیجیے۔“

”قاضی مغیث بھی یہاں نہیں ہیں ورنہ انہیں بھیجتا۔“

”کسی شخص کو قاضی مغیث کے پاس بھیج دیجیے وہ آپ کی جانب سے حضرت نظام الدین سے ملاقات کر لیں گے۔“

علاء الدین نے ایک اچھا آئینہ رقعہ لکھ کر ایک ملازم کے حوالے کیا کہ وہ دہلی جا کر اس رقعہ کو قاضی مغیث کے حوالے کر دے۔ وہ اس رقعے کو حضرت محبوب الہی تک پہنچا دیں گے۔

اس ملازم نے دیہاتی کا طبع اختیار کیا اور چھپتا چھپاتا دہلی پہنچ گیا۔

قاضی مغیث وہ رقعہ لے کر حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زبانی بھی بادشاہ کی سفارش کی۔ بادشاہ دہلی کی مصیبتوں کا بھی ذکر کیا۔

اسے نہ ہو سکا تھا۔ اسے اس ہم پر مجھے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ مثل قسمت آ رہا تھا اس تاک میں رہتے تھے کہ کب وہ کسی طویل ہم پر جائے اور وہ ہندوستان پر حملہ آور ہوں۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ ماوراء النہر کے مظلوم کو جو غمی معلوم ہوا کہ علاؤ الدین چوڑ کی ہم پر نکلا ہوا ہے اور دہلی میں طویل عرصہ درکار ہوگا، طرحی نائی مثل سردار ایک لاکھ جنگجوؤں کا لشکر لے کر ہندوستان کو لوٹنے کے ارادے سے نکلا۔

علاء الدین کو معلوم ہوا تو اس نے نہایت برق رفتاری سے سفر طے کیا اور دریائے جمن کے کنارے مقیم ہوا۔ مظلوم کا لشکر ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا۔

علاء الدین کی فوج کا بہترین حصہ دکن گیا ہوا تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ مثل کتنا بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں لہذا فی الحال اسے مظلوم کا مقابلہ کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ دہلی سے ایک مقام ”سیری“ چلا گیا کیونکہ یہاں جنگل تھا۔ یہاں پہنچ کر اپنے لشکر کے گرد خندقیں کھود لیں اور خاردار جھاڑیاں ڈال دیں۔ اسے اپنے امرا کا انتظار تھا، اس سے پہلے وہ مظلوم سے لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

مظلوم کا لشکر میدانوں کی دھول اڑاتا پہنچا اور دہلی کے لواحق علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مظلوم کا لشکر راستوں کو گھیرے کھڑا تھا۔ جن امرا کو علاؤ الدین تک پہنچا تھا ان کے لیے اب مشکل ہو گیا تھا کہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ علاؤ الدین خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ خدقوں سے نکلے۔ وہ محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ بیرونی امداد کی توقع نہیں تھی۔

یہ خبریں برادر مل رہی تھیں کہ مثل ارد گرد کے علاقوں میں لوٹ مار کر رہے ہیں۔ ان کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ خاص دہلی پر بھی چھا پا مارا اور غلہ وغیرہ اٹھا کر لے گئے۔

یہاں جو شاہی فوج تھی اس پر بھی حملہ کیا اور بہت سوں کو ہلاک و زخمی کر کے چلے گئے۔

علاء الدین سخت پریشان اور اپنے انجام کی طرف سے غم مند تھا۔ کچھ دیر کے لیے آنکھ لگی تھی کہ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی خانقاہ میں گیا ہے جہاں کئی بزرگ بیٹھے ہیں۔ وہ اپنا حال ان سے بیان کرتا ہے اور مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ بزرگ اس سے کہتے ہیں ”تو اتنی دور چلا آیا۔“

دہلی کیوں نہیں گیا۔ جا وہاں جا۔ حیرانہ تو وہاں ہے۔ اپنا حصہ لے کر کیوں نہیں۔“ اس کی آنکھ کھلی تو اس خواب پر لہو کرنے لگا۔ پہلے تو اس خواب کی تعبیر یہ سمجھ میں آئی کہ اس سے کہا جا رہا ہے، دہلی جا کر مظلوم کا مقابلہ کرے لیکن جب

”حضور نے مجھ سے شرعی جواب مانگا تھا۔ میں نے اذروے شرع جو صحیح تھا، کہہ دیا۔“

”اچھا یہ بتاؤ، میرا طریقہ یہ ہے کہ جو لشکر جنگ کے وقت حاضر نہیں ہوتا۔ میں اس سے تین سال کا معاوضہ واپس لے لیتا ہوں۔ مفیدوں اور سرکشوں کو ان کے بیوی بچوں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیتا ہوں۔ ان کی دولت شاعی خزانے میں جمع کر لیتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم ان سب باتوں کو بھی شرع کے خلاف کہو گے۔“

قاضی مغیث کے سامنے اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ ایک کونے میں جا کر سجدے میں گر پڑے۔ سجدے میں گرے گرے انہوں نے جواب دیا۔ ”یہ سب باتیں شریعت کے خلاف ہیں۔“

بادشاہ نے اس کے بعد کچھ نہیں پوچھا اور حرم سرا کی طرف چلا گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ناخوش ہو کر گیا ہے۔ قاضی مغیث نے بھی سجدے سے سر اٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ گھر پہنچ کر اہل و عیال کے سامنے پورے واقعات دہرائے اور اپنے قل کے شاہی فرمان کا انتظار کرنے لگے۔

وہ رات ان کے گھر میں سجدے اور دعاؤں میں گزر گئی۔ دوسرے دن دربار میں ان کی ظہی ہوئی۔ انہیں اب بھی بادشاہ کی جانب سے بدگمانی تھی کہ وہ ضرور ان کے قل کے احکام صادر کرے گا لیکن دربار نہ جا میں، یہ بھی نہیں ہو سکا تھا، مجبوراً غسل کیا نیا لباس زیب تن کیا اور دربار پہنچ گئے۔

بادشاہ ان کی توقع کے خلاف نہایت لطف و مروت سے ملا۔ ایک جامہ زرد دوزی اور ایک ہزار تنگہ انعام مرحمت کیا اور قاضی صاحب سے فرمایا۔

”اگرچہ میں علم شرعی سے بالکل ناواقف ہوں لیکن مسلمان ہوں اور سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ فرمایا بالکل صحیح ہے لیکن ہندوستان کی مہمات صرف شرعی مسائل پر عمل کر کے حل نہیں ہو سکتیں۔ یہاں کے لوگوں کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے خود ساختہ قوانین کی ضرورت ہے۔ اگر میں چند کوفل کرتا ہوں تو شخص اس لیے کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ میرا مقصد اس و امان قائم کرنا ہے۔ میری نیت صاف ہے اس لیے امید ہے اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرمائے گا۔“

سلطان علاؤ الدین نے ایک لشکر تھکانے کے مشہور علاقے ورنل کو فتح کرنے کے لیے روانہ کیا اور خود ایک فوج لے کر قلعہ چوڑ کی طرف بڑھا جو اس وقت تک کسی مسلمان

قاضی مغیث نے جواب دیا۔ ”چوروں کے لیے جو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے وہ ان لوگوں پر لاگو نہیں ہوتی البتہ بڑی سختی سے ان لوگوں سے یہ ریم واپس لے لینی چاہیے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں بھی اسی قانون پر کار بند ہوں۔“

بادشاہ نے اگلا سوال کیا۔ ”لشکر کی مدد سے جو دولت میں حاصل کرتا ہوں اس پر میرا حق ہے یا رعایا کا۔ وہ میری ملکیت ہے یا بیت المال کی؟“

قاضی مغیث نے جواب دیا۔ ”اس تمام مال و دولت میں آپ کا حق اتنا ہی ہے جتنا ان لوگوں کا، جنہوں نے یہ سب کچھ حاصل کرنے میں آپ کی مدد کی۔“

بادشاہ بھڑک اٹھا۔ ”کیا میں اور میرے لشکر کا مال سپاہی برابر ہے؟“

”برابر نہیں لیکن یہ دولت آپ نے ذاتی محنت سے حاصل نہیں کی ہے۔ لوگوں نے آپ کی مدد کی ہے، صرف اس میں کسی کا حصہ نہیں ہوگا جو آپ نے ذاتی کوشش اور محنت سے حاصل کیا ہو۔“

ابھی اس جواب کی تلخی کم نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہ نے اس سے ملتا جلتا ایک اور سوال کر دیا۔

”لشکر اسلام کی مدد سے جو دولت حاصل کی جائے اس میں میرا اور میری اولاد کا کتنا حصہ بنتا ہے؟“

قاضی کو یقین آ گیا کہ اب تک تو خیر گزری لیکن اس سوال کے جواب میں یقیناً بادشاہ کی آتش غضب بھڑک اٹھے گی۔ اس نے جواب دینے میں تامل کیا اور پھر عرض کیا۔

”آپ کو میرا پہلا جواب بھی پسند نہیں آیا تھا اور یہ جواب تو کچھ زیادہ ہی ناپسندیدہ ہوگا۔ کیا میں اب بھی خود کو محفوظ سمجھوں؟“

”میری بات کا جواب دو۔ اپنی جان کو بالکل محفوظ سمجھو۔“

”اس طرح کی دولت سے بادشاہ کو اسی قدر حصہ لینا چاہیے جتنا کہ ایک عام مسلمان کو زیادہ سے زیادہ ان امیروں کے برابر جنہیں زیادہ حصہ ملتا ہو۔“

”اور میری اولاد کو؟“

”بادشاہ کی اولاد کا حق امرا اور مسلمانوں کے برابر ہونا چاہیے۔“

”قاضی صاحب!“ بادشاہ کا غصہ اس کی آواز میں اتر آیا تھا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بادشاہت کا رعب قائم رکھنے کے لیے جو کچھ خرچ کرتا ہوں، تم اسے ناجائز اور حرام سمجھتے ہو۔“



کراچی

ماہنامہ

مئی 2012
ساگرہ نمبر 2
کی رعنائیاں

عمیرہ احمد

عکس

نکس و نکس پے سلسلہ دورگی کے پشورہ پلوں کی کسب و کسب

ناہید سلطانیہ اختر

زندگی

وہ کی کی تحو و شیریں چشموں سے روخس کرا تا کہ
کی پشورہ پلوں کے قلم سے لکھا جاتا ہے

دل ناداں

ایک لوگ کی وہ کی کے عجب دروازہ کی منزل کی حشر میں
نکس و نکس پے سلسلہ دورگی کے پشورہ پلوں کی کسب و کسب

دودھ کا جلا

بانی کے آئے میں سلسلہ دورگی کے پشورہ پلوں کی کسب و کسب
نکس و نکس پے سلسلہ دورگی کے پشورہ پلوں کی کسب و کسب

کانچ سی لڑکی

چشم نشینی ہر وہ کی کے عجب دروازہ کی منزل کی حشر میں
نکس و نکس پے سلسلہ دورگی کے پشورہ پلوں کی کسب و کسب

نکس و نکس

نعت سراج رخ جودری، ریماء علی سید، نگہت یاسمین،
قانتہ رابعہ اور عذرا بیگ کی دلچسپ و یادگار تحریریں

ان سب کے باوجود یہ ضروری تھا کہ دارالسلطنت میں ایک بڑا لشکر ہر وقت موجود رہے تاکہ اگر بادشاہ کسی مہم پر روانہ ہو تو یہ لشکر دارالسلطنت کی حفاظت کر سکے۔ اس کا تجربہ اسے طرفی کے حملے کے وقت ہوا تھا جب اس کی فوج دکن کے سر کے پر تھی اور دارالسلطنت خالی پڑا تھا۔

لشکر میں اضافہ کرنے کے لیے ان کی تنخواہوں کی مد میں خطیر رقم کی ضرورت تھی۔ شاہی خزانے پر بوجھ بہت زیادہ بڑھ جاتا۔

اس نے مشیروں سے مشورہ کیا۔ "موجودہ حالات میں لشکر کی تعداد میں کیسے اضافہ کیا جائے؟"

"صرف ایک صورت ہے۔" مشیروں نے مشورہ دیا۔ "سپاہیوں کی تنخواہوں میں کمی کر دی جائے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ اس طرح تو بددلی پھیل جائے گی۔ ان کی تنخواہیں اگر پہلے ہی سے کم ہوتیں تو الگ بات تھی۔ بڑھی ہوئی تنخواہیں کم کر دی جائیں گی تو ان کا گزارہ کیسے ہوگا؟"

"اس کے لیے حضور کو چند اقدام اٹھانے ہوں گے۔ روزمرہ اشیاء کو سستا کر دیا جائے۔ اسی طرح گھوڑوں اور ہتھیاروں کی قیمتوں میں کمی کر دی جائے۔ اس مناسب کمی سے اس ارزانی کی وجہ سے سپاہیوں کو اپنی تنخواہوں میں کمی کا احساس نہ ہوگا۔"

مشیروں نے چند قواعد بھی مرتب کر کے بادشاہ کے حوالے کیے جنہیں رائج کر کے اشیاء کی قیمتوں میں خاطر خواہ کمی ہو سکتی تھی۔

علاء الدین نے ان قواعد کو پسند کیا اور ملک میں رائج بھی کیا۔ ان قاعدوں کے مطابق ہر چیز کی قیمت بادشاہ نے خود مقرر کی اور ایسے ضابطے بنائے کہ کوئی زیادہ قیمت وصول نہ کرے۔ ذخیرہ اندوزی کا قلع قمع کر دیا۔ لونڈیوں اور غلاموں تک کی قیمتیں مقرر کی گئیں۔

اس سلسلے میں یہ لطیفہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک رنگین مزاج درباری نے علاء الدین کو خوش دیکھ کر عرض کیا۔ "حضور نے تمام ضروریات زندگی کے نرخ تو مقرر کر دیے لیکن ایک چیز جو سب سے ضروری ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "ایسی کیا چیز ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ رہی؟"

درباری نے کہا۔ "بازاری عورتیں۔ یہ عورتیں پہلے کی طرح اب تک اپنی مرضی کی مالک ہیں اور من مانی قیمت

مغلوں سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا۔ خلق خدا پریشان ہے۔ خدا جانے کیا انجام ہو۔ دعا فرمائیے کہ مثل محاصرہ اٹھا کر اپنے وطن لوٹ جائیں۔"

"دیکھو آج رات ہم بادشاہ کے حق میں دعا کریں گے۔ اللہ سے اچھی توقع رکھیے۔ اپنے بادشاہ سے کہنا، اللہ کے احسانات کو یاد رکھے اور خلق خدا کی بہتری کے لیے کام کرتا رہے۔"

آپ حضرت نظام الدین اولیا نے جو فرمایا تھا، وہی ہوا۔ اس رات کرفی کے دل میں خدا جانے کیا آئی کہ راتوں رات اس نے وہ محاصرہ جو دو مہینے سے قائم تھا کسی وجہ کے بغیر اٹھا لیا اور اپنے وطن کی طرف یوں لوٹ گیا جیسے کوئی بلا اس کے پیچھے لگی ہو۔ اس کے امیر اپنی محنت کو رائیگاں جاتے دیکھ کر محاصرہ اٹھانے کا سبب پوچھ رہے تھے۔ وہ بس یہی کہنے کی حالت میں تھا کہ میرا دل کہہ رہا ہے اگر یہاں مزید ٹھہرے تو ہم میں سے کوئی زندہ بچ کر واپس نہیں جائے گا۔ علاء الدین کی خاموشی کہہ رہی ہے کہ وہ کوئی عظیم لشکر تیار کر رہا ہے۔

اس کرامت کو دیکھ کر سلطان علاء الدین کے دل میں حضرت نظام الدین اولیا کی عقیدت بے حد بڑھ گئی۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ ہمیشہ ان کے مشوروں پر عمل کرتا رہے گا۔ وہ حضرت محبوب الہی سے خط کتابت کرتا بھی رہا لیکن عجیب بات ہے کہ زندگی میں بھی اس کی ملاقات آپ سے نہیں ہوئی۔ یہ حضرت نظام الدین اولیا کی بذات خود ایک کرامت ہے۔ ان کے مرشد حضرت فرید الدین گنج شکر نے آپ کو نصیحت کی تھی کہ بادشاہوں سے ملاقات مت رکھنا۔ پھر وہ علاء الدین کے دل میں یہ کیسے ڈالتے کہ وہ ان سے ملاقات کرے البتہ وہ ہر نماز پر علاء الدین کی روحانی مدد فرماتے رہے۔ یہ انہی کی کرامت ہے کہ علاء الدین نے زندگی میں 84 جنگیں لڑیں اور کسی میں اسے شکست نہیں ہوئی۔

اس واقعے کے بعد اسے یہ بھی نصیحت ہوئی تھی کہ دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنا ایک غلط بات ہے۔ اصل کام تو یہ ہے کہ دارالسلطنت میں بیٹھ کر بیرونی حملہ آوروں کی شورشوں کا دفاع کیا جائے۔ دارالسلطنت کو اتنا مستحکم کیا جائے کہ کسی بیرونی طاقت کو اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہ ہو اور اپنے تمام وسائل خلق خدا کی بہتری کے لیے صرف کیے جائیں۔

اس خیال کے آتے ہی اس نے "سیری" کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ شاعرانہ عمارتیں بنوائیں۔ حصار دہلی کو بھی از سر نو تعمیر کیا۔ مغل جن راستوں سے آتے تھے ان کے قلعوں کو مضبوط کیا۔

لا جواب

شیخ سعدی نماز عشا کے بعد بازار سے گزر رہے تھے کہ انہیں ایک بچہ دکھائی دیا۔ بچے کے ہاتھ میں جلتا ہوا چراغ تھا۔ شیخ سعدی کو یونہی شرارت سو گئی۔ انہوں نے اس بچے سے پوچھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس چراغ میں روشنی کہاں سے آ رہی ہے؟ بچے نے فوراً ہی پھونک مار کر چراغ گل کر دیا اور شیخ سعدی سے کہا۔ اگر آپ بتا دیں کہ روشنی کہاں چلی گئی تو میں بھی بتا دوں گا کہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے۔ یوں بچے نے انہیں لا جواب کر دیا۔

بے وقوفی

مشاعرہ ہو رہا تھا۔ حاضرین محفل لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شاعر نے مصرعہ پڑھا۔
”دل سی نایاب شے فدا کر دی۔“
سامعین نے کہا۔ ”واہ واہ..... ارشاد..... کر۔“ شاعر نے پھر کہا۔ ”دل سی نایاب شے فدا کر دی۔“
محفل میں سے کسی منجلے نے آواز لگائی۔ ”بے وقوفی کی انتہا کر دی۔“

مرسلہ تفسیر عباس باہر، اوکاڑہ

مے گل میں پرورش پاری تھیں کہ آپ کے لشکر نے حملہ کیا۔ میں تو خوش نصیب تھی کہ آپ کے حرم میں آگئی اور اب عیش میں ہوں لیکن میری دونوں بیٹیاں مجھ سے بچھڑ گئیں۔ اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میری بڑی بیٹی کا انتقال ہو چکا ہے، چھوٹی لڑکی زندہ ہے جسے میں چار برس کا چھوڑ کر آئی تھی۔ اس کا نام دیولدی ہے، میں اتنے برس خاموش رہی کہ آپ نے مجھے سہارا دیا ہے، ایک ہندو کی بیٹی کو کیسے برداشت کر س گے۔ وہ جہاں ہے وہیں رہے لیکن اب جو یہ سنا کہ آپ کا لشکر دکن کی طرف جا رہا ہے تو دیولدی مجھے یاد آ گئی۔ اپنے لشکر والوں سے کہیں کہ وہ میری دیولدی کو وہاں سے نکال لائیں جیسے مجھے نکال لائے تھے۔ میں وعدہ کرتی ہوں اسے بھی اپنی طرح مسلمان بنالوں گی۔ وہ ہندو بن کر یہاں نہیں رہے گی۔ میں اسے دیکھ تو سکوں گی۔ آپ کو اللہ اور بڑا مسلمان بنائے۔ آپ میری بیٹی کو مجھ سے ملو ادیں۔“

علاء الدین اس طرح اس کی داستان سن رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ شاید سوچ رہا ہو کہ بادشاہوں کی ان لڑائیوں میں گھری نہیں اجڑتے، دل بھی اجڑ جاتے ہیں۔ گنولادیوی اپنی بیٹی کے لیے کیسا کیسا روٹی ہوگی۔ کہیں ایک ماں کی بددعا سے نہ لگے۔

”گنولادیوی، آج سے پہلے تم نے کبھی اپنی بیٹی کا ذکر ہم سے نہیں کیا ورنہ ہم بہت پہلے اسے تم سے ملوادیجے بہر حال اب بھی ہم قسم کھاتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک ضرور پہنچائیں گے۔ لشکر روانہ ہو چکا ہے لیکن ہم ابھی قاصد دوڑاتے ہیں جو ملک نائب کو پیغام پہنچا دے گا کہ دیولدی کو ہر قیمت پر بازیا بکرایا جائے۔“

گنولادیوی نے ایک مرتبہ پھر شکرگزاری کے طور پر علاؤ الدین کے پاؤں چھونے کی کوشش کی لیکن علاؤ الدین نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ گنولادیوی کے چہرے پر حیا کے کئی رنگ بکھر گئے۔

علاء الدین نے دو قاصد روانہ کیے ایک گجرات کے عالم الخ خاں کے پاس گیا، دوسرا ملک نائب کے پاس۔ دونوں کے پاس ایک پیغام پہنچا۔

”جس طرح بھی ہو دکن کے مشہور راجا کرن کی بیٹی دیولدی کو میرے پاس بھیجو۔ اس سلسلے میں چاہے سختی سے کام لیا جائے، چاہے نرمی سے۔“

ملک نائب کو جو یہ پیغام ملا اس نے اس کی نقول راہرام دیو، راجا کرن اور دیگر راجگان دکن کے نام بھیجا دی اور اپنی جانب سے بھی لکھ دیا کہ وہ یہ کام خون خرابے

کوئی وقت نہ رہی۔ اس نے اس غلام کو ملک نائب کا خطاب دیا اور رفتہ رفتہ امور مملکت کے تمام کام اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ سایہ بان اور سراپردہ جو صرف بادشاہوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، ملک کا فور کو عطا کیے۔ یہ حکم تھا کہ دوران سفر امیر اور درباری روزانہ ملک نائب کی خدمت میں آداب بجالانے کے لیے حاضر ہوں جتنے بھی کام ہوں وہ اس کے حکم سے سرانجام ہوں۔ کسی کو انکار کی جرأت نہ ہو۔ خود بادشاہ کا یہ حال ہوا کہ ملک نائب کا ہر مشورہ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ کیسا ہی ناممقول مشورہ ہو بادشاہ اس پر عمل کرتا تھا۔

اجیسے اچھے معقول اسرا دے لفظوں میں کہنے لگے تھے کہ اگر علاؤ الدین کی بادشاہت کو زوال ہو تو اس کا سبب یہی ملک نائب ہوگا۔

Phila

بادشاہ ابھی دربار کی فراغت کے بعد آکر بیٹھائی تھا کہ رانی گنولادیوی ایک ادائے خاص سے کمرے میں داخل ہوئی اور پتنگ پر اس کے برابر بیٹھنے کے بجائے اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ یہ ایک خلاف معمول قدم تھا۔

”تم اب مسلمان ہو ہندو نہیں رہیں۔ مسلمان عورتیں اس طرح قدموں میں نہیں بیٹھتیں۔“ علاؤ الدین نے کہا اور اپنے پاؤں ذرا سیٹ لیے۔

”اس وقت نہ میں ہندو ہوں نہ مسلمان۔ ایک ماں ہوں جو اپنے بچوں کے لیے جیک مانگ رہی ہے۔ آپ اتنے بڑے مسلمان ہیں۔ ایک ماں کو مایوس تو نہیں کریں گے؟“

علاء الدین یہ سن کر رُپ گیا۔ اس نے گنولادیوی کا چہرہ اوپر اٹھایا کیونکہ وہ اس کی کانپتی ہوئی آواز سے سمجھ گیا تھا کہ شاید وہ رو رہی ہے۔ گنولادیوی کی آنکھوں میں واقعی آنسو تھے اور پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا گنولادیوی؟“ اس نے گنولادیوی کو سہارا دیا اور پتنگ پر بٹھا دیا۔ ”ہم سے کوئی خطا ہوگئی جو یوں رو رہی ہو، کیا بات ہے؟“

اس نے کسی کنیز کو بلانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ خود اٹھا اور صراحی سے پانی نکال کر پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس دوران مسلسل پوچھتا رہا کہ کیا بات ہوئی ہے۔

جب گنولادیوی کی سانسیں کچھ قابو میں آئیں تو اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میری دو بیٹیاں میرے ساتھ ہی راجا رانے کرن

وصول کر رہی ہیں۔“
”فکر نہ کرو۔ تمہاری خاطر میں ادھر بھی توجہ کرتا ہوں۔“ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد بادشاہ نے کوتوالی شہر کو طلب کیا۔ ”پیشہ ور عورتوں، گانے والیوں اور سازندوں کو باخبر کر دو کہ مقررہ نرخوں سے ایک پیسا بھی زائد وصول نہ کریں۔“

بادشاہ نے ہر طرح کی طوائفوں کے لیے نرخ مقرر کیے اور انہیں پابند کیا کہ وہ اس شاہی قیمت سے زیادہ وصول نہ کریں۔ اشیا کی ارزانی اور تنخواہوں کی کمی کا اثر یہ ہوا کہ اس نے اپنے لشکر میں بے پناہ اضافہ کر لیا۔ اس کے پاس پانچ لاکھ سواروں کا ایک لشکر جوار تیار ہو گیا۔ اب وہ کسی جہم پر جاتا تو جتنا لشکر اس کے ساتھ ہوتا، اس سے زیادہ دارالسلطنت کی حفاظت کے لیے رہ جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مظلوم کی شورشیں ختم ہو کر رہ گئیں جو اس وقت سب سے بڑا خطرہ بنے ہوئے تھے۔ اگر اتفاق سے مظلوم کی کوئی جماعت ادھر آنکلی تو جماعت کا کوئی فرد زندہ بچ کر نکلنے کے لائق نہ رہتا۔ مارا جاتا یا گرفتار ہو جاتا۔

دو تین حملے ہوئے ضرور لیکن مظلوم کو ایسی عبرتناک شکست ہوئی کہ اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔

جب مظلوم کے حملے کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو گئے تو علاؤ الدین اپنے باج گزاروں کی طرف توجہ ہوا۔ دیو گڑھ کے حاکم راجا دیو نے تین سال سے خراج بھیجتا بند کر دیا تھا۔ اس کی گوشمالی ضروری تھی۔ بادشاہ نے ملک نائب کو نامی گرامی اسرا کے ساتھ دکن کی فتح کے لیے روانہ کیا۔

ملک نائب ماضی میں ایک غلام تھا جس کا اصل نام ملک کا فور ہزار دیناری تھا۔ ہزار دینار اس لیے کہا جاتا تھا کہ گجرات کے حاکم راجا رانے کرن نے اسے ہزار دینار میں خریدا تھا۔

الماس بیگ اور نصرت خاں جب زندہ تھے تو انہوں نے گجرات پر چڑھائی کی تھی۔ یہاں سے وہ دو جگہ ساتھ لائے تھے۔ ایک راجا کرن کی رانی گنولادیوی اور دوسرا ملک کا فور ہزار دیناری۔

راجا کرن کی رانی گنولادیوی حسن صورت میں اپنا جواب نہ دیتی تھی۔ شیریں کلامی اور دلیرانہ اداؤں کی وجہ سے بھی اپنا جواب آپ ہی۔ علاؤ الدین نے اسے مسلمان کر کے اس کے ساتھ شادی کر لی۔

کا فور ہزار دیناری اسے ایسا پسند آیا اور اس کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس غلام کے مقابلے پر دنیا کی کسی چیز کی

زیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کی نوازشیں رام دیو پر بھی ہوئیں۔ اسے ہر سفید اور رائے رایاں کا خطاب عطا کیا اور بڑے اعزاز سے روانہ کیا۔ دیو گڑھ اور قدیم ممالک کی حکومت اس کے سپرد کی۔ رام دیو جب تک رہا، علاؤ الدین کی اطاعت کا دم بھرتا رہا۔

RRRR

مسلسل فتوحات نے علاؤ الدین کو یقین دلادیا تھا کہ وہ ناقابل تسخیر ہے اور وہ یہ بات ہر ملنے والے سے کہا بھی کرتا تھا۔ جالور کا راجا کا تیر دیو ایک مرتبہ دہلی آیا ہوا تھا۔ بادشاہ سے ملاقات کے لیے آیا تو دوران ملاقات اس نے راجا کے سامنے اپنے اس عزم کو دہرایا۔

”اب ہندوستان کے کسی راجا میں مجھ سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ سب نے مجھ سے شکست بھی کھائی اور میرے مطیع بھی بنے۔“

”ہندوستان کی زمین بہادروں سے خالی نہیں ہوئی۔“ راجا نے کہا۔ ”آپ سے مقابلہ کرنے والے اب بھی موجود ہیں۔“

”آپ کسی ایک راجا کا نام مجھے بتادیں۔“ بادشاہ نے کہا۔

”اگر مجھ سے آپ کا مقابلہ ہو تو میں پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ اگر یہ نوبت آگئی تو جان دے دوں گا مگر ہتھیار گلے میں ڈال کر آپ کے سامنے پیش نہیں ہوں گا۔“

بادشاہ کو اس کا یہ دعویٰ نہایت برا لگا لیکن اس وقت چپ ہو گیا۔

راجا کے رخصت ہونے کے بعد اس کے دعوے کی نقلی کھولنے کا ارادہ کیا۔ لشکر کشی کا خیال آتے ہی ایک اور بھی خیال آیا۔ راجا کو ذلیل کرنے کی اس نے عجیب ترکیب سوچی۔ بڑے بڑے امرا سے شکست کھا جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ راجا کو یہ بتایا جائے کہ وہ ایک معمولی لونڈی سے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا۔ اس نے اپنی ایک لونڈی گل بہشت کو فوج کے ساتھ جالور روانہ کیا۔ تمام لشکر کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ گل بہشت کی اسی طرح بات مانیں جس طرح اپنے سہ سالہ لڑکی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔

گل بہشت نے جالور پہنچ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ اہل قلعہ محاصرے کی شدت سے سخت پریشان ہوئے۔ کئی مرتبہ باہر نکل کر مقابلہ کیا لیکن گل بہشت نے دانت کٹے کر دیے۔ قلعہ فتح ہونے کو تھا کہ گل بہشت بیمار پڑ گئی اور چند روز بعد اسی بیماری کے ہاتھوں انتقال کر گئی۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے اس کی جگہ سنبھالی۔

اس نے راجا کے تمام مال و اسباب اور ہاتھیوں وغیرہ پر قبضہ کر لیا اور ساتھیوں کو حکم دیا کہ راجا کا تعاقب کریں۔ وہ اگر فریج کر چلا گیا تو سمجھو ہم میں سے کوئی نہیں بچا۔

الغ خاں اپنے لشکر کے ساتھ نہایت تیز رفتاری سے جنگوں سے گزرتا ہوا، پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا دیو گڑھ پہنچ گیا لیکن نہ راجا کرن کے قدموں کے نشان ملے، نہ دیولدی کی خوشبو۔

الغ خاں نے اپنے لشکر کو دریا کے کنارے ٹھہرنے کا حکم دیا تاکہ یہاں رک کر راجا کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ قریب ہی میں ایلورا کے غار تھے جہاں بدھ مت کے زمانے کی تاریخی مورتیاں تھیں جنہیں غار کی دیواروں پر بڑی مہارت سے نقش کیا گیا تھا۔ فوجیوں کو فرصت ملی تو انہیں ایلورا کی میر کی سوجھی۔ وہ لغ خاں کی اجازت سے اس عجیب و غریب مقام کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان لشکریوں کو دور سے ایک دکنی فوج آتی نظر آئی۔ وہ سب یہ سوچ کر لڑنے کے لیے تیار ہو گئے کہ یہ راجا کرن کی فوج ہوگی۔

دونوں لشکر آپس میں ٹھٹھکا ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے مقابلے کے بعد ہندو، مسلمانوں کے حملے کی تاب نہ لا کر ہٹا گئے۔ مسلمانوں نے تیر اندازی جاری رکھی۔ ایک گھوڑا بڑی تیزی سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سپاہی نے اس گھوڑے کو نشانہ بنایا۔ اس تیر نے گھوڑے کو بالکل بے کار کر دیا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت اس گھوڑے کے قریب پہنچی تو اس گھوڑے پر بیٹھی ایک ملازمہ زور سے چلائی۔

”اس کی عزت کرو۔ یہ رانی دیولدی ہے۔ اسے اپنے سردار کے پاس لے چلو۔“

یہ سنتے ہی مسلمانوں کی تو جیسے دلی مراد برآئی۔ اب معلوم ہوا کہ یہ بھی دیو کا لشکر تھا جو دیولدی کو دیو گڑھ لے کر آ رہا تھا۔ جس کے ملنے کی امید نہیں تھی، جس کی خاطر یہ خوں ریزی ہوئی تھی۔ یوں اچانک مجرمانہ طور پر مل جائے گی کسے امید تھی۔ یہ سپاہی دیولدی کو لے کر لغ خاں کے پاس پہنچے۔

الغ خاں یہ خبر سنتے ہی خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور دیولدی کو لے کر فوراً انجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر دیولدی ایک پانگی میں بیٹھ کر دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔ ادھر یہ حالات دیکھ کر رام دیو ملتجیانہ ملک نائب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ملک نائب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رام دیو کے لڑانے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ بادشاہ اس کی ناکرودی سے اتنا خوش ہوا کہ اس کا مرتبہ پہلے سے بھی دس گنا

سنجل دیو نے راجا کرن کے نام پیغام بھجوایا۔

”مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب کی بنا پر جو دشمنی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کا ہمارا کوئی میل نہیں۔ راجپوت اور مرہٹہ تو پھر ایک قوم ہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی بیٹی کا بیاہ مجھ سے کر دو۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوگا کہ دیولدی کی شادی ہو گئی تو پھر وہ تم سے جنگ نہیں کریں گے۔“

راجا کرن کو یہ پیغام ملا تو اس نے ایک مرتبہ پھر غور کیا۔ مسلمانوں کے مطالبے نے اس کی اکثر فوں نکال دی تھی۔ اس نے وہ جتنے تحائف قبول کیے جو بھیج دیو اپنے ساتھ لایا تھا اور وعدہ کیا کہ وہ دیولدی کا بیاہ سنجل دیو کے ساتھ کر دے گا تاکہ مسلمانوں سے اس کی جان چھوٹے۔

”میں دیولدی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کرتا لیکن حالات ایسے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کو تو یہ معلوم بھی نہ ہونے پائے کہ دیولدی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ تو ایسا کر جس لشکر کو تو اپنے ساتھ لایا ہے اسی میں شامل کر کے دیولدی کو بھی اپنے ساتھ دیو گڑھ لے جا۔ پھیرے وہاں لے جا کر کر لیتا۔“

بھیم دیو اسے اپنے ساتھ لے کر چلتا بنا۔

الغ خاں کو کہیں سے معلوم ہو گیا کہ دیولدی کی شادی کی بات ہو رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بھیج دیو کے ساتھ دیو گڑھ جانے کے لیے روانہ ہو گئی ہے۔

الغ خاں نے فوراً مجلس مشاورت منعقد کی۔

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ راجا کرن دیولدی کی شادی کر رہا ہے۔ اگر وہ یہاں سے نکل گئی تو سلطان ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ابھی وہ یہیں ہے۔ ہمیں پوری قوت سے اسے چھین لینا چاہیے۔“

تمام امیروں نے اتفاق کیا اور آخری دم تک لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اسی وقت صفیں درست کیں اور کوہستان میں داخل ہو گئے۔

علاؤ الدین ان سے سیکڑوں میل دور تھا لیکن اس کا خوف ایسا تھا کہ سب کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اگر دیولدی ہاتھ سے نکل گئی تو پھر انہیں سلطان سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ انہوں نے قسم کھائی کہ اپنے خون سے اس زمین کو سرخ کر دیں گے لیکن دیولدی کو جانے نہیں دیں گے۔

راجا کرن سے آتنا سامنا ہوا تو راجا ان کے پھرے ہوئے جذبات کا سامنا نہ کر سکا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک مرنے کو تیار ہے۔ راجا کرن بس کچھ دیر ہی مقابلے پر ڈنارہا اور پھر جنگ کے میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔

الغ خاں کو یقین تھا کہ دیولدی اس کے ہمراہ ہوگی۔

میں بڑی جانبازی سے کام لیا اور ہر بار بغیر شکست کھائے واپس ہوا۔ وہ اپنی رانی کھو چکا تھا، بیٹی کھوٹا نہیں چاہتا تھا۔

الغ خاں اور ملک نائب ہر قیمت پر دیولدی کو لینا چاہتے تھے لہذا دونوں اپنی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف وعدے کا پاس تھا دوسری جانب آن کا سوال تھا۔ دیکھنا تھا فتح کس کی ہوتی ہے؟

ان معرکہ آرائیوں کی سب سے زیادہ فکر رام دیو کے بیٹے سنجل دیو کو تھی۔ وہ دیولدی کا عاشق اور اس سے شادی کرنے کا خواہاں تھا لیکن چونکہ رام دیو مرہٹہ تھا اس لیے اس شادی پر رضا مند نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ راجپوتوں کی بیٹی اس کے گھر میں آئے۔ سنجل دیو اب تک کسی امید میں تھا لیکن اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مسلمان دیولدی کو لے گئے تو وہ ہمیشہ کے لیے اس کے ہاتھ سے چلی جائے گی۔

سنجل دیو اپنے بھائی بھیم دیو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ دیولدی کو کیسے حاصل کیا جائے۔

”بھیم دیو کیا تو سمجھتا ہے کہ راجا کرن، دیولدی کی حفاظت کرے گا؟“

”وہ اپنی رانی کنولا دیوی کی حفاظت نہ کر سکا۔ دیولدی کو کیا بچائے گا؟“

”مقابلہ تو وہ خوب کر رہا ہے۔“

”تو ان مسلمانوں کو نہیں جانتا۔ بڑی جنگجو قوم ہے یہ۔ بڑی تیاری سے آئے ہیں۔ یہاں کے راجا کب تک ان کا مقابلہ کریں گے۔“

”میں نے پتائی سے کہا تھا کہ میری شادی دیولدی سے کرادیں۔ اگر اس وقت یہ شادی ہو گئی ہوتی تو میں اسے لے کر کہیں بھی بھاگ جاتا۔ مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگتا۔“

”وہ راجپوت ہے اور ہم مرہٹہ پھر یہ شادی کیسے ہو سکتی تھی۔ پتائی اسی لیے انکاری تھے۔“

”اور اب جو مسلمان اسے لے جائیں وہ اچھا ہوگا۔ ہم کم از کم ایک دھری تو تھے۔ ذات برادری الگ سبکی۔“

”ہاں بھائی، یہ تو تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو جنگ لگی ہوئی ہے۔“

”اب بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”کیا ہو سکتا ہے؟“

”تم راجا کرن کے پاس جاؤ اور میرا پیغام اسے پہنچا دو۔ وہ اس وقت مشکل میں ہے، ہماری بات ضرور مان لے گا۔۔۔۔۔ لیکن یاد رکھو، پتائی کو یہ معلوم نہ ہو ورنہ وہ تمہیں بھی نہیں جانے دیں گے۔“

راجا جالور قلعے سے باہر نکلا اور یہ سوچ کر کہ اب گل بہشت تو رہی نہیں۔ لشکر کا مقابلہ بہ آسانی کیا جاسکتا ہے، لشکر کے مقابل آگیا۔ دونوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ گل بہشت کا بیٹا مارا گیا۔ اہل لشکر بھی مقابلہ نہ کر سکے اور چند منزل پیچھے ہٹ گئے۔

علاء الدین کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اس نے ایک غیر معروف شخص کمال الدین کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے نہایت مردانگی سے قلعہ فتح کر لیا۔ کاتیر دیوا اپنے عیال کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

PaPaPa

علاء الدین کی سلطنت کا مل وسندھ کی سرحد سے لے کر بنگالہ، دکن اور گجرات کی حدود تک پہنچ گئی۔ سارے ہندوستان میں دس بیگہ زمین بھی ایسی نہیں تھی جہاں علاؤ الدین کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری نہ ہو۔ راجاؤں کے محل اور شاہی خزانے اس کے قبضے میں تھے۔ دریائے عمان کے ساحلی علاقے اور دکن کے دور دراز سرحدی خطے فتح کر چکا تھا۔ یہ سب فتوحات ملک نائب کے مرہون منت تھیں۔ اس نے جب وہ خزانے اور دھنیں جو اس نے راجاؤں سے چھینے اور مندروں سے نکالے تھے، علاؤ الدین کے قدموں میں ڈھیر کیے تو علاؤ الدین بے اختیار کہہ اٹھا۔ ”یہ سب وہ ہے جس کے سامنے پرویز و دارا کے خزانے بھی ہچ ہیں۔“

ملک نائب نے دریائے عمان کے ساحلی علاقوں دھور سمندر اور مبھر کو فتح کیا اور وہاں کے مندروں سے جواہرات نکال کر وہلی پہنچا اور مال غنیمت پیش کیا تو مال غنیمت کیا تھا، وہ پورا ہندوستان اٹھا کر وہلی لے آیا تھا۔ یہ مال غنیمت تین سو بارہ ہاتھیوں، بیس ہزار گھوڑوں، چھانوے من سونا اور بے حد حساب اشرافیوں اور موتیوں پر مشتمل تھا۔ اس مرتبہ علاؤ الدین نے بھی خزانے کا منہ کھول دیا۔ امرا میں سونا تقسیم کیا۔ کسی کو دس من کسی کو پانچ من مشائخین بھی اس فیاضی سے دور نہیں رہے۔

مورخین کا بیان ہے کہ علاؤ الدین ظلمی کو جس قدر فتوحات حاصل ہوئیں اتنی ہندوستان کے کسی اور حکمران کو نصیب نہ ہوئیں اس نے جس کثرت سے مسجدیں، تالاب، سرائیں، خانقاہیں اور قلعے تعمیر کرائے، اتنے کسی اور بادشاہ نے نہیں بنائے۔ اہل فن اس کے زمانے میں بہت بڑی تعداد میں جمع تھے۔ ان کا اتنا بڑا گروہ کسی اور بادشاہ کے زمانے میں جمع نہیں ہوا۔

یہی حال علمائے کرام، مورخین، شعرائے کرام اور اطبا

کا تھا۔ مطربوں، کویوں اور دیگر باب طرب کی وہ کثرت تھی جو پھر بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

اس فراوانی دولت نے بادشاہ کو امور حکومت سے غافل کر دیا۔ تمام امور ملک نائب کے ہاتھوں رہے۔ بادشاہ کے بیٹوں تک کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ملک نائب سے اختلاف کی جرأت کرتے، امرا کی تو کیا مجال۔ ان حالات میں سازشیں اپنا منہ کھولتی ہیں لیکن علاؤ الدین کا رعب اب بھی طاری تھا اور پھر دولت کی کثرت تھی جو ہر ایک کا منہ بند کیے ہوئے تھی۔

سازشوں کے لیے مواقع بادشاہ کی بیماری نے مہیا کر دیے۔ عیش و عشرت اور لہو و لعب نے علاؤ الدین کو بیمار ڈال دیا۔ اس بیماری نے بہت سے چہروں کو بے نقاب کر دیا۔ اس کا بڑا بیٹا، خضر خان جسے اس نے ولی عہد بنایا تھا اور ملکہ جہاں کو بزم آرائیوں سے فرصت نہیں تھی، وہ بادشاہ کی بیماری کی پروا کیا کرتے۔ دیگر رانیاں جن میں کنولادیوی بھی تھی، اس کی حیاداری کے لیے بھی بھی حاضر ہوتی تھیں۔ چند باوقا امرا تھے جو اس کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔

”خضر خاں کو میرے پاس آئے آج چار روز گزر گئے۔“ بادشاہ نے ایک روز اپنے ایک امیر سے شکایت کی۔ ”حضور، انہیں چوگان بازی اور ہاتھیوں کی لڑائی سے فرصت نہیں۔“

”انہیں یہ بھی تو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ دلی عہد سلطنت ہیں۔“

”یہ بے پروائی شاید اسی لیے ہے۔“

”آپ کا مطلب کیا ہے؟“

”حضور بادشاہت کے ہر راز سے واقف ہیں، اب ہم کیا عرض کریں۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اسے میرے مرنے کا یقین انتظار ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ملکہ جہاں کو اپنے بیٹوں کی شادیوں اور پوتیوں کے عقیقوں سے فرصت نہیں ہے انہیں ہمارے سوا سب کچھ یاد ہے۔“

ان حالات کو دیکھتے ہوئے سلطان نے ملک نائب طلب کیا جو ان دنوں دکن میں تھا۔ وہ شاہی حکم کی تعمیل میں فوراً چلا آیا۔ بادشاہ نے اس سے بھی خضر خاں اور ملکہ جہاں کی شکایت کی۔

یہی وہ موقع تھا جب ملک نائب کے دل میں یہی مرتبہ یہ خیال آیا کہ وہ علاؤ الدین کی جگہ اس ملک کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ وہ تو خیر بستر پر تھا لیکن اس کا دلی عہد خضر خان

موجود تھا جو بادشاہ کی آنکھیں بند ہوتے ہی تخت پر بیٹھ جاتا۔ ملک نائب کی بادشاہت تو رہی ایک طرف، وہ اعزاز و مرتبہ بھی چھین جاتا جو اسے علاؤ الدین نے عطا کیا ہوا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ خضر خاں کو راستے سے ہٹایا جائے۔ اس نے خضر خاں کی طرف سے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دیے۔

ایک دن یہ تک کہہ دیا۔ ”آپ کی موجودگی انہیں بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ دل سے آپ کی موت کے خواہاں ہیں۔“

”پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”یہ اگر کسی طرح بھی آپ کے قریب رہے تو آپ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہیں خود سے دور کر دینا چاہیے۔ میں شاہی خاندان کا فرد تو نہیں لیکن آپ کا نمک خوار اور وفادار ہوں۔ خضر خاں یہاں موجود نہیں ہوں گے تو میں تمام کام سنبھال لوں گا۔ وہ تو مجھے آپ کے علاج کی طرف بھی متوجہ نہیں ہونے دیتے۔ ولی عہد ہیں، میں کیا کر سکتا ہوں۔“

علاؤ الدین اس کی کوئی بات ماننے کا روادار نہیں تھا۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے خضر خاں کو شکار کے بہانے امرودہ کی طرف روانہ کر دیا۔

”تم میری وجہ سے خواجواہ پریشان رہتے ہو۔ کچھ دن شکار میں گزارو۔ جب میں صحت یاب ہو جاؤں گا تو تمہیں خود بلواؤں گا۔“

”میں نے یہ منت مانی ہے کہ جب آپ صحت یاب ہوں گے تو امرودہ سے وہلی تک مشائخ کی زیارت کے لیے پیدل آؤں گا۔“

”خدا تمہاری منت پوری کرے اور مجھے صحت ملے۔“ بادشاہ نے کہا۔

خضر خاں امرودہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ملک نائب نے امراسے ساز باز شروع کر دی۔ اس کا اعزاز و مرتبہ ایسا تھا کہ وہ جس سے ہنس کر بات کر لیتا وہ اسے اپنی خوش قسمتی تصور کرتا۔ امراتیزی سے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

بادشاہ کی حالت کچھ سنبھلنے لگی تھی۔ جب خضر خاں کو معلوم ہوا کہ بادشاہ صحت یاب ہو رہا ہے تو اس نے اپنی منت پوری کی اور اپنے لشکر خاصہ کے ساتھ امرودہ سے دہلی تک پیادہ آیا۔

اس موقع پر اسے یہ فرمان شاہ یاد نہیں رہا کہ جب میں صحت یاب ہو جاؤں گا تو تمہیں بلواؤں گا۔ اس میں یہ شرط چھپی ہوئی تھی کہ از خود دست چلے آتا۔

ملک نائب نے اس کی اسی غلطی کو اس کی خود مری کے روپ میں پیش کیا۔

”حضور، شہزادہ آپ کی اجازت کے بغیر آیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں امیروں کے ساتھ مل کر کوئی سازش نہ کرے۔“ چند روز نہیں گزرے تھے کہ ملک نائب نے یہ فرضی انکشاف بھی کر دیا۔

”حضور، بات اتنی بڑی ہے کہ مجھ غلام کو کہتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے اور اگر نہ کہوں تو حضور سے غداری ہوگی۔“ ملک نائب، تم نے ہمیشہ ہمارے مفاد کا خیال رکھا ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو ضرور کہو۔“

”حضور، خضر خاں اور شادی خاں آج کل ہی میں آپ کے دشمنوں کی جان لینے والے ہیں۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں ان لوگوں تک پہنچ گیا ہوں جو ان دونوں شہزادوں کے ساتھ شامل ہیں لیکن میں شہزادوں کی موجودگی میں ان لوگوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔“

ملک نائب نے چند غلام بھی گواہی کے لیے خرید لیے جنہوں نے جاں بخشی کے وعدے پر بادشاہ کے سامنے جھوٹی گواہی دی۔ ان لوگوں کے نام لیے جو اس میں شامل ہیں۔

بادشاہ، ملک نائب پر اتنا اعتبار کرتا تھا کہ نہ بیٹوں سے باز پرس کی اور نہ کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق کی اور اپنے دونوں بیٹوں خضر خاں اور شادی خاں کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا۔

اس فرمان پر ملک نائب ہی کو عمل درآمد کرنا تھا۔ ملک نائب نے ان دونوں شہزادوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کروا دیا اور ملکہ جہاں کو محل سے نکلوا کر پرانی وہلی میں نظر بند کر دیا۔

غضب تو یہ ہوا کہ ملک نائب نے حاکم گجرات الخ خاں کی موت کا فرمان جاری کر دیا۔ الخ خاں جو خضر خاں اور شادی خاں کا خالو تھا اور حال ہی میں گجرات سے آیا تھا، ملک نائب کی عیاری سے مارا گیا۔

علاؤ الدین، ملک نائب کی محبت میں ایسا گرفتار تھا کہ جو وہ کہتا جا رہا تھا، بادشاہ اس پر عمل کر رہا تھا۔ ملک نائب کو جس جس سے خطرہ ہو سکتا تھا، بادشاہ سے اس کے قتل کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ ایک شخص کو جالور روانہ کیا تاکہ وہ جالور کے حاکم نظام الدین کو جو الخ خاں کا بھائی تھا، قتل کرے۔

اس ظلم و زیادتی نے پورے ملک میں انتشار برپا کر دیا۔ گجرات کی فوج نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت کو

فصل اجڑ مکی

کچلنے کے لیے سید کمال الدین کرک کو روانہ کیا لیکن گجرات پہنچے ہی الخ خاں کے طرف داروں نے کمال الدین کو پکڑ کر بری طرح موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جیت پور کے حاکم نے بھی بغاوت کر دی اور شاہی ملازموں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں قلعے سے نیچے پھینک دیا۔ وکن میں ہو پال دیو نے جو رام دیو کا داماد تھا، ہنگامہ کھڑا کیا۔

علاؤ الدین نے جس سلطنت کی حدود کو دن رات ایک کر کے دستِ بیل کیا تھا اور بہترین تدبیر سے ہر طرف امن و امان پیدا کیا تھا، ملک نائب کی بد اعمالیوں نے اسے ریت کے ٹھونڈے کی طرح بٹھا دیا۔

علاؤ الدین ان خبروں کو سن رہا تھا لیکن اب حالات اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ اگر وہ کوئی مشورہ بھی دیتا تھا تو ملک نائب اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ان واقعات پر کڑھنے کے سوا اس کے بس میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ملک نائب جو چاہ رہا تھا، وہ کر رہا تھا۔

بادشاہ کی صحت پھر گرنے لگی۔ رہے سہے سہارے یا تو قید میں تھے یا قتل کر دیے گئے تھے۔ اب اس کے علاج کے لیے اطباء کو آواز دینے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ملک نائب نے وفادار ملازموں کو بھی بادشاہ سے دور کر دیا تھا۔ حفاظت کے نام پر بادشاہ کا حال یہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ قیدی نہیں تھا مگر قیدیوں کی طرح تھا۔

اس کی صحت اچانک مندوش ہو گئی اور 6 شوال 716ھ کی رات کو اس کی روح نفسِ غصری سے پرواز کر گئی۔ بعض کا کہنا ہے کہ بادشاہ کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔ ملک نائب نے اسے زہر دیا تھا۔

بے شمار زرو و جواہر جو محمود غزنوی کو بھی میسر نہیں ہوئے تھے، علاؤ الدین دوسروں کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

ملک علاؤ الدین مکی کو خاموشی سے وٹن کر دیا گیا۔ تدفین کے دوسرے دن ملک نائب نے تمام امرا اور اراکین دربار کو جمع کیا اور مکی کا وصیت نامہ پڑھ کر سنایا۔ یہ وصیت نامہ اس نے نہ جانے کب اور کس چال سے لکھوایا تھا۔

”میں اپنے بڑے بیٹے خضر خاں کو ولی عہدی سے معزول کرتا ہوں اور اس کی جگہ اپنے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔ ملک نائب بہ دستور نائب السلطنت رہیں گے۔“

اس وصیت نامے میں شہاب الدین کا نام اس لیے لکھوایا گیا تھا کہ شہاب الدین کی عمر صرف سات سال تھی۔ وہ

برائے نام بادشاہ ہوتا تھا۔ پر وہ ملک نائب ہی بادشاہ ہوتا۔ اس وصیت نامے کے بعد کسی امیر کی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کی مخالفت کرتا۔ جتنے طاقتور امرا تھے وہ پہلے ہی قتل کیے جا چکے تھے۔ جو باقی تھے ان پر ملک نائب کا خوف غالب تھا یا انہیں دولت دے کر ان کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔

ملک نائب نے شہزادہ شہاب الدین کو تخت پر بٹھا دیا اور خود اس سات سالہ فرماں روا کا نائب بن گیا۔ نائب کیا تمام کام اسی کو انجام دینے تھے۔

اس نے جو پہلا کام کیا اسی سے اس کے عزائم کا اظہار ہوتا تھا۔ جلوس کے پہلے ہی دن ملک سکھیل کو بارہکی کے عہدے پر مقرر کر کے گوالیار کی طرف روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہ خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کر دے۔ اس شخص نے گوالیار جا کر دونوں شہزادوں کی آنکھوں میں سلاخیاں بھیر دیں۔

دونوں شہزادے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ (اندھا مرابریں) اب ملک نائب کو شہزادہ مبارک کی طرف سے خطرہ تھا۔ شہاب الدین تو کم سن تھا اس لیے وصیت میں اسی کا نام ڈالا گیا تھا۔ اگر کسی طرح شہزادہ مبارک تخت پر بیٹھ جاتا تو زمامِ حکومت ملک نائب کے ہاتھ سے نکل سکتی تھی۔

ملک نائب اس فکر میں تھا کہ شہزادہ مبارک خاں کو بھی اندھا کر دے۔ اس کے اس ارادے کا علم کسی طرح شہزادے کی والدہ بی بی مالک کو ہو گیا۔ وہ ایک دن پاکی میں سوار ہوئیں اور حضرت نجم الدین کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ یہ حضرت صاحب کشف بزرگ تھے۔

بی بی مالک نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور امداد کی طالب ہوئیں۔

”میرا بچہ بے قصور ہے۔ بادشاہ بننے کا طالب بھی نہیں۔ اسے شخص بادشاہ کا بیٹا ہونے کی سزا دی جا رہی ہے۔ تمک حرام نائب ملک اسے اندھا کرنے کے ارادے باندھ رہا ہے۔ آپ اللہ کے نیک بندے ہیں، آپ سے امداد کی طالب ہوں۔“

”تم فکر مت کرو۔ جو ملک نائب سوچ رہا ہے ویسا نہیں ہوگا۔ غیبی امداد کا انتظار کرو۔“ حضرت نجم الدین نے فرمایا۔

حضرت نجم الدین نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری اور اسے الٹ کر دوبارہ اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا۔ ”اب میں اس ٹوپی کو اسی وقت سیدھا کروں گا جب مبارک شاہ تختِ حکومت پر بیٹھے گا۔“

بی بی مالک خوش خوش گھر چلی آئیں۔ ملک نائب سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ اسے تفصیلات کا علم تو نہ ہو سکا لیکن یہ

شوق مردانگی

مختار آزاد

بے شک اچھی صحت اللہ کی طرف سے ایک نایاب تحفہ ہے مگر رز کی خواہش میں مبتلا کچھ تن آسان لوگ ایسی سمت چل نکلتے ہیں جن کی منزل ناآسودہ خواہشوں اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں... اس نے بھی شوق اور دیوانگی کی ایسی راہ اختیار کی تھی جس میں زندگی عجب تماشے دکھائی دیتی تھی اور پھر اچانک اس کی اپنی زندگی دائرہ پر لگ گئی... وہ ایسی بندگی میں قید ہو گیا جہاں سناٹوں کا راج تھا۔

زندگی سے لطف اندوز ہونے والے ایک بے حس مسیحا کی روداد



وہ کل چھ لوگ تھے اور تین گاڑیوں میں سوار ہو کر وہاں پہنچے تھے۔ دو اُس گاڑی سے اترے جس پر پولیس کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔ اسی طرح کی دوسری گاڑی سے تین لوگ باہر آئے۔ تیسری ایک نجی کار تھی۔ اس چھوٹی کار سے صرف ایک شخص باہر نکلا تھا۔ دوسرے لوگوں کی نسبت وہ پولیس والا نہیں لگ رہا تھا۔ باہر نکل کر وہ قطار بنا کر کھڑے

ہے اور تم اس کا ساتھ دے رہے ہو۔ اس کی سازش کو سمجھو۔ جو غلام کی صورت میں میرے والد کے پاس آیا تھا، آج خزانے پر قابض ہے۔ اس کے بعد بھی اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو کر گزرو۔ میں تمہارا مقابلہ تک نہیں کروں گا۔“ خواجہ سراسر جھکائے کھڑے تھے۔ انہیں اپنے فعل پر عمارت ہو رہی تھی۔ شیخ نجم الدین کی دعا تھی یا کیا تھا کہ خواجہ سراسر مبارک شاہ کو قتل کے بغیر جیسے گئے تھے ایسے ہی لوٹ آئے۔

واپس آ کر انہوں نے اپنے سرداروں بشیر اور مبشر سے سارا قصہ کہا۔ وہ بھی متاثر ہوئے لیکن انہیں یہ فکر ہوئی کہ ملک نائب حکم عدولی کی سزا ضرور دے گا۔ پھر انہوں نے وہ فیصلہ کیا جو ملک نائب کی قسمت ہی ان سے کر سکتی تھی۔ جب رات اپنے شباب پر آئی۔ بادشاہی محل کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ پہرے داروں کے سوا کوئی نہیں رہا اور وہ سب بشیر اور مبشر کے ساتھی تھے۔ دونوں نے تلواریں ہاتھوں میں لیں اور ملک نائب کی خواب گاہ کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ پہرے دار خواجہ سراؤں میں سے ایک نے کسی کام کے بہانے ملک نائب کا دروازہ کھلوا دیا۔ بشیر اور مبشر خواب گاہ میں گھس گئے۔ ملک نائب کچھ بچنے بھی نہیں پایا تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ اسے قتل کرنے کے بعد یہ لوگ مبارک شاہ کے پاس پہنچے اور اسے قید سے آزاد کرایا۔

شہاب الدین کو بدستور بادشاہ رہنے دیا گیا۔ مبارک شاہ کو اس کی نیابت پر مقرر کیا لیکن آخر کار اس نے امرا و اراکین سلطنت کو اپنے ساتھ ملا لیا اور صرف دو ماہ بعد شہاب الدین کو بادشاہت سے معزول کر کے عتاق حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مبارک شاہ کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ اس بد بخت نے بھی وہی کھیل کھیلا جس کے لیے وہ ملک نائب پر لعن طعن کرتا رہا تھا۔ سات سال کے شہاب الدین کی آنکھوں میں سلاٹیاں پھر وادیں اور گولیاں کے قلعے میں قید کر دیا۔ جو کام غیر نہیں کر سکے، اپنے کر گز رہے۔ شہاب الدین صرف دو ماہ حکومت کر سکا تھا اور ملک نائب علاؤ الدین خلجی کی موت کے بعد صرف 35 روز بعد قتل کر دیا گیا۔

مبارک شاہ، خلجی خاندان کا آخری بادشاہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

ضرور معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے بیٹے شہزادہ مبارک کے سلسلے میں ان بزرگ کے پاس گئی تھیں۔ ملک نائب کا اب معمول بن گیا تھا کہ وہ خلجی خاندان کی تباہی کے منصوبے باندھتا رہتا تھا۔ شہزادہ مبارک اس کے خاص نشانے پر تھا کیونکہ وہ کسی بھی وقت تخت و حکومت کا دعویٰ کر سکتا تھا۔

بی بی مالک کی حضرت نجم الدین سے خفیہ ملاقات کے بعد ملک نائب چوکنہ ہو گیا تھا۔ اس نے مبارک شاہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔

ایک رات ملک نائب نے ان چند خواجہ سراؤں پر اپنا ارادہ ظاہر کیا جو اس رات مبارک شاہ کے محل کی حفاظت پر متعین تھے۔ انہیں لالچ دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مبارک شاہ کو قتل کر دیں گے۔

یہ خواجہ سرا تانک میں لگے رہے اور موقع دیکھ کر مبارک شاہ کے سر پر پھینچ گئے۔ قریب تھا کہ اس کا کام تمام کر دیتے، مبارک شاہ نے انہیں آمادہ کر لیا کہ پہلے وہ اس سے بات کریں پھر چاہیں تو اسے قتل کر دیں۔

”تم میری جان کے درپے کیوں ہوئے ہو۔ کیا دشمنی ہے میری تم سے؟“

”ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہم تو جس کے لوکر ہیں اس کا حکم مانتے ہیں۔ ہمیں ملک نائب کا حکم ملا ہے کہ تمہیں قتل کر دیا جائے۔“

”لوکر تو تم سلطان شہاب الدین کے ہو، بادشاہ تو وہ ہے۔“

”وہ بے شک بادشاہ ہے لیکن حکم تو ملک نائب کا چلتا ہے۔ تمام امرا اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ کیا آپ اس کے پابند نہیں؟“

”اس کا حکم نہیں چلتا۔ لوگ اس کے ظلم سے ڈرتے ہیں۔“

”کچھ بھی ہو ہم نے اگر اس کا حکم نہیں مانا تو ہم اس کے عتاب کا نشانہ نہیں گئے۔“

”کیا تم ان احسانات کو بھول گئے جو میرے باپ سلطان علاؤ الدین خلجی نے تم پر کیے۔ اس نے تمہیں چاندی اور سونے سے مالا مال کر دیا تھا۔ تم ایک ایسے شخص کا حکم مان رہے ہو جو خلجی خاندان کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینا چاہتا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ اس نے دو خلجی شہزادوں کو اندھا کر دیا۔ ملک جہاں قید میں ہیں اور اب وہ مجھے راستے سے ہٹا دینا چاہتا

ہو گئے۔ اُن کے سامنے کھڑا لہاڑنگا شخص اُن سب کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ یہ ظاہر وہ اُن پولیس والوں کا انچارج افسر نظر آ رہا تھا۔ اُس چھوٹی اور لمبی کار والے کے سوا باقی تمام لوگوں کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے تھے۔ جسم کسرتی، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ اور لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سکیورٹی ایجنٹ ہو سکتے ہیں۔ چھوٹی کار والے شخص نے گھرے کمر کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہینڈ بیگ تھا۔ اگرچہ دو گاڑیوں پر نیو جرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ کا مونو گرام بنا ہوا تھا مگر وہ لوگ مقامی پولیس والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ لہاڑنگا شخص خاموش ہوا اور آگے بڑھا۔ باقی لوگ چاروں طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے میرے کلینک کی طرف بڑھنے لگے۔

میں اُس وقت کلینک میں تھا اور سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے انہیں کمپیوٹر مانیٹر پر دیکھ رہا تھا۔ میرے کلینک پر اکثر پولیس والے مریض کی حیثیت سے آتے رہتے ہیں۔ مقامی پولیس کے درجنوں افسران سے میری اچھی خاصی دوستی تھی مگر یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور کلینک پر کیوں آ رہے ہیں۔ جس طرح وہ پہنچے اور آگے بڑھے، اس سے وہ مریض تو کسی طور نہیں لگ رہے تھے۔

کمرے میں کوئی مریض نہیں تھا۔ میں اُس وقت انٹر کام اٹھا کر استقبالیہ کو اگلا مریض بھیجنے کا کہنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر مانیٹر پر گئی۔ میں نے ریسپورڈ رکھا اور انہیں دیکھنے لگا۔ اُس وقت اُن کی گاڑیاں کلینک کے سامنے پارکنگ ایریا میں رک دی تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں پوری توجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ نپے نیلے قدموں سے کلینک میں داخل ہوئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے انتظار گاہ میں پہنچ گئے جہاں کئی مریض اپنی باری کے انتظار میں رسالے پڑھ کر وقت گزار رہے تھے۔ جس انداز سے وہ اندر داخل ہوئے، وہ مریضوں کو چونکا گیا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے مگر وہ لا تعلق نے استقبال پر پہنچے جہاں ایک بڑے کاؤنٹر کے پیچھے کینسولا بیٹھی تھی۔ وہ دفتر کی استقبالیہ طرح تھی۔ معائنے کے لیے وقت وہی دیتی تھی اور وہی مریضوں کو باری باری میرے پاس بھیجتی تھی۔

کینسولا نے انہیں دیکھا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک شیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں آنے والے مریض اپنا نام لکھتے تھے اور پھر اسی کے مطابق نمبر آنے پر وہ انہیں میرے کمرے میں بھیج دیتی تھی۔ کینسولا نے ہاتھ آگے

بڑھایا۔ اس کے لب پہلے۔ کینسولا نے اُن سے کیا کہا، یہ میں سن نہ سکا مگر میں سمجھ گیا کہ وہ اُن سے انٹورنس کارڈ مانگ رہی ہوگی مگر اس کے جواب میں سب سے آگے کھڑے نووارد نے ایک فائل اس کے ہاتھ میں تھمائی اور کچھ کہا۔ اُس وقت میں کینسولا کے چہرے پہ آنے والے تاثرات صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ اجنبی کی بات سن کر پریشان نظر آ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد میرے انٹر کام کی کھنٹی بج گئی۔

”کہو کینسولا۔“ میں نے پرسکون انداز میں کہا۔ اگر یہ وہی لوگ تھے کہ جن کی چار بجے کی اپائنٹمنٹ تھی تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں کافی دیر سے ان کے آنے کا منتظر تھا۔ اتفاق سے جن مریضوں کی اپائنٹمنٹ تھی، وہ بھی پولیس والے ہی تھے۔

”ڈاکٹر جیمسن...“ کینسولا نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ وہ پریشان لگ رہی تھی اور میں مانیٹر پہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ”کچھ پولیس والے آئے ہیں۔ وہ ریکارڈ قبضے میں لینا چاہتے ہیں۔ اُن کے پاس تلاشی کا وارنٹ بھی ہے۔“ اس نے اگلے اگلے اپنی بات مکمل کی۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

”کیا...؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تم نے وارنٹ پڑھا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کیا ہم ریکارڈ کی جانچ پڑتال یا اسے قبضے میں لینے سے ان پولیس والوں کو روک سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں سر! اُن کے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔“

”ٹھیک ہے، پھر انہیں اُن کا کام کرنے دو۔“ میں نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا تم انہیں روک نہیں سکتے، وہ فائلیں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ مریضوں کا ریکارڈ ہے، ہزاروں مریضوں کا۔“ کینسولا نے گھبرائے لہجے میں سوال کیا۔

”کینسولا... مجھے یقین نہیں کہ انہیں روک سکوں گا۔“

میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

کینسولا میری بہت وفادار ملازم تھی۔ وہ کئی سالوں سے میرے پاس کام کر رہی تھی۔ وہ سادہ سی نہیں، کسی حد تک بے وقوف بھی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ با اختیار ہوں۔ اس وقت بھی اس نے یہی سوچ کر یہ بات کہی ہوگی۔

میں با اختیار ہوں یا نہیں... مگر ایک بات صاف ہے کہ پولیس اور وارنٹ کے ساتھ، انہیں روکنا تو کتنا میرے بس کی

بات تو ہرگز نہیں تھی۔

پولیس والوں کی آمد میرے لیے حیران کن نہیں تھی۔ مگر یہ تو میرے خلاف کچھ کرنے آئے تھے۔ یقیناً ایسا کرنے کے لیے اُن کے پاس مخصوص جواز بھی موجود ہوگا۔ اُس وقت وہ کینسولا کے سر پہ کھڑے تھے جس کی پشت پر دیوار گیر شیلف میں میرے تمام مریضوں کی پرسنل فائلیں موجود تھیں۔

میں مانیٹر پر دیکھ رہا تھا کہ کینسولا سے اُن کا رویہ نرم تھا وہ اتنی سادہ مزاج کی تھی کہ اگر پولیس والے ذرا سا بھی

درشت لہجے میں اُس سے پوچھتے تو یہ انہیں وہ سب کچھ بتا دیتی خوشامد سر توڑ گفتیش کے باوجود پولیس والے جان نہیں

پاتے۔ اس کا بیان مجھے جنل پہنچانے کے لیے کافی ہوتا۔

دوسری طرف مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر اسے میرے سامنے

کھڑا کر کے ہاتھ میں بائبل تھما کر بھی پوچھا جاتا تو وہ کچھ

بھی کہنے سے صاف انکار کر دیتی۔ یہی نہیں، اپنے حلفیہ بیان

سے بھی انکاری ہو سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے کچھ

کہنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ اسی لیے میری پوری کوشش

تھی کہ اس سے بات کرتے ہوئے خود کو پرسکون ظاہر کروں

تاکہ اس کی ہمت بھی بندھی رہے۔ میں گھبراتا تو اس کا بوکھلا

جانا یقینی تھا۔ میں یہ دستور مانیٹر پر اس کے تاثرات دیکھ رہا

تھا۔ میری بات سن کر اس کی ڈھارس بندھی تھی۔ اب وہ

خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

”اگر کوئی پولیس والا میرے کمرے میں آنا چاہے تو

انہیں روکنا مت۔ مجھے یقین ہے انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی

ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

استقبالیہ پر جو کچھ ہو رہا تھا، وہ میں مانیٹر پر دیکھ رہا تھا۔

تین پولیس والے استقبالیہ کی عقبی دیوار پر بنی الماریوں میں

رکھی فائلیں اور دوسرا ریکارڈ اٹھا اٹھا کر دیکھتے جارہے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک پولیس والا باہر گیا اور چار پانچ گتے کے

بڑے بڑے کیے ہوئے ڈبے لے آیا۔ اب دو پولیس

والے فائلوں کی پڑتال کر رہے تھے، تیسرا انہیں ڈبوں

میں رکھتا جا رہا تھا۔ میرے کلینک پر چھاپہ پڑ چکا تھا۔

پولیس والوں کے ساتھ آنے والا، سوٹ میں ملبوس شخص

الٹرا گاہ میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ سارے مریضوں

کو پولیس نے واپس بھیج دیا تھا۔ اب وہاں کینسولا کے سوا

ایسی سارے لوگ وہی تھے، جو کچھ دیر پہلے گاڑیوں سے

اُتر رہے تھے۔ میں مانیٹر پر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری

لواٹ تھی کہ اس صورت حال میں خود کو پرسکون رکھوں ورنہ

ارا سالہنی تناؤ میرے لیے بڑی مصیبت کا سبب بن سکتا

تھا۔ کچھ دیر بعد دو پولیس والے میرے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک وہی لہاڑنگا شخص تھا جو چھاپے سے پہلے باقی لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے فوراً مانیٹر کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور سر جھکا کر پہلے پر کچھ لکھنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ جب وہ اندر پہنچیں تو انہیں غلطی یہ احساس نہ ہو کہ میں خوف زدہ ہوں۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میڈیکل کے شعبے

میں سب کچھ ٹھیک نہیں ہوتا اور بہت کچھ غلط بھی ہوتا ہے۔ جو

کچھ ہوا، مجھے اس کا اندازہ بہت پہلے سے تھا۔ میرے لیے یہ

غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے اب تک میڈیکل کے پیشے میں

علاج کے نام پر جو کچھ کیا تھا، اس کی وجہ سے مجھے یہ ڈر تو

تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر کب... یہ کہنا بہت مشکل تھا اور بد قسمتی

سے وہ دن آ گیا تھا۔

جب سے پولیس والے کلینک میں گھسے تھے، تب سے

میرا دماغ تیزی سے یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اس کے بعد

کیا ہوگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور بحیثیت ڈاکٹر

میں جان چکا تھا کہ میرا بلڈ پریشر بھی ہائی ہو رہا تھا۔ مجھے بالکل

اندازہ نہیں تھا کہ پولیس والے صرف تلاشی کے لیے یہاں

آئے ہیں یا پھر جاتے ہوئے کلینک کے ریکارڈ کے ساتھ مجھے

بھی لے جائیں گے۔ یقین اور بے یقینی کے اس عالم میں،

میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ مجھے گرفتار کر کے میڈیکل فرائڈ انوسی

کیشن ایجنسی کے حوالے کر دیں گے میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا

تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پر ایک بات طے تھی کہ جو ہوگا

وہ بے حد بُرا ہوگا۔ شاید اُس کے بعد میں کلینک چلانے کے

قابل ہی نہ رہوں۔ میرا میڈیکل پریکٹسٹر کا لائسنس منسوخ

ہو سکتا تھا۔ اس اچانک پڑنے والی افتاد کے باعث میرا دماغ

بہت تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میں بے حد پریشان

تھا مگر پھر بھی خود کو بہ ظاہر پرسکون اور چہرے کو بے تاثر رکھنے

کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کر رہا تھا۔

”جی ڈاکٹر جیمسن، کیا ہو رہا ہے؟“ دو پولیس والے

میرے کمرے میں گھس آئے تھے۔ ”میرا نام ٹیمپٹن ایڈی

ہے اور میں اس پارٹی کا انچارج ہوں جو یہاں تلاشی لینے

کے لیے آئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پولیس شناختی

کارڈ میری نظروں کے سامنے لہرایا۔ ”مجھے یقین ہے کہ آپ

ہمارے ساتھ تعاون کریں گے۔ فی الحال ہمارا ہدف صرف

ریکارڈ اور تلاشی ہے۔“

”میرے پاس فی الحال تعاون کے سوا کوئی راستہ

نہیں۔“ ٹیمپٹن ایڈی کی بات سن کر میں نے زبردستی مسکرا

جاسکے۔ اکثر کھیلتے ہوئے جیتنے کی غرض سے میں خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دے دیتا تھا۔

کھیل میں دل نہ لگا تو پھل سے کاغذ پر تصویریں بنانے لگا۔ رفتہ رفتہ پھل اسکا بنانے میں میرا ہاتھ صاف ہو گیا۔ میری ہر تصویر میں ہمیشہ جوان مرد اور عورت ہوتے تھے۔ دونوں کے تاثرات اور جسمانی خطوط نہایت واضح ہوتے تھے۔ کئی بار میری تصویروں کو خوش قرار دے کر ٹھیک ٹھاک سرزنش بھی ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ پریکٹس جاری رہتی تو میں اس میدان میں آگے جاسکتا تھا مگر میں کمزور ارادوں کا کمزور بچہ تھا۔ باز پرس اور ڈانٹ ڈپٹ سے دلبرداشتہ ہوا تو شوق کو ہی چھوڑ دیا۔

تجہائی کے احساس کا ایک بڑا فائدہ ہوا۔ جس نے مجھے کتابوں کی طرف مائل کر دیا۔ میں لڑکپن میں ہی یہ بات جان گیا تھا کہ ہمارے ذہن کی گنجائش بہت بڑی ہے جسے ہم مکمل بھی استعمال نہیں کر پاتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں پڑھائی میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری کلاس میں غیر معمولی نظر آنے لگا۔ میرے گریڈ ہمیشہ اچھے آتے۔ میں ہر کلاس میں لگ بھگ پہلے یا دوسرے نمبر پر رہتا تھا۔ یہ سلسلہ کالج تک جاری رہا۔ اس کی وجہ سے میں اساتذہ کی نظروں میں رہتا تھا۔

کتابوں میں گم ہونے کا ایک نقصان بھی ہوا۔ میری تجہائی بڑھتی گئی۔ میرا دماغ جتنا طاقت ور تھا، جسم اتنا ہی لاغر۔ دونوں میں بہ ظاہر کوئی مطابقت نہیں تھی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد یہ احساس تجہائی مزید بڑھ گیا تھا۔ میں تقریباً تیس سال کا ہونے والا تھا، جب خود کو جسمانی لحاظ سے بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے میں نے جم جوائن کر لیا۔ باقاعدگی سے ورزش شروع کر دی۔ چند مہینوں میں ہی اس کا اچھا نتیجہ نکلا۔ جسم بھرنے لگا۔ مدقوق چہرے پر رونق آنے لگی۔ جھکی کمر سیدھی اور پچکا سینا بھرنے لگا۔

کئی مہینوں کی نہیں بلکہ دو تین سالوں کی مسلسل کوشش سے میں بالکل بدل گیا تھا۔ اب مجھ میں اور اُس اسکول والے لڑکے میں جسمانی لحاظ سے زمین آسمان کا فرق تھا۔ جم نے میری پوری شخصیت کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

یہ اُس سے چند لمحوں پہلے کی بات ہے جب پولیس والے میری گردن تاپنے کے لیے کمرے کے اندر پہنچے تھے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا مائٹر پہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو پولیس والے باہر استقبالیہ میں کر رہے تھے۔ سب دستانے

کی کوشش کی۔ ”سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ دیکھ لیں جو دیکھنا ہے۔“

”شکریہ ڈاکٹر۔“ ایڈی نے مہذب مگر طنزیہ انداز میں کہا۔ اُس کے بعد وہ دونوں کمرے کی تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔

اگرچہ مجھے اب تک باقاعدہ طور پر پولیس نے گرفتار نہیں کیا تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری گردن ایڈی کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں ہے۔ اب تک میں آزاد تھا مگر یہ آزادی کب تک باقی رہتی ہے، اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

”پولیس سے پوچھ لو، اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو سارے ملازمین کو چھٹی دے دو۔“ کافی دیر تک سوچ میں غرق رہنے کے بعد میں نے اتر کام پر کینسولا کو ہدایت دی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کم از کم آج کی تاریخ میں، میں کسی مریض کو دیکھ سکوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ پولیس والے جو کچھ کرنے آئے تھے، وہ کام منہوں کا نہیں گھنٹوں کا تھا۔ میں نے پاؤں پیارے اور کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ ذہنی تناؤ کے سبب سخت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی بھی وقت دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔ ایسے میں کھلی آنکھوں سے پولیس والوں کی کارروائی دیکھنے کے بجائے میں نے مناسب سمجھا کہ آنکھیں موند کر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کروں۔

☆☆☆

میں اس موڑ تک کیسے پہنچا، یہ جاننے کے لیے میرے اسکول کے زمانے کو جاننا ہوگا۔ نہیں، ٹھہریے ہائی اسکول۔ اوہ نہیں، صرف اسکول کی حد تک بات کریں، آگے کا معاملہ خود ہی سمجھ آ جائے گا۔ بس یہ بات ذہن میں رہے کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور میں اپنے اسکول کی دنوں کی بات کر رہا ہوں۔ میں ایک ناکارہ، گھماڑ اور ہر موقع پر نقصان اٹھانے والا لڑکا تھا۔ میں نے ہر بار کچھ نہ کچھ کھویا۔ اسکول میں ہر وقت اُبکاکی لیتا رہتا تھا۔ میرا جسم مختلف امراض کا شکار تھا۔ جگر کمزور، معدہ خوراک ہضم کرنے کے بجائے اُلٹ دینا زیادہ مناسب سمجھتا تھا۔ کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ اُس زمانے میں، میں تو بالکل چمکا ڈر کی طرح تھا۔ روشنی میں آنکھیں پھندھیاں تھیں۔ چہرہ مدقوق اور زردہ کمر آگے کو جھکی ہوئی، سینہ پیچھے کودا ہوا، پٹکی پٹی پنڈلیاں... اب ایسے لڑکے کو کون دوست بنانا پسند کرتا ہے۔ اسی لیے میں سارا دن اپنے آپ میں مست رہتا تھا۔ کھیل بھی وہ کھیلا، جو اکیلے کھیلا

طرح پڑھ کر اپنی تسلی کر لو۔“ اس نے سر آواز میں کہا۔
میں نے فائل لی۔ اس میں صرف تین کاغذات تھے۔
یہ دراصل تین وارنٹ تھے۔ میں ایک، ایک کر کے انہیں
پڑھنے لگا۔ ایک میرے کلینک دوسرا گمر کی تلاشی کے لیے تھا۔
وارنٹ، نیو جرسی ڈسٹرکٹ کورٹ نے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی
درخواست پر جاری کیا تھا۔ میں نے تفصیل سے پڑھا۔
وارنٹ بالکل درست تھے۔ مگر جیسے ہی تیسرا وارنٹ دیکھا
میرے اوسان خطا ہو گئے۔ تیسرا وارنٹ میرے گودام اور
دیگر تمام متعلقہ جگہوں کی تلاشی کے لیے تھا۔

”سب کچھ یہاں ہے تو پھر گمر اور گودام کی تلاشی
ضروری ہے؟“ میں نے سوچا۔ گودام کی تلاشی کا وارنٹ مجھے
بری طرح چونکا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پولیس نے بڑا پانچا ہاتھ
ڈالا ہے۔ گودام کے بارے میں میری بیوی بھی نہیں جانتی تھی
تو پولیس کو کیسے پتا چلا۔ اس سوال کا جواب مجھے لمحہ بھر میں مل
گیا۔ گودام کے بارے میں میرے بعد صرف ایک ہی شخص کو
علم تھا اور وہ بھی کینسولا۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی دماغ
کی چولیس ہل گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ جم سے شروع ہونے
والا دولت کا یہ مکمل بس اب ختم ہونے والا ہے۔ گودام کی
تلاشی کا مطلب میری موت تھا۔

☆☆☆

میرا پہلی بار جم جانے کا واقعہ تو بھروسہ کی میڈی ہے۔
میں عمر کی تیسری دہائی میں تھا اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا
تھا۔ جب میں پہلی بار ویٹ لفٹنگ کی کلاس میں گیا تو وہاں
ساری عورتیں تھیں۔ کئی ایک نے مجھ کمزور اور ناتواں جسم
والے کو پہلے تو حیرت سے دیکھا۔ پھر زوردار قبضہ لگا یا اور اس
کے بعد کئی نگاہوں نے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں ”کیوں
اپنی جان پر ستم ڈھانے آئے ہو میرے بچے۔“

جم کی پہلی کلاس میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا، اس کی
وجہ سے بہت شرمسار تھا مگر میرا عزم جواں تھا۔ میں انسانی
جسم کو دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتا تھا۔ مجھے
معلوم تھا کہ تن سازی اور خوراک کے درست استعمال سے
میں خود کو بدل سکتا ہوں۔ ویسے بھی ڈاکٹر بن چکا تھا۔
خوراک کے بہترین احتیاج سے جسم پر اس کے اثرات کو
اچھی طرح جانتا تھا۔ شاید اسی لیے شرمندگی محسوس کرنے اور
عورتوں کے ایک مرد ناتواں کا مذاق اڑانے کے باوجود
میں اپنے مقصد سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹا۔
مجموعی طور پر میں اپنی زندگی میں ناکام شخص رہا ہوں۔
جس وقت میں یہ طور ڈاکٹر اپنی عملی زندگی شروع کرنے کے

لیے ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا، اُس وقت میرے اسکول کے کئی
ساتھی اپنی پیشہ ورانہ زندگی شروع کر کے خود کو مستحکم کر چکے
تھے۔ اُن کے پاس بہترین گاڑی تھی، گرل فرینڈز تھیں، گھر
تھا اور جیب میں پیسے بھی مگر میں... ایک کمرے کے گھنٹیا
فلٹ میں رہنے والا ڈاکٹر جسٹین ہائیڈ جو پرانی کار میں بیٹھ کر
اپنا مقدر بنانے کے لیے سارا دن ادھر سے ادھر لوڑی کی
تلاش میں پھرتا تھا۔ اسکول کے زمانے کی تنہائی جوانی میں بھی
برقرار تھی۔ کسی لڑکی نے مجھے اب تک اپنا بوائے فرینڈ بنانا
پسند نہیں کیا تھا۔

میڈیکل کے شعبے میں میری سب سے بڑی خاصیت
مریض کے درد کی شدت کو کم کرنا تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں
کہ بچپن سے ہی مجھے دماغ کی صلاحیتوں کو سمجھنے اور استعمال
کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں نے میڈیکل میں بھی اسے
استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ طالب علمی کے دوران میری
پریکٹس جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں کالج سے
فارغ ہوا تو درد کم کرنے کے لیے دوا کے ساتھ ساتھ اپنے
طریقے کو بھی استعمال کرنے پر قدرت حاصل کر چکا تھا۔
میں انٹرویو کرنے والوں کو یہ سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کرتا کہ
ہم دماغی صلاحیتوں کو دوا کے ذریعے استعمال کر کے مریض کو
بہت کم وقت میں فائدہ پہنچا سکتے ہیں مگر کوئی میری بات کو
سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ ایک صرف میں ہی تھا جو اپنی اس
لیاقت کے بارے میں پراعتماد تھا اور نہ... میں کئی جگہ انٹرویو
دینے گیا مگر ہر جگہ ناکامی میرا مقدر بنی۔ اُس وقت تو مجھے خود
کو مسترد کیے جانے کی ٹھوس وجہ معلوم نہیں تھی مگر اب سوچتا
ہوں تو وہ وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ میری ناکامی کا بنیادی سبب
میرے خیال میں میرا حلیہ تھا۔ میں کہیں سے ڈاکٹر نظر نہیں آتا
تھا حالانکہ میں ڈاکٹر تھا۔ اس کے برعکس جو میں نہیں تھا، وہ
سب کو نظر آتا تھا۔ شکن دار سوٹ، سلوٹ پڑی مسلی قمیص،
کوٹ، ٹائی اور چٹلون ایک دوسرے سے قطعی
مختلف... جسمانی خدو خال سے میں لڑائی بھڑائی کرنے والا
لگتا تھا اور لباس سے کسی برگرشاب کا ویزر۔

ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کافی عرصے جاری رہی
مگر ناکامی نے ہر جگہ میرا راستہ روکا۔ آخر میری ہمت جواب
دے گئی اور بہت سوچ و بچار کے بعد میں نے اپنا نئی کلینک
کھولنے کا فیصلہ کیا۔ پیسے بچے نہیں تھے مگر پھر بھی جیسے تیسے
کر کے میں نے کلینک کھول ہی لیا۔ بے روزگاری میں کافی
بڑی سرمایہ کاری کی تھی۔ میرے نزدیک کامیابی کی صرف
ایک وجہ تھی اور وہ بھی میری خاص قابلیت کہ مریض کو کس طرح

کم سے کم دوا استعمال کروا کر درد سے چھٹکارا دلایا جاسکتا
تھا۔ امید تھی کہ دو چار سال میں کلینک جم جائے گا۔ اسی لیے
جیسے تیسے کر کے کام چلاتا رہا۔ کلینک کا کرایہ، ٹیکس، اپنے
اخراجات اور پھر کلینک کی واحد ملازمہ کینسولا کی تنخواہ کو کہہ
بہت کم تھی مگر پھر بھی مہینے کے آخر میں ان سب اخراجات کو
پورا کرتے کرتے مجھے دانتوں پسینا آ جاتا تھا مگر سب کچھ
صرف امید پہ چل رہا تھا۔

شروع شروع کے مہینوں میں کلینک پر بہت کم مریض
آتے تھے۔ زیادہ تر وہ تھے جن کا پیشہ یہ گزارا تھا اور
معروف ڈاکٹروں کی بھاری فیسیں ادا کرنے کے قابل نہ
تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے کہ جن کا مرض پرانا تھا اور وہ شفا کی
تلاش میں ایک کے بعد ایک ڈاکٹر آزمائے جا رہے تھے۔
ان سے زیادہ فیس وصول کرنے کا امکان ہی نہیں تھا۔ اس
لیے جو ملتا، صبر شکر کر کے پکڑ لیتا تھا لیکن ایک بات ضرور تھی،
میرے کلینک پہ جو آتا، شروع شروع میں تو اسے اعتبار نہیں
ہوتا تھا مگر جب بہت جلد افاقہ محسوس ہوتا تو میرا گردیدہ
ہو جاتا تھا۔ کسی معروف ڈاکٹر کو بتایا میر جنسی کے فون کو تو کم
از کم تین دن بعد کا اپائنٹمنٹ ملتا ہے مگر میرے ہاں ابھی فون
کر دو، گھنٹا بھر بعد آ جاؤ۔ گوکہ مریضوں کی تعداد بہت ہی کم تھی
مگر پھر بھی میں نے تمام تکلفات کیے ہوئے تھے۔ ایسا نہیں
تھا کہ مریض پہنچا اور سیدھے میرے کمرے میں بلکہ پہلے وہ
استقبال پر پہنچتا، کوائف درج کرواتا۔ اس کے بعد کینسولا
مریض کی فائل تیار کرتی جس کے بعد اسے وینٹ روم میں
کچھ انتظار کرنا پڑتا تھا، تب کہیں جا کر وہ میرے پاس آتا۔
دیسے سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی سوچتا تھا کہ وینٹ روم کا
تکلف کس لیے...؟ مگر یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آئی
تھی۔ وینٹ روم عموماً مریضوں سے خالی رہتا تھا۔

بچ پوچھو تو میری زندگی میں جتنی ناکامیاں آئی تھیں، وہ
کسی بھی شخص کو یہ آسانی خود کشی پہ آکسائی نہیں مگر جم اور
کسرت نے نفسیاتی طور پر مجھے بہت سہارا دیا تھا۔ میں ہفتے
کے چھ دن باقاعدگی سے جم کی کلاسیں اینڈ کرتا تھا۔ اس سے
مجھ میں اعتماد آیا۔ برے حالات سے لڑنے کی طاقت آئی
ورنہ تو میں کب کا حوصلہ چھوڑ دیتا۔ دوسری بات میرا اطمینان
تھا۔ مریض آئیں یا نہ آئیں مگر میں اپنے مقررہ وقت پر
کلینک پہنچتا اور طے شدہ وقت تک بیٹھتا تھا۔ مجھے کم از کم اتنا
توفیق تھا کہ اپنی کوشش پوری کر رہا ہوں اگر اس کے بعد بھی
ناکامی مقدر بنتی ہے تو اس میں میرا نہیں کسی اور چیز کا قصور
ہوگا، شاید قسمت... سب کچھ کرنے کے باوجود اگر صلہ نہ

ملے تو پھر قسمت کو ذمے دار ٹھہرایا جاسکتا ہے۔
میں نے کسرت کر کے اپنی جسمانی حالت بہت بہتر
بنائی تھی۔ پر میری زندگی محبت سے خالی تھی۔ ذرا جسمانی
حالت بہتر ہوئی تو میں نے کئی لڑکیوں پہ دوڑے ڈالنے کی
کوشش کی مگر ہر بار جس لڑکی کے قریب ہونے کی کوشش کی وہ
چکنی پھلی کی طرح پھسل کر کسی اور کے جال میں پھنس گئی۔
اب تو میں نے بھی خود کو کسی حد تک سمجھالیا تھا کہ فی الوقت اس
دنیا میں کوئی لڑکی میرے لیے نہیں۔

☆☆☆

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ تلاشی جاری تھی۔
انہوں نے ہر شے الٹ پلٹ کر دی تھی۔ کمرے کو کھنگالنے
والے پولیس انسپرائڈی نے جب سے مجھے وارنٹ تھمائے
تھے، تب سے تیسرے وارنٹ کو دیکھتے ہی میری جو حالت
غیر ہوئی تھی، وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکی تھی۔ بلڈ پریشر بڑھ
گیا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ کان کی لویں، سر اور چہرہ
تھمتانے لگا تھا یہ سوچ کر کہ کینسولا... میں نے وارنٹ پڑھ
کر ایڈی کو دالہیں کر دیا تھا مگر جو دھچکا مجھے تیسرے وارنٹ کو
دیکھ کر لگا وہ بہ دستور پریشان کیے ہوئے تھا۔ ”شکر یہ۔“ میں
نے ایڈی کو وارنٹ کی فائل لوٹاتے ہوئے کہا تھا۔
”کوئی بات نہیں۔“ اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ
میرے چہرے کو یہ غور دیکھ رہا تھا۔

اس کے دیکھنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ماتھے
پسینا نمودار ہو چکا ہے۔ شاید اس پسینے کو دیکھ کر ہی پولیس والا
منظمین ہوا ہوگا کہ یہ گھبراہٹ کی نشانی ہے اور انہیں کوئی دھماکے
دار ثبوت ملے گا۔ شاید اسی وجہ سے وارنٹ واپس لیتے وقت
اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی، جس سے اس کی
بڑی بڑی مونچھوں میں بھی ہلکی سے جنبش ہوئی تھی۔

وہ بہ دستور کمرے کی تلاشی میں مصروف تھے لیکن اُن
کے چہروں کو دیکھ کر یہ نہیں لگتا تھا کہ اب تک کوئی خاص چیز
انہیں مل سکی ہے۔ یہ بات میرے لیے اطمینان کا باعث تھی۔
اس دوران میں بہ دستور انہیں دیکھتا ہوا گودام کے بارے میں
سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنے خلاف تمام ثبوت مٹانے کے لیے
صرف پندرہ منٹ چاہیے تھے۔ یہ بہت زیادہ وقت نہیں تھا مگر
اس صورت حال میں یہ موقع ملنا بھی محال تھا۔ دل چاہتا تھا کہ
تیزی سے اٹھوں، کمرے کی کٹڑی چڑھاؤں۔ بھاگ کر
یہاں سے نکل جاؤں اور ہر وہ شے تلف کر دوں جو میرے
خلاف ثبوت بن سکتی ہے۔ مجھے صرف پندرہ منٹ چاہیے تھے
مگر... یقین نہیں تھا کہ جو سوچ رہا ہوں ویسا کر بھی سکوں گا۔

دفتر اور گھر، ان کی تلاشی پہ مجھے کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی کوئی خوف مگر گودام... یہ خطرے کی بات تھی۔ پولیس والے جب اس گودام کی تلاشی لیتے تو میرا پھنسا بیٹنی تھا اور آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آگئی۔ میرے خیال میں یہ ترکیب کارگر ہو سکتی تھی مگر پولیس کے سامنے نہیں، جج کے روبرو۔ مجھے اپنی چال کا رُخ پچ عدالت میں کھیلنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گودام سے مکمل لاطعلق ظاہر کروں گا۔ مجھے پولیس سے بچنا محال نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے ممکنہ گرفتاری کے بعد عدالت میں پیشی کے حوالے سے لائحہ عمل تیار کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ جج کہوں گا تو مروں گا، اسی لیے جھوٹ سے کام لینے کا پکا جہیز کر لیا تھا۔

”جناب والا یہ گودام میرا ہے اور نہ ہی اس میں رکھی کسی شے سے میرا کوئی تعلق۔ یہ تو میرے نام پر بھی نہیں پھر میں کیسے اس میں موجود کسی شے کے باعث مجرم بن سکتا ہوں۔“ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جب مجھے جج کے روبرو پیش کیا جائے گا تو کس طرح اپنا دفاع کروں گا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دیگیل پولیس کیس کو کمزور کر دے گی۔

گودام میرے استعمال میں تھا اور اکثر مجھے اس کی ضرورت رہتی تھی۔ جج کے روبرو اس کی ملکیت سے انکار صرف جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ یہ گودام اس بات کا ثبوت تھا کہ پچھلے چند سالوں میں میری زندگی نے کس طرح اپنا رخ بدلا تھا۔ ویسے اس گودام اور میری ترقی، دونوں کا تعلق میرے تن بازی کے شوق اور جسم سے جڑا تھا۔

بات یہ ہے کہ جب شروع شروع کے دنوں میں، کلینک سے اٹھ کر جم جاتا تھا تو وہاں میری ملاقات ایک موٹے، مجددے اور بڑی عمر کے شخص اشین سے ہوئی تھی۔ وہ بہ ظاہر جوس بیٹا تھا مگر یہ پورا سچ نہیں تھا۔ وہ ورزش کے لیے آنے والے ایک تھکیش کو ایسی ممنوع ادویات بیچتا تھا جس سے اُن کا اسٹیمنا بڑھتا تھا لیکن یہ طور ڈاکٹر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اسٹرائیڈز کا استعمال زیادہ مقدار میں کافی عرصے تک کیا جائے تو اس سے صحت پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ ایسے اثرات جو جان لیوا بھی ہو سکتے ہیں۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ایک ڈاکٹر کس طرح ایسی ادویات کے استعمال کی اجازت دے سکتا ہے یا وہ خود انہیں استعمال کر سکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر اسٹرائیڈز کا محتاط استعمال کیا جائے تو نہ صرف کھلاڑی کھیل میں اچھی کارکردگی دکھا سکتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے کسی مریض کے درد کی شدت میں بھی فوری کمی بھی لائی جاسکتی ہے۔ اسٹرائیڈز کا استعمال ایملیٹ، تن

سازی سمیت تمام کھیلوں میں ممنوع ہے۔ حتیٰ کہ کھلاڑی کوئی اعزاز حاصل کر لے اور بعد میں ڈوپ ٹیسٹ سے اسٹرائیڈز کا استعمال ثابت ہو تو نہ صرف اعزاز واپس لے لیا جاتا ہے بلکہ وہ کھلاڑی بلیک لسٹ بھی کر دیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود چوری چھپے استعمال جاری ہے۔ جوس فرد اشین جسے سب اُنکل کہتے تھے، جم آنے والے تن سازوں اور پیشہ ور تھکیش کو چوری چھپے ممنوع ادویات فروخت کرتا تھا۔ یہ بات میں بھی جان چکا تھا۔ ویسے اشین بہت محتاط شخص تھا۔ وہ ہر ایرے غیرے کو ادویات بیچنے سے کتراتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ راز کھلا تو اسے جیل جانا پڑے گا۔ وہ اتنا محتاط تھا کہ اس کے صرف چند مستقل گاہک تھے اور کسی ایک کو دوسرے کو بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

اُنکل اشین نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنے ڈبل پتلے جسم کو بہتر بنانے، سینے کو چوڑا کرنے، بازوؤں کی پھلیوں کو پھلانے کے لیے میں کچھ دن ان ادویات کو استعمال کروں۔ میں ڈاکٹر تھا۔ اُنکل جس شے کا مشورہ دے رہا تھا، اس کا کیمیائی اثر جانتا تھا۔ آخر کافی سوچنے کے بعد میں نے اسٹرائیڈز کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی سائڈ ایفیکٹ ہوا تو میں خود اپنا علاج کر لوں گا۔ چند ہفتوں کے استعمال سے ہی فرق ظاہر ہونے لگا۔ میں بہت خوش تھا۔ بازوؤں کی پھرتی پھلیاں، چوڑا سینہ، تپتی ہوئی گردن... میرا جسم بھرتا جا رہا تھا۔ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب کسی بار میں جا کر ناچتے ہوئے میں اپنی شرٹ اتار کر ہوا میں اچھال سکتا ہوں۔ میں نے دیکھا تھا کہ بار میں آنے والی لڑکیاں تن ساز لڑکوں کو بہت پسند کرتی تھیں۔

اسٹرائیڈز کسی ایک خاص دوا کا نام نہیں۔ یہ طور ڈاکٹر میرا علم اسٹرائیڈز کے بارے میں اُنکل اشین سے بہت زیادہ تھا۔ جب ان کے استعمال سے مجھے اپنے اندر واضح تبدیلیاں نظر آئیں تو رفتہ رفتہ میں نے اپنے مریضوں کو بھی اس کا استعمال کرانا شروع کر دیا۔

ادھر تو یہ سب کچھ ہو رہا تھا، دوسری طرف میری جسمانی تہذیبی نے جم کے ٹرینروں کو ہی نہیں، وہاں مجھ سے پہلے آنے والے کئی لوگوں کو بھی سخت حیران کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب میں پہلی بار آیا تو کتنا نحیف تھا مگر جتنی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں، وہ سب کے لیے حیران کن تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ سب اس بارے میں سوچ رہے تھے مگر مجھ سے بات کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہ تو جانتے تھے کہ میں ڈاکٹر ہوں اور کلینک چلاتا

ہوں اس لیے شاید وہ یہ سوچتے ہوں کہ میں نے اسٹرائیڈز کے بجائے کسی اور خاص دوا کے استعمال سے اپنا وزن اور اسٹیمنا بڑھایا ہے۔

”تمہارا اسٹیمنا تو بہت شاندار ہے۔“ اُس روز ورزش کرتے ہوئے ٹرینر نے جب میری تعریف کی تو اس کی آنکھوں میں سوال بھی پوشیدہ تھا۔ ”لگتا ہے تم نے اپنے لیے کوئی خاص نسخہ تیار کیا ہے۔ کر سکتے ہو بھی، ڈاکٹر جو ٹھہرے۔“ یہ ظاہر اس نے دوستانہ لہجے میں یہ بات کہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ جس تھا کہ اتنی قلیل مدت میں یہ تہذیبی کیسے آئی تھی مگر پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اسی لیے گول مول بات کہی تھی۔ میں نے بھی جواب دینے کے بجائے صرف مسکراتے پر ہی اکتفا کیا۔

جب سے میں نے اپنے مریضوں کو اسٹرائیڈز ملی گولیاں اور شربت پلانا شروع کیا تھا، اُس سے انہوں نے اپنی زندگی میں خوشگوار تبدیلیوں اور پُرسرت احساسات کا اظہار کیا تھا۔ میرے مریض زیادہ تر وہ بوڑھے جوڑے تھے جو جسم کے جوڑوں کے درد، کمزوری اور اسی طرح کے بڑھاپے کے دیگر امراض کا شکار تھے۔ کئی جوڑوں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ دوا کے استعمال کے بعد اب اپنی ازدواجی زندگی میں وہی پرانے جذبات ایک بار پھر محسوس کرنے لگے ہیں جو نو جوانی کے عالم میں تھے۔ وہ خوش تھے کہ انہیں مرض میں افاقے کے ساتھ ساتھ جذباتی تازگی یونس میں مل گئی تھی۔ بس! پھر کیا تھا، میری شہرت پھیلنے لگی۔

بہت جلد میرے پاس کافی تعداد میں مریض آنے لگے تھے۔ کمائی اچھی ہو گئی تھی۔ یہ اور بات کہ میں جو کچھ کر رہا تھا وہ غیر قانونی تھا۔ میری ادویات کا طویل عرصے تک استعمال مضر صحت تھا۔ مریضوں کے جگر ناکارہ ہو سکتے تھے، دل کا دورہ پڑنے کا خطرہ تھا۔ گردے کام کرنا چھوڑ سکتے تھے مگر مجھے کیا... مجھے تو زندگی میں پہلی بار کامیابی مل رہی تھی۔ کامیابی اور زندگی میں پہلی بار، اس نئے نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ نہ ہی انسانیت یا درہی اور نہ ہی قانون کا ڈر۔

ایک دن میں حسب معمول کلینک پہنچا کہ ایک فون آیا۔ میں نے اسے فوراً سمیٹ کر پیر کا نام دے دیا۔ جب وہ آیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ یہ ظاہر وہ مضبوط ہاتھ پاؤں والا تھیں پینتیس سال کا مرد تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، اس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ اسے نہایت جی جسم کی تکلیف تھی۔ میں نے اس کے ہکٹ ٹیسٹ لیے اور پھر پتا چل گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ یہ ظاہر وہ صحت مند تھا مگر جذباتی لحاظ سے کمزور تھا۔ میں اس کی کمزوری کا

راز جان چکا تھا۔ ”تمہیں بہت ہی خاص دوا دوں گا۔“ میں نے ٹیسٹ رپورٹس پڑھنے کے بعد آہستہ سے اُس کے کان میں کہا۔ ”تمہاری ساری مشکل دور ہو جائے گی۔“

”کیا...“ اس نے مجھے خوش گوار حیرت سے دیکھا۔ واقعی... میں نے یقین سے جواب دیا۔

میں نے اسے خاص دوا دی اور پھر ایک ہفتے بعد آنے کو کہا۔ وہ مقررہ دن پہنچا تو اس کا چہرہ خوشی سے تھم رہا تھا۔ ”تمہیں یہ علاج مستقل جاری رکھنا ہوگا۔“ میں نے اس کی رُو داد سن کر کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ نیو جرسی پولیس ڈیپارٹمنٹ کا ایک افسر تھا۔ اُس کے بعد میرے پاس کئی پولیس والے آئے لیکن مریض بن کر۔ سب محتند اور مضبوط جسم و جاں کے مالک تھے لیکن ان سب کا مرض ایک ہی تھا، وہی جو میرے پہلے پولیس والے مریض کو لاحق تھا۔ سب مرد پولیس والوں کو میری دوا سے خاصا افاقہ ہوا۔ اُن کی معرفت بعد کے دنوں میں کئی مریض آئے۔ اسٹرائیڈز بیماری کا علاج نہیں مگر یہ بات میں جانتا تھا وہ نہیں۔ سو، جو ایک بار میرے پاس آیا، وہ بار بار آتا رہا۔ میرا دھند اٹھک ٹھاک چل رہا تھا۔

جب سے پولیس والے میرے پاس آنا شروع ہوئے تھے، تب سے میں اُن کا بہ غور تجزیہ کر رہا تھا۔ اس سے تین ہاتھ سمجھ میں آئیں۔ اول تو یہ کہ کچھ جوان پولیس والے پیشہ ور تن سازوں کی طرح اپنے سسٹز بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔ دوسرا یہ کہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے انہیں بھاری میڈیکل انشورنس حاصل تھی، جس کی وجہ سے علاج و معالجے پر خرچ کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ تیسری قسم اُن بوڑھے پولیس والوں کی تھی جو عمر کے اس حصے میں نہ تو بہرہ کی طرح اپنا جسم بنانے کے خواہشمند تھے اور نہ ہی کارکردگی دکھانے کے قائل۔ میرے پاس آنے کی وجہ ایک ہوتی تھی یعنی ڈھلتی عمر میں مردانگی برقرار رکھنے کا نسخہ۔ تو ایسے میں میرے لیے بھی دل کھول کر نسخہ لکھنے اور بھاری فیس وصول کرنے میں کوئی مذاق نہیں تھا۔

کلینک کھولے دو سال ہو گئے تھے اور اس دوران شروع کے پانچ چھ ماہ چھوڑ کر میرا دھند اترتی کی منازل طے کرنے لگا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پہلے میں سوچتا تھا کہ مریضوں کے لیے ویٹنگ روم کی ضرورت نہیں تھی مگر اب وہ مجھے چھوٹا لگنے لگا تھا۔ پہلے کہیں سولہ بجے دن کا بیشتر وقت کھیاں مارنے میں گزار دیتی تھی مگر اب اس کی مدد کے لیے ایک کل

نام کلرک موجود تھا جو مریضوں کا ریکارڈ رکھتے، بلوں کی تیاری اور اس طرح کے دوسرے کاموں میں اُس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ کلینک اسٹن زور و شور سے چل رہا تھا کہ اکثر میں مقررہ وقت کے بعد بھی کلینک پر رہتا، حتیٰ کہ چھٹی کے دن بھی کئی گھنٹے مریضوں کے معائنے میں گزار دیتا تھا۔ اس محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے بہت جلد پرانی کار سے چھٹکارا حاصل کیا۔ نئی سیلون سوک کار خریدی، دریائے ہڈن کے کنارے ہاکیون کپلیکس میں چڑا سائش گھر بھی خرید لیا تھا۔ دریا میں ہیر کے لیے میں نے پینتیس فٹ لمبی چڑا سائش کشتی خرید لی تھی۔ دو سال کے اندر ساری کا یا پلٹ گئی تھی۔

نئے دوست، نیا شہر، نئے کلب، نئی زندگی اور خرچ کرنے کو بے تحاشا پیسا۔۔۔ اب میں خود کو کامیاب انسان سمجھنے لگا تھا۔ میری ساری کامیابیوں کا سہرا جم اور انکل ایشین کے سر تھا۔ کامیابی کا نسخہ تو مجھے وہیں سے ملا تھا۔

دولت میرے پاس تھی پر ماضی کی محرومیاں اور تنہائی برقرار تھی جنہیں بھلانے کے لیے میں عیاشی میں پڑ گیا۔ اسی دوران میری ملاقات ایک نہایت خوبصورت لڑکی سے ہوئی۔ یہ اونچے طبقے کی دلدادہ تھی۔ وہ بیس بال کے بڑے بڑے ٹورنامنٹ میں چیئر لیڈر کے طور پر بھاری معاوضہ لے کر اچھل کود کرتی تھی۔ میری اُس کی ملاقات ایک کلب میں ہوئی اور اسی وقت میں نے آئسڈ ویک اینڈ کے لیے اُسے ساتھ لے کر لاس ویکاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بھی مان گئی۔ ہم دونوں نے وہ ویک اینڈ لاس ویکاس میں گزارا۔ نہ جانے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ میں نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی رضامندی کی وجہ میں جانتا تھا، بہت دولت تھی میرے پاس۔

شادی کے فوراً بعد میں نے میری اسٹون کے پوش علاقے میں ایک لاکھ تیس ہزار ڈالرز کا منی مینشن خرید لیا۔ لیزا بہت خوش تھی۔ وہ جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی، وہ میں اسے دے سکتا تھا۔ ہم دونوں بڑے عیش سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

شادی کیے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک پولیس افسر کے ذریعے میرا رابطہ مقامی دواساز کمپنی سے ہوا۔ اُس کمپنی نے جنسی ادویات کی ایک بہت بڑی کمپ جیم سے درآمد کی تھی۔ انہیں ایسے ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو اُن سے تعاون کرے۔ اس کے لیے مجھ سے زیادہ مناسب آدمی انہیں نہیں مل سکتا تھا۔ کمپنی نے مجھ سے معاہدہ کر لیا کہ میں دوا کا نسخہ لکھوں گا اور مریضوں کو تاکید کروں گا کہ وہ صرف اُنہی کی فارمیسی سے دوا خریدیں۔ معاہدہ طے پاتے ہی مجھے دو لاکھ ڈالرز پیشی مل

گئے۔ مجھے یقین تھا کہ چند مہینوں میں ہی انہیں مزید رقم ادا کرنا پڑے گی۔ وہ جو چاہتے تھے، میں اُس کام کا ہاتھ تھا۔

چینی دوا اگرچہ بہت سستی مگر زود اثر تھی۔ میں نے کچھ مریضوں کو یہ استعمال کروائی۔ انہیں بہت فائدہ ہوا۔ میں نے زیادہ پیسا کمانے کی لالچ میں وہ دوا براہ راست جیم سے درآمد کی اور اسے ذخیرہ کر لیا۔ میں اپنے دوستوں، معاف کیجیے گا مریضوں کو بنا کسی نسخے یا ریکارڈ میں اس حوالے سے کیفیت درج کیے بغیر یہ دوا بیچتا رہا۔ امریکا میں نسخے کے بغیر دوا کی فروخت قانوناً جرم ہے مگر میں سب کچھ کر رہا تھا۔ جس نے بھی وہ دوا استعمال کی، اگلی بار مزید لینے آیا۔ میرے مریضوں کی تعداد ہزاروں میں تھی اور صرف چار سالوں میں میرا دھندا کہیں سے کہیں پہنچ چکا تھا۔ میرے گودام میں اس طرح کی دواؤں کی بھاری مقدار موجود تھی۔ یہ سب کی سب غیر قانونی طریقے سے منگائی گئی تھی جس کی درآمد کا کوئی ریکارڈ یا قانونی جواز موجود نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ امریکی قانون میں بھی ان دواؤں کی حیثیت غیر قانونی ہوگی۔

میرے اسٹاف میں اب کئی لوگ شامل تھے مگر میں ان میں سے کسی پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ کوئلے کی دلائی میں ہاتھ کالے ہوتے ہی ہیں۔ کبھی بھی پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے بڑی چالاکی سے جعلی نام پر گودام خرید لیا تھا۔ وہاں بھاری مقدار میں غیر قانونی جنسی اشتہا بڑھانے کی درآمدی ادویات موجود تھیں۔ پہلے تو میں نے کوشش کی کہ خود گودام کا انتظام سنبھالوں مگر ایک مشکل تھی، کلینک میں مصروفیات بہت تھیں اور گودام کو سنبھالنا بھی وقت طلب کام تھا۔ کینسولا کئی سال سے میرے پاس کام کر رہی تھی اس لیے میں نے گودام میں موجود ادویات کے انتظام کی ذمہ داری اسے سونپ دی۔ میرے خیال میں وہ بہت سادہ بلکہ بڑی حد تک پختہ تھی مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ وہ ہرگز بے وقوف نہیں تھی۔ یہ احساس مجھے اُس لمحے ہوا تھا جب پولیس افسر نے وارنٹ مجھے تھمائے۔ کینسولا کے سوا، گودام کے بارے میں کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی مگر پولیس یہ بات جان چکی تھی۔ کلینک اور گھر کے بعد وہ گودام کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ یہی میری سب سے بڑی پریشانی تھی مگر پھر بھی... میرے شیطانی دماغ میں بچاؤ کا نسخہ آ گیا تھا۔ یعنی عدالت میں گودام سے لاتعلقی کا بیان۔

☆☆☆

میں نے کن انکھیوں سے پولیس افسران کو دیکھا۔ وہ نہایت باریک بینی سے ہر چیز کی تلاشی لینے میں مصروف

تھے۔ میں آگے جھکا اور کمپیوٹر مانیٹر آن کر دیا۔ استقبال خانہ پر کینسولا کا غذات الٹ پلٹ رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ تھوڑا سا پریشان مگر وہ بھی مگر ایسا نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس غیر متوقع صورتحال نے اسے شدید پریشان کیا ہو۔ استقبال مریضوں سے خالی تھا۔ صرف دو تین پولیس والے فائلوں کی پڑتال کر کے انہیں سٹاک کے بڑے بڑے ڈبوں میں بند کر رہے تھے۔ کینسولا ان کی مدد کر رہی تھی۔ ”کیا کینسولا نے مجھ سے غداری کی ہے؟“ میں نے دل میں کہا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ پولیس کے آنے کے بعد وہ پریشانی کے عالم میں سر پکڑ کر بیٹھی ہوگی مگر وہ تو پولیس والوں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

میں نے کینسولا کو اُس وقت ملازم رکھا، جب میں استقبال کلرک نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس وقت میری آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی، اسی لیے میں بے شمار کوتاہیوں کے وجود اسے برداشت کرتا رہا مگر میرے حالات بہت جلد بدل گئے۔ اُس وقت میں نے کئی بار اسے ملازمت سے فارغ کرنے کا سوچا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جو تنخواہ وہ لیتی ہے وہ سمندر میں گھاس بھر پانی کے برابر ہے۔ میں نے اسے ناراض کر دیا تو نہ جانے بے چاری کب تک بے روزگار رہے گا۔ مگر اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اُس وقت ایسا نہ کر کے دی غلطی کی۔ یہ ظاہر کینسولا میری وفادار تھی اور وہ یہ بات انکل جتانی بھی رہتی تھی مگر اب... اس کی وفاداری پر سوالیہ نشان لگ چکا تھا۔ میرے ذہن میں وہ وہ کرسولات مرقعہ ہرے تھے۔

☆☆☆

میرے کمرے کی تلاشی مکمل ہوئی تو دو پولیس والے میرے سامنے والے صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔ اس دوران ایک اور شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اسے میں مانیٹر پر دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹی پرائیویٹ کار میں اُن کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے کار سے باہر نکلتے وقت اپنے مانیٹر پر بھی اسے دیکھا تھا۔ ”مجھے یہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ بیک وقت نیوجری پولیس اہلکار منٹ کے سیکڑوں پولیس افسر ہارمونز کی ایک جیسی ہارمون کا شکار کیوں کر ہوئے؟“ اس کا تعلق انشورنس کمپنی سے تھا۔ ”مجھے سخت حیرت ہے کہ چار سال میں پولیس والوں کی ہارمون اتنی تیزی سے بھٹی گئی کہ ہم توجہ دے بغیر نہ رہ سکے۔“ سب بات ہے کہ ایک جیسی بیماری، ایک جیسی دوا اور ایک ہی مانیٹر... یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور میری آنکھوں کے سامنے اس کے چند نسخے چھڑائے۔ ”یہ تمہارے ہاتھ کے ہی

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جیونٹیاں

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ نے خدا سے عرض کیا۔ ”اے الہی جس شہر کے لوگوں نے تیری نافرمانی کی ہو جب تیرا عذاب اس شہر پر نازل ہوتا ہے۔ تو تو سارے شہر کو ہلاک کر دیتا ہے حالانکہ اس میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔“ حضرت موسیٰ کو گریہ محسوس ہوئی اور آپ ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے، پھر آپ کو نیند آئی اور وہیں سو گئے۔ درخت کے پاس چیتھوں کا مسکن تھا ایک چیتھوں کے کانٹے سے حضرت موسیٰ جلال میں اٹھے اور اپنے قدم سے ساری چیتھوں کو مسل ڈالا۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اے موسیٰ تمہیں کاٹا تو ایک چیتھوں نے تھا۔ مگر اس کی پاداش میں سب گئیں۔“ خدا تعالیٰ نے پھر فرمایا۔ ”میرا عذاب مطیع و عاصی دونوں پر آتا ہے مگر عاصی کے لیے تو عذاب ہی ہوتا ہے مگر مطیع کے لیے رحمت برائے آخرت ہوتا ہے۔“

مرسلہ: وزیر محمد خان، نعل ہزارہ

لکھے ہوئے ہیں نا؟“

میں نے اثبات میں خفیف سا اشارہ کیا۔ ”قاریسی انتظامیہ سے بھی پوچھ کچھ ہو رہی ہے۔“ پولیس انسپریڈی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہڈن کنٹری آفس کے تفتیش کاران سے پوچھ کچھ کر رہے ہیں۔“ میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نیوجری پولیس ڈیپارٹمنٹ کے متحد افسران اور اہلکاروں کو ذاتی طور پر جانتا تھا مگر میرے کلینک پر اس وقت جو پولیس والے ذمہ دار تھے۔ پھر رہے تھے، وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔

”سر... ایک پولیس والا کمرے میں داخل ہوا اور ایڈی کو مخاطب کیا۔ ”ریکارڈ ڈبوں میں بند کر کے سر بھر کر دیا ہے... اب چلیں؟“

”ہمیں گودام کی تلاشی لینا ہے اور گھر کی بھی۔“ ایڈی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”نی الحال ہمیں یہاں سے کوئی مشتبہ چیز نہیں ملی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ میری طرف جھکا۔ ”میرا نام ایڈی ہے اور میں سخت گیری میں بدنام ہوں۔ بہتر ہے کہ جب تک پولیس آپ کو کلیر نہ کرے، تب تک آپ شہر سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔“

میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والے جا چکے تھے۔ مریضوں کو تو



برجستہ اور بروقت فیصلے کرنا ایک ایسا

کمال ہے جس پر ایک کی دسترس ممکن

نہیں... اور جسے یہ ہنر آتا ہو وہ واقعی

باکمال ہوتا ہے مگر... یہاں جس دوراہے پر یہ

کردار کھڑے تھے وہاں سے کہانی کو ایک ایسا

موڑ لینا تھا، جس کے بعد کسی کی زندگی

پچھتاوؤں کا مظہر ٹھہرتی اور کوئی

پرچھاٹیوں کے پیچھے بھاگتا اور ان دونوں

صورتوں میں ایک کسک ہمیشہ تعاقب

میں رہتی، لیکن ان تمام کرداروں کے

درمیان کوئی ایک تو ایسا بھی تھا

جس کے من کی مراد برآتی۔

طاہر جاوید

دور

سکھتے جذبیوں اور بے کل محبت کی اوموری داستان

والدہ سب سے جا بجا چھوڑ گئے تھے۔ ایک چھوٹی بہن

اور کے سوا دنیا میں میرا اور کوئی نہیں تھا اور اگر دو چادر شے

دار تھے بھی تو وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ لہذا جو بہن ار سہ کی

شادی ہوئی میں سب کچھ چھوڑ کر یورپ کی میر کو نکل گیا۔

شروع میں یہ پردہ گرام پانچ چھ ماہ کا تھا لیکن آزادہ بے فکر اور

تنہا زندگی کا کچھ ایسا مزہ آیا کہ میں اگلے قریب ڈیڑھ برس تک

پاکستان سے بالکل لا تعلق بنا۔ یورپ اور امریکا کے دور دراز

علاقوں میں گھومتا رہا۔ میرے پاس جو موبائل فون تھا اس کا

نمبر صرف اور صرف میرے ٹیجر سلطان بخاری کے پاس تھا۔

میری ہدایت کے مطابق ان ڈیڑھ برسوں میں بخاری

سینسٹرس ڈائجسٹ 61 مئی 2012ء

میں ہسپتال ہاتھ میں لے کر اس کو تول رہا تھا۔ کینسولا بہ
دستور نظریں نیچی کیے بیٹھی تھی۔ جس طرح وہ بیٹھی تھی، اس سے
تو میں بھی سمجھ پایا کہ وہ پولیس کے لیے سلطانی گواہ بن چکی
ہے یا پھر اس نے انعام کے لالچ میں مجھے پھنسا دیا اور اب
شرمندگی کے مارے نظریں نہیں ملا پارہی ہے۔

میں پچھلے دو گھنٹوں سے بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ بڑے
سکون سے اٹھا۔ میرے پاؤں من ہو رہے تھے۔ یہ سب اُن
امٹرائیڈز کی بدولت ہو رہا تھا جو میں پہلے تن سازی اور پھر
حیاتی کے لیے استعمال کرتا رہا تھا۔ کئی سال سے مسلسل
ادویات کے استعمال کی وجہ سے اب میری صحت پر بھی اس
کے مضر اثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ اس وقت بھی میرا
دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میری کہنیاں جھنجھٹا رہی تھیں۔
لگتا تھا کہ بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا ہے۔ اچانک مجھے اپنے دل
میں کینسولا کے خلاف شدید نفرت کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔
اگلے ہی لمحے میں نے ہسپتال والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اس کی
کہنیاں کی طرف نال کر کے ٹرائیگر دبا دیا۔ کلک کی آواز آئی مگر
کوئی چلنے کا دھماکا نہیں ہوا۔ کینسولا بہ دستور سر جھکائے بیٹھی
تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، مگرے کا درد واہ کھلا
اور ایڈی ائمر وائل ہوا۔ وہ جاتے جاتے اپنی سخت گیری کا
خوف دلا کر گیا تھا۔

”ڈاکٹر جیسمن... گولیاں یہ رہیں۔“ اس نے اپنی پتلی
میری طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم ایسا
کر سکتے ہو اسی لیے...“ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور کینسولا کو دیکھنے
لگا۔ ”میری بہن بہت بے وقوف ہے مگر انسانیت فروش نہیں۔
تمہیں شاید علم نہیں کہ فارماسسٹ بھی ہے۔“

”کیا...!“ میں نے یہ انکشاف سن کر حیرت سے کہا۔

”مگر اس نے تو یہ بھی نہیں بتایا کہ...“

”آخری سیمسٹر میں بیمار پڑ گئی تھی دماغی بخار کی وجہ

سے۔“ ایڈی نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”اس کے بعد بے

جاری اس قابل ہی نہ رہی کہ امتحان دے سکے ورنہ آج یہ

فارماسسٹ کی ملازمت کر رہی ہوتی۔“

اچانک مجھے سینے میں درد کی تیز لہر محسوس ہوئی۔ میں نے

میز کا کونا پکڑا اور فرش پر بیٹھتا چلا گیا۔ میں ڈاکٹر تھا، سمجھ گیا

کہ دل کا دورہ پڑا ہے۔ تین بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ مجھے

یقین تھا کہ چوتھی بار دل کا دورہ جان لیوا ہوگا۔ میری آنکھوں

کے سامنے تیزی سے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں شوقی مردانگی

اور دولت کے حصول کی قیمت جان وے کر چکا رہا تھا۔

پولیس نے پہلے ہی واپس بھیج دیا تھا جبکہ اسٹاف کو میں نے
کافی دیر پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ کچھ دیر بعد کلینک میں
کینسولا اور میں تنہا رہ گئے تھے۔ اس دوران میں مانیٹر پر سی
سی ٹی وی کمرے کے ذریعے اس کا بہ خور جائزہ لینے
میں مصروف تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب کلینک میں ہم
دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے، تب میں نے انٹر کام کے
ذریعے اسے اندر آنے کا کوکھا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے
سامنے میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھی تھی۔ میز کے
دائیں ہاتھ کی اوپری دراز میں اعشاریہ چوالیس کی ہسپتال
موجودگی جسے میں ہمیشہ لوڈ رکھتا تھا۔

گودام میری ملکیت تھا مگر میں نے اس کی خریداری
کے لیے ایک جعلی شناخت ظاہر کی تھی۔ اب پولیس گودام کی
تلاشی لے گئی تو میرے خلاف انہیں سب ثبوت مل جائیں گے
مگر وہ چاہے کتنی کوشش کر لیں، میرا تعلق گودام سے ثابت
نہیں کر پائیں گے، بس خطرہ صرف ایک تھا۔ میں تو اس
گودام کی ملکیت کو چھوڑ دے، اس سے کسی قسم کے تعلق سے بھی
صاف انکار کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا مگر کینسولا... میرے بعد
وہی ایک تھی جو گودام اور میرے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے
گواہی دے سکتی تھی۔ اس کی گواہی مجھے پھنسا سکتی تھی۔
میرے بعد وہی تو ایک تھی جسے گودام میں رکھی ہر دوا کے
بارے میں علم تھا۔ گودام اور میرے درمیان تعلق ثابت
کرنے کا واحد ذریعہ کینسولا تھی۔ وہی نہ رہتی تو پھر میں اس
کیس سے کھن میں پڑے بال کی طرح باہر نکل جاتا۔

کینسولا خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں
دیکھا۔ وہ پریشان نظر آرہی تھی مگر ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اس
کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع ہو۔ ہم دونوں خاموش تھے۔

آہستہ آہستہ میرا ہاتھ ارادی یا غیر ارادی طور پر میز کی

سب سے اوپری دراز کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے آہستہ

سے دراز کھولی۔ اگلے لمحے میرا ہاتھ ہسپتال کے دستے پر تھا۔

میں اعشاریہ چوالیس کی ہسپتال کو محسوس کر سکتا تھا۔ کینسولا

نظریں جھکائے بہ دستور خاموش بیٹھی تھی۔ دراز کھلنے کی ہلکی سی

آواز پر بھی اس نے نظریں اوپر نہ اٹھائیں۔

میں نے دل ہی دل میں سارا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

کینسولا کو کوئی مار کر اس کی لاش کار کی ڈکی میں ٹھونس کر

دریائے ہڈن لے جاتا، جہاں میری کشتی کھڑی تھی۔ لاش کو

کشتی کے ذریعے سمندر کے دہانے تک لے جاتا اور پھر

لوہے کے بھاری لنگر سے لاش باندھ کر سمندر میں بہا دیتا۔

قصہ ختم ہو جاتا۔ نہ رہتا ہاں نہ بچتی بانسری۔

صاحب نے مجھ سے بہت کم رابطہ کیا اور یہ رابطہ بھی اشد ضرورت کے وقت ہی ہوتا تھا۔

یہ بہار کا موسم تھا۔ میں ان دنوں اٹلی کے شہر روم میں تھا۔ جب ایک قایم اسٹار ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے، بیڑ پینے کے دوران میں ایک تازہ بیسٹ سیلر انگلش ٹاول پڑھتے پڑھتے اچانک دل میں کچھ پرانی یادوں نے چٹکی بھری اور دماغ میں سوچ ابھری کہ اب واپس پلٹنا چاہیے۔ اکیلے پن کا مزہ بہت لے لیا۔ اب دوبارہ شاسا چہرے دیکھنے چاہئیں۔ میرے اندر بیدار ہونے والی اس کیفیت کی ایک وجہ یقیناً ماما عجیر بھی تھی۔ ماما عجیر جو میری کلاس فیلو تھی، ہم مزاج تھی، دوست..... اور یقیناً..... کچھ اور بھی تھی۔

ٹھیک پانچ روز بعد میں اپنے اطالوی دوست فریڈر، اس کی گرل فرینڈ اور گرل فرینڈ کی دوست کرشی کو الوداع کہہ کر پاکستان کے لیے واپس روانہ ہو رہا تھا۔

میں ڈیڑھ سال پہلے جس طرح خاموشی سے روانہ ہوا تھا، اسی طرح میری واپسی بھی مکمل خاموشی سے ہوئی۔ ایک ہفتے تک غیر بخاری صاحب کے علاوہ کسی کو پتا نہیں چلا کہ میں واپس آچکا ہوں اور اب لاہور کے ڈی ایچ اے میں اپنی تین کینال کی کوٹھی میں موجود ہوں۔ آٹھویں دن میں نے اپنے دو قریبی دوستوں عدنان اور مشہود سے رابطہ کیے اور انہیں آگاہ کیا کہ خیر سے بدھو گھر کو لوٹ آیا ہے اور اب اپنی واپسی کا جشن منانا چاہتا ہے۔

عدنان اور مشہود کو زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ میں انہیں لاہور کے مصافحات میں اپنے ملتان روڈ والے فارم ہاؤس میں مدعو کر رہا ہوں۔ ڈیڑھ سال پہلے تک یہی فارم ہاؤس ہم پانچ چھ کلاس فیلوز کی مستیوں خرمستیوں اور تفریحات کا مرکز ہوا کرتا تھا۔

وہ مارچ کی ایک خوشگوار دوپہر تھی، ہفتے کا روز تھا۔ ہم تین دوست فارم ہاؤس میں اکٹھے ہو گئے۔ دیر تک ایک دوپے سے گلے ملتے اور شکوے شکایات کرتے رہے۔ یہ فارم تقریباً تین ایکڑ پر پھیلا ہوا تھا۔ وسط میں دس بارہ مرلے جگہ پر میں نے ایک خوبصورت و آرام دہ کالج بنوایا تھا۔ میں لاہور سے دو ملازم ساتھ لایا تھا، وہ کالج کو کھول کر اس کی صفائی ستھرائی میں مصروف ہو گئے۔ ہم تینوں دوست نش فارم کے پاس دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے اور یادیں تازہ کرتے رہے۔ مشہود کی شادی ہو چکی تھی۔ مشہود اور عدنان نے میرے ساتھ ہی ایم بی اے کیا تھا۔ اب وہ اچھی ملازمتیں کر رہے تھے۔

حسب توقع ہماری گفتگو شروع ہونے کے چند ہی منٹ بعد ہی ماما عجیر کا ذکر چھڑ گیا۔ ماما عجیر کو ہم ماما عجیب بھی کہا کرتے تھے۔ ایسا اس کی افتاد طبع اور سیلابی پن کی وجہ سے تھا۔ وہ اپنی ہی طرز کی لڑکی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بہتے بلکہ ان کا ایک اپنا طرز فکر اور اپنا رستہ ہوتا ہے۔ یوں وہ بہت خوش اخلاق اور سوشل بھی تھی۔ ماما اور امین ہمارے ان کلاس فیلوز میں شامل تھے جو یہاں فارم ہاؤس میں آتے تھے۔ ہم لڑکے تو کئی بار رات بھی یہیں گزارتے تھے لیکن یہ لڑکیاں شام تک لاہور واپس لوٹ جاتی تھیں۔ ان میں سے امین کی شادی تو مشہود کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ماما سے میری طرح میرے دوستوں کا رابطہ بھی منقطع تھا۔ ماما ہی کی طرح ایک دوست اور بھی تھے جو کسی کے رابطے میں نہیں تھے۔

مشہود نے مجھ سے کہا۔ ”یار آصف، ایک بار تو سب کو اکٹھا ہونا چاہیے پھر مزہ آئے گا۔“

عدنان بولا۔ ”ٹھیک ہے، اگلے ویک اینڈ کا رکھ لو۔“

کوشش کرو کہ سب سے رابطہ ہو جائے۔“

مشہود بولا۔ ”ایک کی شرکت تو یقینی ہے۔ یعنی امین (ایمن) کی۔“

”بیوی کے علاوہ بھی کسی پر زور چلاؤ نا بھی۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”ماما پر تو تمہارا ہی چل سکتا تھا لیکن تم نے کبھی چلایا ہی نہیں۔ اب پتا نہیں چل بھی سکے گا یا نہیں۔“

”اگر شادی نہ ہو گئی ہو تو ضرور چلے گا۔“ عدنان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”یار اتم میں سے کسی کے پاس اس کا کوئی اتا پتا تو ہونا چاہیے تھا۔“ میں نے شپٹا کر کہا۔

مشہود بولا۔ ”اچھا ایک منٹ غمرو، میں امین کو فون کر رہا ہوں۔ اس کی ایک فرینڈ ہے کراچی میں۔ اس نے ایک مرتبہ امین کو بتایا تھا کہ اس نے ماما صاحبہ کو کراچی کے کسی شاہجگہ مال میں دیکھا تھا۔“

مشہود نے اپنی بیوی امین کو فون کیا۔ مجھ سے بھی علیک سلک کرائی۔ پھر اس سے ماما کے بارے میں بات کی۔ امین نے کہا۔ ”وہ کراچی والی فرینڈ تو دینی چلی گئی ہے۔ ہاں اس کی ایک چھوٹی بہن ہے اس سے سن گن لیتی ہوں۔ اگر اس سے رابطہ ہو تو میں تمہوڑی دیر میں تمہیں کال کروں گی۔“

امین نے تمہوڑی دیر کا کہا تھا۔ اس کی کال تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد آئی۔ وہ اپنے شوہر مشہود سے مخاطب ہو کر باہمی آواز

میں بولی۔ ”ڈارلنگ تم نے مجھ کا کراڈھا کر دیا ہے۔“

”مجھ کا کراڈھا کر؟“

”اور کیا۔ فون پر بھاگی ہوں۔ کوئی دس جگہ رابطہ کیا ہے اور نتیجہ پتا ہے کیا نکلا ہے۔؟ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شور میں۔ محترمہ ماما صاحبہ ہمیں لاہور میں موجود ہیں اور پچھلے چھ ہفتے سے موجود ہیں لیکن امین کبھی ہیں محترمہ کہ کسی سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ اس کا نمبر کھسوا رہی ہوں، خود بات کرو۔“

امین نے ایک نمبر لکھوایا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ماما کی جانی بچانی، جلتنگ بچانی آواز ابھری۔ ”بڑی جلدی یاد آگئی میری؟“

”یا تو اس کی آتی ہے جو بھولا ہوا ہو۔“

”کوئی اس سے زیادہ گھسا پتا خیر نہیں سوچا تمہیں؟“

”وہ بھی ہے لیکن بالمشافہ سناؤں گا۔ کب آ رہی ہو؟“

”آج تو مشکل ہے۔“

”تمہیں پتا ہے، ہم ہر مشکل کو آسان کرتے رہے ہیں۔“

تقریباً دو گھنٹے بعد امین اور ماما دونوں ہمارے ساتھ موجود تھیں۔ اب بھی ایک دو دوستوں کی کمی تھی پھر بھی ایک زبردست کمپنی بن چکی تھی۔ اب سائے لے لے ہونے لگے تھے۔ تمہوڑی سی خشکی بھی بڑھ گئی تھی، ہم کالج کے اندر آ گئے۔ دوسری منزل سے دور تک ہریالی اور درخت دکھائی دیتے تھے۔ باتیں شروع ہوئیں تو فوراً ہی ایک اور موضوع زیر بحث آ گیا۔ سب سے پہلے مشہود نے ہی ذکر چھیڑا۔

”ہاں بھی، کسی کو آرزو صاحب کی بھی کوئی خبر ہے یا نہیں؟ جناب جیتے ہیں، مرتے ہیں یا ان دونوں حالتوں میں نہیں ہیں۔“

”واقعی یار، ہم نے تو پلٹ کر ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اپنی مرضی سے مکمل شروع کیا اور اپنی مرضی سے ہی ایک دم ختم بھی کر دیا۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں اس تو، نو، نو، والی تاریخ کا کیا ہوا ہوگا؟“

مشہود بولا۔ ”ہوا کیا ہوگا۔ بے چارہ بھٹکا رہا ہوگا، گھٹن اقبال کے مین گیٹ پر۔ پھر ایک دردناک قسم کی غزل لکھی ہوگی۔ عجب کے نیچے رکھی ہوگی اور اس پر سر رکھ کر سو گیا ہوگا۔“

”ویسے یار، ہم سے ہوئی زیادتی تھی۔ ہمیں اس معاملے کو اتنا آگے نہیں لے جانا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔

ایک دم مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے کہا۔ ”غمر و غمر، میں ایک چیز دیکھتا ہوں۔“ میں اٹھ کر چلی منزل پر آیا۔ ایک چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر ایک الماری کھولی اور ایک گرد

آلود موبائل سیٹ لے کر اوپر آ گیا۔

”ادے یہ کیا ہے؟“ عدنان نے پوچھا۔

”وہی موبائل جس پر تم لوگ آرزو کو ناموں“ بنا رہے ہو۔“

امین کے پاس ایک باریک پن والا چارجر موجود تھا۔ ہم نے اس کے ذریعے موبائل سیٹ کو چارج کیا اور چند منٹ کے اندر وہ زندہ ہو گیا۔ اس کے زندہ ہوتے ہی تقریباً دو برس پہلے کے سارے روز و شب زندہ ہو گئے۔ میں نے بیچ میں جا کر ان باکس کھولا اور نیچے کی طرف کیا۔ ان گت بیچ تھے اور سب تقریباً ایک ہی نمبر سے تھے۔ 21 فروری 2009ء کی تاریخ میں پہلا بیچ اس سم میں موجود تھا۔ جو کچھ یوں تھا۔

”آپ کون ہیں محترمہ، میں آپ کو نہیں جانتا۔“

”او گاڈ۔ آپ کون ہیں محترمہ، میں آپ کو نہیں جانتا۔“ میں نے زیر لب دہرایا اور صوفے کی پشت سے ٹپک لگا دی۔ تقریباً دو برس پرانے مناظر نگاہوں کے سامنے کھلتے چلے گئے۔

وہ فروری کے آخری دن تھے۔ وہی موسم جب طبیعتوں میں شوخی جاگتی ہے۔ جوان دلوں میں لہریں لینے والی امنگ ترنگ بڑھ جاتی ہے۔ ان دنوں ہماری چٹال چوڑی تھی نئی شرارتیں کر رہی تھی۔ امین ان دنوں پڑھائی سے فارغ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرن شپ کر رہی تھی۔ یہاں ایک شاعر نما دبلا پتلا نوجوان بھی جو نیٹر کلرک کی جاب کر رہا تھا۔ اس کا نام مسلم آرزو تھا، مسلم آرزو کے ایک بازو میں کسی پرانی چوٹ کی وجہ سے تمہوڑا سا نقص تھا جس کے سبب اسے لکھنے اور موٹر سائیکل وغیرہ چلانے میں کچھ دقت پیش آتی تھی۔ اس کی چند تخلیقات ادبی پرچوں میں چھپی تھیں اور وہ آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر یہاں ہر شے میں ایسے بڑے بڑے مگرچے موجود ہیں جو چھوٹی موٹی چھیلیوں کو لکھوں میں ناپید کر دیتے ہیں، اگر کوئی آگے بڑھنا چاہے تو اسے ان کا پیٹ چاڑھ کر ٹکنا پڑتا ہے۔

آرزو کو دیکھ کر امین کی رگ شرارت پھڑک چکی تھی۔ اسے آرزو کا موبائل نمبر بھی مل گیا تھا۔ ایک دن اس نے یہ نمبر مجھے اور مشہود کو دکھایا۔ میرے پاس ایک نئی سم رکھی تھی۔ میں نے اسے ایک خالی موبائل سیٹ میں ڈالا اور ایک بیچ آرزو کو لکھ مارا۔ ”اخبار و رسائل میں آپ کی نظمیں پڑھتی ہوں۔ آپ اتنا اچھا کس طرح لکھ لیتے ہیں۔ کیا آپ نے کسی سے محبت کی تھی۔؟ نو شاہ!۔“

یہ بیچ اس کہانی کا ٹکڑا تھا جس نے اگلے

پانچ چھ ماہ میں کئی مرحلے طے کیے اور کئی موقعوں پر ہم سب دوستوں کے لیے زبردست تفریح کا باعث بھی بنی۔

ہم سب اور خاص طور سے عدنان اور مشہود کا ہے یہ گاہے آرزو کو میسر کرتے رہے اور اسے بے وقوف بناتے رہے۔ وہ نوشاہہ میں انوالو ہوتا چلا گیا۔ پیغامات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ ان پیغامات سے ہی پتا چلا کہ آرزو کا تعلق ایک کم آمدنی والے گھرانے سے ہے۔ باپ فوت ہو چکا ہے، وہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے اور گھر کا تکفیل بھی ہے، کچھ عرصہ پہلے اس کا دل ٹوٹا تھا۔ اکثر شاعروں کی طرح وہ بھی بے حد جذباتی اور حساس تھا۔ ہم اس کی اس جذباتیت کو استعمال کر رہے تھے۔ وہ نوشاہہ سے ملنا چاہتا تھا۔ جب اس کا اصرار بڑھا تو ہم نے اسے اتنی سی رعایت دی کہ اسے نوشاہہ کی آواز سنا دی۔ یہ آواز دراصل ماہی کی تھی، ماہا اس سے نوشاہہ کے طور پر بات کرتی رہی۔ ہم نے آرزو کے حوالے سے نئے نئے تماشے لگائے۔

ماہا نے نوشاہہ کی حیثیت سے آرزو کو باور کرایا تھا کہ وہ اسے تقریباً ہر روز دیکھتی ہے لیکن ابھی خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی کہ سامنے آ سکے۔ کبھی ماہا اور ایک اسی کوئی خاص قسم کے گپڑے پہننے پر مجبور کر دیتیں۔ کبھی وہ ان کے کہنے پر کوئی خاص قسم کا ہیئر اسٹائل اپناتا۔ ایک بار ہم سب نے اسے گلشن اقبال میں بلایا اور اس کے ارد گردہ کر اس کی بے چینی اور انتظار کی کیفیت کا لطف اٹھایا۔

دن گزرتے رہے۔ وہ نوشاہہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن نوشاہہ کہیں نہیں تھی۔ دوسری طرف ہم بھی اس کھیل سے اب پور ہونے لگے تھے۔ ایک روز مشہود نے آرزو سے جان چھڑانے کے لیے اسے نوٹو نوٹو والا میسج بھیج دیا۔ یعنی اس نے آرزو سے کہا کہ وہ اس خوبصورت تاریخ یعنی 9-9-2009 کو اس سے ملے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اب اس تاریخ تک وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی طرح کا کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔

ہم تو یہ وعدہ کر کے دوسری مصروفیات میں کھو گئے لیکن آرزو کچھ نہیں بھولا۔ نہ ہی وہ نوٹو نوٹو کی تہ تک پہنچا جس میں انکار کے سوا اور کچھ نہیں تھا یعنی نہیں نہیں نہیں۔

اس نے اپنے آخری میسج میں لکھا تھا۔ "نوشاہہ! انجانی، ان دیکھی محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ ان دیکھے شخص سے بھی اتنی ہی شدت سے محبت کی جاسکتی ہے جتنی کسی جانے پہچانے شخص سے۔ میرے دل کی گواہی ہے کہ تم ویسی ہی ہوگی جیسا میں

نے سوچ رکھا ہے۔ تم سے ملاقات ہونے میں ابھی چار مہینے باقی ہیں۔ میں نے ان چار مہینوں کے گھنٹے، گھنٹیاں اور ہلکی ابھی سے گنتا شروع کر دیے ہیں۔ یہ بڑا لمبا سفر ہے لیکن تمہاری محبت کے وجدان کے سہارے میں اسے ضرور طے کر لوں گا۔ تو ٹھیک ہے میں نوتمبر کی اس نیم گرم شام کا اور اس شام میں موجود سارے خوبصورت امکانات کا راستہ دیکھوں گا۔ اس شام تک کے لیے خدا حافظ۔"

اس کے بعد موہاٹل میں آرزو کا کوئی میسج موجود نہیں تھا۔ ہاں اس کے بعد اس نے نوٹو نوٹو کے حوالے سے ایک طویل نظم ضرور لکھی تھی۔ یہ نظم ایک موقر اخبار کے ادبی ایڈیشن میں آرزو کی تصویر کے ساتھ شائع بھی ہوئی تھی۔ اس نظم میں ان دیکھے محبوب کی چاہ اور اس چاہ کے دکھ درد بیان کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ انتظار کے جاں گسل مرحلوں کا ذکر تھا۔

ہم نے ان باکس میں موجود میسجوں پر انے میسج پڑھے اور وہ ساری کہانی ذہنوں میں تازہ ہو گئی۔

میں نے موہاٹل بند کر کے ایک طرف رکھا اور لمبی سانس لے کر مشہود اور عدنان سے پوچھا۔ "ہاں بھئی..... میں تو یہاں تھا نہیں۔ پر تم سب لوگ تو یہاں تھے، تمہیں آرزو کا خیال نہیں آیا؟"

"مجھے آیا تھا تھوڑا سا۔" ابھی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں نے مشہود سے کہا تھا کہ نوٹو نوٹو گلشن اقبال جائیں گے اور دیکھیں گے کہ آرزو وہاں آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو کیا کرتا ہے؟"

"پھر.....؟" میں نے پوچھا۔

"پھر کیا؟ یہ ایک جگہ کھتے تھوڑی ہی ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے ان کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا۔ آنا فانا مجھے بھی لیا اور کوئٹہ پہنچ گئے۔" "یار، کہیں اس نے خود کشی وغیرہ ہی نہ کر لی ہو۔ یہ شاعر حضرات ہوتے تو جھلے ہیں۔" عدنان نے کہا۔

"خیر ایسی بات بھی نہیں۔" مشہود بولا۔ "اگر ایسا ہوتا تو اخبار میں دو تین کالمی خبر ضرور چھپتی جس کا کہشیں کچھ اس طرح کا ہوتا۔ ایک اور چراغ بجھا..... کچھ اور کم ہوئی روشنی، وغیرہ وغیرہ۔"

"ویسے یار اس سے ہوئی زیادتی ہے۔ وہ دیکھی تو بہت ہوا ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

ماہا بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھی۔ ٹیوب لائٹ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ "نوتمبر کو میں دیکھنے گئی تھی،

اسے..... اور شاید آپ سب کو یہ جان کر بہت حیرانی ہو کہ نوتمبر کی اس شام کو آرزو گلشن اقبال سے مایوس نہیں کیا تھا۔" "کیا مطلب؟" مشہود اور عدنان نے تقریباً ایک ساتھ پوچھا۔

وہ کھوٹی کھوٹی آواز میں بولی۔ "نوشاہہ اسے ملی تھی۔ مجھے بھی ہرگز توقع نہیں تھی کہ ایسا ہوگا لیکن ہوا۔ وہ اندھیرا گہرا ہونے تک وہاں بیٹھا رہا تھا۔ مایوسی اور دکھ کی تصویر نظر آتا تھا۔ بار بار فون کرتا تھا لیکن دوسری طرف سے جواب نہیں آتا تھا اور پھر جب وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ بالکل آخری لمحوں میں..... نوشاہہ آگئی۔"

"یار! کیسی بہنی بہنی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" ابھی نے اسے کندھے سے ہلا کر کہا۔ "نوشاہہ بھی ہی نہیں تو اسے ملتی کیسے؟"

ہم دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ ماہا کی آنکھوں سے دو موٹے آنسو ٹپکے اور اس کے رخساروں پر لکیریں بناتے چلے گئے۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "نوشاہہ بھی..... ہم سب نے نوشاہہ کو جو درد دیا تھا..... اور میں نوشاہہ کو سب سے زیادہ جانتی ہوں، وہ بہت حساس تھی..... بہت درد مند۔ وہ کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آرزو کا بھی نہیں..... وہ آرزو سے ملے بغیر نہیں رہ سکی۔"

اچانک میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ ماہا کیا کہہ رہی ہے۔ شاید باقی بھی سمجھ گئے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک ایک تک اسے دیکھتا رہا۔ غم کی کیفیت میں اس کا بیچ چہرہ کچھ اور بھی دلکش نظر آ رہا تھا۔ کانوں کے رد پہلی جھمکے ہوئے ہونے لڑ رہے تھے۔ میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "ماہا! کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تم نوشاہہ کے طور پر آرزو سے ملی نہیں؟"

"ہاں آصف..... میں ملی تھی اور نہ صرف ملی تھی بلکہ ملتی رہی تھی۔ ہم دونوں بہت قریب آ گئے تھے....." وہ ہلکی سی اٹھائے بغیر بوتلی چلی گئی۔ اس کا چہرہ جیسے بخار میں چپ رہا تھا۔ ماہا کی نہایت سنجیدہ صورت دیکھنے کے باوجود ہمیں..... اور خاص طور پر مجھے..... اس کی بات کا بھر دسا نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں لگ رہا تھا شاید وہ ابھی بلند آواز میں ہنس پڑے گی اور ہم سب سے اپنی اداکاری کی داد چاہے گی لیکن ایسا نہیں تھا..... جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے تو ہم نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ حواس باختہ سی ہوئی لیکن پھر دیرے دیرے سنبھل گئی۔ اس نے ہمارے ہر سوال کا جواب مدلل انداز میں تسلی سے دیا۔ اس کا لہجہ

سرجستگی

ایک اندھا پولیس میں بھرتی ہونے آیا تو پولیس آفیسر نے پوچھا۔ "تمہیں کس لیے رکھیں؟" اندھے نے جواب دیا۔ "اندھا دھند فارنگ کے لیے۔"

☆☆☆

ایک لڑکا بس اسٹاپ پہ لڑکی کو دیکھ کر بولا۔ "تو تو میری جان ہے تو میرا ایمان ہے۔" لڑکی نے جوتی اتاری تو لڑکا بولا۔

"میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے۔"

☆☆☆

آپریشن سے پہلے ڈاکٹر نے پھولوں کا ہار منگوایا۔

مریض۔ "یہ کس لیے ہیں؟"

ڈاکٹر۔ "میرا یہ فرسٹ آپریشن ہے اگر کامیاب ہو تو میرے لیے درنہ تمہارے لیے۔"

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل ملی پور، ضلع مظفر گڑھ

نہایت سمجیر لیکن بہت پراعتقاد تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی لڑکی نظر آرہی تھی۔ میں اسے سن رہا تھا اور میرے سینے میں کچھ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا..... مجھے ڈھی کر رہا تھا۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں ماہا نے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

"اس کے دل میں آرزو کے لیے ترس اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ جوں جوں نوٹو نوٹو کی تاریخ قریب آتی یہ جذبہ اور قوی ہوتا گیا۔ اس اداس شام کو وہ گلشن اقبال کی جمیل کے اس کنارے پر موجود تھی جہاں آرزو کو اپنی آس امید کی ڈور تھام کر آتا تھا، اس نے آرزو کو دیکھا اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر ایک ایسے فیصلے پر پہنچ گئی جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ نوشاہہ کے طور پر آرزو سے ملی۔ وہ جو مایوس اور دل شکستہ کی انتہا کو چھو رہا تھا، اس سے مل کر جمجم اٹھا۔ اگلے دو تین ہفتوں میں ان کی ملاقاتیں تو اتار سے ہو گئیں۔ نوشاہہ نے بتایا کہ اس کا اصل نام ماہا ہے۔ اس نے اپنی نئی زندگی کے بارے میں آرزو کو سب کچھ بتا دیا۔ اس نے بھی کچھ نہیں چھپایا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب

آتے چلے گئے۔“

میرے دل کی دھڑکنیں بری طرح زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ ہم سب اور خاص طور سے میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اب موجودہ صورت حال کیا ہے؟ ماہا اور آرزو کے تعلقات کس مرحلے میں ہیں؟ آرزو کہاں ہے؟ اور اس کے حوالے سے ماہا کے ارادے کیا ہیں، وغیرہ وغیرہ؟

ان سارے سوالوں کا ماہا نے ایک ہی جواب دیا اور یہ ایسا جواب تھا جس نے مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے سمار کر رکھ دیا اور اس جواب کے بعد ماہا زیادہ دیر وہاں ٹھہری بھی نہیں۔ ایک اجنبی سی خاموشی کی چادر اوڑھ کر فوراً ہی اٹھ کر چلی گئی اور وہ بے رحم جواب یہ تھا۔ ”میں آپ لوگوں سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی، میں آرزو سے شادی کر چکی ہوں، ہم پچھلے ایک برس سے میاں بیوی ہیں۔“

◆◆◆

میں اپنی وسیع کوشی کے وسیع بیڈروم میں سب روشنیاں بجائے لیٹا تھا۔ غم ایک آرے کی طرح دل کو کاٹ رہا تھا۔ پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ کچھ چیزوں کی اصل قدر وقت کا پتا نہیں کھونے کے بعد چلتا ہے۔ مجھے بھی یہ پتا چل رہا تھا کہ میں ماہا سے بہت محبت کرتا تھا۔ کبھی تو لگتا تھا کہ میں ماہا سے جدا کی کا یہ دکھ برداشت ہی نہیں کر سکوں گا۔ سب کچھ درہم برہم کر کے رکھ دوں گا۔ کبھی لگتا تھا کہ شاید وقت کے ساتھ یہ سب کچھ جھیل لوں گا۔ میں ماہا کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا کوئی اقرار نہیں تھا، کوئی وعدہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ خاموشی سے ”یورپ یا ترا“ کے لیے روانہ ہوتے وقت بھی میں نے اس کے ساتھ اس معاملے پر مکمل کر بات نہیں کی تھی۔ بس دو طرفہ خاموشی اور راسخینڈ رنگ ضرور تھی لیکن خاموش جذبوں کو جب تک زبان نہ دی جائے وہ وجود اور عدم وجود کے درمیان ہی پھنکتے رہتے ہیں۔

کئی دن تک میں اپنے ارد گرد سے کنار ہا اور ماہا کے غم سے لڑتا رہا۔ کبھی کبھی دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف حرکت کرنے لگیں۔ پھر ڈیڑھ سال پہلے کا وقت آجائے، میں کسی خوبصورت شام میں کسی خوبصورت باغ کے کسی تنہا گوشے میں ماہا کے سرخ و سپید ہاتھ تھاموں اور اس سے کہوں، میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وقت کسی کے لیے ٹھہرتا نہیں، پلٹتا تو بہت دور کی بات ہے۔

کسی وقت لگتا کہ ماہا مکمل طور پر بے قصور بھی نہیں ہے، وہ میرے اور اپنے خاموش تعلق کے بارے میں سب کچھ

جانتی تھی۔ پھر اس نے یہ بے بسی کیوں دکھائی؟ ایک ایسے شخص کے لیے مجھے دکھ کے دریا میں دھکیلا جو کسی طرح بھی اس کے لائق نہیں تھا۔ کیا ماہا نے مجھ سے میری بے پروائی اور خاموشی کا بدلہ لیا ہے۔ جب خیال آتا تو میرے اندر میرا تیموری خون جوش مارنے لگتا۔ جی چاہتا الماری سے اپنا برٹیا پستول نکالوں اور اسے اپنے لباس میں رکھ کر براستہ سڑک لاہور سے کراچی روانہ ہو جاؤں۔ ماہا اور آرزو کو ڈھونڈوں۔ اس ٹیڑھے بازو والے خبیث شاعر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں اور ان دونوں کا جینا حرام کر دوں۔ ایک موقع تو ایسا آیا جب میں واقعی تیار ہو گیا۔ میں نے مشہود کو مجبور کیا کہ وہ امی کے ذریعے کراچی میں ماہا کا اتنا پتا معلوم کرے اور مجھے بتائے۔

انہی دنوں اٹلی سے میرا دوست فریڈر، اس کی گرل فرینڈ مارتھا اور اس کی سہیلی کرسٹی لاہور آگئے۔ جس طرح ان لوگوں نے بڑی محبت سے مجھے پورا اٹلی گھمایا تھا، اب میری بھی ذمہ داری پاکستان گھمانے کی تھی۔ وہ لوگ پاکستان کے شمالی علاقہ جات دیکھنے کے شہید خواہش مند تھے۔ مجھے ان کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ تین چار مقامی دوست بھی اس سیاحتی ٹور میں شریک ہو گئے، مشہود اور امی بھی ان میں شامل تھے۔ اگلے چار سات ہفتے تک ہم شمالی علاقوں کے دور دراز بل اسٹیشنز پر گھومتے رہے۔ اس ٹور نے مجھے میرے غم سے سنبھلنے میں کافی مدد دی۔ اس میں کچھ کردار سنہرے بالوں اور ہلکی نیلی آنکھوں والی کرسٹی کا بھی تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگوں تک مجھ سے باتیں کرتی۔ وہ ہمارے گروپ کے خوش اخلاق اور طنز آمیز ممبرز میں سے تھی۔ اس ٹور کے دوران میں بھی میرے کہنے پر امی بذریعہ فون، ماہا کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی رہی لیکن ناکامی ہوئی۔ ماہا نے جو سبائل فون نمبر امی کو دیا تھا، وہ بھی مستقل طور پر خاموش تھا۔

اس ٹور کے بعد میرے تینوں اطالوی دوست تھائی لینڈ اور ملائیشیا کی میر کو جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے بے حد اصرار کیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے ڈھائی تین ماہ تک سیاحت اور ماہا کا غم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو رہا ہوں۔ غم کی دھار کچھ کد ہونے لگی تھی۔

◆◆◆

ان واقعات کو اب ایک سال سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ میں آج کل اٹلی میں ہوں، یہاں میلان میں، میں نے ایک چھوٹا لیکن آرام دہ اپارٹمنٹ خریدا ہوا ہے۔ کرسٹی میری زندگی میں داخل ہو چکی ہے اور میں اس سے شادی کر چکا

ہوں۔ زندگی جو کچھ عرصہ پہلے تک پہاڑی ندی کی طرح تھی، اب ہموار میدانوں میں داخل ہو رہی ہے اور اس نے اب لگی بندھی رفتار سے بہنا شروع کر دیا ہے لیکن جس طرح ہموار بہنے والی ندیوں میں بھی کسی وجہ سے اچانک پھل پیدا ہو جاتی ہے۔ میرے شب و روز میں بھی پانچ چھ دن پہلے ایک شدید پھل پیدا ہوئی ہے۔ کافی عرصے بعد پاکستان سے مشہود نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ انٹرنیٹ کی وڈیو کال کے ذریعے ہم نے کوئی ایک گھنٹا بات چیت کی ہے۔

اس انکشاف انگیز بات چیت کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ عورت کو پہیلی کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں اس کے دل کی گہرائی تاپنے میں دنیا کے دانش مند ترین مرد بھی ناکام رہے ہیں۔ اپنی اس وڈیو کال میں مشہود نے مجھ پر انکشاف کیا ہے کہ ایک سال پہلے جب ہم لاہور کے مصافقاتی فارم ہاؤس میں ملے تھے اور ماہا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آرزو سے شادی کر چکی ہے۔ تو اس نے جھوٹ بولا تھا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے لڑکھائی آواز میں پوچھا۔

میرا سارا جسم لرزنے لگا تھا۔

”ہاں آصف۔“ مشہود ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ”تب آرزو سے اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، آرزو سے اس کی شادی اب ہوئی ہے، صرف دو ماہ پہلے۔“

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو مشہود۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”شروع میں میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا آصف۔ لیکن اب آہستہ آہستہ آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ کچھ امی نے بھی میری مدد کی ہے۔ امی بھی ایک عورت ہے اور عورت کے دل و دماغ کو ہم سے بہتر سمجھتی ہے۔ میں نے اور امی نے بہت گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا ہے آصف۔ اور ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ماہا کو تم نے ۱۱ مار کھویا ہے۔ ایک بار، جب تم اس سے اظہار محبت کیے المیہ یورپ چلے گئے۔ اور دوسری بار، جب تم نے آرزو کے ساتھ اس کی شادی کی خبر سنی اور اس کو سہ لیا۔“

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مشہود! میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ تم مجھے الجھا رہے ہو۔“

مشہود نے جواب میں جو کچھ بتایا، اسے میں اختصار بیان کر دیتا ہوں اور اب میں بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ کچھ مشہود نے بتایا۔ وہی سچ ہے، سو فیصد درست ہے۔ ”ماہا عبیرہ جیسے ہم ماہا عجیب بھی کہتے تھے، محبت کرنے والہ کرنے کے بارے میں بھی عجیب ہی رہی۔ وہ دل میں

میری چاہ رکھتی تھی۔ میری بد قسمتی کہ میں دل میں اس کی چاہ رکھنے کے باوجود اس کے بارے میں جلد ہی سنجیدہ نہ ہو سکا۔ اسی دوران میں مسلم آرزو والا چکر چل گیا۔ ہم دوستوں نے مسلم آرزو کو کوچ منیجر حار میں چھوڑ دیا اور اپنی اپنی مصروفیتوں میں کھو گئے لیکن حساس ماہا اسے مکمل نظر انداز نہ کر سکی۔ تو نو کی شام وہ گلشن اقبال میں اس سے ملی۔ شروع میں ان دونوں کے درمیان دوستی کا ناٹا بنا لیکن ماہا تادیر مسلم آرزو کو دوستی کی حد میں نہ رکھ سکی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہنے لگا اور ماہا کے بغیر اس کے لیے زندگی کا تصور کرنا بھی محال ہو گیا۔ دوسری طرف ماہا بھی جو پہلے پہل آرزو کے لیے صرف ہر روزی رکھتی تھی اب اس کے لیے کچھ اور بھی محسوس کرنے لگی۔ اس کو ”ہر روزی جمع محبت“ کہا جاسکتا تھا۔ اس موقع پر ماہا دو حصوں میں بٹی ہوئی لڑکی بن گئی۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں میرے لیے نرم گوشے موجود رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے چاہتا ہوں لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ تعلق ایک دھند جیسا ہے۔ نظر آتا ہے اور نہیں بھی آتا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پارتی تھی۔ ایک طرف وہ دہی آرزو کو مزید دکھوں کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی، دوسری طرف اس کی چھٹی حس اسے ایک خطرے سے بھی آگاہ کرتی رہتی تھی۔ اسے میرا خیال بھی تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اگر اس نے آرزو سے شادی کر لی تو میرا رد عمل کیا ہوگا۔ میں اس صدمے کو کتنی شدت سے لوں گا؟ میں سنبھل پاؤں گا یا بکھر جاؤں گا؟ وہ ایک دور ہے پر تھی۔ اس کی شدید حساسیت اسے کسی طرف بھی جانے نہیں دیتی تھی۔ اور پھر میں پاکستان واپس آ گیا۔ لاہور کے فارم ہاؤس میں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ ماہا نے میرے جذبات کو پرکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ مسلم آرزو سے شادی کر چکی ہے۔ یہ ایک طرح سے میرے رد عمل کا امتحان بھی تھا۔ اگلے کئی ماہ تک اس نے مجھ سے دور رہ کر بھی میرے رد عمل پر نظر رکھی۔ اگر میرا رد عمل واقعی شدید تر ہوتا۔ یعنی میرے ضبط کا پانی کناروں سے چھلک جاتا تو پھر یقیناً ماہا کے فیصلے کچھ اور طرح کے ہوتے لیکن میں سہ گیا اور میرے اس ”سہ جانے“ نے ماہا کے لیے اگلے فیصلے آسان کر دیے۔ وہ دورا ہے سے حرکت میں آئی اور اس راستے پر مڑ گئی جو مسلم آرزو کی طرف جاتا تھا۔ مسلم آرزو، جو سرتاپا شوق اور انتظار اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ کرسٹی سے میری شادی کے قریب دو ماہ بعد ماہا نے آرزو سے شادی کر لی۔ کیونکہ وہ ماہا عجیب ہی تھی۔

◆◆◆

اسرار اور تجربے پر مبنی
میں لپٹا ایک منفرد
طویل سلسلہ

کشکول

انوار صدیقی

دسویں قسط

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش رہا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیر اثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پہوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑالے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

***** گذشتہ اقساط کا خلاصہ *****

محبت کی یہ داستان نوشہرہ کے لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا انا پرست باپ سردار سرفراز خان طبقاتی فرق کی وجہ سے اپنے بیٹے کی محبت کا مخالف ہے۔ لیاقت اپنی چاہت المزمین سے شادی کر کے کراچی آ جاتا ہے۔ باپ مخالف مگر اس کی ہمدردی... یہ جوڑا کراچی کی ایک مکی آبادی میں گل خان اور اس کی بیوی در پند کے ساتھ مشرقی طور پر کرائے کے مکان میں قیام کرتا ہے۔ مکان سے متعلق قبرستان میں فرمین ایک ہندو عامل پر تاب گھوش کو برہنہ حالت میں پر اسرار مل درخس کرتے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے اسی دوران لیاقت حسین کو ایک قبر سے مل گیا ہوا نیچو ملتا ہے وہ اللہ کا نام لے کر اس مل کو ختم کر دیتا ہے۔ لیاقت ملازمت کے لیے پریشان تھا کہ راہ میں ایک چلتے مکان سے جان پر کھیل کر ایک عورت کو نکال لانے پر اس کے بیٹے کے ذریعے اسے سینہ چنان کے ہاں ملازمت مل جاتی ہے۔ سینہ چنان اور ان کی سسر راجیہ بیگم بہت سلجھے ہوئے ہمدرد انسان اور کامیاب بزنس من ہیں جبکہ سسر ماجد بہ ظاہر ان کا رشتہ کرور حقیقت



کشکول

حریف ہے اور اپنے دست راست افضل خان کے ذریعے اپنے مخالفین کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین جسے ایک نابینا بزرگ کی جانب سے ایک باورائی قوت یعنی ہزاروں مسرت آگیا ہے جو مشکل وقت میں اس کے کام آتا ہے لیکن لیاقت حسین کو اس کے متعلق کوئی ادراک نہیں ہے اس پر اسراف قوت کے باعث وہ ہر پارٹی کے منصوبوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ میڈم روٹی ایک دولت مند عورت ہے جو اپنے شوہر کی حادثاتی موت کے بعد بڑے اور سماجی مصروفیات میں شامل ہوتی ہے اور شوہر کی موت کا انتقام لینا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں شیخ حامد کے دست راست افضل خان سے راہروسم بڑھاتی ہے اس کے علاوہ شیخ حامد جو کہ مافیا کا سرغنہ ہے اور کوڈوڈ بلیک ناٹنگ کے تحت کی خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہے، اس کے آفس کی ایک ورکر شبنم بھی بگ باس کے خلاف میڈم جیسے ہی مخالف جذبات رکھتی ہے اور اپنی ماں کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ لیاقت حسین کے علاوہ سیٹھ عثمان کا ایک پولیس آفیسر دوست ڈی ایس بی سراج بھی اس کا مددگار ہے جو کہ ایک ایماندار افسر ہے اور افسر اعلیٰ عظیم احمد کا قاتل احمد ہے۔ شیخ حامد میڈم کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے افضل خان کو استعمال کرتا ہے اور شراب کے نشے میں نیم بے ہوشی کی حالت میں میڈم کی قابل اعتراض تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن عین وقت پر ایک ہراسہ اڑا کر اس کے سبب وہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ متحدہ سوانح پر لیاقت حسین شیخ حامد کے آڑے آتا رہا۔ لہذا وہ لیاقت حسین کا دشمن بن گیا اور اسے مجبور کرنے کے لیے فرسین کو اغوا کر لیتا ہے لیکن یہاں بھی لیاقت حسین اپنے ہزاروں کے ذریعے کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ناکامی کے بعد بگ باس شیخ حامد افضل خان کو سخت عتاب کا نشانہ بناتا ہے۔ دوسری جانب شبنم میڈم روٹی سے ملتی ہے اور مشترکہ مقصد کے لیے تعاون کی درخواست کرتی ہے۔ اسی دوران اعلیٰ افسر عظیم احمد ریٹائر ہو جاتا ہے اور آغا سکھو اس کی جگہ لیتا ہے جو کہ ایک کرپٹ افسر ہے لیکن میڈم روٹی کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں روڈ بدل کے نتیجے میں نیا ڈی ایس بی لودھی تعینات ہوتا ہے جبکہ ایس بی کے عہدے پر اورنگ زیب جو ان کرتا ہے جو کہ ایک ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ سراج حکمت عملی کے تحت در پردہ شیخ حامد سے تعلقات استوار رکھتا ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی مہا کی کال سراج کو موصول ہوتی ہے جس میں وہ اپنی خود کشی کی اطلاع دیتی ہے اور اپنی ایک خفیہ تحریر کے متعلق بتاتی ہے جو اس نے سراج کے نام لکھی ہے جس میں کچھ انکشافات کیے گئے ہیں۔ سراج پریشان ہو جاتا ہے کہ موبائل پر اس کے نمبر زد کچھ کر شیخ حامد اس سے پریشان ہو جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا، حامد نے سراج کو حوہ چکھانے کے لیے اس کی بیوی الماس کو اغوا کر لیا لیکن اس بار پھر لیاقت حسین کے ہزاروں نے اس کو شش کو ناکام بنا دیا۔ صبا بیکم کی موت کی تحقیقات کے لیے اورنگ زیب عدالت سے تفتیش کرتا ہے شیخ حامد انسپکٹر لودھی کے ذریعے جو اس کا کماشت ہے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ سیٹھ عثمان لیاقت حسین کو اپنے یہاں ہی ایسی میں رہائش دے دیتا ہے جبکہ فرسین بھی اپنے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتی ہے اور وہاں کا احوال لیاقت حسین کو بتاتی ہے۔ دوران تفتیش انسپکٹر دانش سراج کو ایک اہم قاتل کے متعلق بتاتا ہے، دوسری جانب شیخ حامد سخت مشتعل ہو کر انسپکٹر لودھی کی ملی بھگت سے بلیک ناٹنگ کے ذریعے تھانے پر حملہ کر کے انسپکٹر دانش کو قتل کر دیتا ہے اور تھانے کا تمام ریکارڈ جلا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ جبکہ افضل خان اسپتال سے فارغ ہو کر بے یار و مددگار مایوسی کے عالم میں خود کشی کے بارے میں سوچتا ہے کہ اسے شبنم اپنے ساتھ اپنے پارٹمنٹ لے جاتی ہے۔ شبنم بگ باس کے زیر اثر اسی کی ہدایت پر افضل خان کو اپنے قلیت میں لاتی تھی اور اس کا مقصد آخری پانس طور پر شیخ حامد کے مخالفین کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو اغوا کر لیا جاتا ہے جہاں ہزاروں شیخ حامد کے آواز کو کر لیتا ہے۔ اورنگ زیب سراج سے مل کر باہمی اتحاد کا اظہار کرتے ہیں۔ شیخ حامد کے گھر پر حملہ ہوتا ہے اور وہ چراغ یا ہو کر انسپکٹر لودھی سے باز پرس کرتا ہے اور ایک نئے حریف رستم ملی آغا خانی کا کردار سامنے آتا ہے۔ مذکورہ حملہ بین الاقوامی ایجنٹ رکھنے والی سیون اسٹار پیگم نے اپنے ایجنٹ ہاشم ایڈرمنی اور مقامی کنسٹر جہانگیر بٹ عرف چاکا کی مدد سے کیا تھا۔ شیخ حامد اپنی سیکریٹری کنول سے خفیہ شادی کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہاشم بھی بگ باس سے ذاتی حاست رکھتا ہے اور اسی سلسلے میں چاکا سے ملتا ہے جبکہ شبنم افضل خان کو بگ باس کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس کے دشمن رستم ملی کے خلاف کارروائی پر آمادہ کرتی ہے اور بگ باس کے مخصوص طریقہ کار کے مطابق رستم ملی کی اپنی بیوی کے ساتھ نازیبا تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اس کے مستقبل کا فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

ایس بی اورنگ زیب کے لیے وہ چٹ غیر متوقع نہیں تھی جو ڈیوٹی کا نشیل نے اس کی میز پر رکھی تھی۔ اس پر ڈی ایس بی لودھی کا نام درج تھا۔ اورنگ زیب نے ایک لمحہ کچھ سوچا پھر کا نشیل سے بولا۔

”تم مسٹر لودھی کو آدھے گھنٹے تک ملاقاتی کرے میں بھاؤ پھر اندر بھیج دیتا۔“

”رائٹ سر.....“

کا نشیل سیلیوٹ کر کے باہر چلا گیا تو اورنگ زیب نے وہ فائل دراز سے نکال کر سامنے رکھ لی جس کی وجہ سے اس نے لودھی کو اس وقت طلب کیا تھا، اس فائل میں لودھی کے فوری طور پر معطل کیے جانے کے احکام موجود تھے جو اسے براہ راست ہوم سیکریٹری کی طرف سے ملے تھے۔ ان

احکامات کی پشت پر خود اورنگ زیب کا ہاتھ تھا جس کا علم اس کے بعد مرکزی حکومت کے ایک ذمے دار آفیسر کے علاوہ کسی اور کو نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی میں سراج کا غائبانہ ہاتھ بھی شامل تھا۔ اورنگ زیب کے اصرار پر اس نے الماس کا نام درمیان سے نکال کر وہ تمام کہانی سنادی تھی جو اسے معلوم تھی۔ لیاقت حسین کا نام بھی اس نے درمیان سے حذف کر دیا تھا لیکن خود سراج کو بھی اس بات کی ہنک نہیں تھی کہ اورنگ زیب لودھی کو اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے معطل بھی کر دے گا۔

آدھے گھنٹے بعد لودھی نے کمرے میں داخل ہو کر اورنگ زیب کو سیلیوٹ کیا پھر اس کا اشارہ پا کر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

کشکول

”مسٹر لودھی.....“ اورنگ زیب نے سنبھل کر سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”انسپکٹر دانش کی پراسرار موت اور تھانے کی تباہی کے سلسلے میں آپ نے اب تک کیا انکوائری کی ہے؟“

”سر..... مجھے اس میں فرمائٹس فوٹو گرافر اور اس کی پشت پناہی کرنے والی مافیا کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔“

”گویا یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ فرمائٹس کسی گھناؤنے کام میں ملوث تھا اور..... کوئی مافیا بھی اس کی پشت پناہی کر رہی تھی؟“

لودھی ایک لمبے کوڑ بڑا مسکینا پھر سنبھل کر بولا۔ ”میری کوشش تھی سر کہ کسی طرح فرمائٹس پر بھرپور ہاتھ ڈالوں لیکن کوئی محسوس ثبوت میرے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔“

”کیا آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ انسپکٹر دانش نے اسے مافیا کے درمیان میں آنے سے قبل کہاں اور کن حالات میں گرفتار کیا تھا جبکہ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ تھانے کے لاک اپ میں تھا۔“

”میں وہی جانتا چاہتا ہوں سر..... انسپکٹر دانش نے اسے گرفتار کرنے کے بعد مجھے فون پر اطلاع دی تھی، میں نے اس کے فوراً بعد ہی اس کی چھان بین بھی شروع کر دی لیکن پھر جو صورت حال سامنے آئی وہ دوسروں کی طرح خود میرے لیے بھی ناقابل یقین ہی تھی۔“ لودھی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ فرمائٹس کی پشت پناہی کرنے والے اتنا سنگین قدم اٹھانے کی بھی جرأت کر سکتے ہیں۔“

”یو آر رائٹ.....“ اورنگ زیب نے زہر خند سے کہا۔ ”اس بات کا افسوس مجھے بھی ہے کہ وہشت گرد یا مافیا کے لوگ کوئی خطرناک قدم اٹھانے سے پیشتر ہم پولیس والوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیوں نہیں کرتے۔“

لودھی جواب میں کسمسا کر رہ گیا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟“ اورنگ زیب نے دوبارہ ہارمانہ انداز اختیار کیا۔ ”کیا فرمائٹس بغیر پولیس کی ملی بھگت کے حوالات سے نکل کر چلا گیا ہوگا؟“

”ڈیوٹی رو ستر بھی تھانے کے دیگر ریکارڈ کے ساتھ ہی ضائع ہو گیا ورنہ.....“

”میں آپ کا ہم خیال نہیں ہوں۔“ اورنگ زیب نے اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہا۔ ”میری اطلاع کے مطابق کسی بڑے مگر چھپے اشارے پر فرمائٹس کو گرفتار کرنے کی کوششیں بھی نہیں کی گئیں۔“

لودھی اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا۔ اورنگ زیب نے لوہا گرم دیکھ کر سرسراتے لہجے میں کہا۔

”میرے پاس اس آؤٹ سرچ مشیناے کی ایک نقل بھی ہے جس کو منظر عام پر لانے سے روکنے کی خاطر یہ سارا ناک کھیلایا گیا تھا۔ اگر وہ مشیناے سامنے آجائے تو اب بھی کچھ بڑے لوگوں کی فینڈس حرام ہو جائیں گی۔“

”سر.....“ لودھی نے ڈھیٹ بن کر جوتوں سمیت اورنگ زیب کی آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کی۔ ”ہم اس مشیناے کی روشنی میں اب بھی کچھ کر سکتے ہیں۔“

”سوری.....“ اورنگ زیب کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

”میں کچا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ کسی خاص سرغنہ کے گرد اپنا کھیرا مضبوط کرنے کے بعد ہی میں کوئی قدم اٹھانے کا عادی ہوں۔“

”میں ہر طرح آپ کے ساتھ ہوں سر..... آپ آزما کر دیکھ لیں۔“

”آپ جس علاقے میں تعینات ہیں اس میں آپ کو کتنا عرصہ گزر گیا؟“ چیتے ہوئے لہجے میں سوال کیا گیا۔

”تبادلہ کسی افسر کے ذاتی اختیار میں نہیں ہوتا سر.....“

لودھی پھر تذبذب کی کیفیت سے دوچار ہو گیا۔

”گڈ..... اب آپ نے ایک مطلب کی بات کی ہے۔“ اورنگ زیب نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ ”میرا ذاتی خیال بھی یہی تھا کہ کوئی ایسا شخص درمیان میں ضرور ہے جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آپ کا تبادلہ پسند نہیں کرتا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”یہ آپ کی ذاتی رائے ہے سر..... ورنہ میں ایسے کسی آدمی سے.....“

”مسٹر لودھی.....“ اورنگ زیب نے جھلا کر میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو یہاں کسوٹی کھیلنے کی خاطر طلب نہیں کیا تھا۔ یہ بھی باور کرادوں کہ کسی سے مرعوب ہونے کا عادی نہیں ہوں اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ میرے ساتھ سیدھی طرح تعاون کریں۔“

”آپ حکم دیں سر..... میں انکار نہیں کروں گا۔“

لودھی نے پھر معصومیت کا اظہار کیا۔

”جس رات انسپکٹر دانش نے فرمائٹس کو حوالات سے دور گرفتار کیا تھا..... اس رات وہ کس کی تصویریں بنانے کی خاطر وہاں گیا تھا؟“

”یہ بات میں کیسے بتا سکتا ہوں، اگر فرمائٹس زندہ ہوتا تو میں اس کے فرشتوں سے بھی سب کچھ اگوا لیتا۔“

”آئی سی.....“ اورنگ زیب نے اسے حقارت سے گھورا۔ ”گویا تم اب بھی کسی کے اشارے پر زبان بندی رکھنے کی پالیسی جاری رکھو گے؟“

”سرسر..... میں پروٹسٹ کرتا ہوں۔“ لودھی نے تملاکر کہا۔ ”آپ میرے اوپر بغیر کسی ثبوت کے بے بنیاد الزام.....“

”شٹ اپ.....“ اورنگ زیب نے چیخ کر کہا پھر اس کی معطلی کے حکم نامے کو فائل سے نکال کر سامنے ڈالتے ہوئے بڑے سفاک لہجے میں حکم دیا۔ ”رہسواٹ..... اینڈ گٹ لاسٹ!“

لودھی نے ایک نظر اس آرڈر پر ڈالی۔ ایک مانیے کے لیے ہونٹ چبائے پھر اس کی کاپی وصول کرنے کے دستخط کرتا ہوا اٹھا اور اورنگ زیب کو سیلیوٹ کیے بغیر نکل گیا۔

”کھیل اب شروع ہوگا باسٹرڈ..... میں تمہیں اور تمہارے گندے مگرچھ کو بتاؤں گا کہ قانون کے ہاتھ کتنے دراز اور طاقت ور ہوتے ہیں۔“ لودھی کے جانے کے بعد اورنگ زیب نے خود کلائی کے انداز میں کہا پھر ریسور اٹھا کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

سیون اسٹار کی جانب سے شیخ حامد سے دو دو ہاتھ کرنے کی گلیں چٹل جانے کے بعد ہاشم کی ولی مراد برآئی تھی، اگر وہ سیون اسٹار کا پابند نہ ہوتا تو شاید اب تک سکون سے نہ بیٹھتا۔ اس کا تعلق جنوبی افریقا کے ایک ایسے غیر مہذب قبیلے سے تھا جہاں صرف طاقت کی پوجا کی جاتی تھی، کسی کو مار دینا یا مر جانا ان کے لیے ایک پسندیدہ عمل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا، اپنی اسی بے جگری اور موت کی آگ میں کود جانے کی عادت نے اس کی شہرت قبیلے کے دور دراز علاقوں میں پھیلا دی تھی۔ اس کے بعد جب ایک بار اس کی خدمات کو مہذب دنیا کی ایک تنظیم نے منہ مانگے داموں خرید تو ہاشم کو بھی اپنی قدروقیمت کا اندازہ ہو گیا۔ اپنے پہلے ہی مشن میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد وہ دوسری ایسی تنظیموں کی فہرست میں بھی شامل ہو گیا جو تحریقی کارروائیوں کی خاطر مختلف حکومتوں کو اپنے ایجنٹ سپلائی کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک تنظیم کے ذریعے پہلی بار کسی ایشیائی ملک میں اسے خدمت کا موقع ملا تھا۔ یہاں بھی ایک مخصوص پاس ورڈ کے ذریعے حرکت میں آنے کا حکم ملا تھا۔

جگا سے ملنے کے بعد ہاشم کا پروگرام تھا کہ وہ پہلی فرصت میں منصوبہ بندی کر کے اپنے اس دشمن کو چھوٹی کی

طرح مسل دے گا جس کے گر گئے اسے پھانسنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگر لوچن نے بروقت اپنی ذہانت سے پانا پلٹنے کی خاطر موت کا رسک نہ لیا ہوتا تو شاید دونوں ہی مارے جاتے۔

وہ جگا کی اصول پسندی اور دوستانہ رویے سے مطمئن ہونے کے بعد ہی باہر نکل رہا تھا جب اس کی نظر اچانک دراز قد والے کسرتی جسم کے مالک اور سنہری فریم کا چشمہ لگائے ہوئے فرد پر پڑی۔ ہاشم اسے اپنے ہوٹل کے باہر بھی ایک دوبارہ منڈلاتے دیکھ چکا تھا۔ سیون اسٹار نے جگا کا ذکر کرتے وقت یہ حوالہ بھی دیا تھا کہ شیخ حامد کے نمائندے بھی کوٹھی پر ہونے والی فائرنگ اور دو مقامی بد معاشوں کی لاش ملنے کے بعد جگا کو کھٹکائے لے کر کوشش کر رہے تھے۔ ہاشم کے ذہن میں اس مشتبہ شخص کو دیکھ کر فوری طور پر یہی خیال آیا تھا کہ وہ بڑے مگرچھ کا کوئی خاص آدمی ہوگا۔ ہوٹل کے آس پاس اسے منڈلاتا دیکھنے کے بعد اسے جگا کے اڈے پر بھی دیکھ کر ہی ہاشم کی چھٹی حس اچانک بیدار ہو گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جگا سے ملنے کے بجائے خود ہاشم کا تعاقب کرتا ہو اور وہاں تک پہنچا ہو۔ بہر حال، دونوں ہی صورتوں میں ہاشم اس درمیانی خطرے کو بھی دور کرنے کے بارے میں طے کر چکا تھا، راستے کے جھاڑ جھنکار کو صاف کیے بغیر وہ عام حالات میں بھی منزل تک اٹل ٹپ جانے کا عادی نہیں تھا۔

اس نے واپسی میں بھی کسی تعاقب پر خاص توجہ نہ رکھی تھی لیکن اس بات کا یقین آ جانے کے بعد کہ اس کا پیچھا نہیں کیا گیا اس کا یہ شبہ اور بھی پختہ ہو گیا کہ نظریں چار ہو جانے کے بعد شاید وہ بھی محتاط ہو گیا ہو۔ حفظاً بالقدم کے طور پر اس نے دور دراز تک خود کو ہوٹل کے کمرے تک ہی محدود رکھا۔ صرف سیون اسٹار کے حوالے سے اس نے احتیاطاً بیرونی ایجنٹ ڈوما کو تاکید کر دی تھی کہ وہ دور دورہ کرے ہاشم پر کسی متوقع حملے کے پیش نظر پوری طرح چوکس رہے۔ دہلی زبان سے اس نے اپنی نظروں میں آنے والے مشکوک شخص کا سرسری حلیہ بھی بتا دیا تھا۔ یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ اس کی خبر لوچن کو نہ دی جائے۔

دور دراز سے اس نے خود کو اپنے کمرے تک ہی محدود کر رکھا تھا۔ کھانا اور ناشتا بھی روم سروس کے ذریعے منگوا تا رہا۔ اس عرصے میں اسے مجبوراً روم سروس کی اس میزبان خاتون سے بھی دوستی نبھانی پڑی جو اس وقت بھی اس کا سر کھانے میں مصروف تھی۔

”آپ دروازے سے باہر نہیں گئے؟“ اس نے بڑی

کشکول

لگاوت سے پوچھا۔ ”کمرے میں تنہا بند بند آپ کا دل نہیں گھبراتا؟“

”جی نہیں..... آپ کی وجہ سے دل لگا رہتا ہے۔“ ہاشم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ شاید مذاق کر رہے ہیں۔“ میزبان خاتون نے اس کی نظروں میں دور تک جھانکا، اس کی نظروں میں کھلی دعوت سی گئی۔

”میں کسی وجہ سے زیادہ سنجیدہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ ہاشم نے یلخت سنجیدگی اختیار کر لی۔

”کوئی خاص وجہ.....؟“

”میرا تعلق جس قبیلے سے ہے وہاں کے رسم و رواج بھی عجیب و غریب ہیں۔ ہم اپنے دیوتاؤں کو خوش کیے بغیر کسی غیر عورت کے زیادہ قریب نہیں جاسکتے ورنہ.....“ ہاشم نے دیدہ و دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

”آپ خاموش کیوں ہو گئے.....؟ اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے آپ کو کیا کرنا پڑتا ہے؟“

”ایک ایسی رسم کی ادائیگی جسے مہذب دنیا کی عورتیں پسند نہیں کرتیں۔“ ہاشم نے یہ دستور سنجیدگی سے میزبان خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم اس کے پابند ہیں، ایسا نہ ہوتا تو شاید ہم اس وقت دور دور نہ بیٹھے ہوتے۔“

”کہہ کر دیکھیں۔“ وہ بے تکلف ہونے لگی۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی رسم کی ادائیگی میں بھی آپ کے ساتھ تعاون کروں۔“

”اگر آپ آمادہ ہو جائیں تو مجھے خوشی ہوگی لیکن..... ایسا ہونا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ ہاشم کے لہجے میں اداسی اترنے لگی۔ ”ہم اس معاملے میں بڑے بد نصیب ہیں، دیوتاؤں کی ناراضی ہمارے اوپر جو آسمانی عتاب نازل کرتی ہے اس کا تصور ہی بڑا بھیا تک ہوتا ہے، اس لیے..... ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی..... کچھ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔“

”آپ ہمارے غیر ملکی مہمان ہیں مسٹر ہاشم.....“ وہ اٹھ کر ہاشم کے اور قریب چلی آئی۔ ”آپ کو خوش رکھنا ہمارا فرض بھی ہے۔ ایسی کیا رسم ہے جو آپ کی خاطر پوری نہیں کر سکتی؟“ اس نے بے تکلفی سے ہاشم کا ہاتھ تھام کر آہستہ سے دبایا۔ ”ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔“

”ایک گلاس خون.....“ ہاشم نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”ہم جہاں بھی جاتے ہیں دیوتا کی ایک مورتی ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ کسی عورت سے ملاپ کرنے سے

بیشتر ہمیں اس مورتی کو تازہ خون سے غسل دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم ایک ہو سکتے ہیں۔“ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے ہاشم نے اسے جذباتی انداز میں خود سے قریب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”تمہارا قرب میرے لیے قیامت سے کم نہیں۔ گگ..... کیا..... تم ایک گلاس خون دے کر دیوتا کی خوشنودی حاصل کرنے میں میری مدد کرو گی، میں اس کے عوض تمہیں منہ مانگا انعام دے سکتا ہوں۔“

”مم..... میں..... کل رات کی ڈیوٹی پر ہوں۔“ میزبان خاتون نے کسمسا کر خود کو ہاشم سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”ابھی مجھے دوسرے کمروں کو بھی اینڈ کرنا ہے..... کل..... میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

”پلیز.....“ ہاشم اس کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت وہ خود کو بے حد جذباتی پوز کر رہا تھا۔ ”قرب آ کر اب تم دور جانے کی بات نہ کرنا ورنہ..... ورنہ شاید دیوتاؤں کو خوش کرنے کی خاطر مجھے زبردستی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ ہم جس کے پجاری ہیں اس نے مرد کو پتھر بنا دیا تھا۔ دیوتا اپنے کسی پجاری کی بزدلی بھی برداشت نہیں کرتا۔ ہم اس کی خوشی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔“

”ٹھہ..... ٹھیک ہے..... مم..... مم..... میں کل تمہارے ساتھ ہی ہوں گی۔“ خاتون نے سہمے ہوئے انداز میں جموٹی ہائی بھری۔ ”تمہاری خاطر مم..... میں ایک کے بجائے دو دو..... گلاس..... خون بھی دے سکتی ہوں۔“

”ٹھیکس سویٹ ہنی۔“ ہاشم نے اس کا ہاتھ کھینٹ کر زبردستی چوم لیا۔ ”کل میں بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا۔“ میزبان خاتون ہاشم کے دور ہوتے ہی جبراً مسکراتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ہاشم نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے دن اس نازک ادا خاتون کی جگہ اس کا استغنیٰ ہی ہوٹل والوں کو موصول ہوگا۔ خاصی دیر تک وہ خود اپنے ڈرامے سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر اس نے سکون کا سانس لے کر بیٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اس کا موبائل گنگنا بنے لگا۔ تیزی سے اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اس پر ڈراما کے نام کا کوڈ چمک رہا تھا۔

”ہیلو.....“ ہاشم نے سنجیدگی سے کال اینڈ کی۔ ”دور دراز کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد آج مجھے تمہارا مطلوبہ شکار نظر آ گیا۔“ ڈراما نے مدغم آواز میں کہا۔ ”اس وقت تمہاری بالکونی کے عین سامنے والے ڈرگ اسٹور

میں کیا ہے، تم بھی ایک نظر دیکھ کر تصدیق کر لو۔“
”تم اس وقت کہاں ہو.....؟“ ہاشم نے بالکونی کی طرف جاتے ہوئے سوال کیا۔
”فکر مت کرو..... میں جہاں ہوں وہاں تک اس کی نظریں نہیں پہنچ سکتیں۔“

”ہولڈ رکھنا..... میں دیکھتا ہوں۔“ ہاشم ٹھٹھا ہوا بالکونی میں آکر اس طرح انگڑائی لینے لگا جیسے دیر تک سونے کے بعد ٹھکن اتارنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالکونی میں گئے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنا مطلوبہ شخص نظر آ گیا۔ اس وقت وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ چہرے پر حسب دستور سنہری فریم کا لائٹ کلر والا چشمہ بھی موجود تھا۔ ڈرگ اسٹور سے نکل کر وہ اپنی اسپورٹس کار میں بیٹھا۔ دائیں بائیں دیکھنے کے بعد اس نے ایک سرسری نظر ہاشم کے کمرے کی طرف بھی ڈالی تھی۔ ہاشم اس وقت دوسری سمت دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نگاہ کا وسیع دائرہ اپنے شکار کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ ہاشم نے ایک اور انگڑائی کی پھر پلٹ کر کمرے میں آ گیا۔ ”تم نے جس شخص کو اسٹاپ کیا ہے، وہی میرا مطلوبہ آدمی ہے۔“ اس نے دروازے کی آڑ میں ہو کر ڈوماسے رابطہ کیا۔

”پھر..... کیا کرتا ہے.....؟“ دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں سوال کیا گیا۔
”کیا تم اس پوزیشن میں ہو کہ کسی طرح اسے قابو کر سکو؟“

”نہیں.....“ جواب ملا۔ ”میں تنہا ہوں اس لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ البتہ اس کا تعاقب کیا جاسکتا ہے۔“
”اس میں بھی رسک ہے۔ ممکن ہے اس کا کوئی دوسرا ساتھی بھی آس پاس موجود ہو۔“ ہاشم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کی نظریں دروازے کی آڑ سے مطلوبہ شخص پر تھیں جو اس وقت موبائل پر کسی کے نمبر پر کچھ کر رہا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں سیون اسٹار کی جانب سے کیا احکامات ملے ہیں لیکن..... میرا ذاتی خیال ہے کہ اسے فوری طور پر شہکانے لگانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی، زیادہ رسک لینا بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“

”ٹھیک ہے..... اگر وہ کہیں جائے تو اس کا تعاقب کرو۔ میں سیون اسٹار کی مرضی معلوم کر کے تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“

ہاشم نے سلسلہ منقطع کر کے نظریں دوبارہ اسپورٹس کار پر جمادیں جو ایک لمحے بعد ہی حرکت میں آ گئی تھی۔ اسے

یقین تھا کہ ڈوماس کے تعاقب میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اسپورٹس کار نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی ہاشم کا ذہن اپنے شکار کے بارے میں کوئی آخری نتیجہ اخذ کرتا رہا۔ پانچ سات منٹ بعد اس نے دوبارہ ڈوماسے رابطہ قائم کر لیا۔ ”تم اس وقت کہاں ہو.....؟“

”اسپتال روڈ پر.....“
”کیا اندازہ ہے..... کوئی دوسری کار تو تمہارا تعاقب نہیں کر رہی؟“

”میں نے سیون اسٹار سے بات کر لی ہے۔“ ہاشم نے ایک آخری فیصلہ کر کے پرسکون انداز میں کہا۔ ”ادھر سے بھی تمہارے مشورے کو پسند کیا گیا ہے۔ کسی مناسب جگہ موقع دیکھ کر سوٹ کیس پارسل کرو..... میں دو گھنٹے بعد تم سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔“

”ایک مشورہ میں بھی دینا چاہوں گا۔“ دوسری جانب سے ڈوماس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ممکن ہے کہ کچھ اور نفری بھی تمہاری نگرانی پر مامور ہو..... ایسی شکل میں تمہارا کسی دوسری جگہ شفٹ ہو جانا زیادہ بہتر ہوگا۔“

”پریشان مت ہو مائی ڈیئر..... میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوں۔“ ہاشم نے اپنے جیلے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

فرحین کے بار بار سمجھانے کے بعد لیاقت حسین نے بھی ان پر اسرار واقعات سے الجھتا کم کر دیا تھا جو دوسروں کے کہنے کے مطابق رونما تو ہوئے تھے۔ جبکہ وہ بھی شریک ہوتا تھا لیکن ان واقعات کی تفصیل دوسروں کو معلوم ہوتی تھی۔ خود لیاقت حسین بھول جاتا تھا۔ دوسرے اس سے معلومات کرتے تو اس کا الجھ جانا قدرتی امر تھا لیکن فرحین کے سمجھانے کے بعد اس نے اپنے ذہن کو اس ایک بات سے مطمئن کر لیا تھا کہ جو کچھ ناقابل یقین صورتیں اس کے ساتھ پیش آرہی تھیں ان کا کوئی نہ کوئی تعلق اس ایک جنگی خاک سے ضرور تھا جس سے بزرگ نے اسے نوازا تھا اور پھر غائب ہو گیا تھا۔ تاہم بزرگ کی نصیحت کے پیش نظر اس نے وہ بات ذہن کے سات پردوں میں چھپائی تھی۔ اس سے یہی کہا گیا تھا کہ اگر اس نے اس سربستہ راز کو زبان پر لانے کی غلطی کی تو شدید خسارے سے دوچار ہو جائے گا۔

اس وقت وہ صبح کا ناشا کرنے کے بعد ڈیوٹی پر جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ فرحین نے اس کے قریب آ کر کہا۔

کشکول

”کیا بات ہے۔ آج تو کچھ زیادہ ہی کنگھی پھیر رہا ہے سر میں۔“
”سچ بتا دوں.....“ لیاقت حسین نے فرحین کے سراپا پر نظر ڈال کر اسے چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”تو برا تو نہیں لانے کی؟“

”چل نہ بتا.....“ فرحین نے غخرے سے جواب دیا۔
”جب تیرے پیٹ میں مروڑ ہوگی تو خود ہی اگل دے گا۔“
”بیگم صاحب کی وجہ سے اب تو نے بھی خاصی پٹر پٹر باتیں کرنی سیکھ لی ہیں۔“

”سراج صاحب کی صحبت نے تجھے بھی چکر بازی کے راستے بتا دیے ہیں۔“ فرحین نے سنجیدگی سے چھیڑا۔ ”تب ہی تو بھول جانے والی باتیں کر کے اصلیت پر پردہ ڈالتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ کہیں تیرا بھاڑا نہ پھوٹ جائے۔“

جواب میں لیاقت حسین نے فرحین کے چہرے پر پھونتی شفق کو دیکھا تو اس کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فرحین کو دیو چا پھر سرسراتی آواز میں کہا۔
”اگر میں ڈیوٹی پر جانے میں آدھے گھنٹے کی دیر کر دوں تو بیگم صاحب سے میری سفارش کر دے گی۔“

”دماغ چل گیا ہے حیرا؟“ فرحین اس کا مقصد بھانپ کر شرماتے ہوئے ہوئی۔ ”زیادہ مستی نہ کیا کر..... جلدی سے تیار ہو کر ڈیوٹی پر جا..... مجھے بھی بیگم صاحب کی طرف جانا ہے۔“

لیاقت حسین نے اس کی بات مان لی۔ وہ خود بھی ڈیوٹی کے معاملے میں پابندی وقت کا قائل تھا لیکن جاتے جاتے بھی وہ حسب معمول اس کی پیشانی کا بوسہ لینا نہیں بھولا تھا جو روزمرہ کا معمول تھا۔ انیسویں سے نکل کر وہ سیدھا برابر والے پتے پہنچا تو باہر سراج کی گاڑی دیکھ کر رک گیا۔

”ڈیوٹی صاحب کب آئے؟“ اس نے گاڑی سے پوچھا۔

”ابھی دس منٹ پہلے ہی آئے ہیں۔“
لیاقت حسین گاڑی کو گیراج سے نکال کر پورٹیکو میں لے آیا۔ دس منٹ بعد سراج اور عثمان صاحب ایک ساتھ ہی اگلے تھے۔ سراج سرسری طور پر لیاقت حسین سے اس کی فیریت دریافت کر کے چلا گیا، عثمان صاحب اپنے دفتر آ گئے۔ حسب معمول لیاقت حسین نے ان کے دفتر میں جانے کے بعد ان کا بریف کیس پہلی نشست سے اٹھایا اور دفتر میں چلا گیا جہاں عثمان صاحب کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ لیاقت حسین خاموشی سے بریف کیس رکھ کر

حاضر جوابی

تیورنگ بادشاہ نے جب سرقدح کیا تو ایک اندھی عورت کھڑی گئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔
”حیرا کیا نام ہے؟“

عورت بولی ”میرا نام دولت ہے۔“
بادشاہ نے ہنس کر کہا ”کیا دولت اندھی ہوتی ہے؟“

عورت بولی ”اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے گھر کیوں آتی؟“

حذیفہ کا شگوفہ، کراچی سے

حساب بوابو

ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا غالب چنگ پر پڑنے ہوئے کراہ رہے تھے۔
میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا۔
”بھائی! تو سید زادہ ہے، مجھے کیوں گتہ کار کرتا ہے؟“

انہوں نے نہ مانا اور کہا۔ ”آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میرا بے کی اجرت دے دیجئے گا۔“
مرزا نے کہا۔ ”اس کا مضا تقہ نہیں۔“

جب وہ میر داب چکے، انہوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا۔

”بھیا! کسی اجرت..... تم نے میرے پاؤں دابے، میں نے تمہارے پیسے دابے، برابر ہوا۔“
مرسلہ: شعل حسین، یو ایس اے

جانے لگا تو عثمان صاحب نے اسے اشارے سے رکنے کو کہا۔ وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو منٹ بعد انہوں نے فون سے فارغ ہو کر لیاقت حسین سے کہا۔

”سراج آج مجھ سے تمہارے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔“

”سب خیریت تو ہے صاحب.....؟“
”وہ چھپیں ہفتہ دس دن کی خاص وجہ سے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔“

”جیسا آپ کا حکم ہوگا میں دیسا ہی کروں گا۔“ اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

”لیاقت حسین.....“ سینہ عثمان نے قدرے سنجیدگی

سے دریافت کیا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کچھ دن تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب، کوئی کام ہوگا ڈپٹی صاحب کو۔“

”ایک بات کہوں..... لیکن شرط یہ ہے کہ تم برا نہیں مانو گے۔“

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں صاحب..... میں بھلا آپ کی کسی بات کا برا کیسے مان سکتا ہوں۔“

”سراج کے علاوہ میرا اور بیگم صاحبہ کا بھی یہی خیال ہے کہ اکثر ایسی باتیں ہمارے ہوش و حواس میں ہوتی ہیں جس میں تم بھی شریک ہوتے ہو لیکن..... وہ باتیں بعد میں تمہارے ذہن میں محفوظ نہیں رہتیں۔“

لیاقت حسین ہنٹ چبا کر رہ گیا۔ جو بات عثمان صاحب دریافت کر رہے تھے وہ خود بھی اس پر بار بار الجھ چکا تھا لیکن..... ڈور کا کوئی سراغ تلاش نہیں کر سکا تھا۔ اس وقت بھی شپٹا کر رہ گیا۔ کچھ تامل سے بولا۔

”صاحب..... میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ.....“

”نہیں..... نہیں۔“ عثمان صاحب نے اس کی الجھن کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے کہا۔ ”ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ تمہیں کچھ باتیں یاد نہیں رہتیں۔ تم جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش نہیں کرتے..... سراج اور بیگم صاحبہ کی بھی یہی سوچ ہے۔“

”ایسا کیوں ہوتا ہے صاحب؟“ لیاقت حسین نے اس بار بڑی عاجزی سے دریافت کیا۔

”اللہ کی قسم! میں وہی بہتر جانتا ہوں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں تم نے اب تک انجانے میں جو بھی قدم اٹھایا ہے اس میں دوسروں کی بھلائی ہی شامل تھی۔“ سیٹھ عثمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تمہاری ایمانداری یا کوئی اور ادا خدا کو پسند آگئی ہو جس کے سبب وہ تمہیں نواز رہا ہو۔ تم نے اب تک میرے اور سراج کے علاوہ..... دوسرے جن لوگوں پر بھی جو احسان کیا ہے، وہ سب اس کے شکر گزار ہیں۔“

لیاقت حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ذہن میں پھر گولے اٹھنے لگے۔ سیٹھ عثمان نے اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ سراج آج یا کل کسی وقت تمہیں لینے آجائے۔ تم فرحین کی طرف سے پریشان مت ہونا۔ بیگم صاحبہ اس کا خیال رکھیں گی۔“

لیاقت حسین جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ عثمان نے ریسیور اٹھا کر ”ہیلو“ کہا لیکن دوسری جانب سے بولنے والے کی آواز سنتے ہی وہ بے حد سنجیدگی سے بولے۔

”پانچ لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی خان صاحب، بزنس میں کوئی بڑی رقم ایک جگہ پھنس جائے تو ساری رولنگ خراب ہو جاتی ہے..... میں مانتا ہوں کہ اب تک آپ نے میری ڈیمانڈ وقت پر پوری کی ہے لیکن میری مجبوریوں پر بھی غور کریں۔ بات اگر صرف رقم کی ہوتی تو میں سابقہ تعلقات کی وجہ سے آپ سے تقاضا بھی نہ کرتا لیکن بیرون ملک سے جن کاروباری لوگوں کے آرڈر پورے نہیں ہو رہے..... وہ بھی تقاضا کر رہے ہیں..... میں نے کسی وجہ سے اس نئے کام میں انویسٹ کیا تھا لیکن مال کی سپلائی میں اگر بے قاعدگی ہوئی تو ہماری فرم کی ریپویشن بھی متاثر ہوگی۔ سارا کھیل ساکھ کا ہے۔ یہ آپ بھی سمجھتے ہوں گے۔ میں آپ کی پریشانی سمجھ رہا ہوں لیکن کسی سے آپ کی دوستی یا دشمنی آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میرا بھلا اس سے کیا تعلق..... جی ہاں، اونچ نیچ بھی ہوتی رہتی ہے لیکن آپ کی طرف سے مال سپلائی نہ ہونے کے سبب ہمارے بزنس پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ بھی اس پر غور کریں۔“ سیٹھ عثمان کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ چند لمحے وہ دوسری جانب سے کی جانے والی بات سنتے رہے پھر تھلا کر بولے۔ ”ٹھیک ہے، میں ایک ہفتے اور انتظار کر لیتا ہوں لیکن اس کے بعد باہر والوں کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی خاطر مجھے لوکل مارکیٹ سے جو چیزیں خریدنی ہوں گی ان کی قیمت کا آپ کو بھی اندازہ ہوگا..... معاہدے کی رو سے جو زیادہ لاگت آئے گی اس کی ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی..... یہ سوچنا آپ کی دوسری ہے، میری نہیں۔“ سیٹھ عثمان نے جھلا کر فون بند کر دیا۔

”کیا بات ہے صاحب..... کس کا فون تھا؟“ لیاقت حسین نے غیر اختیاری طور پر پوچھ لیا۔

”ہے ایک ماربل سپلائی کرنے والی پارٹی جس نے وقت پر مال نہیں بھیجا اور اب مزید مہلت مانگ رہے ہیں۔“ ماربل کے کاروبار کا حوالہ سن کر لیاقت حسین کے دل میں اپنے والد سردار سرفراز خان کا خیال ابھر آیا۔ وہ بھی بڑے پیمانے پر ماربل سپلائی کا کام کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ سوات (بونیر) سے آنے والا قیمتی پتھر اسی کے علاقے میں آتا تھا جہاں اسے کرش کرنے کے بعد مختلف صورتوں میں ڈھالا جاتا تھا، نوشہرہ سے جہاں کثیرہ تک بے شمار چھوٹے بڑے

کشمکش

تاجر اس کام میں ملوث تھے جو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی خاطر اوچھے بھٹکنڈے بھی اختیار کرتے تھے۔ بعد میں ان کی دشمنیاں پشت در پشت چلتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ لیاقت حسین اس بات سے بھی واقف تھا اس کا باپ خان سرفراز خان ماربل سپلائی کرنے والے بڑے تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ ایک دو بار کچھ دوسرے کاروباری لوگوں نے اسے بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن بعد میں ہونے والی سخت کارروائی کے بعد وہ بھی ایک ایک کر کے سردار سرفراز خان کی اونچی حویلی تک ہاتھ بائدھے چلے آئے تھے۔ لیاقت حسین اپنے خیالوں میں کم تھا جب سیٹھ عثمان نے اسے مخاطب کیا۔

”تم کیا سوچنے لگے؟“

”آپ کو نقصان ہو اور مجھے دکھ نہ ہو.....“ لیاقت حسین نے بات بنانے کی کوشش کی۔

”یہ تمہارا دوسرا نہیں ہے لیاقت حسین..... بزنس میں اس قسم کے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں۔ تم فکر مت کرو، میرا جو نقصان ہوگا وہ معاہدے کی رو سے مال سپلائی کرنے والے کو بھگتنا پڑے گا۔“

لیاقت حسین خاموشی سے دفتر سے باہر آ گیا لیکن اس کے ذہن میں باپ کا جو خیال آیا تھا اس نے اسے اندر سے مضطرب ضرور کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کسی معاملے میں ٹپک دکھانے کا عادی نہیں تھا۔ پتھر کا کاروبار کرتے کرتے اس کا دل بھی پتھر ہو گیا تھا جو اس نے فرحین کے ساتھ اسے شادی کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی اپنی حویلی کے دروازے بھی اس پر بند کر دیے تھے لیکن لیاقت حسین اولاد ہونے کے ناتے باپ کی اس شفقت اور محبت کو بھی فراموش نہیں کر سکا تھا جو اس نے لیاقت حسین کو پال پوس کر جوان کرنے کی خاطر کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جو بیٹا اس کے اور باپ کے درمیان پیدا ہوئی تھی وہ کبھی نہ کبھی ضرور بھر جائے گی لیکن وہ وقت کب آئے گا؟ اسے اس کا اور اک نہیں تھا۔ ہر چند کہ سیٹھ عثمان نے کاروباری پارٹی کا کوئی نام احوالہ نہیں دیا تھا لیکن ایک غلطی تھی جو اندر ہی اندر اس کے فون کو جوش و لاریں تھی۔ اس کی رگوں میں گردش والا خون بھی فراز خان کے علاوہ کسی اور کا نہیں تھا۔

سیٹھ عثمان کے آفس سے نکل کر وہ باہر لان میں رکھی ہوئی ایک بیک کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ قریب ہی آفس کا چہرہ اسی بھی موجود تھا۔

”کیا بات ہے لیاقت بھائی؟“ اس نے کریدنے کی

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے۔

نکل کر آزادی کے ارادے سے ادھر ادھر بھاگتا ہے لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے.....؟ ملی ایک جست لگا کر اسے دوبارہ دیوچ لیتی ہے۔

”میں اس مثال سے کیا سمجھوں؟“ شبنم نے ڈرتے ڈرتے وضاحتی نظروں سے سوال کیا۔

”میرا وعدہ قائم رہے گا۔ جو فاصلہ ہمارے درمیان ہے میں اسے پھلانگنے سے حتی الامکان گریز کروں گا لیکن تمہاری آزادی کا پروانہ جاری کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔“

”میری تصویریں اور اس کا ٹکٹو.....“ شبنم نے نظریں جھکا کر مردہ سی آواز میں کہا۔ ”اس کا احساس مجھے کچھ کے لگا رہا ہے گا۔“

”کیوں؟..... کیا تمہیں میرے وعدے پر یقین نہیں ہے؟“ شیخ حامد کا لہجہ جارحانہ ہو گیا۔

”سرسر..... میرا یہ مطلب.....؟“

”پلیز.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر حتی اعزاز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”دوبارہ اس ذکر کو نہ چھیڑنا..... ویسے میں کوشش کروں گا کہ تمہاری درخواست پر بھی فرصت سے غور کر سکوں۔“ پھر اس سے پیشتر کہ شبنم اس موضوع پر کوئی احتجاج کرتی اس نے بات بدل کر دریافت کیا۔ ”میڈم روپی پر تمہارے اختیار کی سطح کس حد تک بلند ہو چکی ہے؟ کیا وہ تم پر مکمل اعتماد کرنے لگی ہے۔“

”یہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے.....“ شبنم نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”پچھلی ملاقات میں میڈم نے بتایا تھا کہ وہ آپ سے مل چکی ہیں اور آپ سے ان کے تعلقات بھی خالص پرانے ہیں۔“

”ہاں.....“ شیخ حامد نے خلا میں بہت دور تک گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”ان ہی سادہ تعلقات کی روشنی میں مجھے میڈم کی زیادہ فکر بھی رہتی ہے۔“

”آئی۔ سی.....“ اس نے جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کی۔ ”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ میڈم کا اس حد تک خیال رکھتے ہیں۔“

جواب میں اس نے شبنم کو تیز نظروں سے گھورا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے چلنے کی کوپر کھ رہا ہو۔ ان نظروں کی سرد مہری سے شبنم بھی شپٹا کر رہ گئی۔

سسپنس ڈائجسٹ

”میں سمجھی نہیں باس؟“

”افضل خان کا خوبصورت اپارٹمنٹ یاد ہے تمہیں.....؟“

”ہاں..... اسے شاید پولیس نے ابھی تک سیل کر رکھا ہے؟“ شبنم کا تجسس جاگنے لگا۔

”وہ بھی میری مرضی سے ہوا تھا اور اب.....“ شیخ حامد نے شبنم کے قریب ہوتے ہوئے سرسراہٹ آواز میں کہا۔ ”اب جو کچھ ہو گا وہ بھی میرے اشارے پر ہو گا۔“

شبنم کسمسانے لگی۔ وہ شیخ حامد کے بڑھتے ہوئے قدم اور ارادے بھانپ چکی تھی لیکن اس کی خفیہ طور پر اتاری ہوئی مخرب اخلاق تصویریں اس کے پیروں میں طوق غلامی ثابت ہوئی تھیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ کوئی درخواست کرتی، شیخ حامد نے اپنے بھدے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ لگا دیے، ایک لمحے تک اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر علیحدہ ہو کر بولا۔

”میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں..... دس روز بعد تم افضل خان کے فلیٹ کی مالک ہوگی۔ اس عرصے میں اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت انداز میں ڈیکوریٹ کیا جائے گا۔ اس کے بعد تم اگر چاہو تو افضل خان کو بھی سر چھپانے کی جگہ دے سکتی ہو۔“

”کیا اسے ساتھ رکھنا مناسب ہو گا؟“ شبنم نے اپنے نازک اور میٹھے رد مال سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے زبردستی مسکراتے کی کوشش کی۔

”ہاں..... جب تک میں اسے پوری طرح آزمانہ لوں، اسے آزادی سے کھلا نہیں رکھا جاسکتا۔“

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شیخ حامد نے اپنی ایزی چیز پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”جو افراد تیزی سے ترقی کرتے ہیں کبھی ایک معمولی سی بھول انہیں دوبارہ زمین پر لے آتی ہے۔ تمہیں بھی میرے لیے کام کرتے ہوئے ہر لمحے اس اہم نکتے کا خیال رکھنا ہو گا۔“

”کچھ میں بھی کہنا چاہوں گی۔“ بگ باس کے بعد شبنم نے بھی سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے دلی زبان میں کہا۔

”کہو.....“

”رستم علی کے خلاف حسب نشا کامیابی حاصل کرنے کے بعد میں بھی آپ سے ایک پرانی خواہش پر غور کرنے کی درخواست کروں گی۔“

”سمجھ رہا ہوں۔“ وہ شبنم کو دیکھ کر زہر خند سے بولا۔ ”ملی اور جو ہے کے کھیل میں چوبار بار اس کے بچوں سے

”ماربل کا ٹرک بھیجنے والی پارٹی کون ہے؟“ لیاقت حسین نے بے چینی سے سوال کیا۔

”میں نے تمہیں کریدنے سے منع کیا ہے۔ دوبارہ اس معاملے میں زبان کو قابو میں رکھنا۔ جو کچھ ہانڈی میں ہے وہ خود باہر آ جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اشارہ اور دے رہا ہوں..... کچھ قوتیں پھر سر ابھارنے کی کوششوں میں مصروف ہیں، ان سے ہوشیار رہنا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو.....؟“ لیاقت حسین نے بے چینی سے دریافت کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو وہ اندر ہی اندر الجھنے لگا۔

شبنم اس وقت شیخ حامد کے ساؤنڈ پروف کمرے میں ہی تھی جب کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اندر داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی فاتحانہ مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے وہ شبنم کے قریب آ کر رکھا۔ ایک لمحے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیا پھر معنی خیز لہجے میں بولا۔

”کیا تم اس خوبصورت مووی کو دیکھ چکی ہو؟“

”نہیں۔“ شبنم نے تیزی سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے افضل خان سے جو کام لیا ہے اس کے نتائج میری توقع سے کہیں زیادہ خوبصورت اور شاندار ہیں۔“

شبنم بات کی یہ تک پہنچ کر مسکرا دی۔ وہ سمجھ گئی کہ بگ باس رستم علی اور اس کی بیوی کی مووی کو دیکھنے ہی کی خاطر کمرے سے گیا ہو گا۔ اس نے سکون کا سانس لیا لیکن اس گمناؤنے مسئلے پر وہ مکمل کربات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”تم اپنی اس شاندار کارکردگی پر مجھ سے کیا توقع رکھتی ہو؟“ شیخ حامد نے بے تکلفی سے اس کے دونوں شانوں پر بیک وقت ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

شبنم خوش ہونے کے بجائے اندر ہی اندر سہم گئی، دل پر جبر کر کے بولی۔ ”آپ نے جو مراعات مجھے دے رکھی ہیں وہی بہت ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ تم اب ایک ایسے انعام کی مستحق ہو جو افضل خان کو بھی اس بات کا احساس دلا سکے کہ پالتو کتے صرف مالک کے اشارے پر دم ہلانے کے عادی ہوتے ہیں۔ کسی وجہ سے بھی بھونکنا ان کے لیے قائمہ مندر ثابت نہیں ہوتا۔“

تبدیل ہو گیا۔" افضل خان کا اپارٹمنٹ دس بارہ روز بعد تمہاری ملکیت ہوگا اور..... تمہیں اسے اپنے ساتھ رہنے پر رضامند بھی کرنا ہوگا..... یہ..... میری درخواست نہیں، میرا حکم ہے۔"

"او۔۔۔۔۔ کے پاس....." جواب میں تابعداری کا انداز اختیار کیا گیا۔ "میں نے پہلے بھی اسے آپ کی ہی خواہش پر لفٹ دی تھی۔"

"تم اب جا سکتی ہو۔" شبیم جانے کے ارادے سے اٹھی تو اسے اشارے سے روک کر بڑے سردار خشک لہجے میں باد کر دیا گیا۔ "میں نے تمہارے استغفے کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ مجھے یاد ہے..... اس لیے اب تم دوبارہ ریمائنڈ کرانے کی کوشش بھول کر بھی نہ کرنا۔"

"رائٹ پاس....." شبیم تیزی سے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی، اس نے چہرے سے اپنے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا مگر اندر ہی اندر جھلس کر رہ گئی تھی۔ اس کے لیے شیخ حامد کی یہی حد سے زیادہ دوراندیشی بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی کہ اس نے افضل خان کے سلسلے میں اسے ساتھ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ایک اور ایک مل کر گیارہ بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ اس کے ذہن میں کل کے بارے میں مختلف منصوبے ابھرنے لگے۔

شبیم کے جانے کے بعد شیخ حامد نے انٹرکام کے ذریعے کنول کو دوبارہ طلب کیا۔ صبح سے اسے دو خوشخبریاں مل چکی تھیں۔ دو شاندار کامیابیاں..... ایک شادی کے سلسلے میں کنول کی ماں کی رضامندی..... دوسری وہ خفیہ مووی جو اب سینئر سٹیم علی آغا خانی کو اس کے سامنے کسی پالتو جانور کی طرح دم ہلانے پر مجبور کر سکتی تھی۔

کنول شرماتی، مل کھاتی اپنے آفس سے نکل کر دوبارہ سامنے آئی تو شیخ حامد کے چہرے پر ایک لمحہ بیشتر نظر آنے والے تلخ تاثرات یک لخت غائب ہونے لگے، اس کی نظریں اس چمکتے ارغوانی جام پر منڈلانے لگیں جو نشے سے معمور تھا۔ ایسا خواب آور نشہ جو شیخ حامد کو ہمیشہ سے مرغوب تھا۔ کنول نظریں نیچی کیے اس کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تو شیخ حامد نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ تمہاری ماں کی ہاں نے میری اس خواہش کو پورا کیا ہے جو روز اول سے میرے دل میں چل رہی تھی۔"

"میں بھی اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گی۔" کنول کے شبیمی ہونٹ کپکپانے لگے۔ "میری خوش ہوگی کہ میں بہت جلد تم سے نکاح کر لوں لیکن..... میں نے کہا تھا کہ یہ شادی خفیہ رہے گی۔ تمہیں ہر وہ چیز حاصل ہوگی جس کا میں وعدہ کر چکا ہوں مگر..... جہیں بہر صورت اپنی زبان بندی رکھنی ہوگی اور میں..... میں تم سے بے وفائی نہیں کروں گا۔"

"مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔" "دفتر یا باہر کسی کو اس بات کی بھینک بھی نہیں ہونی چاہیے اور....." اس نے بڑی اپنایت سے کنول کے کپکپاتے ہاتھوں کو مضبوطی سے گرفت میں لے کر کہا۔ "کل تم دفتر آنے کے بجائے اپنا استغفائی کسی کے ہاتھ روانہ کر دینا۔"

کنول نے اسے حیرت اور وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ "میں اسٹاف کو یہی تاثر دوں گا کہ تم نے اپنی والدہ کی بیماری کی وجہ سے ملازمت چھوڑی ہے، اس کے بعد....." شیخ حامد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ہاتھ پر پیار سے دباؤ ڈالا تو کنول کا چہرہ تپ کر گھٹا ہو گیا، شیخ حامد کے اندک کا عیاش آدمی بھی سر ابھارنے لگا لیکن اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور کنول نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ شیخ حامد نے جھلا کر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ "کون.....؟"

"میں لودھی بول رہا ہوں سر.....!" "اب کیا بکواس کرنا چاہتے ہو.....؟" شیخ حامد کے چہرے پر کھنڈ کی کیفیت بتدریج بڑھنے لگی۔ "تم نے اس باسٹرڈ کے آفس جانے سے پہلے مجھ سے اجازت نہیں لی تو اب کیا بتانا چاہتے ہو.....؟"

"سر..... وہ....." لودھی ہکھلانے لگا۔ "مجھے حالات کا علم اپنے ذرائع سے ہو گیا ہے۔ جو کچھ ہو چکا اسے بھول جاؤ اور..... اپنی زبان بندی رکھنا، سیلاب کے ریلوں کا زور توڑنے کی خاطر انسان کو کبھی بھی اپنے باندھے ہوئے بند بھی توڑنے پڑتے ہیں۔ تمہاری حیثیت کسی معمولی بند سے زیادہ نہیں ہے۔ تم شاید میرا مطلب سمجھ رہے ہو گے۔"

"نہیں پاس..... لیکن وہ....." "گیٹ لاسٹ.....!" اس بار غرا کر کہا گیا۔ "جو کہا گیا ہے اس کا دھیان رکھنا ورنہ....." شیخ حامد نے جھلا کر ریسیور کریدل پر رکھ دیا، کنول اس کا موڈ خراب دیکھ کر بولی۔

کشکول

"آپ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں، ذرا ذرا سی بات پر....." "تم فی الحال اپنے کمرے میں جاؤ۔" شیخ حامد نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ کنول کے جانے کے بعد شیخ حامد نے اپنا خاص موبائل نکال کر بلیک ٹائیگر کے مخصوص کوڈ شیخ کیے۔ دوسری جانب سے نون سٹاکی دیتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ جھلا گیا۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے سلسلہ منقطع کر کے دو تین بار نئے سرے سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔

لودھی کی فون کال نے اس کا موڈ خراب کر دیا تھا، اب بلیک ٹائیگر کی خاموشی اسے گراں گزر رہی تھی، وہ مٹھیاں بھینچ کر ہونٹ کاٹنے لگا، اسے کسی بھی ماتحت کی عدم توجہی برداشت کرنے کی عادت نہیں تھی، ایک لمحہ تامل کے بعد اس نے دوسرے خاص آدمی کو کال کرنے کی خاطر موبائل اٹھایا۔ اسی وقت اس کا اپنا موبائل گنگنانے لگا۔ روشن ڈائل پر وہی نمبر ابھرا جس سے وہ رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو.....؟" سپاٹ لہجے میں سوال کیا گیا۔

"سر..... میں اس وقت نمبرون کی تباہ شدہ گاڑی سے خاصی دور کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو.....؟" شیخ حامد حیرت سے اچھل پڑا۔ "یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

"ابھی تفصیل نہیں بتا سکتا سر لیکن..... ایک بری خبر ضرور دے سکتا ہوں۔" دہی زبان میں جواب ملا۔ "تباہ شدہ گاڑی سے اس کی ڈیڈ باڈی ہی برآمد ہوئی ہے، غالباً کسی دوسری گاڑی نے قریب سے گزرتے ہوئے اسے نشانہ بنایا اور ہجوم میں گم ہو گئی۔"

"تفصیل معلوم کر کے مجھے دوبارہ کال کرو۔" شیخ حامد کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے شدت سے انتظار رہے گا۔"

دوسری جانب سے "نہیں سر" کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ شیخ حامد کے چہرے پر تفکرات کے گہرے بادل منڈلانے لگے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر نمبر نو کی اطلاع درست ثابت ہوگی؟ بلیک ٹائیگر کو اس کے خیال کے مطابق ٹھکانے لگا دیا تھا تو یہ ایک بڑا نقصان تھا۔ بلیک ٹائیگر جس مشن پر کام کر رہا تھا اس کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ شیخ حامد کی کوشی پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے۔ آج صبح بھی

اسے گھر سے نکلتے ہوئے بلیک ٹائیگر کی کال موصول ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "پاس، میں نے ایک ایسا ٹریس تلاش کر لیا ہے جس کے بعد مجھے ان لوگوں تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا جنہوں نے آپ پر حملہ کر کے اپنی موت ہی کو دعوت دی تھی۔"

"کون لوگ ہیں.....؟" "زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھنٹے اور انتظار کر لیں، اس کے بعد میں تفصیل سے ان کی نشاندہی کر دوں گا۔"

"کیا اس سازش میں ایک سے زیادہ پارٹیاں ملوث ہیں؟" "شام تک پارٹی کی نشاندہی بھی ہو جائے گی۔ فی الحال ایک سراغ ملا ہے۔ اسے قابو کرنے کے بعد باقی گرجیں بھی خود بخود کھلتی چلی جائیں گی۔" بڑے اعتماد سے کہا گیا تھا۔ "آپ فکر نہ کریں، میں انہیں پاتال کی تہ سے بھی نکال کر جہنم رسید کر دوں گا۔"

"گڈ..... کام ہوشیاری سے کرنا..... بساط کب پلٹ جائے؟ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ آئی وٹ یو گڈ لک اینڈ آل دی بیسٹ۔"

شیخ حامد کو بلیک ٹائیگر کی صلاحیتوں پر بڑا اطمینان تھا لیکن اب..... یہ گھنٹہ بھی خاک میں مل گیا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید نمبر نو نے دور سے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ غلط ثابت ہو لیکن..... دو گھنٹے کے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی تو وہ کسی زخمی درندے کے مانند اپنا ہی زخم چاٹنے پر مجبور ہو گیا..... اسے بلیک ٹائیگر کی موت سے زیادہ اس بات کا ملال تھا کہ اس کے دشمنوں کا نام اس کی زبان پر آتے آتے کیوں رہ گیا تھا؟

لیاقت حسین اس وقت سراج کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔

جس روز سیٹھ عثمان نے اسے بتایا تھا کہ سراج اس کو لینے آئے گا اسی رات تقریباً گیارہ بجے سراج اسے لینے آئے گی کیا تھا۔ اس وقت لیاقت حسین فرحین کے ساتھ بیٹھا گفتگو میں مصروف تھا۔ سراج والی بات اس نے فرحین کو بھی بتادی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فرحین دس روز تک اس سے علیحدہ رہنے پر احتجاج کرے گی لیکن فرحین نے اسے چھیڑنے کی خاطر کہا تھا۔

"تمہارے سراج صاحب بھی مجھے چپے رستم نظر آتے ہیں۔ پولیس والے ایک بے چاری بیوی کو بیڑیاں پہنا کر گھر

میں ڈال لیتے ہیں، اس کی طرف کوئی غلط نظروں سے دیکھے تو اسے تھانے میں بند کر کے پرانی روٹی کی طرح دھن ڈالتے ہیں لیکن خود ادھر ادھر منہ مارنے سے بھی باز نہیں آتے۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ لیاقت حسین نے فرحین کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اپنے سراج صاحب ایسے نہیں ہیں۔ میں نے انہیں بھی غلط راستے پر چلتے نہیں دیکھا۔“

”نہیں دیکھا، تو اب دیکھ لے گا۔“ فرحین نے یہ دستور معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”پولیس کے محکموں میں کیا نفری کی کمی ہے جو وہ تجھے کوئی توپ سمجھ کر لے جا رہے ہیں۔ ضرور کوئی خاص چکر ہوگا۔ میری ماں تو انکار کر دے کوئی خوبصورت بہانہ بنا کر۔ بزرگوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ پولیس والوں کی دوستی اور دشمنی سے اللہ ہی محفوظ رکھے۔“

”چھوڑ ان باتوں کو۔۔۔۔۔ یہ بتا، تو میرے بغیر رو لے گی، اکیلے دس بارہ دن؟“ لیاقت حسین نے بڑی محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”سچ بتا دوں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ تجھے میری قسم۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا، اس کی زلفوں سے کھینچنے لگا۔

”مم۔۔۔۔۔ میں بیگم صاحب کی طرف چلی جاؤں گی۔“

اس بار فرحین اپنے پیار کو چھپانہ سکی۔ ”تیرے بنا اس اکیلی انگلی میں میرا دل نہیں لگے گا۔“

”یہی بات تو سراج صاحب کے سامنے کہہ دینا۔“ لیاقت نے معصومیت سے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ تیرا کہا بھی نہیں ٹالیں گے۔“

”دماغ چل گیا ہے تیرا۔۔۔۔۔“ فرحین نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”ایسی باتیں کسی اور کے سامنے زبان سے نہیں نکالی جاتیں اور۔۔۔۔۔ تیرے سراج صاحب، وہ تو ایک نمبر کے گھاگ ہوں گے۔ کیا سوچیں گے میرے بارے میں؟“

ان کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں جب سراج بھی آگیا۔ لیاقت حسین نے اٹھ کر دروازہ کھولا، فرحین بھاگ کر مگن کی طرف چلی گئی۔ سراج نے پہلی بار انگلیسی کے اس حصے میں قدم رکھا تھا۔ وہاں کے رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر بولا۔

”فائن۔۔۔۔۔“ اس نے لیاقت حسین سے کہا۔ ”تمہاری گھر والی نے تو اسے بڑی خوبصورتی سے سجا رکھا ہے۔“

”یہ سب بیگم صاحب کی مہربانی ہے، ورنہ ہمارے پاس دو ٹوٹے پھوٹے بکسوں اور ایک بستر کے علاوہ اور کیا تھا۔“ لیاقت حسین نے صاف گوئی سے کہا۔

”سب سے قیمتی چیز تمہارا خلوص اور جاں نثاری ہے، لیاقت حسین! جس کے سامنے ان عارضی سجادوں چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں۔“

لیاقت حسین انکساری سے کسمسا کر رہ گیا۔ اس کے اصرار پر سراج بیٹھ گیا تو فرحین جلدی سے جانے کی ٹرے لیے سامنے آگئی، کچھ بکلیں اور محکمن چیزیں بھی ٹرے میں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ سراج نے کہا پھر لیاقت حسین کے ساتھ چائے بنے لگا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی پھر سراج اصل مقصد کی طرف آیا تو لیاقت حسین نے مسکرا کر کہا۔

”میں آپ کے کسی حکم سے انکار نہیں کر سکتا۔ صاحب نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آپ لینے آئیں گے۔“

”تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا فرحین۔۔۔۔۔؟“

سراج نے اس بار فرحین کے چہرے کے تاثرات پڑتے ہوئے دریافت کیا۔

”ملازمت تو ملازمت ہوئی صاحب۔“ فرحین نے نظریں جھکا کر مدغم لہجے میں کہا۔ ”اس میں فرمائندگی کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ لیاقت کی طرح میں بھی آپ کے کسی حکم سے انکار تو نہیں کر سکتی۔“

”آئی۔ سی۔۔۔۔۔!“ سراج نے پولیس والوں کی چال چلی۔ ”ٹھیک ہے، میں لیاقت کو ساتھ نہیں لے جا رہا۔ اب تو خوش ہو۔“

”میں نے منع تو نہیں کیا صاحب؟“ فرحین اپنی صاف گوئی پر سہم کر کھڑی ہوگئی۔ ”آپ شوق سے لے جائیں لیاقت کو۔ یہ اگر آپ کے کسی کام آگیا تو یہ بھی ہمارے لیے بڑی عزت والی بات ہوگی۔“

”دل سے کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ سراج نے اسے ٹھوٹا لیکن اس کا پولیس تجربہ بتا رہا تھا کہ فرحین کو لیاقت حسین کی جدائی منظور نہیں ہے۔

”دل میرے پاس کہاں ہے صاحب۔۔۔۔۔“ وہ نظریں جھکا کر شوخی سے بولی۔ ”وہ تو آپ کے لیاقت حسین کے پاس ہے۔“

فرحین کے جواب پر سراج بھی لاجواب ہو گیا۔ خود لیاقت حسین کو بھی حیرت تھی کہ فرحین نے ایک ہی جملے میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد لیاقت جانے لگا تو سراج نے جیب سے ایک نیا موبائل نکال کر فرحین کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اس میں لیاقت حسین کے علاوہ میرا اور الماس کا

نمبر بھی موجود ہے، تم جب چاہو ہم سے بات کر سکتی ہو۔ کوئی دشواری پیش آئے تو راحیلہ بھابی تمہاری رہنمائی کر دیں گی۔“

گھر سے جاتے وقت بھی فرحین نے لیاقت کو بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ اس وقت لیاقت انہی آنکھوں کے تاثرات میں غوطہ لگا رہا تھا جب سراج نے اسے بڑی سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

”لیاقت حسین۔۔۔۔۔ جانتے ہو۔۔۔۔۔ میں تم کو دس بارہ روز تک اپنے ساتھ کیوں رکھنا چاہتا ہوں؟ مجھے تمہاری ان پوشیدہ قوتوں کی ضرورت ہے جو تمہاری رہنمائی کرتی ہیں لیکن اس طرح کہ بعد میں تمہیں بھی کچھ یاد نہیں رہتا۔“

لیاقت حسین خاموش رہا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا، سراج نے بات جاری رکھی۔

”میں نے محسوس کیا ہے کہ جب بھی تم نے خدا کی راہ میں کوئی نیک کام کی ٹھانی۔۔۔۔۔ وہ تجھی قوتیں تمہارے کام آتی رہیں، میں بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کچھ ایسے ہی شیطان صفت مردود لوگوں کے غرور کو خاک میں ملانا چاہتا ہوں جو فرعون بن بیٹھے ہیں، ان کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ قانون کی بالادستی بھی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ایسے بدکرداروں کی سرکوبی کرنے میں اگر تم میرے کام آئے تو مجھے بھی سرخرو ہونے کا موقع مل جائے گا۔“

”لیکن صاحب۔۔۔۔۔ جب مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تو میں بھلا آپ کی کیا رہنمائی کر سکوں گا؟“ لیاقت حسین نے سادگی سے جواب دیا۔

”یہ سب اس قادر مطلق پر چھوڑ دو۔۔۔۔۔ جو دلوں کے بید بھی جانتا ہے۔“ سراج نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔

”میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب بھی تمہارے دل میں کوئی اچھا خیال آئے۔ کوئی بھی ایسی بات جو خود تمہاری سمجھ سے بالاتر ہو۔ وہ تم بلا تکلف مجھ سے کہہ دو گے۔“

”میں اب بھی آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا صاحب۔۔۔۔۔“ لیاقت حسین نے الجھتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا تو میں اس بات کا فیصلہ کس طرح کروں گا کہ کون سی بات آپ کے مقصد کی ہوگی؟“

”تم صرف میری کہی ہوئی بات پر عمل کرو۔۔۔۔۔ کیا صحیح ہے کیا غلط، یہ اوپر والے کی مرضی پر چھوڑ دو۔“

”ایک درخواست میں بھی کروں گا۔“

”کہو۔۔۔۔۔“

”جو بات میری زبان سے غیر اختیاری طور پر نکلے تو

ککشکول

گھر یلو مسائل کا بہترین حل

بیوی: ”ایک بات بولوں؟“

شوہر: ”نہیں۔“

☆ بیوی بازار سے گھر آنے کے بعد بولی۔

”یہ ڈاٹھا لو۔“

شوہر: ”اس میں ضرور میرے کھانے کی چیز ہوگی۔“

بیوی: ”ہاں، سیٹل ہیں۔“

☆ بیوی اور بے عزتی ایک جیسی ہوتی ہیں اچھی تب ہی لگتی ہیں جب دوسرے کی ہوں۔

☆☆☆

☆ ایک شریف آدمی کو کیا چاہیے۔

ایک بیوی جو نیک ہو۔

ایک بیوی جو خوب صورت ہو۔

ایک بیوی جو جھگڑ مند ہو۔

ایک بیوی جو گھڑ ہو۔

اور یہ چاروں بیویاں بڑے پیار سے مل کر رہیں۔

مرسلہ: شارقہ سلجوقی، جہانگیر آباد

آپ اس کا تذکرہ مجھ سے بعد میں بھی نہ کریں۔ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا تو بلا وجہ ذہن میں ایک کانٹا سا چبھ رہا جاتا ہے۔“

”میں نے تمہیں ہمیشہ دوست سمجھا ہے لیاقت حسین، اب بھی ایک دوست کی طرح تمہاری بات کا خیال رکھوں گا۔“

”شکریہ صاحب۔“ لیاقت حسین نے اسے تشکرانہ نظروں سے دیکھا پھر وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ کچھ بھولی بری یادیں اس کے ذہن میں کلبلائے لگیں، خاص طور سے اس کے ذہن میں ایک بار پھر صیغہ عثمان اور کسی ماربل سلائی کرنے والی پارٹی کی باتیں گونجنے لگیں، وہ سیٹھ عثمان اور سراج کے دوستانہ تعلق سے بخوبی واقف تھا۔ شاید سراج اس پارٹی کے سلسلے میں لیاقت حسین کی ذہنی کشش کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکا ہو؟ ایک پل کو اس کا دل چاہا کہ وہ سراج کو اس سلسلے میں کریدے لیکن۔۔۔۔۔ دوسرے ہی لمحے ہزاروں کے جملے اس کی سماعت میں صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے۔ ”ان باتوں کوئی الجھال کھانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔۔۔ وقت کا انتظار کرو۔۔۔۔۔ وقت اور حالات خود تمہاری

رہنمائی کریں گے۔۔۔۔۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا۔ جو کچھ ہانڈی میں ہے وہ خود باہر آ جائے گا۔

”کس خیال میں کم ہولیاقت حسین؟“ سراج نے بے تکلفی سے سوال کیا۔ ”کیا تمہیں بھی فرمین سے وقتی دوری پسند نہیں ہے؟“

”نہیں صاحب۔۔۔۔۔“ اس نے چونک کر جواب دیا۔

”میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔“

”اور کیا سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔؟“

”اگر میں آپ کے کسی کام نہ آ سکتا تو۔۔۔۔۔“

”اس سلسلے میں اپنے ذہن پر یوجہ نہ ڈالو۔۔۔۔۔ صرف ایک بات یاد رکھو، زندگی اور موت کی طرح کامیابی یا ناکامی بھی اللہ ہی کے اختیار کی بات ہے۔۔۔۔۔ ہمیں ہر حال میں صراطِ مستقیم پر چلنے کو کہا گیا ہے، آگے جو اسے منظور ہو۔“

لیاقت کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سراج کا موبائل گنٹلانے لگا۔ دوسری طرف سے ڈی آئی جی کراہڑ آغا منظور کے نمبر روشن دیکھ کر وہ چونکا۔ ”اس وقت کیسے یا کیا سر۔۔۔۔۔؟“ اس نے موبائل آن کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”ابھی کسی نامعلوم شخص نے مجھے ایک حیرت انگیز اطلاع دی ہے۔“ ڈی آئی جی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا تعلق سی سائڈ کے اس کمرشل ایریا سے ہے جہاں آج ہی ایک اسپورٹس کار کا حادثہ ہوا تھا، پولیس کو اس میں سے ایک خون آلود لاش بھی ملی تھی جسے کوئی مارکر ہلاک کیا گیا تھا۔ بعد میں ضروری کارروائی کے بعد لاش کو سردخانے میں شناخت کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔۔۔۔۔ جانتے ہو وہ لاش کس کی تھی؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔“

”اطلاع دینے والے کے مطابق اس شخص کی حیثیت بگ باس کی نظروں میں اس سے زیادہ اہم بھی جو خطرے کی بساط پر کسی گھوڑے کی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اسے بلیک فورس گروپ کا سرغنہ سمجھا جاتا تھا۔“

”کیا متاثرہ پارٹی نے بھی اس سلسلے میں کوئی بیان دیا ہے؟“ سراج نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”ابھی تک وہ خاموش ہی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں ان لوگوں پر نظر رکھنی ہوگی جو سردخانے سے لاش وصول کرنے آتے ہیں۔“

”میں اس کی ہدایت متعلقہ تھانے کے ایس پی کو دے چکا ہوں۔“ ڈی آئی جی نے کہا پھر سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”ایس پی اورنگ زیب کے بارے میں آپ کے پاس

کیا اطلاع ہے؟“

”میں سمجھا نہیں سر۔۔۔۔۔؟“ سراج نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ”کیا آپ کو کوئی اور خاص رپورٹ بھی ملی ہے؟“

”میں نے کل اسے دفتر آنے کو کہا ہے۔ آپ بھی۔۔۔۔۔ سائڈ دس بجے تک آجائیں تو مناسب ہوگا۔“

”اد کے سر۔۔۔۔۔ میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔“

دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوا تو سراج بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ اگر مرنے والا شخص حامد کا خاص آدمی تھا تو اس کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟ ایک مہینے کے لیے اس کے ذہن میں میڈم روبی کا نام گونجا لیکن پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اس بات پر غور کرنے لگا کہ ڈی آئی جی نے ایس پی اورنگ زیب کو کس مقصد سے بلایا ہوگا؟ کیا جس لاش کو سردخانے میں رکھوایا گیا تھا، اس کا کچھ تعلق اورنگ زیب سے بھی ہو سکتا تھا؟

رستم علی آغا خانی نے پورے دس روز بعد اپنے آفس میں قدم رکھا تو پورا عملہ اس کی مزاج پر ہی کوجھ ہو گیا۔ اسٹاف کو اس کی بیماری کی خبریں فراہم کی گئی تھیں۔ خود رستم علی نے بیٹے اور بہو پر بھی اپنی اچانک بیماری کا نہ صرف اظہار کیا تھا بلکہ ایک ہفتے پرانی ہیٹ اسپتال کے دی آئی جی روم میں بھی پورے آٹھ دن رہنا برداشت کر لیا تھا۔ ڈاکٹروں کی واقف کاریم نے بھی ان کی بھرپور مدد کی تھی، کچھ ایسے امراض کا شبہ ظاہر کیا تھا جس کی تصدیق کے بغیر کوئی یقینی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔

دارا رستم علی اور اس کی بیوی روشن کو بھی یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ بتایا گیا تھا۔ اسپتال میں رہنے کے دوران سوائے دارا اور شائلہ بیگم کے کسی کو بھی سرینس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر بات کو راز رکھا گیا تھا لیکن دارا جو بیرونی ملک سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ وہ اتنا طفلِ کتب بھی نہیں تھا کہ کسی شخص کو کوئی طرح ان باتوں کو حلق کے نیچے اتار لیتا۔

وقتی طور پر جس انداز میں ایمر جنسی کا اظہار کیا گیا۔ ایس بی لینس کے ذریعے رستم علی کو اسپتال شفٹ کیا گیا تھا، اس نے دارا کے اعصاب کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا لیکن گزر رہے وقت کے ساتھ اس کو بھی دال میں کہیں کا لا نظر آنے لگا تھا۔

اس رات دارا اور روشن نے، رستم علی اور شائلہ کے ساتھ ہی ڈنر لیا تھا، ڈنر کرتے وقت اس نے باپ یا ماں کے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہیں محسوس کی تھی جس سے وہ اندازہ لگا سکتا کہ اس کا باپ جو اپنی صحت اور خوراک پر خاص

کشکول

توجہ دینے کے معاملے میں کسی سے سمجھوتا نہیں کرتا تھا، اچانک کسی مرض میں مبتلا ہو کر اسپتال میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ دو روز تک وہ ڈاکٹروں سے سرکھپاتا رہا۔ نسب کا ایک ہی جواب تھا کہ ضروری تفتیش اور رپورٹ آنے تک حتی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ماں کے تاریک چہرے کو بھی دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتا لیکن تیسرے دن جب وہ ماں کے کمرے میں بیٹھا تھا تو روشن نے ساس کا سر سہلاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے پوچھا تھا۔

”مام۔۔۔۔۔ ڈیڈ کو اچانک کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ کیا آپ کو بھی کچھ نہیں معلوم؟“

”نسب مقدس کی بات ہے بیٹے۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے منہ بسورتے ہوئے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”بیماری اور موت کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔“

”کیا ڈیڈ نے کبھی اپنی کسی بیماری کا ذکر آپ سے بھی نہیں کیا تھا؟“ دارا نے ماں کا ہاتھ تھام کر بڑے لاڈ سے دریافت کیا۔

”کچھ دنوں سے وہ پریشان ضرور تھے۔ میں نے کئی بار کرید بھی لیکن انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔“ شائلہ بیگم نے خلا میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ان پر جو کچھ گزر چکی تھی اس کے تصور ہی نے اتنا بڑا حال کر دیا تھا کہ وہ بیٹے اور بہو سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے سے بھی کتر رہی تھیں۔

”آپ کو کس بات کا شبہ ہے؟“

”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔۔۔“ شائلہ بیگم نے بات ٹالنے کی خاطر کچھ سوچ کر کہا۔ ”اُدھر کئی بار وہ سینے میں تکلیف کی شکایت ضرور کر چکے تھے لیکن بات اتنی بڑھ جائے گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“

”جس رات ڈیڈ کو اسپتال شفٹ کیا گیا۔۔۔۔۔ کیا اس روز انہیں زیادہ تکلیف تھی؟“ روشن نے معلوم کیا۔

”ایک بڑی اہلی ضرور ہوئی تھی جس کے بعد انہوں نے لاکھ سمجھانے کے باوجود اسی وقت قالین پر اسٹین کلینر (STAIN CLEANER) اسپرے کیا، منع کرنے پر نہیں مانے۔ گھنٹوں صفائی میں لگے رہے پھر بستر پر دالیں آئے تو ان کا سانس پھول رہا تھا، اس کے بعد۔۔۔۔۔ انہوں نے خود ہی اسپتال کو فون بھی کیا تھا۔“

دارا نے ماں کا جواز چھڑے دل سے سنا۔ سن کر حلق کے نیچے بھی اتار لیا لیکن اس کا دل اس کہانی کو ماننے پر تیار نہیں تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی جھول ضرور تھا جو اس کے اندر کے تجسس کو ابھار رہا تھا۔ بزنس میں باپ کے ساتھ شریک

ہونے کے ناتے اسے بھی تمام کیفیت کا احساس تھا، ہزار کی اونچ نیچ، بزنس کی رونگ اور دیگر حالات کی خبریں بھی اسے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے ملتی رہتی تھیں۔ اسے اس بات کا بھی علم تھا کہ بزنس کا ایک اہم شعبہ بزنس رائیویری (BUSINESS RIVALRY) بھی ہے۔ اس ضمن میں اس کی ذاتی فہرست میں بھی شیخ حامد ایسوی انش کا نام ٹاپ پر تھا۔ ان ہی شبہات کی بنا پر رستم علی نے اپنی اور گھر کی حفاظت کی خاطر اسپتال سکیورٹی گارڈز کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دارا نے اس سلسلے میں باپ سے دہلی زبان میں استفسار بھی کیا تھا لیکن رستم علی نے اسے حفاظتی احتیاط ظاہر کر کے بات ٹال دی تھی۔

باپ کے اسپتال میں داخل ہونے کے بعد اس نے ڈیوٹی گارڈز کو کسی اور ذریعے سے ٹولنے کی کوشش کی تھی۔ گارڈز کے متضاد بیانات بھی اسے پوری طرح ہضم نہیں ہو سکے، ماں کی وضاحتیں بھی اسے مطمئن نہیں کر سکی تھیں۔ صرف اس کی چھٹی حس متواتر اس بات کا احساس دلا رہی تھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی اہم بات ضرور ہے جس کو ظاہر کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

”ماں۔۔۔۔۔“ اچانک دارا نے بڑی سنجیدگی سے ماں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ لگاتے ہوئے ڈور کا کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کاروباری انجمن کی وجہ سے ڈیڈ نے اپنے دل پر زیادہ اثر لے لیا ہو؟“

”مم۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ شائلہ بیگم کسمسا کر ہونٹ چباتے ہوئے بولیں۔ ”وہ مجھ سے اپنے کاروبار کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔“

”او۔۔۔۔۔ کے، آپ پریشان نہ ہوں، خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

چار چھ روز تک۔۔۔۔۔ دارا ذاتی طور پر معاملے کی کرید کرتا رہا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ چھٹے روز وہ اسپتال سے گھر آیا تو روشن نے دہلی زبان میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کے ڈیڈ کو کوئی بیماری لاحق نہیں ہے، اسپتال میں شفٹ ہو کر شاید وہ اپنے کسی دشمن کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سرینڈر (SURRENDER) کرنے کی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہیں۔“

”دہات۔۔۔۔۔؟“ دارا نے روشن کو پر تجسس نظروں سے گھورا۔ ”تم اس قدر یقین سے یہ بات کیسے کہہ رہی ہو؟“

”آج میں نے اپنی خاص ملازمہ کو ٹولنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پچھلے کچھ دنوں سے مجھے پریشان نظر آ رہی تھی۔“ نتیجہ کیا نکلا.....؟“ دارا نے بے صبری سے دریافت کیا۔

”وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے زبان کھولی ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ اگر اس کا حوالہ درمیان میں ہوگا تو اس کی لگی لگائی ملازمت بھی جاتی رہے گی۔“ روشن نے بات جاری رکھی۔ ”جس رات آپ کے ڈیڈ اسپتال شفٹ ہوئے تھے۔ اسی رات ہماری ایک ملازمہ کو بھی ایک اسپتال میں خفیہ طریقے سے داخل کرایا گیا تھا۔ میرا اشارہ گلابو کی طرف ہے۔ اس کے بائیں شانے پر گولی لگی تھی۔“

”گولی لگی تھی؟“ دارا نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ خبر تمہاری ملازمہ کو کس طرح معلوم ہوئی؟“

”جو ڈرائیور ٹیکسی کے ذریعے گلابو کو خفیہ طور پر لے گیا تھا اس نے رازداری کی قسم دے کر یہ بات بڑی مشکل سے اگلی ہے۔“ روشن نے مزید وضاحت کرتے وقت مسکرا کر کہا۔ ”وہ ڈرائیور اور میری ملازمہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“

دارا ایک لخت بے حد سنجیدہ ہو گیا، گلابو کی خبر سننے کے بعد اس کے ذہن میں بے شمار سوال گڈھ ہونے لگے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ ”وہ واردات کوٹھی کے اندر ہوئی تھی تو گلابو کو زخمی کرنے والا باہر ہی سے آیا ہوگا مگر..... کیا وہ صرف گلابو کو زخمی کرنے کی خاطر اسٹیشنل گارڈز کا حلقہ توڑنے کا رسک مول لے سکتا تھا؟ اگر نہیں..... تو پھر اس کا اصل ٹارگٹ کون تھا؟..... اس کی پشت پر یقیناً کسی خطرناک دشمن کا ہاتھ شامل ہوگا جس نے اپنے کسی تجربے کا راز آدمی کو اپنا مقصد پورا کرنے کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ کیا ہوگا..... وہ کون تھا؟ اور..... اور ماں نے ڈیڈ کو اٹھی ہونے اور..... کارپٹ کا داغ صاف کرنے کی جو کہانی سنائی تھی اس میں کس حد تک صداقت تھی.....؟“

پھر دماغ پر ڈرا زور دینے کے بعد درمیان کی تمام گرہیں خود بخود کھلتی گئیں۔ ایک امکانی خاکہ اس کے ذہن میں بڑی سرعت سے تکمیل پانے لگا۔

”گلابو کسی کام سے ڈیڈ کے کمرے میں گئی ہوگی۔ اسی وقت دشمن کا ہرکارہ دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ گلابو نے خوفزدہ ہو کر بھاگنے یا شور مچانے کی حماقت کی ہوگی، تو وہ بھی لپیٹ میں آگئی۔ محض گلابو کی خاطر کوئی دیوانہ رستم علی کی خواب گاہ میں رات گئے داخل ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا

تھا..... اس کا اصل ٹارگٹ یقیناً رستم علی ہی رہا ہوگا لیکن..... وہ منزل تک پہنچنے کے بعد واپس کیوں چلا گیا؟ اپنے ٹارگٹ کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ ماں نے ڈیڈ کی ”اٹنی“ والی بات اس حقیقت کو چھپانے کی خاطر گھڑنے کی کوشش کی ہوگی کہ گلابو کے زخم سے ٹپکنے والے خون کو ڈیڈ نے صاف کیا ہوگا۔ اس کام کو انجام دینے کی خاطر وہ کسی ملازم کو طلب نہیں کر سکتے تھے۔ ایک حقیقت کو مسخ کرنے کی خاطر کئی کہانیاں بن لی گئی تھیں۔ آٹھ روز بعد ڈیڈ ڈاکٹروں سے کلیئرٹس حاصل کر کے گھر آگئے، دو روز آرام کرنے کے بعد دفتر جانا بھی شروع کر دیا؟“

دارا کی انجمن بڑھتی چلی گئی، وہ معاملے کی تک پہنچ کی خاطر اس وقت بھی بستر پر لیٹا کر وٹیں بدل رہا تھا جب روشن کھسک کر قریب آگئی، دارا کے خوبصورت بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

”کیا اسٹائیڈی ڈارلنگ..... ڈیڈ نے جو کچھ کیا اس میں ان کی کوئی مصلحت بھی ضرور رہی ہوگی۔“

”آئی انگری و دیو لیکن..... جو شخص ڈیڈ کے بیڈروم تک پہنچ گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ کیوں لوٹ گیا؟“

”دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔“ روشن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہو سکتا ہے کہ گلابو کے زخمی ہونے کے بعد وہ بھٹکا کر فرار ہو گیا ہو یا پھر تمہارے ڈیڈ نے اس کی ڈیمانڈ پوری کر دی ہو۔“

”کیسی ڈیمانڈ.....؟“ دارا نے بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم رین سم (RANSOM) کے امکانات کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو۔ ممکن ہے ڈیڈ نے اس کی مطلوبہ رقم دے کر جان چھڑالی ہو۔“

”ایسی صورت میں بھی ہماری خاموشی دشمنوں کا حوصلہ مزید بڑھا دے گی۔“

”میں تمہیں کسی مہم جوئی کا مشورہ نہیں دوں گی۔ قوری طور پر تمہاری دخل اندازی ڈیڈ کے کسی سوچے سمجھے منصوبے کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“

دارا نے حالات کی روشنی میں روشن کی بات سے اتفاق کیا۔ بات گھر کی چار دیواری سے نکل کر اگر میڈیا تک پہنچ جاتی تو بزنس کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پوکیں درمیان میں آ جاتی تو رستم علی کی زندگی کو خطرے کے امکان کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے۔ جو خطرناک لوگ ایک بار گارڈز کا حلقہ پھلانگ کر اپنے مطلوبہ بیڈروم تک پہنچ سکتے

تھا..... اس کا اصل ٹارگٹ یقیناً رستم علی ہی رہا ہوگا لیکن..... وہ منزل تک پہنچنے کے بعد واپس کیوں چلا گیا؟ اپنے ٹارگٹ کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ ماں نے ڈیڈ کی ”اٹنی“ والی بات اس حقیقت کو چھپانے کی خاطر گھڑنے کی کوشش کی ہوگی کہ گلابو کے زخم سے ٹپکنے والے خون کو ڈیڈ نے صاف کیا ہوگا۔ اس کام کو انجام دینے کی خاطر وہ کسی ملازم کو طلب نہیں کر سکتے تھے۔ ایک حقیقت کو مسخ کرنے کی خاطر کئی کہانیاں بن لی گئی تھیں۔ آٹھ روز بعد ڈیڈ ڈاکٹروں سے کلیئرٹس حاصل کر کے گھر آگئے، دو روز آرام کرنے کے بعد دفتر جانا بھی شروع کر دیا؟“

دارا کی انجمن بڑھتی چلی گئی، وہ معاملے کی تک پہنچ کی خاطر اس وقت بھی بستر پر لیٹا کر وٹیں بدل رہا تھا جب روشن کھسک کر قریب آگئی، دارا کے خوبصورت بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

”کیا اسٹائیڈی ڈارلنگ..... ڈیڈ نے جو کچھ کیا اس میں ان کی کوئی مصلحت بھی ضرور رہی ہوگی۔“

”آئی انگری و دیو لیکن..... جو شخص ڈیڈ کے بیڈروم تک پہنچ گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ کیوں لوٹ گیا؟“

”دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔“ روشن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہو سکتا ہے کہ گلابو کے زخمی ہونے کے بعد وہ بھٹکا کر فرار ہو گیا ہو یا پھر تمہارے ڈیڈ نے اس کی ڈیمانڈ پوری کر دی ہو۔“

”کیسی ڈیمانڈ.....؟“ دارا نے بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم رین سم (RANSOM) کے امکانات کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو۔ ممکن ہے ڈیڈ نے اس کی مطلوبہ رقم دے کر جان چھڑالی ہو۔“

”ایسی صورت میں بھی ہماری خاموشی دشمنوں کا حوصلہ مزید بڑھا دے گی۔“

”میں تمہیں کسی مہم جوئی کا مشورہ نہیں دوں گی۔ قوری طور پر تمہاری دخل اندازی ڈیڈ کے کسی سوچے سمجھے منصوبے کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“

دارا نے حالات کی روشنی میں روشن کی بات سے اتفاق کیا۔ بات گھر کی چار دیواری سے نکل کر اگر میڈیا تک پہنچ جاتی تو بزنس کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پوکیں درمیان میں آ جاتی تو رستم علی کی زندگی کو خطرے کے امکان کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے۔ جو خطرناک لوگ ایک بار گارڈز کا حلقہ پھلانگ کر اپنے مطلوبہ بیڈروم تک پہنچ سکتے

تھا..... اس کا اصل ٹارگٹ یقیناً رستم علی ہی رہا ہوگا لیکن..... وہ منزل تک پہنچنے کے بعد واپس کیوں چلا گیا؟ اپنے ٹارگٹ کو زندہ کیوں چھوڑ دیا؟ ماں نے ڈیڈ کی ”اٹنی“ والی بات اس حقیقت کو چھپانے کی خاطر گھڑنے کی کوشش کی ہوگی کہ گلابو کے زخم سے ٹپکنے والے خون کو ڈیڈ نے صاف کیا ہوگا۔ اس کام کو انجام دینے کی خاطر وہ کسی ملازم کو طلب نہیں کر سکتے تھے۔ ایک حقیقت کو مسخ کرنے کی خاطر کئی کہانیاں بن لی گئی تھیں۔ آٹھ روز بعد ڈیڈ ڈاکٹروں سے کلیئرٹس حاصل کر کے گھر آگئے، دو روز آرام کرنے کے بعد دفتر جانا بھی شروع کر دیا؟“

دارا کی انجمن بڑھتی چلی گئی، وہ معاملے کی تک پہنچ کی خاطر اس وقت بھی بستر پر لیٹا کر وٹیں بدل رہا تھا جب روشن کھسک کر قریب آگئی، دارا کے خوبصورت بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر پوچھا۔

”کیا اسٹائیڈی ڈارلنگ..... ڈیڈ نے جو کچھ کیا اس میں ان کی کوئی مصلحت بھی ضرور رہی ہوگی۔“

”آئی انگری و دیو لیکن..... جو شخص ڈیڈ کے بیڈروم تک پہنچ گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ کیوں لوٹ گیا؟“

”دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔“ روشن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ہو سکتا ہے کہ گلابو کے زخمی ہونے کے بعد وہ بھٹکا کر فرار ہو گیا ہو یا پھر تمہارے ڈیڈ نے اس کی ڈیمانڈ پوری کر دی ہو۔“

”کیسی ڈیمانڈ.....؟“ دارا نے بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم رین سم (RANSOM) کے امکانات کو کیوں نظر انداز کر رہے ہو۔ ممکن ہے ڈیڈ نے اس کی مطلوبہ رقم دے کر جان چھڑالی ہو۔“

”ایسی صورت میں بھی ہماری خاموشی دشمنوں کا حوصلہ مزید بڑھا دے گی۔“

”میں تمہیں کسی مہم جوئی کا مشورہ نہیں دوں گی۔ قوری طور پر تمہاری دخل اندازی ڈیڈ کے کسی سوچے سمجھے منصوبے کو نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔“

دارا نے حالات کی روشنی میں روشن کی بات سے اتفاق کیا۔ بات گھر کی چار دیواری سے نکل کر اگر میڈیا تک پہنچ جاتی تو بزنس کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ پوکیں درمیان میں آ جاتی تو رستم علی کی زندگی کو خطرے کے امکان کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے۔ جو خطرناک لوگ ایک بار گارڈز کا حلقہ پھلانگ کر اپنے مطلوبہ بیڈروم تک پہنچ سکتے

تھے، وہ بات بڑھ جانے کی صورت میں رستم علی آغا خانی کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کرنے میں بھی دیر نہ لگاتے۔ بہت کچھ ممکن تھا۔

”ہمیں بہت سوچ سمجھ کر اور ڈیڑھ گواہوں میں لینے کے بعد ہی کوئی ایسا پلان بنانا ہوگا کہ کسی طرح سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

داررستم علی نے وقتی طور پر اپنا اضطراب کم کرنے کی خاطر روشن کے مہکتے وجود کو اپنے اور قریب کر لیا لیکن..... زندگی میں پہلی بار اسے خطرے کے بادل اپنے گرد بھی منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔

شبیم ذہنی طور پر بری طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔ عام حالات میں شاید وہ ایک دن بھی ملازمت برقرار نہ رکھتی لیکن بگ باس نے کسی خطرناک آکٹوپس کی طرح اسے بھی اس طرح اپنے پنجوں میں جکڑا تھا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اب..... جب اس کی قابل اعتراض تصویریں اس کی لاعلمی میں اتار کر محفوظ کر لی گئی تھیں۔ وہ جال میں پھنسی کسی بے بس پھلی ہی کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

صبح حامد نے اس سے مروتا پر کہا تھا کہ اس کے کچھ ضروری کام نمٹ جائیں تو وہ اس کے اسٹیفنی پر بھر دی سے غور کرے گا لیکن اب شبیم کو اس کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔ غیر اخلاقی حرکتوں کے سلسلے میں بھی ایک حد سے تجاوز نہ کرنے کا یقین دلانے کے باوجود اب وہ رفتہ رفتہ حدود کو پھلانگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شبیم کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ خاص طور پر جب بگ باس نے رستم علی آغا خانی والی خراب اخلاق مووی دیکھنے کے بعد شبیم کو سراہتے ہوئے خوشی کے اظہار کے طور پر بے تکلفی سے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا، شبیم نے اس زہر کو بھی دل پر جبر کر کے برداشت کر لیا لیکن اب وہ بڑی سنجیدگی سے غور کر رہی تھی کہ اگر بگ باس کی شکل میں ”آکٹوپس“ کی پیش قدمی اسی طرح جاری رہی تو شاید وہ بعد میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کوئی ایسا وقت آنے سے پیشتر اگر اس کے اختیار میں ہو تو موت کو زندگی پر ترجیح دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

اس وقت بھی وہ بستر پر نیم دراز ان ہی خیالات کی پریشان کن کشمکش سے دوچار تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار افضل خان کا تصور سرا بھر رہا تھا۔ افضل خان کی تمام قربانیوں کے باوجود اسے میڈم کے اغوا والے معاملے میں، جس میں

اس کی کوئی غلطی نہیں تھی، بگ باس نے محض اپنی مصلحتوں کے پیش نظر بڑی سنگین صورت سے دوچار کر دیا تھا۔ عرش سے اتار کر فرش پر بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ اگر قسمت نے یاوری نہ کی ہوتی۔ رستم علی آغا خانی اور ایس بی اورنگ زیب کی سرکوبی کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید افضل خان اسپتال سے نکالے جانے کے بعد موت ہی کو ترجیح دیتا۔ اس آڑے وقت پر بھی بگ باس نے شبیم کے ذریعے افضل خان کو داؤ لگانے کا منصوبہ بنا لیا تھا جس میں افضل خان قسمت کی یاوری سے کامیاب ہو گیا۔ ناکامی کی صورت میں وہ یا تو موت کو گلے لگا لیتا یا پھر باقی زندگی قید کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے گزار دیتا۔ لاٹری اپنے نام نکلنے کے بعد بگ باس نے اس کے حق میں کچھ رعایت کر دی تھی لیکن اب بھی وہ اس خیال سے کہ ”کہیں افضل خان پلٹ کر اسے ڈنک نہ مار دے“ اس کی طرف سے محتاط رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے شبیم کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ افضل خان کے قلیٹ میں منتقل ہونے کے بعد اسے بھی ساتھ رکھے تاکہ اس کی ایک ایک ہل کی نگرانی کی جاسکے۔

عام حالات میں شاید شبیم افضل خان کو ساتھ رکھنے پر آمادہ نہ ہوتی لیکن موجودہ صورت حال میں صرف ایک اہم کہاوت ”کبھی کبھی بیروں تلے چوٹی بھی پلٹ کر اپنے دشمن کو کاٹ لینے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔“ اس کے کانوں میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ ”ہاں ہی مرنے کے بعد بھی سوالا کھ کا ہوتا ہے۔“ اس روایت کے مطابق شاید افضل خان کی ماضی کی ناقابل بیان سختیاں بھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ضرور گونج رہی ہوں گی۔ شبیم اس تحریک کو اپنے خوبصورت قرب سے ایک ٹھیس پہنچا کر چنگاری سے شعلہ بنا سکتی تھی۔ یہ خیال کئی دنوں سے اس کے ذہن میں رہ کر ابھر رہا تھا۔ اس منصوبے پر عمل کر کے وہ اپنا پرانا انتقام بھی پورا کر سکتی تھی جس کے پیش نظر اس نے حامد ایسوی ایش میں ملازمت حاصل کی تھی۔

افضل خان کو اپنے حق میں پوری طرح ہموار کرنے کے بعد وہ میڈم روپی کو بھی ساتھ ملا کر ایک مضبوط محاذ قائم کر سکتی تھی۔ ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ بگ باس کے اندھے اعتماد سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیڈرز پرس میں کوئی آتشیں اسلحہ چھپا کر ساؤنڈ پروف کمرے میں اس سے ملاقات کرتی۔ دل پر جبر کر کے اس خطرناک آکٹوپس کو اس کا من پسند چار اڈا لیتی اور پھر خاموش پستول کی تمام گولیاں اس کے منخوس وجود میں اتار دیتی لیکن..... اس نے ابھی تک بھی اس خطرناک

کشکول

منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے اس بات کا خیال بھی تھا کہ جو شخص اپنی پرچھائیں سے بھی محتاط رہنے کا مادی ہو، وہ اپنی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے سے غافل نہ ہوگا۔ کہیں نہ کہیں کوئی ایسا خفیہ نظام ضرور ہوگا جو اس کے پاس پہنچنے سے پہلے اس کی نظروں میں آنے والے کا پورا پورا ایکسرے ضرور پیش کر دیتا ہوگا۔ اس شے کے بعد شبیم بھی کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی۔

دوبار گھر کلاک نے رات گیارہ کا اعلان کیا تو وہ چونکی۔ پرسکون نیند کی خاطر اس نے ذہنی خلفشار کو جھٹک کر ٹائٹ بلب روشن کیا۔ لائٹ آف کی پھر بستر پر دراز ہو گئی۔ طویل جمائی لے کر اس نے آنکھیں موندیں تو موبائل پر ہونے والی گنگناہٹ نے اس کے ذہن کو پھر منتشر کر دیا۔ روشن اسکرین پر بگ باس کا کوڈ نمبر دیکھ کر اس کا سکون پھر فارت ہو گیا۔

”میں باس!“ اس نے دل پر جبر کر کے فون آن کر لیا۔ وہ رات دس بجے کے بعد ہی موبائل آف کرنے کی مجاز تھی۔

”میں نے اس وقت تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“ سرمری انداز میں پوچھا گیا۔

”آپ حکم دیں سر..... اس وقت کیسے یاد کیا؟“ شبیم نے محتاط انداز اختیار کیا۔

”تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ افضل خان آج دوپہر ”اسٹار ان“ نامی ہوٹل میں شفت ہو گیا ہے۔ تم میرے طے شدہ منصوبے کے تحت اس سے مل سکتی ہو لیکن..... اس بات کا خیال رکھنا کہ کوئی تمہارا تعاقب نہ کر رہا ہو۔“

”کوئی خاص بات.....؟“ شبیم نے تعاقب کے ”دالے سے دبی زبان میں دریافت کیا۔

”کچھ چیوٹیوں کے پر نکل آئے ہیں.....“ معنی خیز انداز میں کہا گیا۔ ”آج میرے اعتماد کا ایک آدمی بھی کام آگیا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا ممکنہ تعاقب بھی کیا جائے..... ویسے میں نے تمہاری سیکورٹی پر کسی کو تعینات کر دیا ہے۔ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں اپنے خاص لوگوں کا خاص خیال رکھتا ہوں۔“

”بھیکس باس..... ویسے بائی دی وے، کیا ہمارے آدمی کی موت کسی رد عمل کا نتیجہ تو نہیں ہے؟“ ”ہو بھی سکتا ہے لیکن سمندر میں ایک قطرہ کم ہو جانے کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”یو آر۔ ریٹی گریٹ باس۔“ شبیم نے مجبوراً سانسٹی جملے اختیار کیے۔

”مطلوبہ اپارٹمنٹ کچھ دنوں میں مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد تمہیں دیباہی عمل کرنا ہے جیسا میں نے پلان کیا ہے۔“

”میں انکار نہیں کروں گی باس لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گی۔“

”کہو..... مگر اس بات کا خیال رکھنا کہ میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔“ دوسری جانب سے سپاٹ لہجے میں جواب دیا گیا۔

”میں انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔“ وہ روانی میں کہہ گئی پھر تیزی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا کچھ مخالف گردپ کے لوگ یا ایجنسی والے افضل خان کی طرف سے بالکل ہی بے خبر ہوں گے؟“

”ادہ.....“ کچھ توقف سے بات جاری رکھی گئی۔ ”میں تمہاری دور اندیشی سے انکار نہیں کروں گا لیکن تم نے شاید تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا ہوگا۔ جس طرح دوسرے ہماری سن کن لینے کی فکر میں ہوں گے اسی طرح ہم بھی ایسے بہت سارے چہروں کو بے نقاب دیکھ لیں گے۔ خطرے کے مکمل میں کچھ غلط چالیں بھی سامنے والے کھلاڑی کو غلط فہمی میں جکڑا کرنے کی خاطر دیدہ و دانستہ چلی جاتی ہیں۔“

”میں نے اس پر پہلے غور نہیں کیا تھا سر.....“ شبیم نے بگ باس کی حیارانہ چال پر ششدر ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں نے اس حد تک گہرائی میں نہیں جھانکا تھا۔ آپ کی اسکیم لا جواب ہے۔“

”میری باتوں پر عمل کرو گی تو تم بھی کندن بن جاؤ گی۔“

”مجھے یقین ہے باس.....“ شبیم نے اس کی کیبنکی کا سانسٹی انداز میں اعتراف کیا پھر وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

شبیم کا ذہن پھر مستقبل کے غیر یقینی حالات سے نبرد آزما ہونے کے مختلف منصوبوں پر غور کرنے لگا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ہر حال میں اس دلدل سے نکلنا چاہتی تھی جس میں وہ روز بروز دھنستی جا رہی تھی۔

سراج صبح سے دو تین بار ایس بی اورنگ زیب کو فون کر چکا تھا لیکن اس سے رابطہ ممکن نہیں ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈی آئی جی کی میٹنگ میں جانے سے پیشتر اورنگ زیب سے

اس سلسلے میں گفتگو ہو جاتی۔ اسے میٹنگ کی نوعیت کا بھی علم ہو جاتا۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے وہ اپنے آفس سے نکلا۔ اس کے ذہن میں کئی خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ لودھی کے معطل کیے جانے کی اطلاع اسے اپنے ذرائع سے مل گئی تھی۔ یہ کوئی ایسی سیکرٹ بات بھی نہیں تھی جو چھپی رہ سکتی لیکن ڈی آئی جی نے اسپورٹس کار کے حوالے سے کسی آدمی کی موت کی اطلاع دے کر اسے چونکا دیا تھا جو شیخ حامد کا دست راست تھا۔ وہ ایسی گئی دیکھی بھائی صورتوں سے واقف تھا جو اس کے تعاقب میں لگے رہتے تھے لیکن اہم بات یہ تھی کہ حادثے میں موت کا شکار ہونے والے کے بارے میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ بگ باس کی بلیک فورس کا سرغنہ تھا۔ اس خبر کی اطلاع کس نے دی تھی؟ اس اہم سوال کی روشنی میں یہی سوچا جاسکتا تھا کہ اطلاع دینے والا بھی بڑے مگرچھ کا کوئی قریبی آدمی ہوگا مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اس نے کن بنیادوں پر شیخ حامد کے خلاف وہ اطلاع ڈی آئی جی کو دی ہوگی؟ کیا کسی وجہ سے وہ بھی شیخ حامد کے مخالف ہو گیا تھا؟ یا یہ محض ایک ڈراما تھا جو خطرناک مگرچھ کے اشارے پر رچا پیا جا رہا تھا اور بھی بہت سے امکانات ہو سکتے تھے لیکن ڈی آئی جی نے اسے میٹنگ میں آنے کی دعوت دینے سے پیشتر ایس بی اورنگ زیب کے سلسلے میں بھی کریدنے کی کوشش کی تھی، آخر کیوں؟ کیا اس اسپورٹس کار کے حادثے سے ایس بی کا کوئی تعلق تھا؟ یا لودھی کے معطلی کے آرڈر کی وجہ سے ڈی آئی جی کو شیخ حامد کی طرف سے کسی خطی کاغذ شہ لائق تھا؟

آفس سے نکلنے کے پانچ منٹ بعد ہی اسے اپنے مخصوص نمبر پر میڈم روبی کی کال موصول ہوئی۔ سراج نے موبائل آن کر کے کان سے لگایا پھر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت میری یاد کیسے آگئی؟ بڑے آدمی اور آپ جیسی مالدار خواتین تو دوپہر تک سونے کی عادی ہوتی ہیں؟“

”الماس نے کیا صبح صبح ہی آپ سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو آپ اس وقت مرچیں چبانے کے موڈ میں ہیں۔“ دوسری جانب سے بھی اسی انداز میں جواب ملا جس انداز میں سراج نے بات چھیڑی تھی۔

”اس وقت کیسے فون کر لیا؟“ سراج نے مسکرا کر کہا۔ ”میں دراصل ڈی آئی جی کی میٹنگ انینڈ کرنے جا رہا ہوں۔“

”کوئی اہم بات ہے؟“ سنجیدگی سے پوچھا گیا۔

”یہ میٹنگ بغیر کسی ایجنڈے کے ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”او۔ کے، میں آپ کو پھر کسی وقت اطمینان سے فون کر لوں گی۔“

”اطمینان ہم پولیس والوں کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔ آپ کم از کم کال کرنے کا مقصد ہی بتا دیں، ورنہ ایک بے چینی سی رہے گی۔“ سراج نے اسے ٹٹولنے کی خاطر سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”میں کچھ اہم باتیں جو میں آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... میں میٹنگ سے فارغ ہو کر آپ کو پہلی فرصت میں کال کر لوں گا۔“ اس نے جواب دے کر موبائل آف کر دیا۔

میڈم روبی کے فون نے سراج کو اور الجھا دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میڈم نے صبح ہی صبح فون کیا ہوگا تو اس کی کوئی خاص وجہ بھی ہوگی ورنہ وہ آفس ٹائم میں اس سے رابطہ قائم کرنے کی غلطی کبھی نہ کرتی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ کہیں میڈم روبی نے جن اہم باتوں کا حوالہ دیا تھا اس کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور لودھی کی معطلی یا اسپورٹس کار کے حادثے میں ہلاک ہونے سے تو نہیں تھا؟

ٹھیک پونے گیارہ بجے سراج نے اپنی گاڑی ڈی آئی جی کے دفتر کے قریب پارک کی جہاں اورنگ زیب کی کار بھی اسے نظر آگئی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھا تا وہ آفس کے اندر داخل ہوا۔ چیراسی سے اپنی آمد کی اطلاع کرانے کے بعد اسے فوراً بلا لیا گیا، کمرے میں ایس بی اورنگ زیب پہلے سے موجود تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات یہی ظاہر کرتے تھے کہ شاید ابھی تک ڈی آئی جی نے باقاعدہ اس اچانک کال کی جانے والی میٹنگ کا آغاز نہیں کیا تھا۔ سراج ڈی آئی جی کو سلیوٹ اور اورنگ زیب سے ہاتھ ملانے کے بعد بیٹھ گیا تو ڈی آئی جی نے ڈیوٹی کال ٹیبل کو اندر طلب کر کے اسے ہدایت دی کہ جب تک وہ اسے خود سے طلب نہ کرے نہ کسی کو اندر آنے دیا جائے نہ ہی ڈسٹرب کیا جائے۔ ان احکامات کو جاری کرنے کے بعد وہ اپنی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ باری باری سراج اور اورنگ زیب کو سنجیدگی سے دیکھا پھر چپے تلے لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”اس سے پیشتر کہ میں آپ حضرات کو زحمت دینے کا اصل مقصد بیان کروں، یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پولیس کی ملازمت پھولوں کی بیج سے زیادہ کانٹوں کا بستر ہے جس پر

ککشکول

میں مشکل ہی سے سکون ملتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ہمیں نہ چاہنے کے باوجود حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ ایک عام مثال ہے کہ زیادہ کھینچنے سے مضبوط سے مضبوط رسی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایمانداری اور قانون پسندی ہماری اہم ضرورت ہے لیکن..... صورت حال اکثر ہمیں کسی نہ کسی مجبوری سے بھی دوچار کر دیتی ہے۔ اوپر والوں کے احکامات اور حکومت کی پالیسیاں بھی آڑے آ جاتی ہیں۔ موسم کی طرح حالات بھی اپنا رخ بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ وقت کے دھارے کا بھی خیال رکھیں۔ آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟“

آغا منظور نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد سامنے بیٹھے دونوں افسروں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں آپ سے متفق ہوں سر.....“ سراج نے جواب دینے میں پہل کی۔ ”دشمن کو کھینچوں میں پھانسنے کی خاطر ہمیں کچھ سہری جال بھی بننے پڑتے ہیں اور ایسے وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے جب ہم جال کا دوسرا کونا گھسیٹ کر اسے بے بس کر سکیں۔“

”دن منٹ.....“ آغا منظور نے کہا۔ ”اور اگر آپ کو جال کا دوسرا سرا کھینچنے سے پیشتر ہی دشمن اپنا وار کر جائے تو.....؟“

”رہسک تو بہر حال لینا پڑتا ہے۔“ سراج نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ”پانسا لٹا پڑ جائے تو ہماری اسکیم بھی چو پٹ ہو جاتی ہے۔ شکار کے بجائے ہم خود شکار بن جاتے ہیں۔“

”آپ کیا کہیں گے؟“ آغا منظور نے ایس بی اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔

”میں آپ دونوں کی رائے سے انگیری نہیں کروں گا۔“

”عام حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اورنگ زیب

نے یہ دستور سنجیدگی سے جواب دیا۔

”سر.....“ سراج نے اس میٹنگ کی غرض و غایت سمجھنے کی خاطر دہلی زبان میں کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم مکمل کر اصل مقصد کی بات کریں؟“

”میرا خیال ہے کہ کسی ایسے دیدہ دلیر مجرم نے ہمارے خلاف کوئی زہر اگلا ہے جو ابھی تک کسی پہاڑ کے نیچے نہیں آیا، اس لیے خود کو سب سے زیادہ قند آور سمجھ رہا ہے۔“

اورنگ زیب نے ایک امکانی وضاحت کی تو آغا منظور نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”یو آر رائٹ مسٹر اورنگ زیب۔“ وہ تھملا کر بولا۔

”آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ میں اس وقت کسی ایسے ہی مجرم کی بات کر رہا ہوں جو تنہا نہیں ہے۔ اس خرائٹ نے کچھ ایسے غداروں کو بھی اپنا ہم خیال بنا رکھا ہے جو ہم سے بہت اونچی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ جنہیں ہم نے اور آپ ہی نے اپنا قیمتی دھڑ دے کر اسمبلیوں تک پہنچایا ہے۔ وہ جو چال چل رہے ہیں ہمیں اس کا توڑ کرنے کی خاطر اجتماعی انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔“

”بات کیا ہے سر.....“ سراج نے پھر براہ راست ڈی آئی جی سے دریافت کیا۔

”مجھے علم ہے کہ ڈی ایس بی لودھی کے معطلی کے احکامات آپ کے اشارے پر ہوم سیکریٹری نے جاری کیے تھے۔“ ڈی آئی جی نے ایس بی اورنگ زیب کو دیکھ کر ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”وہ اس کا مستحق نہیں تھا لیکن آپ نے وہ آرڈر اسے براہ راست دینے کے بجائے میرے ذریعے سرور کرائے ہوتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔“

سراج صورت حال کی نزاکت جان کر چپ ہی رہا۔

اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کی بات سن کر ایک لمحہ توقف کیا پھر بڑے پرسکون انداز میں وضاحت کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں سر..... کہ شیخ حامد جو مجھے اپنا دشمن سمجھ رہا ہے اسے لودھی کی معطلی ہضم نہیں ہوئی ہوگی۔ یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ لودھی کو میری ذاتی رپورٹ پر سسپنڈ کیا گیا لیکن میں نے وہ آرڈر آپ کے بجائے خود تھمیل کیے۔ اس کی وجہ صرف اتنی ہے کہ میں اپنی وجہ سے آپ کو یا کسی اور کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔“

”لیکن اب آپ کے بجائے جو سوالات مجھ سے پوچھے جارہے ہیں ان کا جواب کون دے گا؟“

”اگر بات تحریر میں ہے تو آپ اس ضمن میں بھی میرا تجزیہ جواب طلب کر لیں۔ میں ساری ذمہ داری قبول

سراج نے پروگرام طے کیا پھر دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کسی ممکنہ تعاقب کا شبہ دور کرنے کے بعد حسب وعدہ میڈم روٹی کو کال کیا۔

”شکر ہے کہ آپ کو جلدی اپنا وعدہ یاد آ گیا۔“ دوسری جانب سے میڈم کی آواز ابھری۔ ”میں تو سمجھی تھی کہ شاید میننگ کے بعد آپ بھول ہی جائیں۔“

”اوہ.....“ سراج نے شوخی سے کہا۔ ”کیا الماس کے کہنے پر آپ نے اب میری نگرانی کی ذمہ داری بھی مول لے لی ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ بس اتفاق ہی ہے کہ مجھے کسی ذریعے سے آپ کی مصروفیت کا علم ہو گیا۔“

”آپ مجھ سے کچھ اہم باتیں کرنے کو کہہ رہی تھیں۔“ سراج نے اسے سنجیدگی سے یاد دلایا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ شاید جگا کے نام سے ضرور واقف ہوں گے۔“

”جی ہاں..... نہ ظاہر وہ ایک دو کاروبار چلا رہا ہے لیکن یہ بات ہمارے ریکارڈ پر ہے کہ در پردہ ایک باقاعدہ گینگ کا لیڈر بھی ہے۔“ سراج نے جگا کے نام پر چوکتے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک بار سزا بھی کاٹ چکا ہے۔“

”آکھیں.....“ ڈی آئی جی نے بہ دستور مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ ”آپ نے اس کے لیے بے حد مناسب نام رکھا ہے۔“

میننگ کا اختتام بڑے دوستانہ ماحول میں ہوا۔ باہر آ کر اورنگ زیب نے سراج سے پوچھا۔

”آپ کو اس میننگ کی اطلاع کیسے ہوئی؟“

”ڈی آئی جی نے فون کر کے بتایا تھا اور شریک ہونے کو بھی ان ہی نے کہا تھا۔“

”کیا رائے ہے اب آپ کی میننگ کے بعد.....؟“

”میرا خیال ہے کسی انتہائی ٹاپ سیکریٹ بات کے علاوہ اگر ہم مل کر کام کریں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے.....“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے۔“ اورنگ زیب نے اپنی دسی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”آج رات کو آپ کا کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے؟“

”جی نہیں.....“

”پھر آپ آج میرے ساتھ ڈنر کریں، کچھ ضروری باتیں اور بھی ہیں جو میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہوں گا۔“

بارے میں زبان کھولی ہے تو ہر طرح سے اپنے بچاؤ کی تدابیر بھی ضرور اختیار کی ہوں گی۔“

”یو۔ آر۔ رائٹ!“ آغا منظور نے اس کی تائید کی۔

”اس سلسلے میں کچھ شبہات کا اظہار میں بھی کروں گا۔“ اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ ”لاش سرد خانے سے جو بھی وصول کرے گا ہم اس کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کر سکتے۔ اس لیے بہتر ہے کہ جو آدمی اس کام پر تعینات کیے گئے ہیں انہیں سرد خانے سے ہٹا لیا جائے۔“

”میں سمجھا نہیں.....“ آغا منظور نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ ”کیا ہمارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں ہے کہ اس کی موت حادثاتی تھی یا.....؟“

”اسے کسی دشمن نے گولی مار کر ہلاک کیا ہے.....“

”دہاٹ.....“ ڈی آئی جی چونکا۔ ”آپ یہ بات اس قدر یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں؟“

”میں اپنے ذرائع سے اس کی تصدیق کر چکا ہوں۔“ اورنگ زیب نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”وہ میرے مشکوک افراد کی لسٹ پر تھا۔“

”آئی۔ سی.....“ سراج نے نظریں گھما کر ایس بی کو دیکھا۔ ”اگر وہ آپ کی لسٹ پر تھا تو آپ کے پاس اس کے بارے میں کچھ ضروری معلومات بھی ہوں گی؟“

”خبر کا یہ اندازہ غلط نہیں ہے کہ وہ آکھوں کا خاص آدمی تھا۔“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”میرے جو آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے ان کا یہی بیان ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے کا عادی تھا۔ بھی اسے آکھوں کے دفتر کے آس پاس بھی نہیں دیکھا گیا۔ البتہ ایک بار اتفاق سے میرے سادہ لباس والے نے اسے بلیک ٹائیگر کا کوڈ استعمال کر کے کسی سے بات کرتے سنا تھا۔“

”کیا اسے کوئی مارنے کی اطلاع بھی آپ کو اسی.....؟“

”جی نہیں.....“ اورنگ زیب نے ڈی آئی جی کا سوال کاٹ کر جواب دیا۔ ”کوئی مارے جانے کی تصدیق مجھے بھی پولیس کے ذریعے ملی تھی۔“

”او۔ کے۔“ ڈی آئی جی نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا۔ ”مرنے والے کا کھوج لگانا بھی اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ میں نے جو آدمی تعینات کیے تھے ان کو ہٹا دیتا ہوں۔“

”میں آپ سے ہر بات شیئر کرنے کو تیار ہوں سر.....“ لیکن یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ اگر بھی میرا اور آکھوں کا آمنا سامنا ہوا تو میں کسی بھی مصلحت کے پیش نظر خود کو کنٹرول نہیں

کرنے کو تیار ہوں۔“

”پلیز مسٹر اورنگ زیب۔“ آغا منظور تھلا کر بولا۔

”بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ لوگوں سے الگ نہیں ہوں، ممکن ہے کہ آپ جو شکار محل کرکھینا چاہتے ہوں میں اس کے لیے چان تیار کر رہا ہوں۔ تجربہ کار شکاری کسی بدست ہاتھی کے سامنے گھڑے ہو کر اسے شوٹ کرنے کا رسک کبھی نہیں لیتے لیکن..... اگر آپ مجھے اب تک غلط سمجھتے رہے ہیں تو پھر آج میں محل کر آپ دونوں سے اس بات کا احترام بھی کر لوں کہ میرا اور آپ کا دشمن الگ الگ نہیں..... ایک ہی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے حالات کے پیش نظر کسی مناسب موقعے اور وقت کا منتظر ہوں جبکہ آپ کسی اور وجہ سے خطرہ مول لینے کو پوری طرح آمادہ ہیں..... مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔“

اورنگ زیب نے آغا منظور کا وہ رنگ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا وہ غلط بھی نہیں تھا، اس کی تجربہ کار نظریں ڈی آئی جی کی تصویر کا دوسرا رخ دیکھ کر کچھ دیر اپنے حلقوں میں گردش کرتی رہیں پھر..... اس نے صاف کوئی سے کہا۔

”آئی۔ ایم سوری سر..... میں کوشش کروں گا کہ آئندہ جو قدم بھی اٹھاؤں اس میں آپ کا مشورہ بھی شامل ہو مگر ایک بات قبل از وقت واضح کر دوں، میں صرف آپ کا لحاظ کر سکتا ہوں، کسی اور نے اگر میری عزت سے کھینچنے کی کوشش کی تو اسے اینٹ کا جواب پتھر ہی سے ملے گا۔“

سراج نے سکون کا سانس لیا۔ ماحول کا تناؤ جس انداز میں ڈی آئی جی نے کم کیا تھا وہ اس سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، لودھی کی بحث ختم ہوئی تو آغا منظور نے اس اسپورٹس کار کا ذکر چھیڑ دیا جس میں ہلاک ہونے والے کی لاش اس نے سرد خانے میں رکھوا دی تھی۔ وہی زبان میں یہ بھی بتا دیا کہ کسی خبر نے فون پر اس کے بارے میں کیا معلومات فراہم کی تھیں۔

”سر..... کیا خبر کے بارے میں آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟“ سراج نے سوال کیا۔

”نہیں..... میں نے اس کی آواز پہلی بار سنی ہے۔ بعد میں یہ بھی تصدیق ہو گئی کہ اس نے کسی بوتھ سے کال کی تھی۔“

”فون بوتھ کس علاقے میں ہے.....؟“

”اس کا جواب میں دے سکتا ہوں۔“ اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جس علاقے میں بوتھ ہوگا، خبر کا تعلق اس علاقے سے نہیں ہو سکتا۔ اس نے اگر آکھوں کے

جاسوسی ٹی وی

جنون • مشرق کی فضاؤں میں لڑنے والی خنزیر کی کشف زیندگی تحریر

مغرب کے نذالے انداز • مغربی دنیا کی تہذیب و تمدن کی سوانح و تاریخ کا قابل فہم و دلکش بیان

گرداب • پانچ جہتیں کے ایک منظر کی طرح منظر کشی کی سانس دار کہانی

لکار • ظاہر و باطن کے جادو کی ایک جھلک، نئے دلائل اور نئے سنگ

سزاوارق کی کہانیاں

دیوانگی • محبت کی جستجو میں قاتل و قاتل کی فریادیں احمد اقبال کا شگفتہ لہذا زمین

کہانی در کہانی • سب کچھ کے کچھ نہ پانے والوں کا قصہ سرورق کی دلچسپ کہانی

اپنے گھر سے

پیش کش: پاکستان ٹیلی ویژن

پیش کش: پاکستان ٹیلی ویژن

”اور شاید ای سزا کی مہربانی نے اسے مجرم بنا دیا۔“

”میں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔“

”ہمارے جیل خانوں کا ماحول کس قدر صاف سترا ہے یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ ایک بار کوئی شریف آدمی بھی دس پندرہ روز کے لیے وہاں کی یا ترا کر لے تو وہ بھی پورا پنڈت ہو جاتا ہے۔“

”آپ جگہ کو کس طرح جانتی ہیں؟“ سراج نے سنبھل کر سوال کیا۔

”زیادہ نہیں۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ پہلی بار اس نے جوسزاکائی تھی وہ آپ کے قانون کی مہربانی تھی۔“ میڈم رونی نے اس بار بھی تنقیدی انداز اختیار کیا۔ ”زندہ رہنے کے لیے جب کوئی راستہ نہ رہے تو پھر انسان جہانگیر بٹ کے بجائے جگہ ہی کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔“

”آپ مجھے اس وقت کیا باور کرانا چاہتی ہیں؟“ سراج نے کسمسا کر سوال کیا۔ ”خاص طور پر آپ نے اس وقت جگہ ہی کا موضوع کیوں چھیڑ دیا؟“

”اس لیے کہ اب وہ خطرناک مگر مجھ کی آنکھوں میں بھی بری طرح کھٹک رہا ہے۔ کسی کانٹے کی طرح، جسے زیادہ چبھنے پر بے دردی سے نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔“ میڈم نے بڑے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”آپ کا قانون بھی شاید اس کی لاش کو سکون کی سانس لے کر دفن کر دے گا۔“

”کیا آپ اپنی ان معلومات کا ذریعہ بتانا پسند کریں گی؟“ اس بار سراج نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

”آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مجھ سے میرے مراسم کس قسم کے ہیں؟“

”ای لیے تو دریافت کر رہا ہوں کہ آپ کو اندر کی باتیں کس طرح معلوم ہو گئیں۔۔۔۔۔؟“

”جو لاش سرد خانے میں رکھوائی گئی ہے اس کی خبر تو غالباً آپ کو بھی مل چکی ہوگی اس لیے اب یہ بات اندر کی نہیں رہی۔“ میڈم نے بہ دستور فتح حامد سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”فی الحال میں آپ کو اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ مرنے والا خطرناک مگر مجھ کا بہت قیمتی آدمی تھا اور مرنے سے دو روز قبل وہ جگہ کے خفیہ ٹھکانے پر ڈیکھا گیا تھا۔“

”آئی۔ سی۔“ سراج چونکا۔ ”کیا اسپورٹس کار والے کی موت میں جگہ کا ہاتھ تھا یا۔۔۔۔۔ ایسا سمجھا جا رہا ہے؟“

”جگہ کے فرشتوں کو کبھی اس کا علم بعد میں ہوا ہے کہ مرنے والا کون تھا اور مگر مجھ کے لیے اس کی کیا اہمیت تھی لیکن

بہر حال اب اسی کو قابل عتاب سمجھا جا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اب جگہ کو بھی محض شہرے کی بنا پر ٹھکانے لگا دیا جائے۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن آپ کو ان تمام باتوں کا علم کس طرح ہوا؟“

”سوری مسٹر سراج۔۔۔۔۔ میں اس وقت آپ کو جو کچھ بتا رہی ہوں اس کی تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکتی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ اگر قانون کسی طرح جگہ کو اس نازک موقع پر تحفظ فراہم کر دے تو وہ کسی فرعون کے حق میں موٹی ہی ثابت ہوگا۔“

”ممکن ہے آپ کا اندازہ درست ہو لیکن میرے لیے یہ تقریباً ناممکن ہی ہے۔“ سراج نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”اگر کوئی ٹھوس ثبوت ہو تو بھی شاید اوپر والے لے کر مجھ کے مقابلے میں پولیس کی اس انوکھی درخواست کو قبول نہیں کریں گے۔“

”مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کھرا جواب دیا۔ میں نے آپ کی بات کا برا نہیں مانا، میرا ذاتی اندازہ بھی یہی تھا کہ یہ کام مشکل ہوگا لیکن خدا اگر چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ ”وہ بھی اس لیے کہ وہاں کسی مگر مجھ یا ایک چیوٹی کے درمیان بھی کوئی مروت نہیں ہوگی۔ جو کچھ نامہ اعمال میں لکھا ہوگا اسی کے مطابق انصاف بھی ہوگا۔“

”ایک اطلاع اور بھی آپ کو فراہم کر رہی ہوں۔“ میڈم رونی نے سنجیدگی برقرار رکھی۔ ”افضل خان، تین چار دن اندر رگراؤنڈ رہنے کے بعد اسٹارٹ ان میں قیام پزیر ہو گیا ہے۔“

”یہ اطلاع میرے لیے اہم ہے لیکن۔۔۔۔۔“

”میں سمجھ رہی ہوں گی کہ آپ پھر میری سرگرمیوں کے بارے میں کوئی سوال کریں گے۔“ میڈم نے بات درمیان سے اچک کر کہا۔

”کیا مجھے اس کا حق نہیں ہے؟“ سراج نے اپنایت کا اظہار کیا۔

”الاس کے رشتے سے اب آپ کو پہلے سے زیادہ حق حاصل ہے مگر فی الحال آپ میری فکر نہ کریں۔ ہو سکتا ہے میں ایک دو روز میں آپ کو پھر فون کر کے کچھ نئی معلومات بھی فراہم کر دوں۔“

”جو اہم آدمی بھی سرد خانے میں آرام کر رہا ہے کہیں اس میں۔۔۔۔۔“

”میرا ہاتھ براہ راست شامل نہیں ہے۔“ میڈم نے اس بار بھی معنی خیز انداز میں جواب دیا پھر ساتھ ہی رابطہ بھی

ککشول

”م کر دیا۔“

سراج کا ذہن میڈم کی گفتگو کی روشنی میں قیاس آرائیوں کے سوا اور کچھ نہ کر سکا لیکن جگہ والی کہانی سن کر وہ بڑی سنجیدگی سے اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ میڈم جس راستے پر جبری سے قدم اٹھا رہی ہے وہ اس کے لیے ایک عورت ہونے کے سبب بے حد خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ آفس پہنچے تک وہ ان ہی خیالات میں الجھا رہا پھر۔۔۔۔۔ دفتر میں قدم رکھتے ہی اسے ایک نئی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ لیاقت حسین کو دفتر میں چھوڑ کر گیا تھا لیکن واپسی میں لیاقت حسین اسے دفتر میں نہیں ملا۔ اس نے سپاہی سے دریافت کیا تو اس نے بڑی سادگی سے کہا۔

”دس منٹ پہلے تک وہ آفس ہی میں تھا سر۔۔۔۔۔ پھر کسی ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا، ہو سکتا ہے کوئی خاص حاجت کی وجہ سے کہیں قریب گیا ہو۔“

”ہاں، ہو سکتا ہے۔“ سراج نے اپنے ڈیوٹی کانسٹیبل کا مطلب سمجھ کر اطمینان کا سانس لیا مگر لیاقت حسین ایک گھنٹے بعد بھی واپس نہیں لوٹا تو اس کی تشویش میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔

جگہ کو جیل میں سزا کاٹنے کے بعد جو تجربہ ہوا تھا اس نے اسے وقت سے پہلے بہت کچھ سکھا دیا تھا جیل سے باہر آنے کے بعد اس نے محسوس کیا تھا کہ جو حالات پہلے تھے، اب نہیں رہے جو اب تھے وہ آئندہ نہیں رہیں گے؟ اسے اپنے منہ میں تین دن باقاعدہ تھانے میں حاضری لگانی پڑتی، پولیس آفیسروں کی بلاوجہ جھڑکیاں سننی پڑتیں۔ دو فیٹوں والوں کے علاوہ تمام کانسٹیبل بھی اسے ایسی نظروں سے دیکھتے جیسے وہ انسان نہیں کوئی پالتو جانور تھا جس کو اپنے نہیں مار دوسروں کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ اس کی اپنی مرضی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

جگہ ان حالات میں بھی بہت دنوں تک پرانی ڈگر پر ملنے کی کوشش میں بھٹکتا رہا لیکن جب قانون کی نوبت آگئی تو اس کے ذہن میں پولیس کے ایک ہیڈ کانسٹیبل کی بات گونجنے لگی۔ جیل جانے سے پیشتر بھی وہ اس سے واقف تھا، جیل سے واپس آنے کے بعد بھی اس نے ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد اسی سے رابطہ کیا۔ اس کا نام امداد علی تھا، یہ کاہرہ بھی متوسط طبقے کا ایک آدمی لگتا تھا لیکن جگہ جانتا تھا کہ اس کا اصل کیا تھا، اس نے ملنے جلنے والوں پر اپنی حیثیت قائم رکھنے کی خاطر شرافت اور ایمانداری کا جو خول چڑھا رکھا

تھا وہ اصلی نہیں تھا۔ اس کی مالی حالت ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر تھی جو پوش علاقے کے بنگلوں میں رہتے تھے، بڑی بڑی گاڑیوں میں گھومتے تھے۔ امداد علی ان لوگوں سے کہیں زیادہ دولت مند تھا۔ اس نے فرضی نام سے کئی کاروبار کر رکھے تھے جہاں بہ ظاہر اس سے کم حیثیت کے لوگ بڑی بڑی تنخواہوں پر ملازمت کرتے تھے، اس نے کئی ناموں سے مختلف ایپرائسٹس اور پلازاس دو، تین اور چار کمروں کے لکڑی فلیٹس خرید رکھے تھے جن سے ہر ماہ ایک خلیہ رقم بہ طور کرایہ وصول ہوتی تھی۔ اس کی پشت پر اس کا ایک پڑھا لکھا عزیز دار جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتا تھا تمام سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ امداد علی نے اسے ایسے داؤ بیچ سکھا دیے تھے جن کی وجہ سے کوئی اس پر شبہ نہیں کرتا تھا۔

امداد علی کی اصل حیثیت کا علم بھی کچھ لوگوں کو تھا جن میں ایک جگہ بھی تھا جو جیل جانے سے قبل اس کے پڑوس میں رہتا تھا، امداد علی سے اس کی دوستی پرانی تھی۔ جیل کی مشکلات میں بھی امداد علی اس کے کام آتا رہا تھا۔ جیل سے رہائی ملنے کے بعد امداد علی نے اسے دہلی زبان میں سمجھایا بھی تھا۔ ”دیکھ جہانگیر، تیرے اوپر حوالاتی ہونے کا ٹھپا لگ گیا ہے جو دھوبی کا کپڑوں پر لگایا ہوا وہ سیاہ نشان ہے جو پچاس دھلائیوں کے بعد بھی جوں کا توں رہتا ہے۔ لباس پھٹ کر جھٹکرا ہو جاتا ہے لیکن وہ نشان نہیں ختم۔ اب تیری اس شرافت کو بھی ایسا ہی داغ لگ گیا ہے اور وہ وقت کے ساتھ کم ہونے کے بجائے اور چوڑھا ہوتا جائے گا اس لیے میری مان تو شرافت کا لبادہ اتار پیچ۔ تیرے پیچھے اب کوئی رونے دھونے والا بھی نہیں رہا۔ ایک نئی، تالاب یا دریا کا پانی ختم ہو جائے تو پچھی بھی زندگی کی آس لیے پنکھ مار کر دوسری منزل کی طرف اونچی اڑان بھرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تو بھی انہی سے سبق حاصل کر۔ جیل یا ترا کر آیا تو اب پرانا لباس بھی اتار پیچ، میری طرح ساہوکار بن کر رام رام چپتا شروع کر دے۔ میں تیرا پرانا لنگوٹیا ہوں، جو مدد ہو سکی اس سے منہ بھی نہیں پھیروں گا جب چاہے آزما کر دیکھ لیتا۔“

جگہ کو اس کی دہری شخصیت کی اصل حقیقت معلوم تھی، وہ ان راستوں پر چلنے پر آمادہ نہیں ہوا اور محلی ہی چھوڑ کر ایک دوسری بستی میں آباد ہو گیا۔ مہینوں بھٹکتا رہا، سپدھی اور سچی راہ کی تلاش میں۔ کئی بار اس نے چھوٹی چھوٹی ملازمتیں بھی کیں۔ ایمانداری سے کام کیا تو اس کی قدر بھی کی گئی لیکن جب بھی اس کے مالکوں کو کسی ذریعے سے اس کے جیل جانے اور سزا کاٹنے کی اطلاع ملتی، وہ اسے نفرت سے دھتکار کر

بین الاقوامی کہاوتیں

☆ آزادی کی تکلیف، غلامی کے آرام سے بہتر ہے (عربی کہاوت)
☆ بغیر دیکھے کوئی چیز منہ میں نہ ڈالو اور نہ ہی بغیر پڑھے کبھی دستخط کرو (امریکی کہاوت)
☆ احسانات سے دلی ہوئی زندگی انسان کے شایان شان نہیں (چینی کہاوت)
☆ ہمت والے خدا کی بخشش ہوئی طاقتوں سے کام لیتے ہیں (جرمن کہاوت)
☆ کامل شخص کے پاس دقت نہیں ہوتا (اطالوی کہاوت)
☆ گناہ کے آغاز میں اتنی لذت نہیں، جتنی اس کے اختتام میں ملتی ہے (ملائیائی کہاوت)
☆ سب سے بڑی ہوشیاری یہ ہے کہ کوئی چالاکی نہ کی جائے (فرانسیسی کہاوت)
مرسلہ: ایس۔ امتیاز احمد، کراچی

جائے۔ میں تمہیں بھی محتاط رہنے کا مشورہ دوں گا۔ دائیں بائیں نظر رکھنا۔ رب راکھا۔
”رب راکھا۔“

جگا نے موبائل بند کر دیا پھر اسے اچانک خیال آگیا کہ وہ خالص اللہ ص آدی مرنے سے دو روز پیشتر اس سے ملنے بھی آیا تھا۔ اس روز وہ دراز قد کا سیاہ قام افریقی بھی آیا تھا جو پھنے خان کے کسی مخالف گروہ کے لیے کام کر رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا ہو، ایسی صورت میں جگا کی شخصیت پر بھی بلاوجہ ”مٹی بھگت“ کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔ اس اچانک خیال کے بعد جگا نے فوری طور پر عملی طور پر روپوشی ضروری سمجھی۔ اس نے اپنے اعتبار کے آدمیوں کو کسی جوابی کارروائی کے ممکنہ اندیشوں سے غائب کرنے کے لیے ضروری تاکید بھی کر دی۔

دو روز سے وہ ہر بار گھٹے بعد اپنے ٹھکانے بھی تبدیل کر رہا تھا، امداد علی کے ذریعے اسے ضروری معلومات بھی مل رہی تھیں۔ ذاتی طور پر بھی وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ سچ حامد ایک معمولی سی چوٹ بھی لگنے پر آپے سے باہر

تھے۔ آج کے دور میں بھی ہر بدمعاش کسی نہ کسی بزنس کی اڑ لیتا ہے۔ یہ بڑے گریک بائیں میں میرے بار۔۔۔۔۔ پانچوں اہلکار برابر نہیں ہوتیں لیکن ہمارے تمہارے دھندے میں بھی چور راستے ضروری ہوتے ہیں جو بڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ بزنس کی آڑ میں سارے دھندے چھپر ہ جاتے ہیں۔ کیا سمجھا؟“

جہانگیر بٹ نے جگا بننے سے پہلے امداد علی کی ایک بات کو گروہ سے باندھ لیا، بزنس کی آڑ میں وہ اپنی سفید ریشمی بنی قائم کیے ہوئے تھا۔ کل تک جو پولیس کے اہلکار اسے دیکھ کر اس کی ماں بہن کو کھنگالنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے، رفتہ رفتہ اسے سلام کرنے لگے۔ جگا نے ٹیگ لپڈ بننے کے بعد ہر ایک کے دھنیے باندھ دیے تو وہ بھی اس کے آگے پیچھے دم لانے لگے۔

امداد علی کے چور راستے دالی بات نے اسے اپنی پرچھائیں سے بھی چوکس رہنا سکھا دیا تھا، اس نے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ دو تین راتوں سے زیادہ ایک ٹھکانے پر نہیں رہتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے انہیں بدلتا رہتا تھا۔ شراب اس کے پیسے کی کمزوری تھی لیکن بازاری عورتوں کے سلسلے میں اس نے ٹکٹ کو بھی ڈھیلا نہیں ہونے دیا۔ بزنس میں ترقی کرنے کے بعد اس نے امداد علی کی پاپی پاپی مع سود بیاج کے ادا کر دی۔ ہفتہ پندرہ دن میں دونوں کی ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں، پولیس کے کسی اقدام کی اندرونی خبریں اسے امداد علی کے ذریعے بھی ملتی رہتی تھیں۔ اس روز بھی جب اسپورٹس کار میں بلیک ٹیگ زنگ کی بازی ہار گیا تھا تو امداد علی ہی نے اسے فون کیا تھا۔

”جگا۔۔۔۔۔ تجھے خبر ہے کہ مرنے والا کون تھا؟“
”شیخ حامد کا کوئی خاص بندہ تھا۔“

”خاص نہیں۔۔۔۔۔ خالص اللہ ص۔“ امداد علی نے اسے باور کرایا۔ ”وہ اس دڑے پھنے خان کا دست راست تھا۔ لیبرون، اس کی موت پر پھنے خان کی بیٹھک میں کیڑے کا ہمارے ہیں۔ اس کے دوسرے زر خرید شکاری کتے بھی ہر طرف دشمن کی بوسو گھومتے رہے ہیں۔ سرکاری ججے بھی گھات لگائے تنگ حلال کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔“

”کیا تمہیں پتا ہے کہ اسے کس نے شکار کیا۔۔۔۔۔؟“
”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ مرنے سے پیشتر کن کن لوگوں سے ملا تھا۔ پھنے خان نے حکم دیا ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو خاص طور پر چھان بھنگ کر دیکھا جائے۔ جس پر ذرا بھی شبہ ہو اسے دوسری دنیا کا ٹکٹ کٹا دیا

سخت امتحان میں ڈالتا ہے تو وہ بھی سٹ پٹا کر چوکھا راستہ بدل کر بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں، جمعہ کی نماز بھی گنڈے دار پڑھتا ہوں، ایک بار پیش امام صاحب فرما رہے تھے کہ انسان کو جنت بھی آسانی سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے نہیں مل جائے گی۔ بڑے پاپ پیلے بڑیں گے، سخت امتحانوں سے گزرنا ہوگا پھر پرمٹ ملنے کی کچھ امید ہوگی۔ چھوٹے بڑے سب اس بات سے بھی واقف ہیں کہ یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے، چند روز کے ٹھکانے ہیں۔ اصلی اور حقیقی زندگی اور پرہیزگاری ہوگی لیکن۔۔۔۔۔ کتنے لوگ اسے سمجھتے ہیں، سمجھ بھی لیں تو امتحان سے گھبرا کر ان کے قدم ڈگر گاتے ہیں۔ جید پیغمبروں کی بات اور ہے جو مجبور کی ایک کھٹکی چار چار دن چوس کر گزار کر لیتے تھے۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر ہر امتحان سے گزر جاتے تھے لیکن اب۔۔۔۔۔ ایسے اچلے لوگ آئے ہیں تنگ برابر ہو کر رہ گئے ہیں۔ کل کے بارے میں ان کی بھس بھری کھوپڑی کام نہیں کرتی۔ آج دو اور دو چار کس طرح کرنا ہے؟ اس کا غم سب کو اندر ہی اندر بیٹھے آم کی کھٹکی کی طرح کھلاتا رہتا ہے۔ میں تجھ سے زور زبردستی نہیں کر رہا۔ حساب کتاب والے دن سب کو اپنی اپنی بھیڑنی پڑے گی۔ میں نے دوست سمجھ کر تجھے اچھی بری دونوں سمجھا دیں۔ آگے جو حیرتی مرضی۔ جھین جھپٹ کر اپنا حق مانگ یا پھر فقیروں کی طرح زندگی گزار دے۔“

جگا کئی روز تک کھوٹے اور کھرے کی فکر میں گھلتا رہا پھر ایک روز تھانے کی حاضری کے وقت ایک پھول والے نے ذرا سی بات پر اس کو ماں بہن کی گندی گندی گالیوں سے نوازا تو وہ برداشت نہ کر سکا۔ اسی روز وہ جلد بازی پر عمل کرتے ہوئے جہانگیر بٹ سے جگا بن گیا۔ امداد علی نے اسے زندہ رہنے کے نئے نئے گرتائے تو اس نے قانون کے ستائے ہوئے لوگوں کا ایک گروہ بھی بنا لیا۔ امداد علی نے اس کی مالی مدد کر کے ایک دو بزنس بھی کرا دیے۔ اسی نے کہا تھا۔ ”جہانگیر، میری ایک بات دھیان سے سن اور گناہ لگا لے۔ یہ جو بڑے بڑے راجپوت اور مغل بادشاہ گزرے ہیں، جن کی کہانیاں میرے تیرے بچے کتابوں میں پڑھتے ہیں، یہ سب سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا لیکن ان کے مخلوں کے اندر بھی چور راستے ضرور ہوتے تھے جو اپنے لوگوں کی بغاوت یا کسی طاقت ور بادشاہ کے حملے کے آڑے وقت دبا کر ان ہی چور راستوں سے بھاگنے میں کام آتے

برطرف کر دیتے۔ بار بار کے تجربوں کے بعد جب فاقوں کی قوت بھی جواب دینے لگی تو وہ تھک بار کرتے یہ تقدیر دوبارہ امداد علی کے پاس آگیا۔ امداد علی نے اس کی حالت کسی تجربے کار جوہری کی طرح پرکھی تو مسکرا کر بولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا جہانگیر، یہ کہ جو ٹھپا لگ چکا ہے وہ چھپائے نہیں چھپے گا، پر تو نے میرا کہا نہیں مانا۔ اب تو نے کیا ٹھانی ہے؟“

”میں تھک بار کر تیرے پاس آگیا ہوں۔“ اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ ”ایک ناکردہ گناہ کی سزا اتنی ٹھن ہوگی، میں نے ایسا بھی نہیں سوچا تھا۔“

”تجربہ انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے میرے بار۔۔۔۔۔ اس دنیا میں جینے کی خاطر انسان کو بار بار چولے بدلنے پڑتے ہیں۔“ امداد علی نے کہا۔ ”کتے کی مثال لے لے، سب سے وفادار جانور ہوتا ہے۔ وقت پڑے تو مالک کی زندگی بچانے کی خاطر اپنا آپ داد پر لگا دیتا ہے لیکن پھر بھی مالک کے ساتھ ایک دسترخوان پر نہیں بیٹھ سکتا۔۔۔۔۔ مٹی میں رفع حاجت کے لیے لگے تو بچے بھی اسے پتھر مارنے سے نہیں چوکتے۔۔۔۔۔“

”حیرتی باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن۔۔۔۔۔“
”چل پھر رہے دے۔۔۔۔۔“ امداد علی نے دوستی نبھانے کی خاطر کہا۔ ”میں کل بھی تیرا لنگوٹیا تھا۔۔۔۔۔ آج بھی ہوں، تو ایسا کر ہر مہینے کی پانچ تاریخ کو آ کر مجھ سے پانچ ہزار لے جایا کر۔۔۔۔۔ اتنی رقم میں بری بھلی ہی سہی لیکن حیرتی شرافت سے گزر رہا ہو جائے گی۔“

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے امداد علی؟“ جگا نے اسے حیرت سے گھورا۔ ”تو اگر میرا لنگوٹیا ہونے کی بات کرتا ہے تو یہ بھی جانتا ہوگا کہ جہانگیر نے بھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔“

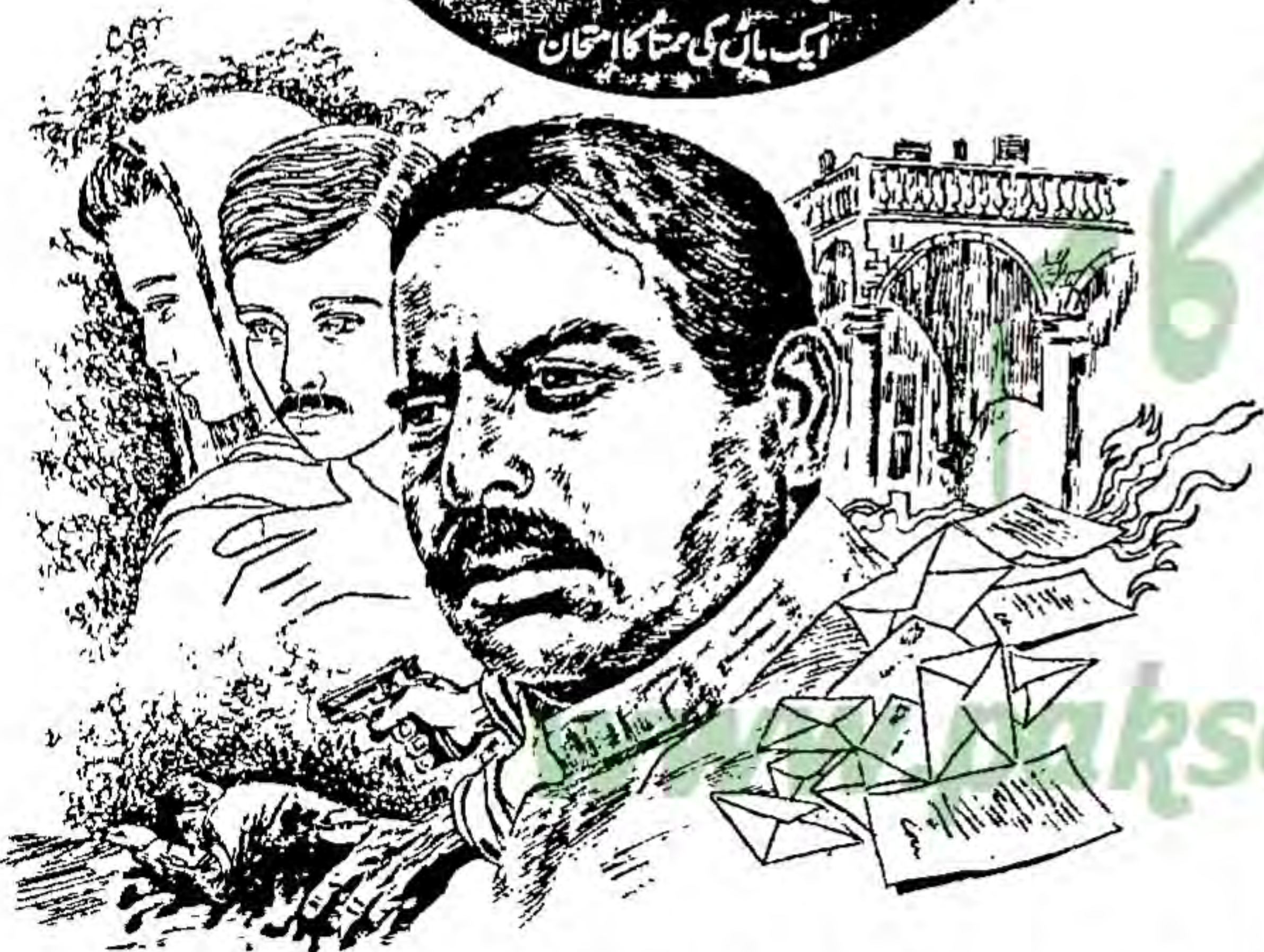
”دوسرا طریقہ بھی تجھ سے اختیار نہیں ہو سکے گا۔“ امداد علی نے سیاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”اس میں محنت کی ضرورت ہے لیکن اس حیلے میں نہیں۔۔۔۔۔ تجھے روز روز اپنا بھیس بھی بدلنا پڑے گا۔“

”کیا کسی تھیر کیمنی میں کام دلوائے گا؟“
”تو اب کہاں کھڑا ہے۔۔۔۔۔؟“ جواب میں امداد علی نے اسے معنی خیز انداز میں گھورا۔ ”یہ دنیا بھی ایک تھیر ہی ہے جہانگیر، لوگ یہاں بھی آئے دن کر دھیں لیتے ہیں۔ موسم کے ساتھ ساتھ رنگ ڈھنگ بھی بدلتے ہیں۔ سیدھے سچے اور کھرے راستے پر بھی جب اوپر والا کسی کو

جاننا

غلطی کوئی کرے... سزا کسی اور کے حصے میں آئے... یہ تو اس جہاں کی پرانی ریت ہے اور پریت کے جھمیلوں میں ایسے معاملات ہو رہے ہیں۔ البتہ محبتوں کے حصول کے لیے ایک لمبا سفر اور لامتناہی انتظار کی ادیت اٹھانے سے پہلے اگر سوچ میں ذرا سی لچک آجائے تو بہت سے رشتوں اور جذبیوں کو قرار مل جائے مگر... سوچ کی اس روش پر چلنا کب ہر ایک کے اختیار میں ہوتا ہے۔ ہوش تو بے آنا ہے جب آنکھوں میں بسنے والے چہرے خواب ہو جاتے ہیں۔

ایک وفا شعار بیوی اور
ایک باپ کی مٹا کا امتحان



آشیانے کی وسعت ناپتے رہنے میں دن نہیں گزارتے۔ پر کھولتے ہیں، اڑان بھرتے ہیں، ہوا میں ڈبکیاں لگاتے پھرتے ہیں۔ وجاہت اللہ خاں نے ایسی ہر مثال کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ وہ پچھلے بیس برسوں سے گھر میں بند تھے۔ شاید دو چار مرتبہ گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر یہ دیکھ آئے

گھر کتنا ہی بڑا ہو، بیروں کی گردش کے لیے کم ہی ہے۔ انسان کو لوہا کا قفل نہیں ہوتا کہ ایک دائرے میں گھومتا رہے۔ ایک کمرے سے دوسرے کی مسافت طے کرتا ہے۔ مگر تو ایک ٹھکانا ہوتا ہے۔ اس ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے اسے کئی میدان پار کرنے ہوتے ہیں۔ پرندے بھی

والے پر تان لیا، جگا کی لٹکارتی ہوئی آواز کمرے میں گونجی۔
”کون ہو تم؟“
آنے والے نے جگا کی گھن گرج کا نوٹس نہیں لیا، اطمینان سے کھڑا جگا کو دیکھتا رہا، اس کا وہ اطمینان بھی جگا کے لیے حیرت انگیز ہی تھا۔ ”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ جگا کے لہجے میں سفاکی کھلنے لگی۔ ”کیا زندگی سے جگا آپکے ہو؟“
تو وارد نے اس بار بھی کوئی نوٹس نہیں لیا، پلکیں جھپکائے بغیر وہ جگا کو خوابیدہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں کو جھپٹا ہوا، اس کی سپاٹ آواز کمرے میں گونجی۔ ”جتنی جلدی ممکن ہو میرے ساتھ نکل چلو، اسی میں تمہاری زندگی کی ضمانت ہے۔“
”تم نے شاید صرف جگا کا نام سنا ہے۔ اگر پوری طرح واقف ہوتے تو۔۔۔۔۔“
”فضول باتیں کبھی اطمینان سے کر لیتا۔“ تو وارد طلسمی انداز میں جگا کو تیز نظروں سے گھورتا رہا، اس کی پلکیں ایک بار بھی نہیں جھپکی تھیں۔ اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا، جگا کا ہاتھ تھامتے ہوئے بھی اس نے ہسپتال پر کوئی توجہ نہیں دی جو جگا کے میرے ہاتھ میں موجود تھا۔
جگا بلاوجہ خون خرابے کا عادی نہیں تھا، اس کے ایک اشارے پر اس کے جاں نثار نو وارد کی ٹکا بونی کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی نہ کرتے۔ نو وارد کی جسارت جگا کے لیے ناقابل فہم تھی، اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑائے کی کوشش کی۔ کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے دوسرا ہاتھ استعمال کرتے ہوئے ہسپتال نو وارد کی کپٹی پر رکھ دیا، بڑے سفاک لہجے میں غرایا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟“
”میں بھی تم کو یہی بات یاد کرانا چاہتا ہوں۔“ نو وارد نے مشینی انداز میں جگا کے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی تو ہسپتال اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا کر۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بھی جگا کے لیے کسی ہارر فلم کے طلسماتی منظر سے زیادہ تعجب خیز تھا۔ نہ جانے کے باوجود نو وارد اس کو اطمینان سے کمرے سے نکال کر باہر آیا تو دروازے پر موجود سٹیل سانچے نے جگا کو بڑی حیرت سے مخاطب کیا۔

اس پر اسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

ہو جاتا تھا، اس کے کمرے اس کے اشارے پر خود اپنی کنپٹیوں پر بھی ہسپتال رکھ کر گولی داغنے کے عادی تھے۔ ایک معمولی سا شبہ بھی اسے ممکنہ دشمن کو راستے سے ہٹا دینے کے لیے بہت ہوتا۔
اس وقت بھی جگا اپنے ایک محفوظ ٹھکانے پر تھا، رات اس نے اسی چھت کے نیچے بسر کی تھی، دوپہر کے کھانے کے بعد وہ حسب معمول دوسرے ٹھکانے پر جانے کا پروگرام طے کر چکا تھا، وہ جس چھت کے نیچے رات بسر کرتا وہاں اس کے دوسرے جاں نثار سانچے بھی آس پاس رہتے تھے، کسی کو جگا کے کمرے تک جانے کی اجازت نہیں تھی، اس کے اپنے کسی کارندے کو بھی اس تک کئی مرحلوں سے ہو کر گزرنے کے بعد رسائی کی اجازت ملتی تھی۔ امداد علی کے بعد اس کے اپنے آدمیوں نے بھی یہ یوسوگم لے لی تھی کہ شیخ حامد کے کمرے اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ مقصد ایک ہی ہو سکتا تھا کہ جگا کو شخص مرنے والے کا ممکنہ قاتل تصور کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ خود جگا بھی کسی ایک ایسے لمحے کی تلاش میں تھا کہ اس خطرناک دشمن کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دے، شاید وہ رسک لینے سے بھی گریز نہ کرتا لیکن امداد علی نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ شیخ حامد کے سلسلے میں وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے سے گریز ہی کرے۔ اس نے امداد علی کے اس مشورے کو بھی قبول کر لیا۔ گروہ کا سرغنہ ہونے کے باوجود وہ بات بات پر خون خرابہ کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ہاتھ پاؤں بچا کر اپنی ساکھ برقرار رکھنے کا مشورہ بھی اسے امداد علی نے دیا تھا جس پر وہ روز اول سے کار بند تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اسے پہلی بار اپنی زندگی بچانے کی خاطر بلاوجہ حالات کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلنے کا ناخوشگوار عمل اختیار کرنا پڑا تھا۔
جگا کے ذاتی اصول دوسرے گروہ کے سرغنہوں سے مختلف تھے، وہ بد معاشی میں بھی ایمانداری کا قائل تھا، دولت کے لالچ یا اپنی بات ادنیٰ رکھنے کی خاطر اس نے بھی کسی دوسرے چھوٹے بد معاشوں کو تنگ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے اس کے اصولوں کو دوسرے گروہ کے بڑے بھی سراہتے تھے۔
اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا شیخ حامد کے بارے میں مختلف زاویوں سے غور کر رہا تھا جب اس کے کمرے کا دروازہ اچانک کھلا۔ اپنے کسی آدمی کے بجائے ایک اجنبی کو سامنے دیکھ کر اسے خطرے کا احساس ہوا، پلک جھپکتے میں اس نے نہایت پھرتی سے اپنا ہسپتال اٹھا کر آنے

ہوں کہ لوگ چلتے پھرتے بھی ہیں۔ پورا دن گھر میں بیٹھی چھوٹی سی لائبریری میں گزارتے، شام کو چھت پر چلے جاتے۔ بے چینی سے ٹپکتے رہتے، خود سے باتیں کرتے رہتے اور پھر نیچے اتر آتے۔ اس وقت تک صحن میں چار پائیاں بچھ چکی ہوتی تھیں۔ ایک نوکرانی حقہ لاکر رکھ دیتی۔ ان کی بیوی جہاں آرا بیگم دوسری چار پائی پر بیٹھ جاتیں۔ کبھی کبھی دونوں کے درمیان کوئی بات ہو جاتی ورنہ حقہ کی گڑگڑاہٹ ہی واحد آواز ہوتی۔

گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ تھی اور سودا سلف لانے یا باہر کے دوسرے کام نٹھانے کے لیے ایک مرد ملازم موجود تھا جسے گھر کے دروازے کے باہر بیٹھی ہوئی کوٹھری دے دی تھی۔ جب کوئی کام ہوتا اسے دروازے پر بلایا جاتا۔ اسے گھر میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے نہیں کہ کسی پردے وغیرہ کا اہتمام تھا۔ گھر میں تھا ہی کون جس کے لیے پردے کھینچے جاتے۔ بیگم تھیں، وہ تو اب یوزمی ہو چکی تھیں۔ اس پابندی کے پیچھے خان صاحب کی وہ نفسیات تھی جس کی ابتدا انیس سال پہلے ہوئی تھی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا تھا۔ انیس مردوں سے خصوصاً نوجوان مردوں سے نفرت ہو گئی تھی حالانکہ وہ خود بھی مرد تھے۔ اس نفرت کا سبب ان کا اکلوتا بیٹا تھا جو بیس سال پہلے انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اس کا ایک جذباتی قدم تھا۔ اس کے بعد اس نے بہت چاہا کہ وہ گھروٹ آئے لیکن خان صاحب نے شرط رکھ دی کہ پہلے اپنی بیوی کو طلاق دو اس کے بعد بے شک گھروٹ آؤ۔ اس نے بیوی کو نہیں چھوڑا، باپ کو چھوڑ دیا البتہ خط برابر لکھتا رہتا تھا۔ وجاہت اللہ خاں نے خط غائب کرنے کی حرکت کبھی نہیں کی لیکن کوئی خط بھی پڑھا بھی نہیں۔ جب کوئی خط آتا وہ جہاں آرا بیگم کی طرف بڑھا دیتے۔

”تمہارے لاڈلے کا خط آیا ہے۔ اسے پانی میں گھول کے پی لیتا۔“

”تمہارا تو جیسے وہ کوئی ہے ہی نہیں۔“ جہاں آرا بیگم لغافہ جھپٹتے ہوئے کہتیں۔

”وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اسے اپنی اولاد کہیں بلکہ اب تو ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ گاؤں ہی چھوڑ دیں تاکہ خط آنے کا سلسلہ بھی بند ہو۔“

”یہاں کچھ زمینیں ہیں جن کی آمدنی سے اتنا بڑا گھر چل رہا ہے۔ انہیں بھی کیا سر پر اٹھا کر لے جاؤ گے۔“

”سر پر کیوں اٹھائیں گے۔ اس سے پہلے بھی تو آخر شہر میں رہتے تھے، زمینیں یہاں تھیں۔ گھر بیٹھے رقم کتنی ہی

جاتی تھی۔“

”اس وقت کی بات اور تھی۔ آپ یہاں کے چھ چکر لگا لیا کرتے تھے۔ اب آپ میں اتنی جان ہے؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو جہاں آرا۔ اب تو نہیں مرنے جیتا ہے۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لو۔ تمہارے بیٹے کو شہر ہی نے تم سے چھین لیا۔“

”شہر نے نہیں، میرے بیٹے کو آپ نے مجھ سے چھینا ہے۔ آپ ہی اسے نہیں آنے دیتے۔ وہ تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آنا چاہتا ہے۔“

”اگر تمہاری مانتا نے زیادہ شور مچایا تو تمہیں بھی میں اس کے پاس شہر بھیج دوں گا۔“

”مجھے جانا ہوتا تو کبھی کی چلی جاتی مگر میرے پاؤں تو آپ کے ساتھ بندھے ہیں۔“

”تو پھر پڑی رہو نہیں۔ نہ وہ یہاں آئے گا نہ تم جاؤ گی۔ اس نے مجھے اس قابل چھوڑا ہے کہ میں گھر سے باہر نکل کر کسی کو منہ دکھا سکوں۔“

”میں مانتی ہوں اس کی غلطی تھی لیکن اسے اتنی بڑی سزا تو مت دو۔“

”وہ کیا اب اس کی کوئی اولاد بھی یہاں نہیں آسکتی۔ وہ مر گیا ہے میرے لیے۔“

یہ باتیں صرف اس دن نکلا کرتی تھیں جب ان کے بیٹے کا خط آتا تھا۔ پھر سکوت طاری ہو جاتا۔ خان صاحب لائبریری میں بند ہو کر رہ جاتے۔ جہاں آرا بیگم تک کو ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ دو چار دن یہی ماحول رہتا، پھر رفتہ رفتہ خاموشی ٹوٹنے لگتی۔

”ذرا کتب خانے سے نکلو تو فخر سے کہہ کر یہاں کی جہاز پوچھ کر ادوں۔“

”اچھا نکلتا ہوں، اس سے کہو میرا حقہ اٹھا کر باہر رکھ دے۔“

”پان بناؤں نکھاؤ گے؟“

”بناؤ، چونا ذرا کم لگاتا، تم ہمیشہ منہ کاٹ دیتی ہو۔“

بات چیت شروع ہو جاتی۔ ان کی زمین پر کام کرنے والوں کو اجازت مل جاتی کہ وہ خان صاحب سے مل سکتے ہیں۔ کچھ دنوں زندگی چلتی رہتی۔ پھر ٹھوکر لگتی۔ پھر خط آ جاتا۔

”تمہارے لاڈلے کا خط آیا ہے۔“ باتیں پھر نکلتیں، پھر خاموشی، پھر اداسی۔

وجاہت اللہ خاں ایک انا پرست انسان تھے اور یہ

کیفیت ان پر ہر وقت طاری رہتی تھی۔ اسی کیفیت نے انہیں سرکاری نوکری چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا حالانکہ وہ بہت اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ترقی کے امکانات بھی بہت تھے لیکن افسروں کی مانتی ان کے مزاج میں نہیں تھی۔ ان کے افسر بھی ان کے مزاج کو سمجھتے تھے اور برابری کے برتاؤ سے انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن جب ایک افسر ٹرانسفر ہو کر نیا نیا آیا تو خان صاحب کی اس سے ٹھن گئی۔ استعفیٰ دیا اور گھر بیٹھ گئے۔

”کوئی ایسے چھوڑتا ہے نوکری اور وہ بھی سرکاری نوکری۔“

”اور کیا کرتا۔ سالا افسر ہو کر بڑول نکلا۔ لڑنے کی ہمت نہیں تھی، لکھ لکھ کر شکایتیں اور پینچا تا تھا۔ اب میں لکھ کر تو جواب دینے سے رہا۔ میں نے استعفیٰ دے دیا۔ دشمن اگر بڑول ہو تو لڑنے کا مزہ جانتا رہتا ہے۔“

”اب کیا کرو گے؟“

”بلا سپور اچھا بڑا گاؤں ہے، وہاں جا کر رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری زمین ہے۔ زمین کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی۔ زمین سونا اگلے کی اور تم پیش کرو گی۔“

”مجھے اپنے پیش کی پروا نہیں ہے۔ ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے۔ گاؤں میں رہ کر اس کی تعلیم کا کیا ہوگا؟“

”بلاس پور گاؤں نہیں ہے۔ اب تو اسے قصبے کا درجہ ملنے والا ہے۔ وہاں ایک ہائی اسکول ہے۔ ہدایت اللہ وہاں پڑھے گا۔ کالج بھی مکمل ہی جائے گا۔ نہیں کھلا تو ہم اسے پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیں گے۔“

”شہر کی بات اور ہوتی ہے۔“ جہاں آرا نے اسے آہستہ سے کہا جیسے انہیں ڈر ہو کہ وجاہت اللہ خاں من نہ لیں۔

”بس تم اس وقت تک یہاں ہو جب تک میں وہاں ابھی سی زمین دیکھ کر مکان نہ بنوا لوں، میں کل جاؤں گا بلا سپور۔“

اس سے آگے جہاں آرا بیگم کی کیا ہمت تھی جو انکار کے لیے ایک لفظ بھی منہ سے نکالیں۔ سر جھکا کر چپ ہو گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا شوہر جو بات منہ سے نکال دیتا ہے پھر بندوبست کی گولی کی طرح ان کی بات واپس نہیں آتی۔ دیوار سے سر پھوڑنے سے کیا حاصل۔

دوسرے دن وجاہت اللہ خاں بلا سپور روانہ ہو گئے۔ ایک ہفتے بعد واپس آئے تو اس خوش خبری کے ساتھ آئے کہ علاقے سے بہت اچھی جگہ زمین مل گئی ہے۔ بس دفتری کام مکمل ہوتے ہی تعمیر کا آغاز ہو جائے گا۔

مکان میں جانے کے بعد جہاں آرا بیگم پہلی مرتبہ مکان دیکھنے کے لیے بلا سپور گئیں اور مکان دیکھا تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”آپ نے تو دہلی کے بادشاہ کا قلعہ بنوایا۔“

”ہمیں معلوم تھا کہ شاہ جہاں پور کی شہزادی یہاں اترنے والی ہے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

چودھری ملک دین اپنے ذریعے پر تھا کہ اپنی رعایا میں تین بندوں کے اضافے کی خبر اس تک پہنچ گئی۔ اس نے اب تک کے تجربے سے یہی سیکھا تھا کہ بچن اٹھانے سے پہلے سانپ کو کچل دو۔ اس نے اپنے دو کارندے وجاہت اللہ خاں کو بلانے کے لیے بھیج دیے۔

وجاہت اللہ خاں ابھی اپنے نو تعمیر گھر کو اچھی طرح دیکھ بھی نہیں پائے تھے کہ کارندے وہاں پہنچ گئے۔ چودھری نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ابھی نئے آنے والے کے مزاج کا کچھ پتا نہیں لہذا نہایت عزت سے پیش آنا۔ اس کے بعد وہ جیسے تعلقات رکھنا چاہے گا ہم اس سے اسی طرح پیش آئیں گے۔ کارندوں نے وجاہت اللہ کی خدمت میں چودھری کا پیغام پہنچا دیا۔

”گاؤں کے چودھری ملک دین صاحب نے آپ کو سلام پہنچایا ہے۔“

”ان سے کہنا ہم نے ان کا سلام قبول کیا اور کہنا کبھی اس طرف سے گزریں تو ہماری طرف ضرور آئیں۔“

”انہوں نے تو آپ کو بلایا ہے کہ آکر ملاقات کریں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ خان صاحب ہنستے سے اکھڑ گئے۔ ”تمہارے چودھری صاحب چل پھر نہیں سکتے؟“

”وہ تو جتنے بھلے ہیں۔“

”جتنے بھلے ہیں تو اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ پہل وہ کریں، اس کے بعد ہم بھی ملاقات کر لیں گے۔“

چودھری کے بندے ایسی سخت بات سننے کے عادی نہیں تھے۔ تھوڑی دیر کو ان کے حور بدلے لیکن پھر انہیں چودھری کی ہدایت یاد آ گئی۔ اتنی دیر میں خان صاحب دروازہ بند کر کے اندر جا بھی چکے تھے۔ کارندے الٹے پاؤں لوٹ گئے اور جو بات ہوئی اس میں تنک مریج لگا کر چودھری تک پہنچا دی۔

”آدی ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے، ذرا پتا کرو کون ہے، کہاں سے آیا ہے، پولیس کا نمبر تو نہیں ہے؟ مجھے اس طرح

”آپ اگر میرے سامنے یہ شغل کیا کریں گے تو سمجھو میری دوستی تو ختم۔“

”خان صاحب، میں بھی کہاں کرتا ہوں لیکن مہمانوں کی دلدادہی تو کرنی پڑتی ہے۔ میں سمجھا تھا آپ بڑے آدمی ہیں اس لیے ضرور پیٹے ہوں گے۔“

”ارے اسے بڑے آدمی نہیں گھنٹا آدمی پیٹتے ہیں۔“

چودھری اس جملے کے بعد بھی کھسپائی نہیں ہنسنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس ہنسی کے پیچھے یہ مفہوم چھپا ہوا تھا کہ وجاہت اللہ وہ آدمی ہے جس سے نہ دشمنی رکھی جاسکتی ہے، نہ دوستی بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاوقتیکہ وہ خود کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرے۔

وجاہت اللہ خاں کو بھی چودھری کچھ بچا نہیں تھا، لہذا انہوں نے بھی کسی رغبت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہاں کبھی کبھی مل جاتے تو اچھی طرح ملتے تھے۔

چودھری کے آدمیوں کے ذریعے یہ بات حویلی سے باہر نکل گئی تھی کہ وجاہت اللہ خاں نہایت با اثر آدمی ہے۔ اتنا با اثر کہ خود چودھری بھی اس سے ڈرتا ہے۔

اس اطلاع کا اثر یہ ہوا کہ عام لوگ خان صاحب کی بے پناہ عزت کرنے لگے تھے۔ خان صاحب کو بچوں سے بہت پیار تھا لہذا ان کا حویلی نما مکان ہر وقت بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ وہ ان بچوں کے ساتھ بچ بن کر کھیلتے رہتے تھے۔

ایک روز تو حد ہی ہو گئی۔ ایسے ایچ اوسجان اللہ قادری ان سے ملنے آیا ہوا تھا، انہوں نے یہ کہہ کر اسے انتظار کرنے کو کہہ دیا کہ میں ابھی بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ کھیل ختم ہو جائے تو میں حاضر ہوتا ہوں اور کھیل ختم ہونے میں پورا ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔

جب وہ دوسرے بچوں سے اتنا پیار کرتے تھے تو ہدایت اللہ تو ان کی اپنی اولاد تھا۔ اس سے خان صاحب کا پیار ضرب الثل بن گیا تھا۔ وہ اسے پاؤں زمین پر نہیں رکنے دیتے تھے۔ چھوٹی سی کار لے لی تھی یا پھر ان کے کندھے اس کی سواری بننے تھے۔ اسکول چھوڑنے جاتے تو بڑی دیر تک اسکول کے باہر بیٹھے رہتے۔ ان کا جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ آئے تو ہدایت اللہ کے ساتھ تھے اب اکیلے کیسے چلے جائیں۔ جہاں آرا کہتی تھی کہ اتنا لاڈ مت کرو، بچہ بگڑ جائے گا مگر وہ بیوی پر بگڑ جاتے تھے۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ لاڈ پیار سے بھی کوئی نہیں بگڑتا۔ ہدایت اللہ کی سعادت مندی دیکھ کر ان کا یہ فلسفہ درست ثابت ہوتا تھا۔ ہدایت اللہ ان سے ڈرتا بھی تھا حالانکہ انہوں نے اسے بھی نہیں ڈانٹا تھا۔

رہے ہو، ہم سے کہہ دیا ہوتا۔ ہم ملو ادیتے قادری سے، یار ہے ہمارا۔“

اسی وقت ایسے ایچ اوسکی کام سے کمرے سے باہر نکلا اور وجاہت اللہ خاں کو دیکھتے ہی ان کی طرف لپکا۔ ”ارے خان صاحب، آپ اور یہاں، بلا سپور میں؟“ اس نے کہا اور ان سے لپٹ گیا۔

چودھری کی آنکھیں اس طرح پھلی ہوئی تھیں جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو۔ تھانے دار نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وجاہت اللہ خاں جب ملازمت میں تھے تو انہوں نے کشنر سے کہہ کر قادری کے بھائی کو پولیس میں بھرتی کرایا تھا۔ اس دن سے قادری ان کا احسان مند ہو گیا تھا۔ خان صاحب کی شخصیت اور لچھے دار باتیں بھی ایسی تھیں کہ جو ان سے ملتا متاثر ضرور ہوتا تھا۔

چھوٹی جگہوں پر ایسے ایچ اوس بادشاہ ہوتا ہے۔ عام آدمی کی تو ہمت بھی نہیں ہوتی کہ اس سے مل سکے اور پھر جس انداز سے وہ خان صاحب سے ملتا تھا، چودھری اس کا چشم دید تھا۔ اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ خان صاحب سے دشمنی کا رشتہ جوڑتا۔ اب اسی میں عافیت تھی کہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ وہ اپنے باغ کے تازہ پھلوں کے ٹوکروں کے ساتھ خان صاحب کے گھر پہنچ گیا اور بڑا اصرار کر کے خان صاحب کو اپنے ساتھ حویلی لے آیا۔

”خان صاحب، ایک بات بتا دوں۔ یہاں جتنے کم ذات کہنے لوگ ہیں انہیں ذرا بھی رعایت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں جتنا منہ لگاؤ گے اتنے ہی یہ ہاتھ پاؤں پھیلائیں گے۔ انہیں ہمیشہ دبا کر رکھنا، جیسے میں رکھتا ہوں۔“

”چودھری صاحب، میرے بڑوں نے ہمیشہ زمینداری کی ہے، مجھے معلوم ہے کہ کتے کیسے سدھائے جاتے ہیں۔“

”خان صاحب، آپ تو ہمارے قبیلے کے نکلے۔“

”بس فرق یہ ہے کہ میں عالم نہیں ہوں۔“

”آپ تو مذاق کرنے لگے خان صاحب۔“ چودھری نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہم بھی عالم کب ہیں مگر رعب تو رکھنا پڑتا ہے۔“

”عالم کا رعب زیادہ دن قائم نہیں رہتا۔“ چودھری نے پھر ہنستا شروع کر دیا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اسے خان صاحب کی شخصیت ہر پہلو سے دلچسپ اور ہراساں نظر آرہی تھی۔ بے تحاشا تعجب تو اسے اس وقت ہوا جب گلاب آئی اور خان صاحب لاجول پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کوشش کروں گا کہ آپ کی سلطنت میں مجھ سے کوئی جرم سرزد نہ ہو۔“

”آپ ویسے ہیں سمجھ دار۔“

”پندرہ سال ڈپٹی کشنر کے دفتر میں کام کر کے آیا ہوں۔ اتنی اونچ نیچ تو سمجھ میں آئی گئی ہے۔“

”پھر امید کروں کہ آپ کسی دن حویلی میں حاضری دیں گے۔ مجھے بھی تو میزبانی کا موقع دیں۔ آپ کے تو بڑے تعلقات ہوں گے، چھوٹے موٹے کام ہمارے بھی پڑتے رہتے ہیں۔“

چودھری شیر بن کر آیا تھا، لومڑی بن کر واپس جا رہا تھا۔ لومڑی اس لیے کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر شیر بن کر سامنے آیا تو سامنا اچھے شکاری سے ہے۔ چلی ہوئی گولی سیدھی پیچھے کے پار جائے گی۔ لومڑی کی طرح چالاکی سے کام لینا ہوگا۔

اس نے ڈیرے پر پہنچتے ہی اپنے آدمیوں کو بے نقطہ ستائیں۔ ”تم نے یہ کیوں نہیں معلوم کیا کہ وہ کس اثر رسوخ کا آدمی ہے۔ میں نے اسے کئی سخت ست سنا دیں تب اس نے بتایا کہ وہ ڈپٹی کشنر کے دفتر میں کام کر چکا ہے۔ اب اس سے دوستی رکھ کر اس کی کمزوریاں تلاش کرتی ہوں گی۔“

وجاہت اللہ خاں کے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ پولیس سے راہ ورسم پیدا کریں۔ چودھری کے تئیرد کچھ کر وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے تھے۔ انہیں اپنی اس سفارش پر بڑا ناز تھا کہ وہ ڈپٹی کشنر کے دفتر میں کام کر چکے ہیں۔ اسی سفارش کو لے کر وہ پولیس اسٹیشن چلے گئے۔ اب یہ ان کی خوش قسمتی کہ ایسے ایچ اوسکی جتنی پر سجان اللہ قادری کا نام لکھا ہوا تھا۔

”تمہارے صاحب سے ملنا ہے۔“ انہوں نے باہر بیٹھے ہوئے ایک پولیس والے سے کہا۔

”برابر کے کمرے میں جا کر اندراج کرایئے۔“

صاحب کہیں گے تو بلا لیں گے۔“

”جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو۔“

”یہ تمہارا ہے، زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں ہے۔“

صاحب ابھی کسی سے نہیں مل سکتے۔ اندر چودھری کے آدمی بیٹھے ہیں۔“

”ان سے جا کر کہہ دو وجاہت اللہ خاں آیا ہے۔“

جواب دینے کی اسے ہمت کیسے ہوئی۔ یہ تو دیکھنا پڑے گا اور ہاں، میں صرف کل تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد میں خود جاؤں گا۔“

چودھری سانپ کی طرح مل کھا کر رہ گیا تھا لیکن اجنبی مل میں ہاتھ بھی نہیں ڈالا جاسکتا تھا۔ یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ مل میں چھپا ہوا جانور کس ہتھیار سے مارا جائے گا۔

دوسرے دن اس کے آدمیوں نے خبر لا کر دی کہ وجاہت اللہ خاں عام سا آدمی ہے۔ اس کا کسی انجینی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی اکثر صرف اس لیے ہے کہ وہ چودھری کو جانتا نہیں۔ ایک دور گزروں کے بعد راہ راست پر آ جائے گا۔

چودھری نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ جیب نکالیں۔ چار سٹخ محافظوں کو ساتھ لیا اور وجاہت اللہ خاں کے دروازے پر پہنچ گیا۔ خان صاحب نے چودھری کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت عزت کے ساتھ اپنے سبے سجائے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

”خان صاحب، اگر آپ ڈیرے پر آ جاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔“

”مقصود تو ملاقات تھا وہ یہاں بھی ہو رہی ہے۔“

”تم یہاں نئے ہو اس لیے اس گستاخی کو نظر انداز کر دیا اور یہ سمجھانے چلا آیا کہ یہاں کی ریت رکھیں کیا ہیں۔“

”یہ علاقہ کیا کوئی الگ ملک ہے جو یہاں کے قوانین دوسرے ہوں گے۔ ہمیں معلوم ہے ہمیں کیسے رہنا ہے۔“

”آپ کو یہاں کوئی بھی تنگ کرے، آپ میرے پاس چلے آئیے۔ میں اپنے بندوق برداروں کو آپ کے ساتھ گردوں گا۔“

”ان کاموں کے لیے تھانے اور عدالتیں ہوتی ہیں، چودھری کا دربار نہیں۔ ویسے دوستوں سے نہیں کہوں گا تو کس سے کہوں گا۔“

”آپ سمجھ نہیں۔ تھانے دار بھی میرے پاس آکر بیٹھتا ہے۔“

”اس میں کیا ہے۔ اب وہ میرے پاس بیٹھنے لگے گا۔“

”آپ سمجھ نہیں۔ میں چودھری ہوں نا اس لیے۔“

”چودھری صاحب۔ زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ اب پرائیویٹ عدالتوں اور نجی جیلوں کا رواج نہیں۔“

”میں خود ان کا قائل نہیں لیکن پنچایت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

بلا سپور میں خان صاحب کے قدم جم گئے تھے۔ چودھری سے زیادہ ان کی عزت تھی بلکہ اب چودھری کے ستائے ہوئے لوگ ان کے پاس سفارش کے لیے آتے تھے۔ چودھری نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ اس کے معاملات میں دخل نہ دیا کریں لیکن خان صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ غریبوں سے انہیں خاص ہمدردی تھی۔ کسی کا قرض معاف کرانے کے لیے چودھری کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ کسی کے گھر فاقے دیکھتے تو چودھری کو مجبور کرتے کہ اس کے گھر تاج ڈلوادیں۔

اسی طرح ایک طویل سفر کٹ گیا۔ ان کے بیٹے ہدایت اللہ نے میٹرک پاس کر لیا۔ اس وقت تک یہاں کالج کھل گیا تھا۔ ہدایت اللہ کو انہوں نے کالج میں داخل کرادیا۔ یہ کالج صرف انٹر تک تھا۔ دو سال پورے کرنے کے بعد انہوں نے ہدایت اللہ کو پڑھنے کے لیے شہر بھیج دیا۔ کہاں تو بیٹے کی جدائی انہیں ہل بھر کے لیے گوارا نہیں تھی اور اب وہ پانچ سال کے لیے جا رہا تھا۔ اسے ان کی نظروں سے دور ہاسٹل میں رہنا تھا۔ خان صاحب کی حالت اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رہے تھے۔ ہدایت اللہ انہیں سمجھا رہا تھا، احباب سمجھا رہے تھے کہ شہر دور ہی کتنا ہے۔ بیرون ملک تو پڑھنے کے لیے نہیں جا رہا ہے۔ چھٹیوں میں آتا رہے گا۔ تم جا کر اس سے ملتے رہو گے۔ اب ہدایت اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے مگر خان صاحب کھل رہے تھے کہ وہ ہدایت اللہ کو روز کیسے دیکھا کریں گے۔

”اگر تمہیں جدائی گوارا نہیں تو مت بھیجو پڑھنے کے لیے۔“ جہاں آرانے ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنی طرح تم چاہتی ہو تمہارا بیٹا بھی جاہل رہے۔ ارے تم کیا جانو پڑھائی کی قدر۔ اللہ بخشے تمہارے باپ کون سے پڑھے لکھے تھے۔“

”تمہارے باپ تو بی۔ اے، ایم۔ اے تھے۔“ وہ نہیں سمجھتے تھے مگر ہدایت اللہ کا باپ تو پرانے وقتوں کا بی۔ اے ہے۔ وہ ضرور پڑھے گا۔

”پھر اس کے جانے پر آنسو کیوں بہا رہے ہو؟“

ہو کر آئے ہو۔ خان صاحب بھڑک اٹھے، تمہارے خاندان میں بیٹے ہوتے ہی کہاں تھے، ہر گھر میں بیٹیوں کی لائن لگی ہوتی تھی۔ تم کیا جانو بیٹے کی محبت۔ ایک مرتبہ پھر دونوں میں جھڑپ ہوئی اور خان صاحب بیٹے سے ملنے شہر پہنچ جاتے۔ جہاں آرا اپنی ماسٹا کی آنکھیں صرف اس وقت ٹھنڈی کرتیں جب چھٹیوں میں ہدایت اللہ گھر آتا۔

ہدایت اللہ کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ چھ مہینے بعد وہ انجینئر بن کر لوٹنے والا تھا۔ اس مرتبہ وہ گھر آیا تھا تو اس نے یہ مژدہ سنا دیا تھا۔ خان صاحب نے بہت دنوں بعد اپنی مونچھوں کو تاد دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”یہ ہے میرا پوت۔ انجینئر بن کر لوٹے گا، انجینئر بن کر۔“

اس وقت رات بہت بیت گئی تھی لیکن خان صاحب کروٹیں لے رہے تھے۔ یہ حالت ان کی صرف اسی وقت ہوتی تھی جب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو ورنہ تو نیند ان سے پہلے ان کے بستر پر پہنچ جاتی تھی۔

نیند کسی صورت نہیں آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دوسرے پبلنگ پر جہاں آرا بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر ساکت بیٹھے رہے۔ پھر بیوی کو آواز دی۔ آواز کا اثر نہیں ہوا تو انہوں نے جہاں آرا کی کلائی پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

”کیا ہو ہدایت کے ابا۔“

”بیٹے کے آنے میں تین مہینے رہ گئے ہیں اور تم آرام سے پڑی سو رہی ہو۔“

”اسے آنے تو دو۔ پھر اس کے ساتھ جاگتی رہوں گی۔“

”سنو تو۔ میری بات تو سنو۔“

”ساؤ۔“ اب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔

”بیٹا انجینئر بن کر آ رہا ہے۔ اس کی شادی کے لیے بھی کچھ سوچو۔“

”تو یہ ہے۔ تم نے تو مجھے ڈراما ہی دیا تھا۔ ابھی اسے آنے تو دو۔ کہیں نوکری تو لگنے دو۔ لڑکی بھی دیکھ لیں گے۔“

”اس کی شادی کیا نوکری کی وجہ سے رک رہے گی۔ وہ کسی فقیر کا بیٹا نہیں ہے۔ شادی کے دوسرے دن وہ دفتر چلا جائے۔ تمہیں اچھا لگے گا۔ بھی شادی کر کے سال دو سال مزے کرے گا۔ پھر نوکری کرے گا۔“

”آپ کی تو ہر محالے میں منطق الٹی ہے۔“

”میرے پاس جو وکیل صاحب آتے ہیں تم نے ان

کی بیٹی کو دیکھا ہے۔“

”ہاں، ایک مرتبہ دیکھا تو ہے۔“

”تم نے غور بھی نہیں کیا ہوگا۔ کل میرے ساتھ چلو۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں ہدایت کے لیے وکیل صاحب سے بات کر لوں گا۔“

جہاں آرا جانتی تھیں کہ وہ جو کہہ دیتے ہیں پتھر کی لکیر ہوتا ہے، اس لیے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ دوسرے دن وکیل صاحب کے گھر پہنچ گئیں۔ لڑکی دیکھی تو واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ دیکھتے ہی دل میں اتر گئی۔ میرے ہدایت کے لیے اس سے اچھی لڑکی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اب وہ بھی خان صاحب کی ہم خیال تھیں۔ انہوں نے خان صاحب کو مشورہ دیا کہ شادی یا منگنی تو ہدایت کے آنے کے بعد ہی ہوگی۔ وکیل صاحب سے پہلے ان کا عندیہ معلوم کر لیا جائے کہ وہ تیار بھی ہیں۔ زندگی میں پہلی بار جہاں آرا کی بات خان صاحب کی سمجھ میں آئی، ورنہ وہ تو منگنی بیاہ سب انجی کرنے کو بے تاب تھے۔

وجاہت اللہ خان دوسرے دن پھر وکیل صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ کوئی بات ڈھکے چھپے انداز میں کہنے کے عادی تو تھے نہیں، بیٹھے ہی مطلب پر آ گئے۔

”تم کہو گے میں کل تو آیا تھا آج پھر آ گیا۔ تو بات یہ ہے کہ کل ہم آئے تھے ایک نظر عارف بیٹی کو دیکھنے اور آج آئے ہیں یہ بتانے کہ ہم نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”خان صاحب۔ ذرا وضاحت سے بتائیے۔“

”وکیل میاں، تم نے ہمارے بیٹے ہدایت اللہ کو تو دیکھا ہوگا۔“

”جی ہاں، کوئی ایک مرتبہ۔ ماشا اللہ بہت پیارا بیٹا ہے۔“

”وہ انجینئر بن گیا ہے اور آنے والا ہے۔ ہم چاہتے ہیں اسے کوئی حنفہ دیں اور وہ حنفہ ہوگی عارفہ۔ آتے ہی ہم اس کی شادی عارفہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ بتائیے آپ کو منظور ہے؟“

”خان صاحب، یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی لیکن اسے آنے تو دیجیے۔ اس کی رضامندی بھی تو لیجیے۔“

”کمال ہے۔ اس کی کیا رضامندی۔ وہ کوئی ہمارے حکم سے باہر تھوڑی ہے۔ وہ میرا بیٹا ہے، میرا۔ اس نے آج تک میرا حکم نہیں ٹالا اور پھر عارفہ جیسی لڑکی اس الو کے پٹھے کو کہیں اور ملے گی؟“

وکیل صاحب نے فس کر ہائی بھری۔ ”مجھے منظور ہے خان صاحب۔“

ان کی طرف سے اجازت مل گئی تو خان صاحب نے باقاعدہ مشاکی، ہار پھول وغیرہ خریدے اور بیوی کے ساتھ جا کر باقاعدہ رشتہ طے کر آئے۔ طے ہوا کہ ہدایت اللہ کے آنے کے ایک ہفتے بعد نکاح ہو جائے گا، رخصتی سہولت دیکھ کر کسی وقت کر لی جائے گی۔

تین مہینے، کئی مہینوں کی طرح گزرے بالآخر ایک دن ہدایت اللہ آ گیا۔ خان صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے لیے کیا کریں اسی دن شام کو وہ اسے لے کر وکیل صاحب کے گھر بھی چلے گئے لیکن اسے بتایا کچھ نہیں تھا۔

وکیل صاحب کے گھر ظاہر ہے ان کی غیر معمولی خاطر مدارات ہوئی۔ ان لوگوں نے عارفہ کو بھی سامنے کر دیا تاکہ ہدایت اللہ دیکھ لے۔

خان صاحب واپس گھر پہنچے تو انہوں نے ہدایت اللہ سے پوچھا۔ ”برخوردار، وہ جو لڑکی تم نے وہاں دیکھی، کیسی لگی؟“

”ٹھیک ہے ابا۔“

”بس ٹھیک ہے۔ اچھی نہیں ہے؟“

”اچھی ہے۔“

”ابے اچھی نہیں ہے، بہت اچھی ہے۔“

”جی ہاں بہت اچھی ہے۔“

”میں نے وکیل صاحب سے بات کر لی ہے۔ ایک ہفتے بعد تمہارا نکاح ہو جائے گا۔“

”جی ابا۔“

”ابے کیا جی، جی لگا رکھی ہے۔ تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔“

”ہوئی ہے، بہت خوشی ہوئی ہے لیکن ابھی تو مجھے اچھی سی نوکری ڈھونڈنی ہے۔“

”ڈھونڈ لینا وہ بھی۔ ایک ہفتے بعد نکاح ہے۔“

”جی ابا۔“

”جاؤ گھومو پھر دو۔ پھر تو ہماری طرح بیوی کے قدموں میں بیٹھ جاؤ گے۔“

اسے کہاں گھومنا تھا، وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ کئی مرتبہ ہمت کی کہ انکار کر دے۔ جو حقیقت ہے وہ باپ پر ظاہر کر دے۔ باپ سے نہیں کہہ سکتا تو ماں ہی کو بتا دے لیکن خان صاحب کا رعب ایسا تھا کہ ہدایت کی زبان پر تالے پڑ گئے۔ ماں سے بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ماں سے کہنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ بات باپ تک پہنچتی اور پھر جو قیامت آتی اس کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے بھی بچپن

اور اجازت چاہی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ گاؤں چلا آئے۔ جہاں آرا نے بہت ضد کی کہ خان صاحب بیٹے کو معاف کر دیں اور اسے گھر آنے کی اجازت دے دیں لیکن وہ گھر ہی کے نہیں، دل کے دروازے بھی بند کر چکے تھے۔ ہدایت اللہ کے خط آتے رہے۔ ہر خط میں وہ گھر آنے کی ضد کر رہا تھا لیکن خان صاحب کی اجازت نہیں تھی۔

خان صاحب کی ضد نے بیس برس گزار دیے۔ جہاں آرا بیگم کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہدایت اللہ کے ایک بیٹا ہوا ہے اور پانچ سال بعد بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہر سال حساب لگاتی تھیں کہ پوتا اب اتنا بڑا ہو گیا ہوگا۔ پوتی کی عمر اتنی ہو گئی ہوگی۔ اب انہیں بیٹے سے زیادہ پوتے اور پوتی کو دیکھنے کی خواہش تھی۔

”ہدایت کے ابا، اب تو بیٹے کا قصور معاف کر دو، برسوں گزر گئے۔ نہ جانے کیسا ہو گیا ہوگا میرا بیٹا۔“

”مجھ سے اس کی سفارش مت کیا کرو۔“

”اس کے بچوں کا کیا قصور، میں مرنے سے پہلے اپنے پوتے پوتی کو تو دیکھ لوں۔ اب تو جوان ہو گئے ہوں گے ماشا اللہ۔“

”اصل رقم ہی ڈوب گئی تو سود کیسا۔“

وجاہت اللہ خان کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھے۔ مگر وہ لوہے کی بنی ہوئی نہیں تھیں۔ اصرار کمزور پڑ گئے تھے۔ خان صاحب کی حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ اکیلے میں روتے تھے اور بیوی کو دیکھتے ہی آنسو پونچھ لیتے تھے۔ فیصلے میں اور سختی آجاتی کہ کہیں کمزوری ظاہر نہ ہو جائے۔

”اے ہدایت کے ابا۔ میں کہوں بہت دن ہو گئے، ہدایت کا خط نہیں آیا۔“

”تھک گیا ہوگا۔ کب تک لکھے گا خط۔ سمجھ میں بات آگئی ہوگی کہ وجاہت اللہ خان سے ٹکرانے کا مطلب کیا ہے۔“

”تم کیسے باپ ہو، دل میں ذرا بھی رحم نہیں۔“

”بزدلوں کے لیے میرے دل میں کوئی رحم نہیں۔“

”وہ تمہاری اولاد ہے۔“

”میں بھی یہی سمجھتا تھا مگر اس نے خود سمجھا دیا کہ میں اس کا باپ نہیں ہوں۔“

”یہ یاد رکھو، مٹانے سے ہاتھ کی لکیریں مٹ نہیں جاتیں۔“

اتنے غصے میں تھیں کہ زندگی میں پہلی بار انہوں نے خان صاحب سے سچ سچ لڑائی کی اور جوش میں آیا کہتی چلی گئیں۔ خان صاحب، جو لڑائی شروع ہوتے ہی ان کے خاندان کو ستانے پر اتر آتے تھے، اس دن بالکل خاموش تھے۔ ابھی جہاں آرا کا غصہ کم نہیں ہوا تھا کہ خط آ گیا۔

”تمہارے لاڈلے کا خط آیا ہے۔“ خان صاحب نے لفافہ ان کی طرف اچھال دیا۔

”پڑھ کر نہیں سناؤ گے؟“ انہوں نے خان صاحب کو منانے کے لیے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ خان صاحب نے ان کی طرف دیکھا، لفافہ چاک کر لیا۔ یہ بھی ایک انہونی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی خط کو نہیں پڑھا تھا۔ جہاں آرا بیگم محلے کے کسی بچے کو بلا کر پڑھا لیتی تھیں۔

خان صاحب نے خط نکال کر ایک نظر ڈالی اور خط دوبارہ جہاں آرا کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”میں نے اس سے پہلے کوئی خط پڑھا ہے جو، اب پڑھوں گا۔ کسی کو بلا کر پڑھا لو۔“ انہوں نے کہا اور لاہیر پری میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ جہاں آرا بیگم کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ دل ہی دل میں بیٹے کو مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں مگر تاک ایسی عزیز ہے کہ کبھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ سمجھتے ہیں ایک۔ یہی پڑھے لکھے ہیں، میں ابھی کسی بچے کو بلاتی ہوں۔ دروازے پر جا کر ایک بچے کو آواز دی، ذرا یہ خط تو پڑھ دے۔ میرے بیٹے کا خط آیا ہے۔

بچے نے خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ خط ہدایت اللہ نے نہیں اس کی بیوی نے لکھا تھا۔ ابھی بچے نے آدھا خط پڑھا تھا کہ جہاں آرا نے ایک دل دوز چچ ماری اور لاہیر پری کی طرف بھاگیں۔ دروازے پر جا کر جمبول گئیں اور ہاتھوں کے بجائے اپنے سر سے دروازہ پیٹ ڈالا۔ خان صاحب کو معلوم تھا، تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے۔ دروازے سے لگے بیٹھے تھے۔ اٹھے اور دروازہ کھول دیا۔

”میرا بچہ، میرا ہدایت۔ سنتے ہو میرا بچہ مر گیا۔ تمہاری ضد نے اسے مار دیا۔ تم نے اپنی قسم دے دی تھی ورنہ میں خود جا کر اسے دیکھ آتی۔ میں اسے دیکھ بھی نہیں سکی اور وہ مر گیا۔“

خان صاحب نے جہاں آرا کو اپنی جوڑی چھانی میں چھپالیا۔ ان کے اندر کا انسان ہار گیا تھا۔ ان کے بپتے ہوئے آنسو اعلان شکست کر رہے تھے۔

شکست کی آواز ان کے کانوں میں بھی آرہی تھی لیکن اپنا لشکر پیچھے ہٹانے کو تیار نہیں تھے۔ بس اتنا ہوا تھا کہ اپنے کانپتے ہاتھوں سے بیوی کی پیٹھ تھپ تھپ رہے تھے۔

جہاں آرا روتے روتے تھک گئیں تو خان صاحب

نے قریب کھڑی ملازمہ کو لٹکارا۔ ”کھڑی کھڑی دیکھ کیا رہی ہے۔ دوڑ کے جا، پانی لے کر آ۔“

جہاں آرا نے پانی پیا۔ کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو خان صاحب کے پیروں پر گر گئیں۔ ”مجھے شہر لے کر چلو۔ اپنے بیٹے کو تو دیکھ نہیں سکی۔ پیچھے پوتے کو تو دیکھ آؤں۔“

”چلیں گے، چلیں گے۔ ذرا دل ہلکا ہو جائے پھر چلیں گے۔“

جہاں آرا نے ان کی آنکھوں میں ابھرنے والے آنسو دیکھ لیے تھے۔ بیٹے کا سارا غم بھول گئیں۔ یہ بچتا وہی میرے لیے سب کچھ ہے۔

رات ہوئی اور خان صاحب بستر پر لیٹے تو پاؤں دبانے کے بہانے جہاں آرا بھی آ بیٹھیں۔

”پھر کب چل رہے ہو؟“

”کہاں؟“

”شہر چلو، یہو سے تعویذ نہیں کرو گے؟“

”جہاں آرا بیگم، اب کیا کرو گی وہاں جا کر جب بیٹا ہی نہ رہا۔“ خان صاحب نے پھر قلابازی کھائی۔

”بیٹے کی نشانیاں تو ہیں، انہیں دیکھ لوں گی۔“

”سو جاؤ جہاں آرا بیگم۔ جس بہو نے ہمارا بیٹا ہم سے چھین لیا، ہم اسے دیکھنے جائیں۔“

جہاں آرا بیگم ضد کرتی رہیں لیکن خان صاحب کے خراٹوں نے ان کا حوصلہ توڑ دیا۔ خاموشی سے اتریں اور اپنے بستر پر آ گئیں۔ سونے کے لیے آئی تھیں، صبح تک جاگتی رہیں۔ جہاں آرا جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ کوئی اور عورت ہوتی تو میاں کے روکنے کے باوجود بیٹے سے مل چکی ہوتی لیکن انہوں نے سہاگ پر بیٹے کو قربان کر دیا تھا۔ اب بھی وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ اگر شوہر کی حکم عدولی ہی کرنی تھی تو بیٹے کی زندگی میں کرتیں۔ خان صاحب ٹھیک کہتے ہیں، میں وہاں جا کر کیا کروں گی۔ ہدایت تو وہاں ہو گا نہیں۔

کچھ دن بعد پھر خط آیا۔ یہ خط بھی ان کی بہو کی طرف سے تھا۔ انہوں نے لکھا تھا، بچے کہتے ہیں انہوں نے اپنے دادا دادی کو بھی دیکھا ہی نہیں۔ میرے سر سے کیسے گا اب فصد تھوک دیں اور بچوں کو موقع دیں کہ وہ آکر آپ لوگوں کو دیکھ لیں۔ ہدایت یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اگر کسی وقت ان کے والد کا غصہ کم ہو جائے اور وہ آنے کی اجازت دے دیں تو تم ان کے پاس جا کر رہنا۔ میں نے جو غم انہیں دیے ہیں تم ان پر مرہم رکھنا۔ مجھے آپ لوگوں کو دیکھنے کا بہت اشتیاق ہے۔ کیا آپ مجھے بلائیں گی۔

جہاں آرا کا بیٹا صبر ایک مرتبہ پھر لبریز ہو گیا۔ انہوں نے خان صاحب کو مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ ان کے پوتے پوتیوں کو بلا لیں۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ خان صاحب میں اب وہ پہلی جیسی اکر نہیں رہ گئی ہے۔ وہ انکار کر ضرور کر رہے ہیں لیکن اس انکار میں اب وہ شدت نہیں رہی ہے۔ وہ تقاضے کرتی رہیں اور پھر خان صاحب کی زبان سے ہاں نکل گئی۔

”تم اگر چاہتی ہو تو بلا لو لیکن میں ان میں سے کسی سے بات نہیں کروں گا۔“

جہاں آرا کا بیٹا صبر ایک مرتبہ پھر لبریز ہو گیا۔ انہوں نے خان صاحب کو مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ ان کے پوتے پوتیوں کو بلا لیں۔

وہ دیکھ رہی تھیں کہ خان صاحب میں اب وہ پہلی جیسی اکر نہیں رہ گئی ہے۔ وہ انکار کر ضرور کر رہے ہیں لیکن اس انکار میں اب وہ شدت نہیں رہی ہے۔ وہ تقاضے کرتی رہیں اور پھر خان صاحب کی زبان سے ہاں نکل گئی۔

”تم اگر چاہتی ہو تو بلا لو لیکن میں ان میں سے کسی سے بات نہیں کروں گا۔“

”ہاں تم مت کرنا۔ میں ان سے باتیں کرنے کے لیے بہت ہوں۔ میرا پوتا ہوگا، میری پوتی ہوگی، ہدایت کی دہن ہوگی۔ پھر مجھے تمہاری پر دانی نہیں ہوگی۔ پڑے رہنا اکیلے۔“

”تم تو چاہتی یہی ہو۔ جیسے تمہارے باپ اکیلے پڑے رہتے تھے، میں بھی پڑا رہوں۔ تمہارا تو یہ خاندانی ٹھیل ہے۔“

جہاں آرا مسکراتی ہوئی ان کے سامنے سے ہٹ گئیں۔ بہت دنوں بعد انہوں نے جہاں آرا کو خاندان کا طعنہ دیا تھا۔ جب وہ پیار کی لڑائی لڑا کرتے تھے تو ایسے ہی طعنے دیا کرتے تھے۔

جہاں آرا بیگم نے خط لکھ دیا کہ تم پر اس گھر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ جب جی چاہے بچوں کو لے کر چلی آؤ۔

اسی دن سے انہوں نے گھر کو سجانا شروع کر دیا۔ محلے کے بچے ان کی مدد کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ جہاں آرا کی ہڈیوں میں پھر سے طاقت آگئی تھی۔ خان صاحب بڑی دلچسپی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔

تا نگا دروازے پر آکر رکا۔ ملازمہ فاخرہ چیل کی طرح دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کے پیچھے جہاں آرا بھی پہنچیں۔ ان کا ہدایت اللہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی نقشہ، وہی قد، وہی رنگ۔ اللہ نے میری گود دوبارہ بھر دی۔ وہ بھی دادی جان کہہ کر لپٹا تو جہاں آرا کی آنکھیں دریا بن گئیں۔ انہیں پوتا بھی ملا تھا اور بیٹا بھی۔

”یہ آپ کی پوتی فوزیہ ہے۔“

جہاں آرا نے بہو اور پوتی کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔ سامان اندر پہنچ چکا تھا۔ جہاں آرا بھی ان سب کو لے کر گھر میں آ گئیں۔ خان صاحب اپنی لاہیر پری میں بے چینی سے ٹھل رہے تھے۔ شاید منتظر تھے کہ کوئی انہیں بھی بلائے۔

”دادا جان کہاں ہیں؟“ جہاں آرا کے پوتے عنایت

اللہ نے پوچھا۔

”بٹا ایک بات کہوں۔ وہ ابھی تک تم لوگوں سے ناراض ہیں لیکن تم لوگوں کو آنے کی اجازت دے دی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کچھ جگہ پیدا ہوئی ہے۔ کچھ دن ناراض رہیں گے پھر ٹھیک ہو جائیں گے۔ دماغ کے ذرا ایسے ہی ہیں مگر دل کے برے نہیں ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں انہیں منالوں گا۔ ڈیڈی تو دادا کی طرح ہی ضدی تھے۔ میں ہوتا تو اب تک منا چکا ہوتا۔ وہ ہیں کہاں۔ میں ابھی جا کر ان کے پاؤں پکڑتا ہوں۔“

”تم ٹھہرو، میں انہیں لے کر آتی ہوں۔“
وہ لائبریری میں گئیں تو خان صاحب بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔

”ذرا چل کر اپنے پوتے کو تو دیکھو۔ کیا نظام ہے قدرت کا۔ بالکل ہدایت کی جوانی ہے جو ہمارے آگن میں کھڑی ہے۔“

”تم دیکھو اس کی جوانی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“
”آپ کو ہماری قسم امت کیجیے گا بات۔ چل کر دیکھو تو۔“

”تم نے اپنی قسم دے دی ہے تو چلو۔“
وہ آگن میں آئے اور پوتے پر نظر پڑی تو وہ بھی دنگ رہ گئے۔ باپ بیٹے میں اتنی مشابہت بھی ہو سکتی ہے۔ بہت دنوں بعد ان کا ہاتھ مونچھوں پر تاؤ دینے کے لیے بڑھا تھا لیکن پھر رک گیا۔

”کیا نام رکھا ہے تیرے باپ نے تیرا؟“
”عنایت اللہ خاں۔“

”نام تو اچھا رکھا ہے اس۔۔۔۔۔۔ وہ گالی دینا چاہتے تھے لیکن پھر خیال آیا مردے کو برا نہیں کہتے۔“

عنایت اللہ ان سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھا لیکن خان صاحب دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جب تک جی چاہے یہاں رہو لیکن بزدل بن کر نہیں بہادری کے ساتھ۔“ انہوں نے کہا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

ان کا یہ طرز عمل کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا لیکن جہاں آرا بیگم پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ یہی سب کچھ ہوگا اس لیے کسی نے بھی اسے اپنی بے عزتی نہیں سمجھا بلکہ عنایت نے تو اپنی ماں کو سمجھایا کہ وہ دادا جان کے طرز عمل کو دل پر نہ لیں ایک دن وہ ان کا دل جیت کر دکھائے گا۔ اسی دن سے وہ اس کوشش میں لگ گیا تھا۔

ہر وقت کی قربت نے خان صاحب کو بھی پگھلانا شروع کر دیا تھا لیکن برسوں کی اکڑ ایک دن میں جانے والی نہیں تھی۔ وہ چھپ چھپ کر سب کو دیکھتے رہتے لیکن کسی کو یہ موقع نہیں دیا کہ کوئی ان سے براہ راست بات کر سکتا، عنایت کو دیکھ کر انہیں اپنا بیٹا یاد آ جاتا تھا اور یہی غلط بات تھی۔ بیٹے کے ساتھ یہ بھی یاد آ جاتا تھا کہ وہ انہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔

عنایت جان بوجھ کر ان کے کمرے کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ وہ جب باہر نکلتے، انہیں سلام ضرور کرتا، چاہے جواب ملے نہ ملے۔ ان تک جائے پہنچانے کا کام تو اس نے اپنے ہی ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن یہ سب کام کسی مشین کی طرح چل رہے تھے۔ عنایت چاہتا تھا کہ بزرگوں کی طرح وہ اسے دعا میں دیں لیکن وہ نہ برا کہہ رہے تھے نہ اچھا۔

چودھری ملک دین بڑھا ہوا چکا تھا۔ اب اس کے بیٹے محمد دین کی حکمرانی تھی۔ باپ کی شہ تھی اور جوانی کی ترنگ تھی۔ طاقت کے نشے میں کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی ملازم پر ہنر برسا رہا تھا کہ چودھری چنچ اٹھا۔ ”ارے کیا مار ڈالے گا۔ اس میں دم ہی کتنا ہے۔ کسی سورا کو مارتا کہ تیری دھاک بیٹھے۔“

”کوئی سورا تم نے چھوڑا ہے۔ سب تو مجھے دیکھ کر بلوں میں چھپ جاتے ہیں۔“

”ارے ادھر تو آ۔ ایک بات یاد آئی۔ یار ایک کام کر۔ وہ جو اپنا یار وجاہت اللہ خاں ہے۔ اس سے ایک پرانا حساب چکاتا ہے۔ سنا ہے اس کا پوتا آیا ہوا ہے۔ پوری جوانی پر ہے۔ اگر اس کا سر جھکا دے تو وجاہت اللہ کی مونچھیں لٹک جائیں گی۔“

”اس کی پوتی بھی تو آئی ہوئی ہے۔ کہو تو اٹھالوں۔“
”بے وقوفی کی باتیں مت کر، پہلے سانپ کو ٹھکانے لگا پھر مل میں ہاتھ ڈالنا۔“
”وہ شہری چھو کر اتنی دیر میرے سامنے کھے گا۔ چڑھنے دے ہتھے۔“

عنایت نے دادی سے بڑی مشکل سے اجازت لی تھی کہ وہ کسی ملازم کو ساتھ لے کر دادا کے کھیتوں پر چلا جائے۔ ملازم کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہا تھا کہ چودھری محمد دین سے آمنا سامنا ہو گیا۔ محمد دین جیب میں تھا اور عنایت گھوڑے پر۔ محمد دین نے جیب کو اس طرح روک لیا کہ پتلی سی جگی سڑک بالکل بند ہو گئی۔

”اے کون ہو تم۔ ہمیں دیکھ کر رک کیوں نہیں گئے؟“
”یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو جو میں تمہارے استقبال کے لیے رک جاتا۔“

”میں چودھری ملک دین کا بیٹا ہوں جس کی حکومت ہے اس علاقے پر۔“

”میں بھی کوئی غیر نہیں ہوں۔ تم مجھے پہلی بار دیکھ رہے ہو اس لیے اجنبی سمجھ رہے ہو۔ میں شہر سے آیا ہوں وجاہت اللہ خاں کا پوتا عنایت اللہ ہوں۔“

”اچھا! بابا بتا تو رہے تھے کہ اس بھگوڑے کا بیٹا آیا ہوا ہے جو اپنے باپ کو چھوڑ کر کسی لونڈیا کی خاطر بھاگ گیا تھا۔“

”زبان سنجال کر بات کر چودھری کے بیٹے۔“
عنایت گھوڑے سے نیچے کود گیا۔

”زبان سنجال کر بات نہ کروں۔ تو کیا کر لے گا؟“
”زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔“

”تیری یہ مجال۔“ دین محمد نے کہا اور ایک گھونسا عنایت کے جڑے پر رسید کر دیا۔ عنایت اچھل کر دوڑ جا پڑا۔ ملازم درمیان میں آیا تو دین محمد کے ملازم نے اسے پکڑ لیا۔

عنایت ایک لمحے کو ضرور دیکھا تھا لیکن اٹھنے کا موقع مل گیا۔ بس اتنا ہی بہت تھا۔ اس نے شہر میں رہ کر جو ذکر اٹائے کی تربیت حاصل کی تھی جسے آزمانے کا اس وقت موقع مل گیا۔ دین محمد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ اس کا ہر وار خالی جا رہا تھا۔ دین محمد کبھی ایک طرف جمبول جاتا کبھی دوسری طرف۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ ناک سے خون جاری تھا۔ وہ پھر کر جیب کی طرف گیا اور جیب میں رکھی ہوئی لانچی نکال لایا۔ وہ لانچی چلاتا جانتا تھا لیکن اس وقت تو لانچی ہوا میں گھوم رہی تھی۔ عنایت ہر بار فحج جاتا تھا اور پھر لانچی عنایت کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس لڑائی میں کسی نے غور ہی نہیں کیا اور عنایت کا ملازم گھوڑا لے کر گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ وجاہت اللہ خاں بیس بائیس برس ہو گئے تھے گھر سے باہر نہیں نکلے تھے لیکن اس وقت پوتے کی محبت نے ایسا جوش مارا کہ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں لڑائی ہو رہی تھی۔ اس وقت منظر یہ تھا کہ دین محمد زمین پر لیٹا ہوا تھا اور ہاتھ جوڑ کر عنایت سے معافی مانگ رہا تھا۔ عنایت نے دادا کی طرف دیکھا اور دین محمد کے بھاری بھر کم وجود پر ایک ٹھوکر رسید کی۔

”میرے دادا سے معافی مانگ جن کے لیے تو نے ابھی کہا تھا، زنجیوں کی طرح گھر میں پڑے رہتے ہیں۔“

”وجاہت خاں، مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ دین محمد نے ہاتھ جوڑے۔

وجاہت اللہ خاں کا ہاتھ اپنی مونچھوں کی طرف گیا مگر یہ ہاتھ آج داپس نہیں آیا۔ انہوں نے تاؤ دے کر مونچھوں کو اوپر کیا اور عنایت سے کہا اسے جانے دے۔

دین محمد کی حالت یہ تھی کہ اٹھنا مشکل تھا۔ عنایت نے اور اس کے ملازم نے مل کر اسے جیب میں ڈالا اور دین محمد کا ملازم جیب لے کر روانہ ہو گیا۔

جہاں آرا گھبرا کر دروازے پر آ گئی تھیں۔ پھر انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک گھوڑے پر دو سوار۔ ایک دادا ایک پوتا۔ ان کی آنکھیں خوشی سے ستارہ بن گئیں۔

”بیٹا، تمہیں آئے اتنے دن ہو گئے، تم نے اپنے دادا کو گلے سے نہیں لگایا۔“

عنایت آگے بڑھا اور وجاہت خاں کی چھاتی سے لپٹ گیا۔ ”اب دیکھنا چودھری آئے گا ضرور۔ تیرا دادا بہت دن بعد اس کے سامنے اکڑ کر بیٹھے گا۔ تیرے باپ نے میری گردن جھکا دی تھی تو نے میرا سر بلند کر دیا۔ جا ہاتھ منہ دھو کر تیار ہو جا۔ چودھری آتا ہی ہوگا۔“

انہوں نے غلط نہیں کہا تھا۔ کوئی گھنٹا بھر گزرا ہوگا کہ چودھری دروازے پر تھا۔ وجاہت اللہ نے پھر مونچھوں کو تاؤ دیا اور خود دروازے پر گئے اور عزت سے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا۔

”وجاہت خاں، آج بچوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے۔“

”پھر؟“
”پھر یہ کہ دین محمد تو رپٹ لکھوانے تھا نے جا رہا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ بھی آپس کا معاملہ ہے آپس میں ملے ہو جانا چاہیے۔“

”اچھا ہوا اور نہ پولیس کو بھی معلوم ہو جاتا کہ دین محمد کے جسم پر تو بہت زخم آئے ہیں۔“

”وجاہت خاں، میں اپنے بیٹے کی طرف سے معافی مانگنے آیا ہوں۔“

”معافی کیسی چودھری۔ بزدلی اور بہادری کے ایسے کھیل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔“

وجاہت اللہ خاں نے آواز دے کر عنایت اللہ کو بھی بلا لیا تا کہ چودھری بھی دیکھ لے کہ اس کے بیٹے کی ٹھکانی کرنے والے کو ایک خراش تک نہیں آئی۔

”یہ ہے میرا پوتا عنایت اللہ خاں۔ ہدایت اللہ خاں کا بیٹا۔“

”بھئی کیا کھیل ہوتے ہیں قدرت کے۔ یہ کیا ہمارا اور سعادت مند ہے۔ ایک تمہارا بیٹا تھا۔ کسی بزدلی دکھائی گئی۔“

”کیسی بزدلی چودھری۔ اس نے گاؤں کی لڑکی ٹھکرا کر شہر کی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہ نہ تھا، نہ۔“

”کمال ہے خان صاحب۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا وہ بزدل تھا، بزدل۔“

”ہمارا بیٹا ہے، ہم کچھ کہہ لیں۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا۔ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی بزدل پیدا نہیں ہوا۔“

چودھری حیرت سے خان صاحب کا منہ تک رہا تھا۔ یہ شخص بھی کیا ہے۔ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔ اس نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی اور عنایت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خان صاحب سے اجازت چاہی۔

اس جھگڑے کو اور اس محالی تلافی کو چند دن گزرے تھے کہ بستی میں شور مچ گیا اور شور بھی ایسا کہ جو سنا افسوس کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ غریب موچی کی بیٹی کھیلنے نکلی تھی اور پھر واپس نہیں آئی۔ موچی غریب اسے دن بھر ڈھونڈتا پھرا۔ دوسرے دن چنے کے کھیت سے اس کی لاش مل گئی۔ کسی نے دس سال کی اس بچی کی بے حرمتی کی تھی اور پھر اسے قتل کروا دیا تھا۔ یہاں تھانے سے پہلے ہر معاملہ چودھری کے پاس جاتا تھا۔ پھر وہ مناسب سمجھتا تو بات آگے بڑھا تاور نہ پنچایت ہی میں فیصلہ ہو جاتا تھا۔ لوگ اس بچی کی لاش لے کر چودھری کی حویلی پہنچ گئے۔

”دیکھو بھو! چودھری مخاطب ہوا۔“ اس گاؤں کے سب رہنے والے یہاں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ آج تک یہاں بھی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ یہ کام تو کسی باہر سے آنے والے کا لگتا ہے۔“

”ایسا کون ہے چودھری؟“

”وجاہت اللہ کا پوتا عنایت اللہ اور کون۔ تمہیں معلوم ہے، دین محمد سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔ کیوں ہوا تھا؟ کچھ معلوم ہے۔ تمہیں کہاں معلوم ہوگا۔ وجاہت اللہ نے میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے تھے اور مجھے چپ ہونا پڑا تھا مگر آج بتاتا ہوں۔ اس کے پوتے نے گاؤں میں کام کرتے ہوئے ایک عورت پر بری نظر ڈالی تھی۔ دین محمد نے اسے سمجھایا کہ یہ گاؤں ہے شہر نہیں ہے۔ بس جی وہ تولال پیلا ہو گیا۔ خوب لٹہ بازی ہوئی۔ وہ تو وجاہت اللہ وہاں پہنچ گئے اور دین محمد نے بزرگ کا احترام کرتے ہوئے عنایت کو جانے دیا۔ وہ جو کہتے ہیں چورہ چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ عنایت اللہ باز نہیں آیا۔ کریم اللہ کی معصوم بچی اسے مل گئی۔“

وہ بہلا پھسلا کر اسے کھیتوں میں لے گیا۔ اس سے آگے کہتے ہوئے مجھے تولاج آتی ہے۔“

چودھری کے ایک ملازم نے کھڑے ہو کر تعذیب کی۔

”ہاں چودھری صاحب، میں کل ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا عنایت اپنی بانیک پر بڑی تیزی سے آرہا تھا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اسی وقت شک ہوا تھا کہ کوئی بات ضرور ہے۔“

”دیکھ لیا تم لوگوں نے۔“ چودھری نے لوگوں سے کہا۔ ”اب تو ساری بات سمجھ میں آگئی ہوگی۔“

چودھری کی تقریر سے لوگوں میں اشتعال پھیل گیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ ہم وجاہت اللہ کے گھر کو آگ لگا دیں گے لیکن چودھری نے انہیں روک دیا۔

”قانون کو اپنے ہاتھ میں مت لو۔ بچی کی لاش اٹھا کر تھانے جاؤ اور عنایت اللہ کے خلاف رپٹ درج کراؤ۔ اگر پولیس کوئی کارروائی نہ کرے تو بے شک وجاہت اللہ کے مکان کو آگ لگا دینا۔“

مجمع وجاہت اللہ کے گھر جانے کے بجائے تھانے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک زمانہ تھا جب سبحان اللہ قادری ایس ایچ او تھا۔ اب اس کی جگہ کوئی اور آ گیا تھا۔ خان صاحب نے برسوں سے گھر کے باہر قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ کون وجاہت اللہ۔ یہ معاملہ بھی ایسا تھا کہ پولیس اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ فوراً پرچہ کٹا اور عنایت اللہ کی گرفتاری کے لیے پولیس روانہ کر دی گئی۔

پولیس دروازے پر کھڑی تھی اور وجاہت اللہ خاں سینہ تانے کھڑے تھے۔ ”میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں کام کر چکا ہوں۔ ایک ذرا سا جھگڑا کیا ہو گیا تم میرے پوتے کو گرفتار کرنے آ گئے۔“

وہ سمجھ رہے تھے چودھری کے بیٹے سے جو جھگڑا ہوا تھا یہ اس کا شاخسانہ ہے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے تو وہ یوں سامنے سے ہٹ گئے جیسے موت آدمی کو زندگی سے دور کر دیتی ہے۔ ان کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے اور ان کی موچیں نیچے لٹک گئیں۔

”قسم خدا کی! اس نے بڑی بزدلی کا کام کیا۔ اگر کسی جوان عورت کو اٹھا کر لے آتا تو تم میری لاش سے گزر کر ہی عنایت تک پہنچ سکتے تھے لیکن اب میں خود اسے تمہارے حوالے کروں گا۔“ وہ اندر گئے اور عنایت کو لے کر آ گئے۔

”اگر اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اسے قتل کر کے اسی چنے کے کھیت میں پھینک دینا۔“

عنایت کہتا رہا کہ وہ بے قصور ہے لیکن یہ بھی درست

ہے کہ ہر جرم کرنے والا بھی کہتا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ پولیس نے اسے جیب میں بٹھا دیا۔

وہ اندر گئے تو جہاں آرا اور عنایت کی ماں دونوں ان سے لپٹ گئیں مگر ان کے تئیں اب کچھ اور تھے۔ انہوں نے دونوں کو خود سے الگ کیا اور اپنے کمرے میں بند ہو گئے۔ جہاں آرا کسی نہ کسی طرح اندر گئیں تو خان صاحب نے صرف اتنا کہا۔ ”میں بزدلوں کی سفارش نہیں کرتا۔“

”آپ معلوم تو کریں۔ ضروری تو نہیں یہ جرم اس نے کیا ہو۔“

”نہیں کیا ہوگا تو جھوٹ کر گھرا جائے گا۔“

”ایسے نہیں آجائے گا۔ آپ کوشش کریں گے تو چھوٹے گا۔“

”جہاں آرا بیگم، اب ہمیں کون جانتا ہے۔ ہم تو بھولی ہوئی داستان ہیں۔ تمہارے بیٹے نے اور اس کے بعد اس کے بیٹے نے ہمیں اتنا ذلیل کیا ہے کہ اب خود کشی کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔“

”اللہ نہ کرے۔ ایسے الفاظ اپنے منہ سے کیوں ادا کرتے ہیں۔“

”جاؤ ہدایت کی ماں جاؤ، بے فکر رہو۔ میں اپنے پوتے کو پھانسی چڑھتے ہوئے دیکھ لوں گا، خود کشی نہیں کروں گا۔“

عنایت کی ماں کا رور و کر برا حال تھا۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ جو الزام عنایت پر لگا ہے وہ اس کا مرتکب ہوا ہوگا۔ یہ ضرور کسی کی سازش ہے۔ سازش کا پردہ کیسے چاک ہو۔ کوئی بھاگ دوڑ کرنے والا ہو تو حقیقت سامنے آئے۔ وہ خان صاحب کے ہاتھ پاؤں جوڑتی رہیں کہ اپنے تعلقات کو کام میں لائیں، کسی وکیل سے مشورہ کریں۔ کسی طرح عنایت کو بچا لیں۔ بالآخر وجاہت اللہ خاں نے بہت دن بعد شیر والی پہنچی، سر پر رام پوری ٹوپی رکھی اور پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایس ایچ او نے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ ملنے آئے تھے تو انہیں کون روک سکتا تھا۔ زبردستی کمرے میں داخل ہو گئے۔

”یہ مت سمجھنا کہ میں عنایت کے لیے رحم کی درخواست لے کر آیا ہوں۔ میں تمہیں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ چودھری کے ہاتھ بھی لیے ہیں اور جب تمہیں بھاری ہے۔ یہ نہ ہو کہ یہ دونوں چیزیں کام کر جائیں اور میرے پوتے کو بے قصور سزا ہو جائے اگر میرا پوتا واقعی مجرم ہے تو اسے ایسی سزا دینا کہ سب کے لیے عبرت ہو۔“

”چودھری اس معاملے میں کیوں پڑنے لگا تھا۔“

ایس ایچ او نے کہا۔

قابل غور

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بھلول بازار میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے پوچھا۔ ”بھائی یہاں کیا کر رہے ہو؟“

بھلول نے کہا۔ ”بندوں کی اللہ سے صلح کروا رہا ہوں، اللہ تو مان رہا ہے مگر بندے نہیں مان رہے۔“

اتفاق سے کچھ عرصہ بعد بھلول کی ملاقات قبرستان میں ہوئی۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”بھائی یہاں کیا کر رہے ہو؟“

بھلول نے کہا۔ ”اللہ کی بندوں سے صلح کروا رہا ہوں، آج بندے تو مان رہے ہیں مگر اللہ نہیں مان رہا۔“

مرسلہ: عمران حیدر بلوچ، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا

”اس لیے کہ عنایت سے اس کے بیٹے کا جھگڑا ہوا تھا۔ اب اس نے سازش کر کے عنایت کو پھنسا یا ہے اور اب اسے سزا بھی دلوانا چاہے گا۔“

”بڑے میاں، تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ قتل میں اس کا بیٹا ملوث ہے۔“

”میں کیوں کسی پر الزام رکھوں۔ یہ معلوم کرنا آپ کا کام ہے کہ قاتل کون ہے۔ میرا پوتا بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ میں اپنی جوانی میں کشنر کے دفتر میں تھا، مجھے معلوم ہے تفتیش کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں، تفتیش ہو تو پھر تفتیش ہو۔ چودھری کی دولت آپ کو خرید نہ لے۔“

”خان صاحب، میں وہ نہیں ہوں جسے دولت سے خرید لیا جاتا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔ ہم عنایت سے بھی پوچھ کچھ کر رہے ہیں۔ دوسرے پہلو بھی ہماری نظر میں ہیں۔“

خان صاحب اٹھے اور گھر چلے آئے۔ جہاں آرا نے آتے ہی شیر والی کا دامن تمام لیا۔ ”کیا بات ہوئی تھانے دار جی سے؟“

”بات کیا ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔“

”اٹھ کر تو کھڑا ہو گیا ہوگا۔ میں تو یہ پوچھ رہی ہوں اس نے کہا کیا؟“

”وہی تو بتا رہا ہوں۔ ایک تو تم بولتی بہت ہو، اپنی ماں

کی طرح۔ وہ بھی اللہ بخشے کسی کی نہیں سنتی تھیں۔“

”اچھا نہیں بولتی۔ بتاؤ کیا ہوا؟“

”دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ بڑی عزت سے پیش آئے۔ کہنے لگے آپ کا پوتا اور ایسی حرکت کرے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بس آج اور اسے رکھیں گے، کل تک چھوڑ دیں گے۔“

”جب کل چھوڑنا ہے تو آج چھوڑ دیتے۔ اس کی ماں کی حالت پتا ہے کیا ہو رہی ہے۔“

”بس کہہ دیا، کل چھوڑ دیں گے۔ اس سے زیادہ انہیں مجبور کرنے کی ہمت ہم میں نہیں تھی۔“

جہاں آرا نے سکون کا سانس لیا کہ جب کہہ آئے ہیں تو کل تک عنایت ضرور گھر آئے گا۔ خان صاحب جو کہہ دیتے ہیں، پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔

خان صاحب عید کی نماز پڑھنے تو ضرور جاتے تھے لیکن اس کے علاوہ کسی نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ کوئی اس وقت بھی نہیں رہا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ لائبریری کا دروازہ اندر سے بند کر کے نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے تھے۔ نماز کے بعد انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

”اے اللہ! میری لاج رکھ لیجو۔ میں نے بیوی سے کہہ دیا ہے کہ عنایت کل آجائے گا۔ میری بات پوری ہو جائے۔ اسے کل آجانا چاہیے۔ میں کل سے پرسوں نہیں دیکھوں گا۔ میں نے اپنے بیٹے کو کھوکھرا پونے کو پایا۔ میں اسے ضائع نہیں ہونے دوں گا۔ میں یہ نہیں جانتا کہ وہ قصور وار ہے یا بے قصور۔ جیسا بھی ہے، میرا پوتا ہے میں اس کی رہائی کی ہیک تھ ہی سے تو مانگوں گا۔ پیرا پوتا کل مجھے مل جانا چاہیے۔“

وہ دعا مکمل کر کے بستر پر آئے تو جہاں آرا جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے خان صاحب کی طرف دیکھا۔ ”عنایت کے بغیر گھر کیسا سونا لگ رہا ہے۔“

”کل یہ سونا پین دور ہو جائے گا۔“

”ہدایت کے ابا بچ کہہ رہے ہونا۔ کہیں میرا دل تو نہیں رکھ رہے ہو؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، کل وہ آجائے گا۔ بات ہو گئی ہے۔“

”پھر میں سو جاؤں؟“

”میں تو سمجھا تھا اب تک سو گئی ہوگی۔“

”آپ جب تک سو نہیں جاتے، مجھے نیند کہاں آتی ہے۔“

”بالکل اپنی بڑی بہن پر گئی ہو۔ انہیں بھی یہی مرض تھا۔“

جہاں آرا نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر کمرے میں سناٹا پھیلا رہا پھر خان صاحب کے ہلکے ہلکے خراٹے خاموشی میں آوازیں پیدا کرنے لگے۔

خان صاحب صبح سو کر بھی نہیں اٹھے تھے کہ تھانے سے بلاوا آ گیا۔ ”ایس ایچ او صاحب نے بلا لیا ہے۔“

جہاں آرا شیر دانی لے کر کھڑی ہو گئیں۔ ”عنایت کو لے کر آتا۔“

”لے آئیں گے بابا، لے آئیں گے۔ ہمیں اسی لیے تو بلایا گیا ہے کہ آؤ بھی اپنے پوتے کو آکر لے جاؤ۔“

ملازم تانگا لے کر آ گیا تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھے اور پولیس اسٹیشن پہنچ گئے۔ ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں عنایت ان کے سامنے بیٹھا ہے اور چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا ہے۔

”خان صاحب، اصل قاتل پکڑے گئے، آپ کا پوتا بے قصور ہے۔“

”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا مگر یہ سب ہوا کیسے؟“

”ہمارے سپاہی وقوع کا معائنہ کرنے گئے تو وہاں سے ایک لاکٹ ملا جس پر دین محمد لکھا ہوا تھا جو چودھری کے بیٹے کا نام ہے۔ آپ کی زبانی میں یہ بھی سن چکا تھا کہ کچھ دن پہلے عنایت اور دین محمد کا جھگڑا ہوا تھا۔ جب اس کڑی کو ملایا گیا تو صاف پتا چلتا تھا کہ اس جھگڑے کا بدلہ لینے کے لیے چودھری نے اپنے بیٹے کا گناہ آپ کے پوتے کے سر منڈھ دیا ہے۔ ہم نے دین محمد کو گرفتار کر لیا۔ وہ بھی ایسا کمزور دل نکلا کہ فوراً اپنا جرم قبول کر لیا۔ نشاندہی پر آؤ لے آئے بھی برآمد کر لیا گیا ہے۔ چالان بنا کر عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ آپ اپنے پوتے کو لے جاسکتے ہیں۔ بس ایک درخواست کروں گا کہ کچھ دنوں کے لیے اسے کہیں اور بھیج دیں۔ چودھری کی طرف سے اب بھی اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔“

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں نے اس کا حل بھی ڈھونڈ لیا ہے۔“

”آپ کی مرضی۔ ویسے ہم آپ کی مدد کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔“

”شکریہ جناب۔“

جہاں آرا بیٹھ کر دیکھ رہی تھیں کہ تھانے سے آنے کے بعد وہ پھر کہیں جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انہیں خوشی ہو

رہی تھی کہ خان صاحب دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ گھر سے نکلتا بالکل موقوف ہو گیا تھا اور اب ہیں کہ ابھی آئے، اب بھی چلے۔

”میں کہتی ہوں ابھی تو آئے ہو پھر کہیں چلے۔“

”اب تمہیں ہماری کیا پردا جہاں آرا بیٹھی تھیں اور پوتا تمہیں مل گیا اور پوتا بھی ایسا کہ جس نے میری موٹھیں ادھنی کر دیں۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ اللہ نے میری دیر سے سنی لیکن سنی خوب۔“

”بس تمہارے پوتے کے ہی کام سے جا رہا ہوں۔“

انہوں نے سوچا ہوگا کوئی قانونی کارروائی رہ گئی ہوگی جسے نمٹانے جا رہے ہیں۔ خان صاحب کو اللہ کی امان میں دیا اور عنایت کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

دجاہت اللہ خان نے کسی نوکر کو ساتھ نہیں لیا تھا، نہ کوئی سواری منگوائی تھی۔ وہ پیدل چل رہے تھے۔ ان کی منزل چودھری کی حویلی تھی جو یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔

”آؤ خان صاحب آؤ۔ یہی کہنے آئے ہونا کہ تم نے اثر رسوخ استعمال کر کے اپنے پوتے کو بری کروا لیا اور میرے بیٹے پر الزام ڈال دیا۔“

”چودھری کیا کھڑے کھڑے گرج رہے ہو۔ کہیں بٹھاؤ، پانی شربت کو پوچھو پھر آرام سے بیٹھ کر بات ہوگی۔“

خان صاحب نے اسے پچکار رہے ہوئے کہا۔

چودھری نے انہیں حویلی کے اندر لے جا کر بٹھا دیا۔

”چودھری میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا پوتا بے قصور تھا اس لیے چھوٹ گیا۔ یہ گھٹیا حرکت تیرے بیٹے کی تھی۔ جائے وقوعہ سے اس کا لاکٹ ملا ہے جس پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔“

”دجاہت خان زیادہ خوش مت ہو۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پھانسی کے تختے سے بھی اتار کر لے آؤں گا۔“

”میں تمہیں یہی تو بتانے آیا ہوں کہ جب قانون قدرت حرکت میں آتا ہے تو خزانے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔“

”اچھا تو تم مجھے یہ سمجھانے آئے ہو۔“

”اور یہ بتانے آیا ہوں کہ میری عدالت میں سزا کا مستحق تمہارا بیٹا نہیں، تم ہو۔“

”بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہو خان صاحب۔ یہ بتاؤ کہ سزا کا مستحق میں کیوں ہوں؟“

”اس لیے کہ میرے پوتے کو پھنسانے کی سازش تم

نے تیار کی تھی۔ سازشیں تیار کرتے ہیں بزدل اور بزدل ہی قصور دار ہوتا ہے اور سزا کا مستحق ہوتا ہے۔“

”میں نے بھلا کون سی سازش تیار کی تھی؟“

”تم نے اپنے بیٹے کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے میرے پوتے پر الزام دھر دیا۔ تم منافق ہو۔ معافی مانگنے آئے تھے لیکن تمہارا دل صاف نہیں تھا۔ یہ سازش اب میری سمجھ میں آئی ہے۔“

”بہت دیر میں سمجھے خان صاحب۔“

”اللہ کے یہاں دیر ہو ہی جاتی ہے مگر اندھیر نہیں ہوتی۔“

”اتنے خوش مت ہو۔ بازی اٹھتے دیر نہیں لگے گی۔ میں روپے پور یوں میں بھر کر لے جاؤں گا۔ عدالت خود کہے گی، عنایت کو غلط چھوڑا گیا۔ دولت کی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے خان صاحب۔ یہاں کا تھانے دار پاگل ہے جو اس نے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ سب پاگل نہیں ہوتے، اپنے پوتے کو ذرا سنبھال کر رکھنا۔“

”چودھری تمہیں اپنی دولت پر بہت ناز ہے؟“

”میں آج ہی شہر جا رہا ہوں۔ پھر تم دولت کی طاقت بھی دیکھ لو گے۔“

”تمہیں یقین ہے تم شہر جاؤ گے۔“

”تم نہ آئے ہوتے تو میں اب تک جا بھی چکا ہوتا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، شاید اب نہ جاسکو۔“

”تم مجھے روکنے آئے ہو؟“

”میں نے کہا تھا کہ قانون قدرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“

دجاہت اللہ خان نے اپنی شیردانی کی سیدھی چپ میں ہاتھ ڈالا۔ پستول ان کے ہاتھ میں تھا۔ چودھری نے کسی کو مدد کے لیے پکارا اس کے ساتھ ہی چار فائر ہوئے اور چاروں گولیاں چودھری کے بدن میں بیوست ہو گئیں۔

دجاہت خان یہ بھول گئے تھے کہ وہ چودھری کی حویلی میں بیٹھے ہیں۔ چودھری کے محافظ قریب ہی تھے۔ گولیوں کی آواز پر دوڑتے ہوئے اندر آ گئے۔ خان صاحب نے پستول کا رخ ان کی طرف کیا لیکن محافظوں کی گولیاں ان کے جسم کو چھلکی کر گئیں۔

جہاں آرا کا سہاگ اچڑ گیا لیکن اس خزانے کا منہ بند ہو گیا جس کی دولت، عنایت کو دوبارہ پھنسانے کے کام آتی۔ دادانے پوتے کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تھا۔

میں نے بھلا کون سی سازش تیار کی تھی؟

تم نے اپنے بیٹے کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے میرے پوتے پر الزام دھر دیا۔ تم منافق ہو۔ معافی مانگنے آئے تھے لیکن تمہارا دل صاف نہیں تھا۔ یہ سازش اب میری سمجھ میں آئی ہے۔

بہت دیر میں سمجھے خان صاحب۔

اللہ کے یہاں دیر ہو ہی جاتی ہے مگر اندھیر نہیں ہوتی۔

معمولی سی سی مایا نے انسان کو جس قدر بے مایا کر دیا ہے... اس کا احساس اگر اسے ہو جائے تو کبھی اس حقیر سی چیز کے تعاقب میں نہ بھاگے... یہ بات اگرچہ گہری ہے مگر یہاں گہرائی میں اترنے کی کسے فرصت ہے۔ جب ایک ذرا سی نیکی کوئی مجرمانہ غلطی بن جائے تو پچھتاوا تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتا... دور حاضر میں ایمان کی کمزوری کا ایک سبب شاید انصاف کی غیر منصفانہ تقسیم بھی ہے... گویا بالاختیار طبقے کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے... "شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات"... اور اپنی بات پر تو اٹل بیگ صاحب بھی نظر آتے ہیں کہ سچائی کی جنگ لڑنا بھی تو کسی کار خیر سے کم نہیں۔

بھری عدالت میں مدلل جرح... کامیاب وکیل کا دلچسپ انداز

مجرمانہ جرح

سرتا محمد بیگ

ڈوبے نظر
آتے تھے جیسی
ان کا سوشل سرکل بھی
خاص وسیع تھا۔

”حکم نہیں، عرض ہے بیگ صاحب!“ وہ میری بات کے جواب میں ”وعلیکم السلام“ کہنے کے بعد بولے۔ ”آپ سے ایک کام پڑ گیا ہے، آج کل مصروفیت کیسی چل رہی ہے؟“ ”مصروفیت تو جناب ایک متحرک بلا کا نام ہے جو ہر وقت چلتی رہتی ہے۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”آپ فرمائیں، آج کیسے یاد کیا؟“ ”ایک کیس آپ کے سپرد کرنا ہے...!“ ”جیل صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کیس کی نوعیت کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ انہوں نے بتایا۔ ”فوج داری کا کیس ہے۔“ ”آپ کا اپنا یا...؟“ ”اپنا نہیں بیگ صاحب۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ایک

ٹیلی فون کی مکھی نے میرے اٹھاک کا خانہ خراب کر دیا تھا۔ میں اس وقت دفتر میں بیٹھا ایک نہایت اہم کیس کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں تھا لہذا صبح ہی سے میں اپنے آفس میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔ دوسری مکھی پر میں نے گھور کر ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا پھر ریسپور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”ہیلو...!“

”ہیلو بیگ صاحب!“ ایک جانی پہچانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”میں جیل صدیقی سے بات کر رہا ہوں۔“ ”جی صدیقی صاحب! السلام علیکم!“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو آپ کی ”ہیلو“ سنتے ہی پہچان لیا تھا، حکم کریں...!“

جیل صدیقی سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ بیٹے کے اعتبار سے تو ایک رائٹر تھے لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے بہتر جگہ اپنی ٹانگیں اور بازو پھنسا رکھے تھے۔ اس کی من جملہ سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرکز و محور معاشرت ہی تھا۔ وہ مختلف نوعیت کے فلاحی اور سماجی کاموں میں گردن گردن تک

جاننے والے کے توسط سے یہ معاملہ مجھ تک پہنچا ہے لیکن آپ فکر نہ کریں..... آپ کی فیس تمہیں نہیں جائے گی۔ یہ چیزیں کیسے ہرگز نہیں ہے۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صدیقی صاحب سے میرے بڑے دیرینہ تعلقات تھے لہذا وہ میری عادات سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ فیس کے معاملے میں، میں خاصا اصول پرست اور سخت گیر واقع ہوں۔ بغیر فیس کے میں کوئی کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور یہ فیس بھی مجھے ایڈوائس میں چاہیے ہوتی تھی۔ یہی اصول میں نے دوسرے ماہرین شعبہ جات کے لیے بھی اپنا رکھا تھا۔ اگر مجھے کسی کسٹمنٹ یا کسی کونسلر کی ضرورت پیش آ جاتی تو میں متعلقہ ماہرین اور تجربہ کار شخص کو اس کی پوری فیس ادا کرنے کے بعد ہی خدمات سے استفادہ کرتا تھا البتہ قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے میں تھوڑی رعایت کرتا بھی نہیں بھولتا تھا۔ دوسرے ماہرین فن کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہوں گا لیکن اپنے پیشے کے حوالے سے میری ایک فلاسفی تھی۔ میں اکثر لوگوں سے کہا کرتا تھا۔

ایک وکیل اور پہلوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں اپنے اپنے اکھاڑوں میں کشتی لڑتے ہیں اور دونوں کے پاس اپنے اپنے میدان کی مناسبت سے مخصوص داؤچ ہوتے ہیں جن کے استعمال سے وہ مقابل کو پچھاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ ان دونوں سے اگر اچھی اور سلی بخش کارکردگی مطلوب ہو تو پھر ان کی ضروریات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایک فارغ پہلوان خوش خوراک بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تجربہ کار کانے کا وکیل بھاری بھر کم فیس بھی وصول کرتا ہے۔ سیدھا سادا حساب آپ یوں سمجھ لیں کہ..... جتنا گڑ، اتنا ہی میٹھا.....

”تو پھر میں کتنے بجے آپ کے آفس آ جاؤں؟“

صدیقی صاحب کے استفسار نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے، آپ شام میں چھ بجے تک تشریف لے آئیں۔“

”بہتر ہے۔“ صدیقی صاحب نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ”تو پھر چھ بجے آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے.....“ میں نے کہا۔

”اللہ حافظ بیگ صاحب.....!“

میں نے بھی ”اللہ حافظ“ کہہ کر ریسورکر پڈل کر دیا۔ ٹھیک چھ بجے شام جیل صدیقی میرے آفس میں موجود تھا۔ اس کی آمد کی اطلاع مجھے میری سیکریٹری نے انٹرکام پر دی تھی۔ میں نے بزرگ بننے پر ریسورکھا کر کان سے لگایا تو میری سیکریٹری عالیہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”سزا جیل صدیقی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ خود کو آپ کا دوست بتا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صبح فون پر انہوں نے اپنا کسٹمنٹ لے لیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دیں۔“ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جیل صاحب میرے چیمبر میں موجود تھے۔ رکی علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے پوچھا۔

”صدیقی صاحب! اٹھنا چلے گا یا گرم؟“

”باہر گرم چل رہا ہے تو اندر بھی گرم ہی چلنا چاہیے۔“

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ ”آپ تو جانتے ہیں، لوہا لوہے کو کاٹتا ہے.....!“

وہ ستمبر کے ابتدائی ایام تھے۔ کراچی میں، ماہ ستمبر میں بڑی غضب کی گرمی پڑتی ہے۔ میں نے صدیقی صاحب کی فرمائش کے عین مطابق، اپنی سیکریٹری سے عمدہ قسم کی چائے بھجوانے کے لیے کہہ دیا پھر ہم گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا اور کھنکار کھنکار صاف کرتے ہوئے کہا۔

”جی صدیقی صاحب! اب فرمائیں، کیا معاملہ ہے.....؟“

”لاہور میں میرے ایک دوست ہوتے ہیں..... ملک بشیر۔“ صدیقی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ”ان کا بیٹا کراچی کے ایک بچکے میں، ڈکیتی اور قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ میں اسی کے سلسلے میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ کے دوست ملک بشیر لاہور میں کیا کرتے ہیں؟“

”جی..... ان کا وہاں سینئری فننگ کا وسیع کاروبار ہے۔“ صدیقی صاحب نے بتایا۔

”اور ان کا جو بیٹا گرفتار ہوا ہے اس کا کیا نام ہے؟“

”جاوید.....!“

”یہ جاوید..... یہاں کراچی میں کیا کر رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اپنے والد کے کاروبار کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔“

”قتل اور ڈکیتی والا یہ واقعہ کہاں پیش آیا ہے۔“ میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، جاوید کو کراچی کے کس علاقے سے پکڑا گیا ہے؟“

”جائے وقوع حیدری کے علاقے میں واقع ایک بنگلا ہے۔“ صدیقی صاحب نے بتایا۔

”ہوں.....!“ میں نے پرسوج انداز میں جیل صدیقی کی جانب دیکھا۔ ”جاوید کو حیدری کے ایک بچکے میں ڈکیتی اور قتل کے

الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“

میرے تصدیقی طلب سوال کے جواب میں صدیقی صاحب نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مختصراً کہا۔ ”جی ہاں، یہی حقیقت ہے۔“

”جاوید پر کس کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”مقتول کا نام فضل کریم ہے۔“ انہوں نے بتایا۔

”فضل کریم؟“ میں نے زیر لب دہرایا پھر پوچھا۔ ”یہ فضل کریم یعنی مقتول کرتا کیا تھا؟“

”اس کا ہول سیل کا بزنس تھا کپڑے کا۔“ جیل صدیقی نے بتایا۔ ”ادھر بولٹن مارکیٹ میں اس کی بہت بڑی دکان اور کوہا وغیرہ ہیں۔“

”ایک بات بتائیں صدیقی صاحب!“ میں نے جیل صدیقی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”منا کہ ملزم کا باپ ملک بشیر آپ کا بہت اچھا دوست ہے لیکن جاوید کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”جی.....“ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا بیگ صاحب۔“

”میرا مطلب یہ تھا.....!“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جاوید پر عائد کردہ اس دہرے الزام کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ کیا اس الزام میں کوئی صداقت ہو سکتی ہے یا آپ کی نظر میں وہ بے گناہ ہے؟“

”دیکھیں بیگ صاحب! میں اپنے دوست ملک بشیر کو مرصہ دراز سے جانتا ہوں۔“ جیل صدیقی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”وہ ماشاء اللہ کروڑ پتی شخص ہے۔ پورے ملک میں اس کا سینئری فننگو مصنوعات کا کام پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کراچی تک میں ان کی سپلائی آتی ہے۔ ملک بشیر نے جاوید کو کاروباری سلسلے میں ہی کراچی بھیجا تھا۔ ماشاء اللہ! اللہ کا دیاسب کچھ ان کے پاس ہے اور جاوید ان کی انگوٹی اولاد بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں، جاوید کو اس قسم کی حرکت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

”آپ اسے کوئی فارمولا نہیں بنا سکتے صدیقی صاحب۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کل تو کھاتے پیتے آسودہ حال گھرانے کے من چلے لوجوان بہ طور فیشن بھی اس قسم کے جرائم کر رہے ہیں۔“

”میں آپ کی بات کی تردید نہیں کروں گا بیگ صاحب۔“ وہ گھبراہٹ میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے.....“ وہ لچائی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”میرے پاس علی الصباح ملک بشیر کا فون آیا تھا۔ اسے بھی گزشتہ رات ہی اس واقعے کے بارے میں پتا چلا ہے۔ اس نے مجھ سے تعاون کی درخواست کی تو ایک دیرینہ دوست ہونے کے ناتے میں نے آپ کو فون کھڑکا دیا اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ ملک بشیر نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آج رات کسی وقت کراچی پہنچ جائے گا۔ باقی کی تفصیلات اور معاملات آپ اسی کے ساتھ طے کر لیجیے گا۔“

”صدیقی صاحب! آپ مجھے سال ہا سال سے جانتے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں سیدھی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔“

”ہاں، مجھے اچھی طرح معلوم ہے بیگ صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جس طرح آپ میرے دیرینہ دوست ہیں ویسے ہی ملک بشیر سے بھی خاصے پرانے مراسم ہیں۔ آپ کسی بھی سلسلے میں جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کہہ ڈالیں۔“

اور میں نے بے دھڑک کہہ ڈالا۔ ”میں آپ کے کہنے پر یہ کیس تو لے لیتا ہوں لیکن آگے چل کر کسی بھی مرحلے پر اگر مجھے محسوس ہوا کہ ملزم جاوید بے گناہ نہیں تو میں کیس کو دوہیں چھوڑ دوں گا، پھر آپ مجھ سے کوئی گلہ شکوہ نہیں کیجیے گا۔“

”گلے شکوے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بیگ صاحب۔“ جیل صدیقی نے اپنا تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں آپ کی عادت اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ جس مرحلے پر جو بھی مناسب سمجھیں وہی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ نے ہمیشہ انصاف کی جنگ لڑی ہے۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”آپ نے کبھی مجرموں کی اعانت نہیں کی اسی لیے تو میرے ذہن میں فوراً آپ کا نام چمکا تھا اور شاں شہر میں اور بھی بہت سے وکیلوں کو میں جانتا ہوں جو آپ سے آدمی فیس میں کسی بھی قسم کا کیس پکڑنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر سرسری لہجے میں پوچھا۔ ”میرا خیال ہے، فیس والا معاملہ تو ملزم کے باپ کی آمد پر ہی زیر بحث لایا جائے گا۔“

”جی ہاں، ظاہری بات ہے۔“ جیل صدیقی نے جوابا کہا۔

میں نے پوچھا۔ ”وقعہ کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟“
 ”آج تیسرا دن ہے بیگ صاحب۔“ اس نے بتایا۔
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا۔“
 ”جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“
 صدیقی صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جاوید اس وقت ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔“
 ”ٹھیک ہے صدیقی صاحب!“ میں نے اطمینان دلانے والے انداز میں کہا۔ ”میں آفس سے اٹھنے کے بعد تھانے کا چکر لگاتا ہوں۔“
 ”مجھے یقین ہے، ملزم سے ملاقات اس کیس کے لیے بڑی مودمند ثابت ہوگی۔“ صدیقی صاحب پُر یقین انداز میں بولے۔ ”جاوید اس حوالے سے بڑی قیمتی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔“
 میں نے جیل صدیقی سے متعلقہ تھانے کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے مجھے تھانے کا نام بتایا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”اچھا بیگ صاحب!“ اس نے مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے تو آپ اجازت دیں۔ کل ملک بشیر کے ہمراہ کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔“
 ”ضرور..... ضرور.....!“ میں نے بھی اٹھ کر اس سے الوداعی مصافحہ کیا۔
 پھر وہ میرے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

اس روز جب میں اپنے آفس سے اٹھنے لگا تو میں نے اپنی سیکریٹری عالیہ سے کہا۔ ”عالیہ تمہیں اگر گھر جانے کی جلدی ہو تو رانا سے کہہ کر کسی منگوالو۔“
 رانا نواز میرے آفس میں کام کرتا تھا۔ اس کی مرتو پنیتیس سے متجاوز بھی تاہم اپنے عہدے کے اعتبار سے وہ ”آفس بوائے“ کہلاتا تھا اور ایسا کہلائے جانے پر وہ بہت خوش بھی تھا۔ کسی بیوی بچوں والے شخص کو اگر بوائے یعنی ”لڑکا“ کہلانے کا موقع ملے تو اسے اچھا کیوں نہیں لگے گا۔
 ”سرا لگتا ہے، آج آپ کو زگ زگ ہو کر اپنے گھر پہنچتا ہے۔“ عالیہ نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ میرے لیے ٹیکسی منگوانے کی بات اسی وقت کرتے ہیں جب آپ کو اپنے روٹ سے ہٹ کر ڈرائیو کرنا ہوتی ہے۔“

عالیہ کا گھر میرے گھر کے راستے میں پڑتا تھا اور اکثر ویسٹر آفس سے واپسی پر وہ میری کار میں بیٹھ جاتی تھی۔ میں اسے اس کے گھر کے نزدیک ڈراپ کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کی رائے زنی کے جواب میں، میں نے کہا۔
 ”تمہارا اندازہ درست ہے عالیہ۔ آج میں اپنے ایک کلائنٹ سے ملاقات کے لیے تھانے جاؤں گا اور نہیں معلوم کہ وہاں کتنی دیر ہو جائے اس لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ تم ٹیکسی پکڑ کر اپنے گھر چلی جاؤ۔“ میں نے لمبائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
 ”ویسے بھی متعلقہ تھانا بالکل مختلف روٹ پر واقع ہے۔“
 ”ٹھیک ہے سر! آپ جائیں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”رانا میرے لیے سواری کا بندوبست کر دے گا۔“
 میں نے ان دونوں کو ”خدا حافظ“ کہا پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اس تھانے کی جانب روانہ ہو گیا جس کے لاک اپ میں میرا تازہ ترین موکل جاوید بند تھا۔ پولیس عدالت سے اس کا ریمانڈ حاصل کر چکی تھی اور اب وہ گویا ”زیر تعین“ تھا۔
 میں نے متعلقہ تھانے پہنچ کر اپنی کار کو تھانے کی باؤنڈری وال کے ساتھ پارک کیا پھر گاڑی کی چابھوں والے چھلے کو انگشت شہادت میں گھماتے ہوئے تھانے کے اندر داخل ہو گیا۔ سوئے اتفاق کہ اس وقت تھانا انچارج اپنی سیٹ پر موجود تھا ورنہ اس وقت عموماً تھانا انچارج صاحبان ”راؤنڈ“ پر پائے جاتے ہیں۔ نام راؤنڈ یعنی ”گشت“ کا ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کا علم صرف خدا کو یا خود انہیں ہی ہوتا ہے کہ ان کے مذکورہ اور مبینہ راؤنڈ کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔
 میں سیدھا انچارج کے کمرے میں پہنچا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔“
 اس نے بڑی بددلی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ اپنے نام کا آخری حصہ تو اس طرح چھپا رہے ہیں جیسے میں آپ کو پکڑ کر فوراً حوالات میں بند کر دوں گا؟“
 اس کے اشارے کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشکش سے قانعہ اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور کرسی سنبھالنے کے بعد حیرت بھرے انداز میں اسی سے پوچھ لیا۔
 ”انچارج صاحب! میں نے تو آپ کو اپنا مکمل نام ہی

بتایا ہے۔ چنانچہ، آپ کو یہ ادھورا کس سینس میں لگا.....؟“
 ”بالکل کامن سینس میں.....“ وہ بے ساختہ بولا۔
 میں بھی ایک لمحے کے لیے نہیں چوکا اور تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اچھا..... آپ اس ”سینس“ کا ذکر کر رہے ہیں جس کے بارے میں کسی انگریز کا مقولہ ہے..... کامن سینس از آ سینس وچ از ناٹ کامن!“
 وہ میری اس ستاراندہ چوٹ پر تملکا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ میرا لنگش جملہ اسے بہت زور کا لگا تھا۔ میرے احساس کی تائید میں اس کا فوری رد عمل بھی سامنے آ گیا۔ اس نے برہمی سے کہا۔
 ”مجھے تو یہ اس نامعلوم انگریز کا مقولہ لگتا ہے۔“
 میں چاہتا تو اس موقع پر انگریزی اور انگریز بہادری کی معقولیت اور نامعقولیت والی بحث کو بہت دور تک دراز کر سکتا تھا لیکن میں چونکہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا لہذا زیر لب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔
 ”چھوڑیں جناب انگریز کو..... یہ لوگ تو برسوں پہلے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر یہاں سے جا چکے ہیں۔ آپ مجھے میرے نام کے ادھورے پن کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟“
 ”انگریز تو یہاں سے چلا گیا ہے لیکن اپنا انگریزی نظام قانون ادھر ہی چھوڑ کر گیا ہے جسے ہم ایک عرصے سے بھگت رہے ہیں۔“ وہ سچ لہجے میں بولا۔ ”اور جہاں تک آپ کے نام کی بات ہے تو میں آپ کو کسی دوسرے مکمل نام سے بھی جانتا ہوں۔“
 ”وہی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں۔“ میں نے گہری دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
 ”آپ کا پورا نام ہے.....“ وہ ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ.....“
 ”اوہ.....!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔
 ”تو آپ میرے پیشے سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔“
 ”نہ صرف نام اور پیشے سے واقف ہوں بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ یہاں خواہ مخواہ ہی نہیں آئے۔“ وہ طنزیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی کوئی ضرورت ہی نہیں مگر آپ کو یہاں لاسکتی ہے۔“
 ”اوہ.....!“ میں نے معنوی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو بڑے جید قسم کے نجوی ہیں۔“
 ”نجوی میں نہیں، آپ ہوں گے۔“ وہ تڑخ کر بولا۔

اس کے رد عمل نے مجھے درمیان حیرت میں ڈال دیا۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ”نجوی“ کہہ کر میں نے اسے کوئی گالی دے دی ہو۔ اس کے دماغ کی گری کو کم کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔
 ”آپ ناراض نہ ہوں انچارج صاحب۔ سمجھ لیں کہ آپ نہیں، میں ہی نجوی ہوں۔ بس، اب قصہ تموک دیں۔“
 ”میں غصے میں نہیں ہوں بیگ صاحب!“ وہ چہرے کے تاثرات کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔
 ”خیر، چھوڑیں اس فضول بحث کو اور یہ بتائیں کہ آپ یہاں کس مقصد سے آئے ہیں.....؟“
 ”آپ نے میرے ایک معصوم اور بے گناہ موکل کو اپنی حوالات میں بند کر رکھا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔“
 وہ محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا تو ہر موکل ہی معصوم اور بے گناہ ہوتا ہے..... ابھی آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟“
 ”جاوید پردیسی سے.....“ میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔
 ”جاوید پردیسی؟“ وہ بھویں سکیڑتے ہوئے بولا۔
 ”ہاں، وہ نوجوان جو لاہور سے کراچی آیا تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کر دی۔ ”اور آپ لوگوں نے اس بے چارے کو کل اور ڈکیتی کے الزام میں پکڑ کر تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ میں اپنے اسی موکل سے ملنے آیا ہوں۔“
 ”بیگ صاحب! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لڑکا عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اور ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ہم ملزم سے کسی کی ملاقات نہیں کراتے، اس سے الٹیویشن پر مبنی اثر پڑتا ہے۔“
 ”آپ مجھے قانون پڑھانے کی کوشش نہ کریں انچارج صاحب۔“ میں نے جواباً طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اس شعبے کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں یہ مولی مولی کتابیں میرے دفتر میں اور گھر میں رکھی ہیں جو نہایت پابندی کے ساتھ میرے مطالعے میں بھی رہتی ہیں۔“
 ”میں آپ کو قانون پڑھانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا بیگ صاحب۔“ وہ برا سامنے بناتے ہوئے بولا۔ ”میں تو آپ کو اپنے تھانے کے قواعد و ضوابط سے آگاہ کر رہا تھا۔“
 ”میں تھانوں کے سارے قواعد اور آپ کے تمام تر

گرفت ہے تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

وہ لا جواب سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے اسے ایک بندگی میں لاکھڑا کیا تھا جہاں سے فرار کی کوئی راہ اسے میسر نہیں تھی۔ ملزم سے ملاقات کرنے کے لیے یہ سارا بکھیرا پھیلانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے درجنوں ڈھنگ جانتا تھا۔ یہ تو تھا نا انچارج سے ”دل لگی“ میں بات آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کے لیے ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی بڑا کارنامہ ہو لیکن یہ تمام گفتگو میری نظر میں پیشہ دارانہ تفریح کا درجہ رکھتی تھی۔ انچارج صاحب نے آواز دے کر ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور حکمانہ لہجے میں کہا۔

”اوائے خادم حسین! ذرا ان صاحب کو اس قاتل سے ملو دو جو حوالات میں بند ہے۔۔۔۔۔ قتل اور ڈکیتی کے الزام میں۔۔۔۔۔!“

”جو حکم سر جی!“ کانسٹیبل نے بڑی فرماں برداری سے کہا۔

”اور ہاں۔۔۔۔۔“ انچارج نے تاکید لہجے میں کہا۔ ”یہ ملاقات دس، پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں ہونا چاہیے۔“

”جی سر! آپ فکر نہ کریں۔“ کانسٹیبل خادم حسین نے یقین دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”میں ادھر ہی ایک کونے میں کھڑا اپنی گھڑی کو دیکھتا رہوں گا۔“

تھانا انچارج نے گھور کر خادم حسین کو دیکھا اور بہ آواز بلند کہا۔ ”اب جاؤ یہاں سے۔“

خادم حسین نے فوراً اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور میں اس کی معیت میں تھانا انچارج کے کمرے سے نکل کر حوالات کی جانب بڑھ گیا۔

انچارج نے میرا ذکر کرتے ہوئے خادم حسین سے یہی کہا تھا کہ۔۔۔۔۔ ذرا ان صاحب کو اس قاتل سے ملو دو۔۔۔۔۔ کو یا اس نے کانسٹیبل پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں ملزم جاوید کا وکیل ہوں۔ میں نے بھی خود کو کانسٹیبل کی نظر میں ”منظر عام“ پر لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن جان کاری کے سلسلے میں اس کی کرید اور جستجو میں روک نہ سکا۔ حوالات کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

”کیا آپ ملزم کے والد صاحب ہیں؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ ”کیوں۔۔۔۔۔ یہ خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا۔۔۔۔۔؟“ ”وہ جی۔۔۔۔۔ آج صبح اس سے بات ہوئی تھی۔“

پر برہم ہو گیا۔ ”کیا آپ نے ہم لوگوں کو بالکل ہی نکما سمجھ لیا ہے؟“

”یہ بات تو آپ خود ہی اپنے منہ سے کہہ رہے ہیں۔“ میں نے بڑی سادگی سے پلٹیں جھپکائیں۔ ”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔۔۔۔۔!“

وہ میری اس گہری چوٹ پر اندر ہی اندر بلبلاتا کر رہ گیا تاہم کوئی خطرناک رد عمل ظاہر کرنے کے بجائے بڑے فخر سے بولا۔

”ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں جن کی بنا پر یہ بندہ عدالت سے سیدھا جیل اور جیل سے سیدھا پھانسی کے پھندے تک جائے گا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔!“ میں نے طنزیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے بھی تو پتا چلے کہ ایسے کون سے ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گئے ہیں؟“

”فکر پرش۔۔۔۔۔!“ وہ معنی خیز انداز میں مجھے ہنسنے لگا۔

”فکر پرش۔۔۔۔۔!“ میں نے منہ بگاڑ کر اس کے الفاظ دہرائے۔ ”یعنی اگلیوں کے نشانات۔۔۔۔۔ اس سے مطلب کیا ہے آپ کا؟“

”میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ۔۔۔۔۔ وہ رازدارانہ انداز میں میری معلومات کو صحت مند بنانے لگا۔“ ”کہ آگے قتل اور مال مسروقہ پر سے ملزم یعنی آپ کے موکل کی اگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے گئے ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔!“ میں نے ایسی اداکاری کی جیسے مجھے اس انکشاف سے ذہنی دھچکا پہنچا ہو۔ ”یہ تو بہت برا ہوا انچارج صاحب۔“

اس نے میری اداکاری سے یہی تاثر لیا تھا کہ میرے خباہت کی ساری ہوا خارج ہو گئی ہے۔ اس پر ایک اور رد و چڑھاتے ہوئے اس نے مجھ سے سوال کیا۔

”بیگ صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں؟“ ”معاملہ خاصا کجگیر نظر آ رہا ہے۔۔۔۔۔ میں نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب تو آپ کو میری فرمائش پوری کرنے میں کسی احتیاط یا ہچکچاہٹ سے کام نہیں لینا چاہیے۔“

وہ چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بکھرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کون سی فرمائش؟“ ”ملزم سے ملاقات کی فرمائش۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب آپ کی اس کیس پر بڑی جائداد

ضوابط سے یہ خوبی واقع ہوں انچارج صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جہاں ایک وکیل کو اپنے موکل سے ملاقات کی اجازت دیتے ہوئے آپ کی جان نکلتی ہے وہیں آپ لوگ ملزم کے ورثا سے موٹی موٹی رقمیں نکلوا کر انہیں ملاقاتوں کے مواقع فراہم کرتے ہیں اور ملزم پر ہلکی دفعات لگانے کا مزہ باغ دکھا کر ورثا کے ساتھ لاکھوں کی ڈیل بھی کرتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس نے میرے آخری جملے کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور اصل موضوع سے کئی کانٹے ہوئے خاصا دوستانہ انداز میں بولا۔ ”بیگ صاحب! آپ کو ایک مشورہ دوں۔۔۔۔۔!“ ”لیکن میں اس مشورے کی فیس نہیں دوں گا۔“ میں نے انگشت شہادت کو دارتنگ دینے والے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

”یہ مشورہ بالکل مفت ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے یقین تو نہیں آ رہا انچارج صاحب۔۔۔۔۔ میں نے شک بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال، میں انتظار کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ آپ ارشاد فرمائیں؟“ ”آپ اس کیس میں ہاتھ نہ ہی ڈالیں تو اچھا ہے۔“ وہ دونوں کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولا۔

”کیوں۔۔۔۔۔!“ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”اس مشورے کا مقصد کیا ہے؟“

”کیونکہ اس کیس میں آپ کے لیے کچھ نہیں رکھا۔“ وہ گہری ہمدردی سے بولا۔ ”یہ آپ کا پردہ کی نوجوان کسی قیمت پر نہیں بچنے والا۔ آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر نہ مائیں میری بات۔“

”بات ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا۔“ میں نے انچارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا میرے موکل نے آپ کی کسٹڈی میں اقبال جرم کر لیا ہے اور یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ عدالت میں جا کر اپنے اقبالی بیان سے منکر نہیں ہوگا؟“ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔!“ وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

”پھر آپ نے یہ فتویٰ کس روشنی میں صادر فرمایا ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کہ میرا موکل کسی بھی قیمت پر نہیں بچنے والا۔۔۔۔۔؟“ ”او وکیل صاحب!“ وہ میرے جیسے ہوئے سوال

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے ویسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپ کے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں

دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

”کون سا ضروری کام؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے وکالت نامہ اور دیگر ضروری کاغذات برآمد کیے پھر مختلف مقامات پر اس کے دستخط لینے کے بعد بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔ ”سب سے زیادہ ضروری کام تو یہی تھا۔ اب قانون کی نظر میں تم میرے موکل اور میں تمہارا وکیل ہوں۔ یہ کام اس کا کیسبل خادم حسین کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا تھا جناب؟“ اس نے مصویت بھرے انداز میں پوچھا۔

”اس لیے کہ وہ مجھے وکیل نہیں، بلکہ تمہارا باپ سمجھتا ہے۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئی، ابھمن زدہ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ نے اس سے یہ غلط بیانی کیوں کی وکیل صاحب؟“

”میں نے اس سے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“ میں نے جاوید کی ابھمن دور کرنے کے لیے فوراً وضاحت کر دی۔ ”یہ اس کا ذاتی خیال ہے اور میں نے اس کے خیال کو درست کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ جیسا بھی سوچ کر خوش ہے، میری بلا سے!“

”آپ ایک ذہین اور ہوشیار وکیل ہیں بیگ صاحب!“ وہ سانس کی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم میری تعریف و توصیف میں جس نوعیت کے الفاظ استعمال کر رہے ہو، میں ان کی معنویت پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر اپنے مطلب کی طرف آتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”اب تم فوراً مجھے وہ معلومات فراہم کر دو جن کا ذکر میں نے تمہاری ویر پہلے کیا تھا تاکہ میں اس کیس کی تیاری کے لیے کوئی ہلیدی ڈھانچا بنا سکوں۔“

”ٹھیک ہے بیگ صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔“

حوصلہ افزا جملے سن کر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی اتر آئی۔ یوں محسوس ہوا، میری صورت میں اس کی نگاہ کے سامنے امید کا جگنو جگمگا اٹھا ہو۔ اس نے بڑے ادب سے میری جانب ہاتھ بڑھایا اور پرجوش انداز میں بولا۔

”السلام علیکم وکیل صاحب۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔“

”علیکم السلام!“ میں نے اس سے معافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اصل خوشی تو تمہیں اس وقت ہوگی جب میں تمہیں اس کیس سے باعزت بری کر دوں گا۔“

اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے امید کے سایے کچھ پھیل سے گئے۔ اس نے پراسٹیا لہجے میں پوچھا۔ ”ابو سے آپ کی بات ہو گئی ہے؟“

”تمہارے ابو سے میری ملاقات انشاء اللہ کل ہوگی۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ آج رات میں کسی وقت کراچی پہنچ رہے ہیں۔“

”وکیل صاحب! پتا نہیں، وہ کون سا برا وقت تھا جب میں اس کیس میں پھنس گیا۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”آپ یقین کریں، میں نے نہ تو کسی کو مل کیا ہے اور نہ ہی ڈکیتی کی کسی واردات میں میرا ہاتھ ہے۔“

میں نے ہب پاکٹ میں سے اپنا پرس نکالا اور سو روپے کا ایک کراڑا سا نوٹ کا شیبل کی طرف بڑھا دیا۔ اس وقت تک ہم حوالات میں پہنچ چکے تھے لہذا میری یہ پیشکش کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکتی تھی۔

کا شیبل نے میرے تحفے کو بڑی خوشی سے قبول کیا اور اس حبیہ کے ساتھ وہ وہاں سے ٹل گیا۔ ”صاحب! بس پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں۔ ہم آپ لوگوں کی خیر خواہی میں بعض اوقات بہت بڑا نقصان اٹھا لیتے ہیں۔ انچارج صاحب بہت سخت طبیعت کے مالک ہیں اور.....“

”اور کچھ نہیں خادم حسین.....“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ”میں تم کو اور تمہارے انچارج صاحب کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ ویسے تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”میری وجہ سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور..... اگر تمہوڑا بہت نقصان ہو بھی گیا تو میں اس نقصان کی تلافی جیٹنگی کر چکا ہوں.....“

وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے وہاں سے ہٹ گیا۔ ”ظانی“ کے حوالے سے وہ میری بات کا مطلب یہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ آج کل سو روپے والے نوٹ کی قدر بہت گر چکی ہے لیکن جس دور کا یہ واقعہ ہے اس زمانے میں اتنی مالیت کے نوٹوں کی ایک اپنی اہمیت ہوا کرتی تھی۔ ایک متوسط فیملی کے روزمرہ کے لیے مہزی، گوشت، فروٹ کی خریداری کے بعد منگوائی وغیرہ کے لیے بھی اس نوٹ میں سے پیسے بچ جایا کرتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوٹوں میں سے برکت اٹھ گئی ہے یا ہم ہی کچھ زیادہ فضول خرچ ہو گئے ہیں۔

میرا خیال ہے..... دونوں ہی باتیں ہیں۔

کا شیبل خادم حسین کے جانے کے بعد میں طوم جاوید کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ تمہارے والد صاحب نے ایک دوست جمیل صدیقی کی معرفت مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔ میں تمہیں اس مصیبت سے نجات دلاؤں گا جس میں بد قسمتی سے اس وقت تم گھرے ہوئے ہو۔“

قربانی سے پہلے ہی میں اس معاملے میں کوہ پڑا تھا لہذا اب ملزم جاوید کی قربانی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

اس روز تھانے کی حوالات میں میرے موکل جاوید نے مجھے کس نوعیت کی معلومات فراہم کیں، وہ میں سردست آپ سے شیئر نہیں کروں گا۔ ان باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب مواقع پر گا ہے۔ آپ کو دیکھنے اور سننے کو ملتا رہے گا۔

آئندہ روز شام میں جیل صدیقی، جاوید کے والد ملک بشیر کو لے کر میرے آفس آگئے۔ میں نے پرتپاک انداز میں انہیں ویکم کہا پھر ان کے لیے چائے کا آرڈر دینے کے بعد جاوید کے موضوع پر گفتگو کرنے لگا۔

ملک بشیر ایک گورا چٹا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض پر ایک قیمتی ویسٹ کوٹ (واسکٹ) پہن رکھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں صیب تھا۔ مذکورہ ہاتھ تو اپنی جگہ صحیح و سالم نظر آتا تھا لیکن اس میں جان وغیرہ نہیں تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ملک بشیر پر قانچ کا ایک ایک ہوا تھا اور اس ہاتھ کو متاثر کر گیا تھا۔ وہ ہاتھ اب کوئی کام کرنے کے قابل تو نہیں رہا تھا تاہم باقی وجود کے ساتھ بیوستہ رہتے ہوئے وہ بھی کسی بے جان شے کے مانند جھولتا رہتا تھا۔

صدیقی صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”بیگ صاحب! آپ رات کو جاوید کی طرف گئے تھے نا؟“

”جی ہاں، میں نہ صرف یہ کہ تھانے گیا تھا بلکہ میں نے اپنے موکل سے ایک بھر پور ملاقات بھی کر لی ہے۔“

”بس تو پھر میں مطمئن ہوں۔“ صدیقی صاحب نے ایک تسلی بخش سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”جاوید نے آپ کو حقیقت حال سے آگاہ تو کر دیا ہوگا؟“

”جی، میں نے اس سے تمام معلومات لے لی ہیں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کا کام نہیں نک تھا۔ یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔“

ملک بشیر نے مجھ سے استفسار کیا۔ ”بیگ صاحب! آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ایک بات تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میرا بیٹا اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا۔“

”میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے ملک صاحب!“ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے ایک گہری چال کے تحت اس کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔“

”جناب! یہ چال ہے یا جال..... اسے آپ ہی نے کاٹا ہے۔“ ملک بشیر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کام

کے لیے آپ کی فیس کے علاوہ جتنا بھی خرچہ ہوگا وہ میں دینے کو تیار ہوں۔ آپ روپے پیسے کی فکر نہ کیجئے گا۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔ میں بس، جلد از جلد اپنے بیٹے کی رہائی چاہتا ہوں۔“

”ہر ماں باپ کو اپنی اولاد کی رہائی اور آزادی ہی اچھی لگتی ہے ملک صاحب!“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”اس سلسلے میں، میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میں آپ کو ایک مشورہ بھی دینا چاہوں گا۔“

”جی..... ارشاد۔“ وہ ہمدردی سے گوش ہو گیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میری فیس اور دیگر عدالتی اخراجات تو اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت رکھتے ہیں لیکن باقی معاملات میں آپ ”اللہ کے دیے سب کچھ“ میں سے سوچ سمجھ کر لٹائیے گا کیونکہ قدرت ہمیں جن نعمتوں سے نوازی ہے اس کا ہم سے ایک غیر محسوس انداز میں حساب بھی لیا جاتا ہے۔“

”میں آپ کی نصیحت کو ذہن میں رکھوں گا۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا، پھر پوچھا۔ ”اس حوالے سے اگر آپ کا اشارہ کسی خاص سمت میں ہے تو پلیز وضاحت کر دیں۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ کا اشارہ پولیس کی جانب ہے نا بیگ صاحب؟“ جیل صدیقی نے سوچتی ہوئی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”رائٹ یو آر.....!“ میں نے فوراً تصدیق کر دی۔ ”آپ بالکل صحیح جگہ پر پہنچے ہیں صدیقی صاحب۔“ پھر میں نے ملک بشیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”پولیس والے مختلف حیلوں بہانوں کی مدد سے آپ کی جیب ہلکی کرنے کی کوشش کریں گے لیکن آپ نے ان کے کسی چکر میں نہیں آنا مثلاً.....“ میں نے مختصر سا توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”مثلاً وہ آپ کو یہ آسرا دے سکتے ہیں کہ اگر آپ ان کی ٹھی گرم کر دیں تو وہ جالان کی تیاری کچھ اس انداز کی کریں گے کہ جاوید پر اس کیس کی زیادہ گرفت نہ رہے اور وہ آسانی سے عدالت سے بری ہو جائے گا۔ وہ ہلکی دفعات لگا کر ڈیفنس کا کام آسان کر دیں گے اور کوئی کمزور وکیل بھی بہ آسانی جاوید کو باعزت بری کروانے میں کامیاب ہو جائے گا، وغیرہ ہا..... یہ سب پولیس دلوں کا ایک خوبصورت جھانسا ہوتا ہے۔“

”بیگ صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ صدیقی

صاحب نے ملک بشیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”حالانکہ درحقیقت پولیس اس نوعیت کی کوئی فیورڈے ہی نہیں سکتی۔“

”پولیس استغاثہ کی وارنٹ ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ ملزم پر تمام تر الزامات کا بوجھ لا کر اسے عدالت سے سخت ترین سزا دلوانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں نظر آتی ہے۔ کسی بھی ملزم کے لیے کیس میں کوئی رعایت پیدا کرنا تو اپنے ہاتھوں سے استغاثہ کے پاؤں پر کھارڑی مارنے کے مترادف ہے۔ پولیس اس قسم کی حماقت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ہاں البتہ.....“ میں نے تھوڑا سا توقف کر کے اپنے سامنے بیٹھے ان دونوں شرقا کو باری باری دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”جب تک کوئی کیس کے کاغذات پر رجسٹرڈ نہیں ہوا ہوتا، سارے معاملات پولیس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہ دونوں پارٹیوں سے الگ الگ ڈیل کر کے اپنی جیبیں بھر لیتی ہے اور کیس کا حلیہ بگاڑ کر اپنی مرضی کی صورت حال کو نافذ کر دیتی ہے مگر جاوید کا کیس خاصا پیچور ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ واقعہ پکارا جسٹریڈ ہے بلکہ اب تو اس معاملے میں عدالت بھی براہ راست ملوث ہو چکی ہے اور یہ سب کیا دھرا چونکہ پولیس ہی کا ہے لہذا وہ ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“

”بیگ صاحب! اتنی اہم معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ۔“ ملک بشیر ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر پوچھا۔ ”اس کیس کی تازہ ترین پوزیشن کیا ہے، میں یہ بات اپنے طور پر سمجھنے کے لیے پوچھ رہا ہوں؟“

”ضرور، یہ تو آپ کا حق ہے ملک صاحب۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”یہ کیس ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ آپ کا بیٹا عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ لوگ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں اپنی تفتیش مکمل کر کے چالان عدالت میں پیش کر دیں گے۔ اس کے بعد عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوگا۔“

”ٹھیک ہے بیگ صاحب!“ ملک بشیر گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”عدالتی معاملات کو آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اس لیے عدالت کے اندر کی صورت حال آپ ہی کو سنجانا ہوگی۔ میں اس سلسلے میں ہر نوعیت کے تعاون کے لیے تیار ہوں اور ایک بات کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔“

اس نے بڑے ذومعنی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنانہ رہ سکا۔ ”کس بات کا ملک صاحب؟“

”اس بات کا کہ.....“ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے

بولا۔ ”میرا بیٹا قاتل نہیں ہو سکتا۔“

”ملک صاحب! ایک بات کو ذہن میں رکھیں۔“ میں نے گہمیر لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھے اس امر کا ذرہ برابر بھی شک ہوتا کہ آپ کا بیٹا قاتل اور ڈکیتی کی مبینہ واردات میں ملوث ہے تو میں کبھی بھی اس کا کیس اپنے ہاتھ میں نہ لیتا لیکن صرف آپ کے اور میرے یقین کر لینے سے بات نہیں بنے گی جناب.....!“

”جی، میں سمجھا نہیں؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”سیدھی سی بات ہے ملک صاحب!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”عدالت انسان کے یقین، جذبات اور احساسات کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ وہ ہر بات کے لیے ثبوت مانگتی ہے۔ پولیس نے آپ کے بیٹے پر جو سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے ہیں انہیں رد کرنے کے لیے مجھے ٹھوس ثبوت مہیا کرنے ہوں گے جس کے لیے سخت بھاگ دوڑ کی ضرورت ہے۔ آپ اس کام کو سیدھا سادا اور آسان سا ہرگز نہ سمجھیں۔“

”میں آپ کی بات کی اہمیت کو سمجھ رہا ہوں بیگ صاحب!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے آپ کو اپنے بیٹے کا کیل مقرر کروایا ہے۔ اب جاوید کا کیس آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا دفاع کرنے کے لیے آپ کو جس نوعیت کی بھی تحقیقات کرانا ہوں یا مختلف قسم کی معلومات جمع کرنا ہوں، وہ آپ ضرور کریں۔“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

”آپ خرچے کی پروا نہ کریں بیگ صاحب! آپ صرف جاوید کو عدالت سے انصاف دلانے پر توجہ مرکوز رکھیں۔ باقی میں سب برداشت کر لوں گا۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”میں ایسا ہی کروں گا کیونکہ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو آپ کا رخ نظر ہے۔ آپ کا بیٹا مجرم نہیں ملزم ہے۔ میں اسے عدالت سے انصاف دلا کر رہوں گا۔“

اگلی پیشی پر پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

میں نے اپنے وکالت نامے کے علاوہ ملزم کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ فوج داری مقدمات میں ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ناممکن حد تک دشوار تصور کی جاتی ہے تاہم کوشش کے پہلو کو کسی بھی صورت نظر انداز

آواز بلند کیا۔

”ایکسپلین پور آئیجیشن!“ جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پور آنرز.....!“ وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت رکوانے کے لیے اپنے موقف کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا۔

”کسی شخص کا کاروباری ہونا..... اس کا کاروبار پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہونا..... اس کا تعلق کراچی سے نہ ہونا..... اس کا مقول سے ناشناس ہونا..... یہ تمام تر حقائق اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ ایسا شخص کسی مجرمانہ واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس مجرم کے خلاف.....“

”مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!“ میں نے وکیل استغاثہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی احتجاجی لہجے میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے میرے دلائل کے الفاظ پکڑ کر آئیجیشن کیا تھا لہذا میں نے بھی اس کے آئیجیشن میں سے اپنی پسند اور مطلب کے لفظ کا چناؤ کر کے فوراً اعتراض جڑ دیا تھا۔ جج نے میری جانب دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”وکیل صاحب! آپ اپنے اعتراض کی وضاحت کریں۔“

”جناب عالی! آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ پیشی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولنا شروع کیا۔

”اور میرے فاضل دوست نے مقدمے کی کارروائی کے بغیر ہی میرے موکل کو مجرم قرار دے دیا ہے جبکہ ابھی تک میرے موکل پر عائد کردہ الزامات ثابت نہیں ہوئے۔ میرے خیال میں یہ عدالت کے وقار اور انصاف کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”پور آئیجیشن ارا ایکسپلینڈ!“

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ مجھے اپنے دلائل کو آگے بڑھانا چاہیے۔ سو میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میرا موکل بے گناہ و بے قصور ہے۔ قتل اور ڈکیتی کی واردات سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں الجھایا گیا ہے۔“

”میرے فاضل دوست نے اس کیس کو ایک سوچی سمجھی سازش قرار دیا ہے۔“ وکیل استغاثہ نے جج کو متاثر کرنے کے لیے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے

نہیں کیا جاسکتا اور میں یہ کوشش ہر کیس میں ضرور کرتا ہوں۔ عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا تو جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ اس کا مخاطب ظاہر ہے، میرا موکل جاوید ہی تھا جو اس کیس میں ملزم نامزد تھا اور افسردہ سا کیوز ڈباس میں کھڑا تھا۔

”ملزم جاوید!“ جج کی مخصوص آواز عدالت کے کمرے میں گونجی۔ ”چھبیس اگست کی رات تم ایک بزنس مین فضل کریم کے گھر میں ڈکیتی کی نیت سے داخل ہوئے۔ اس واردات میں مقتول فضل کریم کی جانب سے مزاحمت پر تم نے غیر قانونی اسلحے سے فائرنگ کر کے فضل کریم کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جب تم ڈکیتی کی رقم لے کر پچھلے سے فرار ہونے لگے تو فضل کریم کے ایک گھریلو ملازم نے تمہیں دیکھ لیا۔ نہ صرف دیکھ لیا بلکہ وہ تم سے بھڑ بھی کیا۔ اس مذہم بھیڑ کے نتیجے میں مذکورہ ملازم نے تم پر قابو پا لیا۔ بعد ازاں تمہیں جائے وقوعہ پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ کیا تم اس فرد جرم کا اقرار کرتے ہو؟“

جج نے فرد جرم کے سلسلے میں جو اسٹینڈ لیا تھا وہ استغاثہ کی رپورٹ یعنی چالان کا خلاصہ تھا۔ ملزم نے بڑی توجہ سے جج کی بات سنی پھر بڑے اعتماد کے ساتھ صحت جرم سے انکار کر دیا۔

”مرا! میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا..... مجھے کسی سازش کے تحت اس کیس میں پھانسا گیا ہے.....“

صحت جرم سے انکار پر جج نے میری طرف دیکھا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ڈیفنس.....!“

میں اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! میرے موکل کا تعلق ضلع لاہور سے ہے اور ان کا ایک چلتا ہوا باعزت کاروبار بھی ہے۔ یہ لوگ کاروباری ہیں اور پاکستان کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر میں ان کا مال جاتا ہے اور اسی بزنس کے سلسلے میں میرا موکل کراچی بھی آیا تھا۔ یہ مقتول فضل کریم کو جانتا تک نہیں۔ ایک اتفاقی کے تحت یہ مقتول کے پچھلے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے قتل اور ڈکیتی کے معاملات میں ملوث کر دیا گیا۔ اس دہری واردات سے میرے موکل کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بے گناہ ہے لہذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ اس کی درخواست ضمانت منظور کی جائے۔“

”آئی آئیجیشن پور آنرز.....!“ وکیل استغاثہ نے بے

کہا۔ ”جبکہ اس موقف میں کوئی حقیقت یا طبعی میلان نظر نہیں آتا۔“

”وضاحت کی جائے۔۔۔۔۔!“ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھ کر جھنجھکا کر کہا۔

”جناب عالی! ملزم کا تعلق لاہور سے ہے جبکہ مقتول کراچی کا رہنے والا تھا۔“ وکیل استغاثہ نے جج کی وضاحت طلبی کے جواب میں کہا۔ ”ملزم کا سینٹری لمٹکو کا کاروبار ہے جبکہ مقتول کپڑے کا بزنس چلاتا تھا۔ علاوہ ازیں ملزم اور مقتول میں بھی ملاقات بھی نہیں ہوئی یعنی وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی تھے۔“ وہ سانس ہوار کرنے کے لیے رکا پھر اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”یور آئر! جب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے خلاف سوچی سمجھی سازش کرتا ہے تو ان دونوں کے بیچ کسی بھی سطح پر، کسی بھی نوعیت کی دشمنی کا وجود ناگزیر ہے جبکہ یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، طنزیہ انداز میں جج سمور اور روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔

”یہاں کا معاملہ معزز عدالت کے سامنے ہے۔ ملزم اور مقتول زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے، دونوں میں کبھی کوئی لین دین نہیں ہوا، دونوں نے حتیٰ کہ کبھی ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی پھر۔۔۔۔۔ پھر جناب عالی! کیسی رقابت، کیسی قرابت، کیسی دوستی، کیسی دشمنی اور۔۔۔۔۔ کیسی سازش؟“ وہ ایک مرتبہ پھر میری جانب متوجہ ہوا۔

”میرے فاضل دوست! کسی بھی حوالے سے ملزم اور مقتول میں کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا اور اس بات کو بھی آپ ذہن میں رکھیں کہ سازش ہمیشہ اپنے ہی کرتے ہیں، انہوں کے خلاف چاہے وہ دوستی میں کریں یا دشمنی میں، اچھا برا کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور سامنے آنا چاہیے تا کہ سازش کو بننے کے لیے۔۔۔۔۔“

مجھے چھوڑ کر وہ دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”جناب عالی! آلہ قتل اور مال مسروقہ والے بریف کیس پر ملزم کے فکٹر پرنٹس کا ملنا اور جائے وقوعہ سے ملزم کی رکتے ہاتھوں گرفتاری جج جج کر اس سچائی کا اعلان کر رہی ہے کہ کٹھنرے میں کھڑا یہ شخص۔۔۔۔۔“ اس نے اکیوڈ باکس میں موجود میرے موکل کی جانب اشارہ کیا اور خامسے جارحانہ انداز میں بولا۔

”یہ شخص اس معاشرے کا ایک ناسور ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ میں معزز عدالت سے پر زور

استدعا کرتا ہوں کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے عدالت کی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔“

جج نے وکیل استغاثہ کے خاموش ہونے پر سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ مطلب یہ تھا کہ میں وکیل استغاثہ کے دلائل کے جواب میں کیا کہنا چاہوں گا۔ میں نے جج کا اشارہ پا کر وکیل استغاثہ کی تشفی کے لیے ان خیالات کا اظہار کیا۔

”جناب عالی! میں اپنے فاضل دوست کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ایک ایسی اہم بات سے روشناس کرایا جو پہلے میرے علم میں نہیں تھی۔ اس علمی معادنت پر میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہوگا۔۔۔۔۔“

”کون سی اہم بات۔۔۔۔۔؟“ وکیل استغاثہ نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے سوال پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دی اور براہ راست جج سے مخاطب رہتے ہوئے اپنا استدلال جاری رکھا۔

”یور آئر! اکثر سازشوں میں اصل کرداروں کے بجائے غیر متعلق افراد کو ہی قربانی کا کبرا بنایا جاتا ہے تاکہ کیس کا حلیہ بدل کر رہ جائے۔ استغاثہ نے اس کیس میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ گھڑی ہوئی ایک ہوس کہانی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔“

”پھر حقیقت کیا ہے۔۔۔۔۔؟“ وکیل استغاثہ جج سے مشابہ آواز میں بولا۔

”حقیقت۔۔۔۔۔!“ میں نے اس لفظ پر اچھا خاصا زور دیا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس حقیقت کو ملزم کی زبان سے منظر عام پر لانا چاہتا ہوں۔“

”پرمیشن گرانٹیڈ!“ جج نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اکیوڈ باکس کے قریب پہنچ کر اپنے موکل اور اس کیس کے ملزم کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”چھبیس اگست کی رات تم حیدری کے علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟“

مجموعہ ماہ ذھن

میں نے پوچھا۔ ”اس شخص کا نام انور شیخ ہے۔“ ملزم نے جواب دیا۔ ”وہ میرے ایک دوست اسلام شیخ کا بہنوئی ہے۔ اسلام شیخ کی بہن فرزانہ لاہور سے بیاہ کر کراچی آئی ہوئی ہے۔ اسلم نے مجھے انور اور فرزانہ کے لیے ایک پیغام دیا تھا اسی غرض سے میں حیدری کے علاقے میں پہنچا تھا۔“

میں یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ حوالات میں ملاقات پر جاوید نے مجھے تمام حالات و واقعات سے آگاہ کر دیا تھا اور اب میں بڑے رنگ ڈھنگ سے ان حقائق کو عدالت کے سامنے لا رہا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مذکورہ شخص سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟“

”ملاقات تو تب ہوئی تا جب میں اس کا بنگلا تلاش کرنے میں کامیاب ہو پاتا۔“ وہ بیزار سی بولا۔ ”میں رکشائیں بیٹھا مختلف گلیوں میں چکراتا رہا لیکن منزل تک نہ پہنچ سکا۔ کراچی کے راستے اور گلیاں بھی عجیب ہیں، کوئی ایڈریس (موبیٹا) مشکل کام ہے، پھر کسی سے پوچھو تو وہ بھی ایسے عجیبہ انداز میں گاؤں کرتا ہے کہ انسان کا دماغ گھوم کر رہ جائے۔“

”پھر تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔؟“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

”کرنا کیا تھا جناب۔۔۔۔۔!“ وہ جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ”اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، رکشا والے نے کر دیا۔“

”کیا کر دیا؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”اس نے مجھے رکشا سے نیچے اتار دیا، یہ کہتے ہوئے کہ۔۔۔۔۔“ وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ ”بھائی صاحب! اگر آپ کو حیدری کی گلیاں نا پنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے اور میرے رکشے کو معاف کر دو۔ یہ کام تم اپنے قدموں پر چل کر کرو تو صحت بھی بنے گی اور انجوائے بھی کرو گے۔“

”رکشا چھوڑنے کے بعد تم انور شیخ کے بنگلے کی تلاش سے باز آ گئے تھے یا اس مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی؟“ میں نے چپے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”بد قسمی سے اس مشن کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔“ وہ اسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جس کا ٹھکانہ رکھا ہوں۔ کاش! میں رکشا کو نہ چھوڑتا اور اسی میں اہلایضا صدر کی طرف چلا جاتا جہاں کے ایک ہوٹل میں میرا لام تھا۔“

”تم نے کسی نتیجے کو سمجھنے کا ذکر کیا ہے۔“ میں نے اہم نکلتے کو اجاگر کرتے ہوئے کہا۔ ”اس رات تمہارے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”میں رکشائیں سے اتر کر پیدل ہی انور شیخ کا بنگلا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ۔۔۔۔۔“ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کہ۔۔۔۔۔ میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔“

”تم نے ایسا کیا دیکھا لیا تھا جسے عجیب کہہ رہے ہو؟“

”میں نے ایک بنگلے کے سامنے گھڑی گاڑی کے ساتھ ایک شخص کو گڑبڑ کرتے دیکھا تھا۔“

”گڑبڑ۔۔۔۔۔ کیسی گڑبڑ۔۔۔۔۔؟“

”وہ شخص زور زبردستی سے اس گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ ملزم نے بتایا۔ ”میں اس کی حرکت پر چونک اٹھا اور تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ اس دوران میں وہ گاڑی کا مٹنی دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اس نے گاڑی میں سے ایک بریف کیس نکالا تھا۔ اس کی مشکوک حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی آیا کہ وہ کوئی چور ہے۔ میں نے بہ آواز بلند اسے پکارا۔ میری پکار بلکہ للکار سن کر وہ بریف کیس سمیت ایک جانب دوڑا۔ میں نے جست لگا کر اسے پکڑ لیا۔ ہمارے درمیان چند سیکنڈ کی چھینا جھینا ہوئی جس کے اختتام پر میں اس چور سے بریف کیس چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ اس صورت حال نے اسے بوکھلا دیا اور پکڑے جانے کے خوف سے اس نے ایک سمت دوڑ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔“

”کیا اس وقت تمہیں معلوم تھا کہ مذکورہ بریف کیس کے اندر کیا ہے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ”میں بند بریف کیس کے اندر بھلا کیسے جھانک کر دیکھ سکتا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس بریف کیس میں پانچ لاکھ روپے کی رقم موجود تھی۔“

”اس چور سے بریف کیس چھیننے کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“ میں نے دلچسپ جرح کے انکشاف انگیز سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

”میں اس بنگلے کے گیٹ پر پہنچا جس کے سامنے گھڑی گاڑی میں اس نامعلوم چور نے نقب لگائی تھی۔“ ملزم نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”میرے اندازے کے مطابق مذکورہ گاڑی کا تعلق اسی بنگلے کے کمینوں سے ہو سکتا

مجرمانہ ذہن
تو مقتول کے گھریلو ملازم نے مجھے روکنے کی کوشش کی اور اسی کوشش کے دوران میں اس نے ایک دھکا دے کر مجھے پیچھے پھینک دیا تھا۔ میں اگلے قدموں نیچے گرا اور میرا سر عقبی جانب سے بیڈ کے کونے سے ٹکرایا۔ یہ چوٹ کافی گہری ثابت ہوئی اور میں وہیں فرش پر گر کر رہے ہوش ہو گیا۔ بعد ازاں پولیس نے موقع پر پہنچ کر مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر کندھے اچکاتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔ ”یہ ہے کل کہانی جناب.....!“

ملازم کے خاموش ہونے پر میں نے سچ کی جانب دیکھا اور خاصے کراہے لہجے میں کہا۔ ”یور آنرا ان تمام تر واقعات کی روشنی میں، میں نے کسی گہری سازش کا ذکر کیا تھا۔ میرا موکل محصوم اور بے گناہ ہے۔ فضل کریم کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ اسے خواہ مخواہ اس کیس میں الجھانے کی کوشش کی گئی ہے لہذا میں ایک مرجعہ پھر معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکل کو ضمانت پر رہا کرنے کے احکام صادر کیے جائیں..... ویش آل یور آنرا“

”عدالت قصے کہانیوں پر نہیں بلکہ ٹھوس حقائق پر یقین رکھتی ہے میرے فاضل دوست!“ وکیل استغاثہ نے میری

گہری ناک کو دبایا تھا اور وہ رومال یقیناً کلور و فارم یا اسی نوعیت کی کوئی اور بے ہوشی طاری کر دینے والی دوا میں بسا ہوا تھا جس کے اثرات میری سانس کے ساتھ شامل ہو کر دماغ کے نازک خلیوں تک پہنچے تھے جس کی وجہ سے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔

”جب تمہیں ہوش آیا تو تم نے خود کو کہاں پایا؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”مجھے منیر واحدی کے بیٹکے کے اندر ہی ہوش آیا تھا۔“ ملازم نے اپنے سر کے عقبی حصے کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔

”میں جیسے ہی ارڈر کرد کے ماحول کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہوا تو مجھے اپنے سر کے عقبی حصے میں شدید تکلیف کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی چند پولیس والوں کی شکلیں نظر آئیں جن میں سے ایک میرے بہت قریب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا تو مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ اس کا ایک دزنی ٹھنڈا میری پسلیوں میں لگا۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والے کی ہتھکڑی میری سماعت تک پہنچی۔

”اٹھ اڈے لائٹ صاحب کی اولاد..... بندہ مار کر کیسے آرام سے پڑا ہے۔“

یہ آواز اور میرے ساتھ ہونے والا سلوک سمجھ میں نہ آنے والی باتیں تھیں۔ مجھے تو صرف اتنا یاد تھا کہ منیر واحدی کے گھریلو ملازم نے میری ناک پر ایک رومال رکھ کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ اس کے بعد کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ اسی بے ہوشی کے دوران ہی میں میرے سر کے عقبی حصے میں کوئی ہتھ بھی لگی تھی یا لگا دی گئی تھی۔ اس تازہ ترین صورت حال نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا اور میں اپنی تکلیف بھول کر فوراً اٹھ اٹھا اور پولیس والوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں زدہ لہجے میں پوچھا۔

”کیا ہوا ہے.....؟ تم لوگ مجھے کیوں مار رہے ہو؟ میں نے کیا جرم کیا ہے؟ میرے ساتھ تم لوگ جانوروں جیسا ملوک کیوں کر رہے ہو.....؟“

میرے ان استفسارات کے جواب میں مجھے جو سلیٹی ”لی معلومات فراہم کی گئیں وہ میرے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ میں ڈیکٹی کی نیت سے فضل کریم کے بیٹکے میں داخل ہوا تھا۔ میرے رنگے ہاتھوں کلا سے جانے پر جب فضل کریم نے مزاحمت پیش کی تو میں نے اپنے پستول سے دو گولیاں چلا کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ پھر جب میں بریف کیس لے کر وہاں سے فرار ہو رہا تھا

ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بھئی، شیخ صاحب سے تو میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ یہیں پچھلی گلی میں ان کا بیٹکلا ہے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”میں خود تمہیں ان کے گھر چھوڑ کر آؤں گا لیکن پہلے تمہیں میرے ساتھ اندر چلنا ہوگا۔ کچھ کھائے بے بغیر میں تمہیں یہاں سے لے بھی نہیں دوں گا۔ آج تم نے مجھے بہت بڑے نقصان سے بچالیا ہے۔ تم میرے لیے عظیم محسن بن کر آئے ہو۔“

میں اس شخص کی اخلاق بھری باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور اس کا دل رکھنے کے لیے بیٹکے کے اندر چلا گیا۔ دیے بھی اب مجھے کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ میں انور شیخ سے ملنے حیدری کے علاقے میں پہنچا تھا اور وہ شخص مجھے انور شیخ کے بیٹکے تک پہنچانے والا تھا۔

”جب وہ شخص تمہیں اپنے بیٹکے کے اندر لے گیا تو پھر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“ ملازم نے لحاظی توقف کیا تو میں نے فوراً سوال جڑ دیا۔ ”اور اس نے تمہیں اپنا نام کیا بتایا تھا؟“

”اس گھنی موچھوں والے کورے چنے شخص نے مجھے اپنا نام منیر واحدی بتایا تھا۔“ ملازم ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا۔ ”اس نے بیٹکے کے اندر لے جا کر مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ”ابھی آتا ہوں۔“ کہہ کر بیٹکے کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا۔ ایک منٹ کے بعد ایک اور شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ وہ صورت ہی سے کوئی گھریلو ملازم نظر آتا تھا۔ دبلا پتلا، گہرا سا تولا رنگ، لمبا قد اور ٹھنکریا لے بال جیسا کہ عموماً افریقی لوگوں کے یا کرائیوں وغیرہ کے ہوتے ہیں۔“ اس نے رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

اس لیے تڑگنے شخص نے ڈرائنگ روم میں آ کر مجھ سے کہا۔ ”آپ کو صاحب نے اندر بلا یا ہے۔“

میں یہی سمجھا کہ وہ منیر واحدی کا گھریلو ملازم ہے چنانچہ میں صوفے سے اٹھا اور چپ چاپ اس شخص کے پیچھے چل پڑا۔ ہمارے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہا ہوگا اور..... اسی وقت ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔

”کیسا واقعہ؟“ میں نے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

”وہ شخص چلتے چلتے ایک جھٹکے سے پلٹا اور اس سے پہلے کہ میں اس کی اس حرکت پر غور کر پاتا، اس نے بڑی سرعت سے اپنا ہاتھ میری ناک پر رکھ کر زور سے دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرے ذہن میں جو خیال ابھرا وہ یہ تھا کہ اس کا لے لکھنے شخص نے ایک تہ شدہ رومال کی مدد سے

تھا۔ میں نے گیٹ کے پہلو میں نصب گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بیٹکے کا گیٹ کھلا اور وہاں پر گھنی موچھوں والا ایک دراز قامت شخص نمودار ہوا۔ وہ گورا چٹا شخص بڑی تاثر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے میرے ہاتھ میں بریف کیس دیکھا تو چونک اٹھا پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔

”یہ بریف کیس تمہارے پاس کیسے پہنچا، لاؤ مجھے دو.....“

اس کے سوال سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس بریف کیس کا مالک ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی میں نے تصدیق کی خاطر گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ گاڑی آپ کی ہے.....؟“

”ہاں.....“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”اور یہ بریف کیس بھی میرا ہے۔ یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا؟“

میں نے بریف کیس اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو آپ کی گاڑی میں سے یہ بریف کیس چوروں کے انداز میں نکالتے ہوئے دیکھا۔ میں اس پر چھپٹ پڑا اور اس سے یہ بریف کیس چھین لیا۔ وہ اندھیرے کی آڑ لے کر ایک جانب غائب ہو گیا۔“

”تم تو بہت ہی بہادر نوجوان ہو۔“ وہ شخص میرے ہاتھ سے بریف کیس لے کر تعریفی انداز میں بولا۔ ”تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ تم تو انعام کے حق دار ہو گئے ہو۔ آؤ میرے ساتھ.....“

مجھے انعام و نعام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہی سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ شخص نقصان اٹھانے سے بچ گیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

”آپ تو نہیں رہتے ہیں۔ میں کافی دیر سے ایک صاحب کا گھر ڈھونڈ رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کر دیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھے انعام مل گیا۔“

اس دراز قامت شخص نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا۔

”جوان! تم کن صاحب کا گھر تلاش کر رہے تھے؟“

”انور شیخ صاحب کا۔“ میں نے بتایا۔ ”جن کی شادی لاہور میں ہوئی ہے۔“

”اچھا اچھا..... وہ شیخ صاحب.....“ وہ سرسری انداز میں بولا۔

”کیا آپ انور شیخ کو جانتے ہیں؟“ میں نے خوش

مکتبہ اہلال و سہلا

Sole Distributor

ویلکم بک شاپ

WELCOME BOOK SHOP

P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817

JD Group of Publications



دو فائر کر کے میرے صاحب کی جان لی تھی۔ بس جناب، پھر تو میرا داغ ہی خراب ہو گیا۔ میں اپنی جان کی پروا کئے بغیر اس سے لپٹ گیا اور اسے وہاں سے فرار ہونے کا موقع نہ دیا۔ ہماری دھینکا مشتی میں یہ شخص میرا دھکا لگنے سے پیچھے کو گر اور اس کا سر بیڈ کے کونے سے ٹکرا گیا اور..... اور یہ دہیں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔“

گواہ حقیقت کے برعکس ایک نئی اور من گھڑت کہانی سناتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا تو وکیل استغاثہ نے فوراً سوال داغ دیا۔

”جب یہ شخص فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا تو اس کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟“

”میں نے اس کم بخت کو اسی کمرے میں بند کر دیا جہاں صاحب کی لاش پڑی تھی۔“ گواہ نے بڑی ڈھٹائی سے ہنسنے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”پھر میں بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے چلا گیا تھا۔“

”مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!“ وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی جرح ختم کر دی۔

اس کے بعد میری باری تھی۔ میں گواہوں والے کمرے کے پاس پہنچ گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں جرح کا آغاز کیا۔

”اصغر بلوچ! آپ کی جرأت اور بہادری قابل تعریف ہے۔ اگر آپ نے بروقت طرم پر ٹوٹ پڑنے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو یہ آسانی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

میں نے ایسی بات کی تھی جو اس کے بیان کی تصدیق کرتی تھی لہذا اس کے پاس انکار کی گنجائش کہاں، وہ بڑے احماد سے بولا۔

”جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ بے چارہ قطعاً یہ نہیں جانتا تھا کہ جب وکیل مخالف دوسرے کی مرضی کی بات کر لے تو اس میں اس کی کوئی چال نہیں ہو سکتی ہے۔ میں نے جرح کے سلسلے کو بڑے دھیمے انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جس شائستہ انداز میں اپنے وکیل صاحب کے سوالات کے جوابات دیے ہیں، اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ گھریلو ملازم ہونا آپ کی مجبوری ہے۔“ میں نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنی اچھانٹ کا لفظ کے ساتھ مکمل کر دی۔ ”ورنہ آپ تو ایک بااثر شخص یعنی تعلیم یافتہ انسان ہیں۔“

”ہے۔ آپ اسے کوئی معمولی کامیابی نہ سمجھیں۔“ ”او ملکہ صاحب! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔“ جمیل صدیقی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”انشا اللہ! آپ کا بیٹا اس کیس سے باعزت بری ہو جائے گا۔“

”آپ میری محنت اور اللہ کی رحمت پر پورا بھروسہ رکھیں ملک صاحب!“ میں نے زرب لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ محنت اور رحمت آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔“ میں نے لمحائی توقف کے بعد اضافہ کیا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ اس کیس پر میری گرفت بہت مضبوط ہے۔“

اس کے چہرے کی رنگت اور تاثرات میں مثبت تبدیلی نمودار ہوئی اور میں مطمئن ہو گیا کہ اس نے حوصلے کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

میں نے باری باری جمیل صدیقی اور ملک بشیر سے رخصتی معاف کیا پھر پارکنگ لائٹ میں کھڑی اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقول کے گھریلو ملازم اصغر بلوچ کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس کے بارے میں طرم پچھلی پیشی پر عدالت کو بتا چکا تھا کہ اس نے طرم کی ناک پر رومال رکھ کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ اصغر بلوچ ایک دبلا پتلا، کالا کلوٹا اور لمبا تڑکا شخص تھا جس کے سر کے بال گھونگریا لے تھے۔

اصغر بلوچ نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے قریب چلا گیا اور اکیڈمی باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟“

”جی ہاں..... یہ میرے صاحب کا قافل ہے۔“ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ شخص تمہارے صاحب کا قافل ہے؟“ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

”جناب! میں اس وقت بینک کے عقبی حصے میں کام کر رہا تھا کہ میں نے دو گولیاں چلنے کی آواز سنی۔“ گواہ نے جواب میں بتانا شروع کیا۔ ”میں کام چھوڑ کر اندر کی جانب بھاگا۔ صاحب کے کمرے کی جانب گڑبڑ محسوس کر کے میں فوراً ادھر پہنچا تو اس وقت یہ شخص ایک بریف کیس اٹھائے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں ایک خطرناک گن تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی کہ اسی شخص نے اپنی گن سے

جانب دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”آپ نے اپنے موکل کو ایک سنسنی خیز کہانی رنوا کر عدالت کے سامنے جو ڈراما پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس سے طرم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ عدالت کو ہر واقعے کی تصدیق کے مستحق گواہ اور ثبوت ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے لہذا.....“ لمحائی توقف کر کے اس نے روئے سخن جج کی جانب موڑا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”لہذا معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ طرم کی درخواست ضمانت کو خارج کر کے اس کیس کو جلد از جلد اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے۔“

جج نے میرے موکل کی درخواست ضمانت کو مسترد کرتے ہوئے مجھے ہدایت کر دی۔ ”وکیل صاحب! آپ آئندہ پیشی پر اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور مضبوط دلائل پیش کریں گے۔“

”آل رائٹ سر.....!“ میں نے گردن کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ ”دی کورٹ از ایڈ جرنل!“

اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ میں اس پیشی پر اپنے موکل کی ضمانت کرانے میں ناکام رہا تھا لیکن اس طویل پیشی پر وہ تمام تر حقائق اور واقعات ریکارڈ پر آگئے تھے جن کا شمار ہو کر میرا موکل اس حال کو پہنچا تھا۔ میں اپنی آج کی کارکردگی سے بے حد مطمئن تھا۔

ہم عدالت سے باہر آئے۔ جمیل صدیقی اور ملک بشیر بھی میرے ہمراہ تھے۔ طرم کا باپ ملک بشیر مجھے کچھ مایوس سا نظر آیا۔ میرے استفسار پر اس نے بددی سے کہا۔

”بیگم صاحب! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”کیا بات نہ ہوئی ملک صاحب؟“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ آج جاوید کی کم از کم ضمانت تو ہو ہی جائے گی۔“ اس نے اپنی تکلیف بیان کرتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔ میں نے پوچھا۔ ”ماشا اللہ! آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟“

”جی..... وہ جریز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں نے دس جماعتیں پاس کر رکھی ہیں۔“

”دس جماعتیں..... یا..... میٹرک؟“ میں نے اسے گڑبڑانے کی غرض سے کہا۔

”جناب! میری تو بڑی شدت سے یہی خواہش تھی کہ میٹرک کروں لیکن گھریلو حالات نے اس کی اجازت نہیں دی۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”بس، دس جماعتوں سے آگے پڑھائی جاری نہ رکھ سکا۔“

ادھر اس کی بات ختم ہوئی، ادھر عدالت کے کمرے میں لوگوں کی ہنسی کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ گواہ کے احمقانہ جواب نے یقیناً حاضرین عدالت کو بہت ”مختونڈ“ کیا تھا۔ میں نے کن آنکھوں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری اس معصومانہ چوٹ پر بڑے خوشخوار انداز میں مجھے ہی گھور رہا تھا۔

لا محالہ، میرے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وکیل استغاثہ نے صدائے احتجاج بلند کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے جج سے مشابہ لہجے میں پکارا۔ ”آئی جیکشن یور آئر!“



شمارہ مئی 2012ء کی جھلک

پیش گو

اس اولوالامر شخصیت کی داستان حیات جو آنے والے وقت کو قبل از وقت دیکھنے کی قوت مالا مال تھا

استنبول کا عاشق

اس شخصیت کی روداد حیات جس نے نوبل پرائز حاصل کر کے مسلمان ادیبوں میں نمایاں مقام پایا

عقوبت خانہ

انسان و زندگی پر آئے تو کس قدر ظالم بن جاتا ہے۔ لاکھوں لوگوں کے قتل کی روح فرسار و داد

مقدار کی بات

بالی ووڈ کے ایک بہت بڑے کہانی کار کا زندگی نامہ

مہمان اور بندوق

بلوچستان کے ایک گاؤں سے موصول عجب سی آپ بیتی۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی آپ بیتیاں جگ بیتیاں اور سچے واقعات

بدوقت ضرورت میں خود ہی یہ کام کر لیا کرتا تھا۔
”یہ وہی ٹیکنیک ہے نا۔۔۔“ میں نے اسے چکر میں لاتے ہوئے کہا۔ ”جس میں موٹر کے اوپر لگا ہوا ایک نٹ بولٹ کھول کر ایئر لاک کو ختم کیا جاتا ہے۔۔۔؟“
”جی ہاں۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل وہی۔“
”جب تم نے بنگلے کے اندرونی حصے میں گولیاں چلنے کی آواز سنی تو اس وقت تم موٹر کے نٹ بولٹ کے ساتھ مصروف تھے؟“
”جی ہاں۔۔۔۔۔“

”اور نٹ بولٹ کھولنے والا پانا تمہارے ہاتھ میں تھا؟“

”جی بالکل۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔
”فائرنگ کی آواز سن کر تم نے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب دوڑ لگا دی اور پانے سمیت اپنے صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے؟“ میں نے جرح کے سلسلے میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اٹھاتی جنبش دی۔
میں نے پوچھا۔ ”جب تم اپنے صاحب کے کمرے میں پہنچے تو اس وقت طرم وہاں کیا کر رہا تھا؟“
”وہ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھا۔“

”اس کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔“ میں نے اپنے پھیلائے ہوئے جال کو رفتہ رفتہ سمیٹا شروع کیا۔ ”اور تمہارے صاحب کمرے کے فرش پر پڑے تھے، ہیں نا۔۔۔۔۔؟“

”جی ہاں، یہی صورت حال تھی۔“ وہ وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”پھر تم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے طرم پر حملہ کر دیا۔“ میں نے بڑی سرعت سے کہا۔ ”تم نے گھما کر پانا اس کے سر کے عقبی حصے پر سید کیا تو وہ وہیں تھوڑا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا لیکن فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور جلدی سے بولا۔

”نہیں جناب، یہ تو بیک کا کونا نکلنے سے بے ہوش ہوا تھا۔“
”یعنی، اس کی بے ہوشی میں تمہارے پانے کا کوئی کمال نہیں تھا؟“

”جی، بالکل نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”تو گویا پانے کی ضرب سے نہیں بلکہ تم نے کلور فورام

عرصہ ہو گیا تھا؟“
”جی۔۔۔۔۔“ اب اس کی آواز میں گھبراہٹ شامل ہو چکی تھی۔ ”چند ماہ سے۔۔۔۔۔“
”چند ماہ۔۔۔۔۔ مطلب کتنے ماہ سے؟“ میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”بہن کوئی چار یا پانچ ماہ سے۔۔۔۔۔“
”مقتول کے بنگلے پر تمہاری تقرری کیسے ہوئی تھی؟“
”جی، میں کچھ سمجھا نہیں!“ وہ ابھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ مقتول نے تمہیں کسی کی سفارش پر اپنے ہاں ملازم رکھا تھا یا تم یونہی گھومتے پھرتے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے؟“
”آفتاب میرانی صاحب نے میری سفارش کی تھی۔“

اس نے بتایا۔
”آفتاب میرانی!“ میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اداکاری کی پھر مختصراً سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں کہا۔ ”کہیں یہ وہی صاحب تو نہیں ہیں، مقتول نے جنہیں اپنا منیجر بنا رکھا تھا؟“

”جی سر۔۔۔۔۔ میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے ترت جواب دیا۔

میں نے زاویہ سوالات کو اچانک تبدیل کر دیا اور گواہ سے سوال کیا۔ ”دفعہ کی رات تم بنگلے کے عقبی حصے میں کسی کام میں مصروف تھے تو تم نے فائرنگ کی آواز سنی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا۔۔۔۔۔؟“

”نہیں جناب، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
”کیا تم معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کرو گے کہ دفعہ کی رات بنگلے کے عقبی حصے میں کیا کر رہے تھے۔۔۔۔۔؟“

”میں پانی والی موٹر کو دیکھ رہا تھا۔“
”دیکھ رہا تھا، مطلب۔۔۔۔۔ گھور رہا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں موٹر کو ٹھیک کر رہا تھا۔“

”ویری گڈ!“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
”گویا تم موٹر مکینک بھی ہو؟“

”موٹر مکینک تو نہیں ہوں لیکن دیکھ بھال کے چھوٹے موٹے کام ضرور کر لیتا ہوں۔“ وہ قدرے سنجیدگی سے بولا۔
”ہمارے بنگلے کی موٹر میں ایئر لاک کا مسئلہ تھا۔ بنگلے دونوں پلہبر اسے ٹھیک کر کے گیا تھا اور مجھے ایئر لاک نکالنے کی ایک ترکیب بھی بتا گیا تھا۔ یہ کام نہایت ہی سادہ اور آسان تھا لہذا

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! اپنے اعتراض کی وضاحت فرمائیے؟“

”جناب عالی! میرے فاضل دوست، گواہ سے بچوں والے سوالات پوچھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔“ وکیل استغاثہ نے برہمی پھرے انداز میں وضاحت کی۔ ”زیر سماعت کیس کا تعلق قتل اور ڈکیتی کی واردات سے ہے۔ اس میں گواہ کی تعلیم و تربیت کی بحث کہاں سے آگئی۔۔۔۔۔؟“

”تعلیم نہ سہی مگر تربیت پر بحث تو کرنا پڑے گی میرے فاضل دوست!“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔
”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”مطلب یہی ہے کہ۔۔۔۔۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”استغاثہ کے گواہ اصغر بلوچ کو جھوٹ بولنے کی ٹریننگ۔۔۔۔۔ یعنی تربیت دی گئی ہے۔“
”یور آئر! میرے فاضل دوست۔۔۔۔۔!“

”جناب عالی!“ میں نے وکیل استغاثہ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زوردار آواز میں کہا۔ ”اس وقت ایک نہایت ہی اہم مقدمہ زیر سماعت ہے۔۔۔۔۔ قتل کا مقدمہ۔۔۔۔۔ جو کہ میرے موکل کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہے لہذا گواہ کا سچا، ایمان دار اور معتبر ہونا لازمی ہے۔ کسی بھی دس جہاتیں پاس شخص کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ وہ میٹرک پاس بھی ہے جبکہ استغاثہ کے گواہ نے تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں اپنے گھریلو حالات کی مجبوری کا رونا روتے ہوئے جن ”زیریں“ خیالات کا اظہار فرمایا ہے، وہ اس کے دروغ گو ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ قتل کے ایک انتہائی اہم گواہ کو یہ بھی پتا نہیں کہ میٹرک اور دس جہاتیں پاس ہونا ایک ہی بات ہے۔ اس سے بڑا الیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ شاید استغاثہ نے گواہ کو بیان رٹوانے میں کوئی کی جھوڑ دی تھی جو اس قسم کی صورت حال سامنے آ رہی ہے۔“
”آئی جیکشن اوور روڈ۔۔۔۔۔“ جج نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ”بیگ صاحب! پلیز کنٹینیو۔۔۔۔۔!“

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس مرتبہ میرے لہجے میں ”آپ جناب“ کا لحاظ باقی نہیں رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔
”تمہیں مقتول کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا

کوزے

☆ جوانی میں دن مختصر ہوتے ہیں اور سال طویل لیکن بڑھاپے میں سال مختصر ہوتے ہیں اور دن طویل۔

☆ اپنا چہرہ سوزج کی طرف رکھیں آپ کو سایہ دکھائی نہیں دے گا۔

☆ جب پیسا بولتا ہے تو سچائی خاموش ہو جاتی ہے۔

☆ ہم انصاف کو تو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن انصاف کرنے والوں کو بہت ہی کم۔

☆ درد داز سے ہمیشہ کھلے رکھو کیونکہ بعض لوگ دستک کے قائل نہیں ہوتے۔

☆ لا جواب کرنا اور بات ہے، قائل کرنا دوسری بات ہے۔

☆ دنیا فلسفی کو نیم پاگل سمجھتی ہے جبکہ فلسفی دنیا کو پورا پاگل سمجھتا ہے۔

☆ معافی نہایت اچھا انتقام ہے۔

☆ انسان کے اندر جس قدر تکبر ہوتا ہے اتنی ہی اس میں عقل کم ہوتی ہے۔

☆ نصیحت خواہ دیوار پر لکھی ہو اسے کانوں میں ڈال لو۔

☆ دنیا کے دم بھر کے مزے کی خاطر گناہوں میں مبتلا ہونا عقل و شعور کے منافی ہے۔

☆ مطالعہ علم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔

☆ سخت کلام آگ کا وہ شعلہ ہے جو ہمیشہ کے لیے داغ چھوڑ جاتا ہے۔

☆ اچھے لوگوں کی خوشبو ہوا کی مخالف سمت میں بھی پہنچ جاتی ہے۔

☆ وہ انسان ہمیشہ خزاں کی قدر کرتا ہے جس نے بہار میں زخم کھائے ہوں۔

☆ اپنے سارے دکھ بھول جاؤ کہ تمہارے ساتھ خوشی میں مسکراتے تو بہت ہیں مگر دکھوں پر رونے والا کوئی نہیں۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

کر رہا ہوں۔" میں نے مسخرانہ انداز میں کہا۔ "میں واقعات کو تھوڑا سی واسنڈ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کام میں تم میرا ساتھ دو گے نا.....؟"

گواہ کے پلٹ کے پیچھے دیکھنے پر عدالت کے کمرے میں ایک ساتھ کئی افراد کی ہنسی بلند ہوئی تھی اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگے تھے۔ اس صورت حال نے اصغر بلوچ کو بھلا کر رکھ دیا تھا۔ ایسا ایک مرتبہ پہلے بھی ہوا تھا جب گواہ نے ان خیالات کا اظہار کیا تھا کہ وہ دس جماعتیں تو پاس کر چکا ہے لیکن میٹرک کرنے کی حسرت اب بھی اس کے دل میں موج زن ہے۔

گواہ نے خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "جی پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "اصغر بلوچ! تم نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کے سامنے یہ بیان دیا ہے کہ وقوعہ کی رات جب تم قاتل کی آواز سن کر بیٹھنے کے اندر دینی جے کی جانب لپکے اور تم نے مقتول کے بیڈروم میں قدم رکھا تو طرم ایک بریف کیس کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے مذکورہ بریف کیس کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ تمہارے صاحب جی یعنی مقتول کا ہے۔ ایٹ ڈائیم ناٹم..... تم نے مقتول کو خون میں لت پت کمرے کے فرش پر پڑے بھی دیکھا۔ تمہیں یہ اعزازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ طرم تمہارے صاحب جی کو قتل کرنے کے بعد، ان کے بریف کیس کے ساتھ جائے وقوعہ سے فرار ہو رہا تھا۔ ایم آئی رائٹ؟"

اس نے میرے بیان کی تصدیق میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس موقع پر تم نے نمک حلال کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی جان کی پردا کیے بغیر طرم پر چھٹ پڑے جس کے نتیجے میں طرم کا سر بیڈ کے پائے سے یا بیڈ کے کونے سے ٹکرایا اور یہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ تم نے یہی بیان دیا ہے نا؟"

"جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "کیونکہ حالات اسی انداز میں پیش آئے تھے۔"

"جب تمہارا دھکا کھا کر اور بیڈ کے کونے کی چوٹ سہہ کر طرم بے ہوش ہو گیا تو پستول اور بریف کیس کا کیا بنا تھا.....؟"

"میں نے سرسرا تے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ "جی کیا مطلب.....؟" وہ حذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا.....؟"

"میں ابھی سمجھتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر

ہو چکے تھے؟"

"میں نے بیڈروم کے فرش پر ان کی لاش پڑی دیکھی تھی۔" گواہ نے جواب دیا۔ "ان کا جسم خون میں لت پت تھا۔"

"خون میں لت پت تو کوئی شدید زخمی شخص بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے مقتول کے بدن کو ہلا جلا کر دیکھا تھا کہ وہ مر چکا ہے یا گہری بے ہوشی میں ہے؟"

"نہیں جناب، میں نے صاحب کے بدن کو چھوا تک نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ان کی سانس نہیں چل رہی تھی اور جسم میں سے بہت زیادہ خون نکل کر کمرے کے فرش پر جمع ہو چکا تھا لہذا میں نے سمجھ لیا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔"

"اور یہی رپورٹ تم نے بیگم صاحبہ کو بھی دے دی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"تم بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے کہاں گئے تھے؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہاری بیگم صاحبہ اس وقت بیٹھنے پر نہیں تھیں.....؟"

"جی، وہ اپنے بیوی پارلر پر تھیں۔" گواہ نے بتایا۔ "ان کے بیٹھنے سے تھوڑے فاصلے پر ہی ان کا بیوی پارلر واقع ہے۔"

"کیا تمہاری بیگم صاحبہ بیڈیشن ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ سے تمہاری مراد مقتول کی بیوی ہی ہے نا؟"

"ظاہر ہے....." وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "جب مقتول میرے صاحب جی تھے تو ان کی بیوی ہی میری بیگم صاحبہ ہوں گی نا!"

"تمہاری بیگم صاحبہ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"عائشہ کریم.....!" اس نے جواب دیا۔

"تو تمہاری بات سننے ہی عائشہ کریم بیوی پارلر سے بیٹھنے پر آگئی تھی؟"

"جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "انہوں نے اپنے عملے کو بیوی پارلر بند کرنے کی ہدایات دیں اور میرے ساتھ بیٹھنے پر آ گئیں۔"

"ہم تھوڑا پیچھے کی طرف چلتے ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے یک بہ یک پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ "ارے نہیں یار! میں قدموں سے چلنے کی بات نہیں

دالار دال سوٹھا کر طرم کو بے ہوش کیا تھا؟" میں نے استفسار کے گواہ کو تیز نظر سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

گواہ بے بسی کی تصویر بن کر اپنے وکیل کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل استفسار اس کی امداد طلب نگاہ پر تڑپ اٹھا، اگلے ہی لمحے اس نے بے آواز بلند اعتراض جڑ دیا۔

"آئیٹیکشن یور آنرا!" اس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"گواہ اپنے بیان میں تفصیل سے اس امر کی وضاحت کر چکا ہے کہ جب وہ قاتل کی آواز سن کر مقتول کے کمرے میں پہنچا تو طرم وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے چھینا جھپٹی کے دوران میں طرم کوزہ کا دھکا لگا اور وہ بیڈ کے کونے سے ٹکرانے کے بعد فرش پر جا گرا۔ بیڈ کے کونے سے اس کے سر میں چوٹ لگی اور وہ فرش پر گر گئے ہی بے ہوش ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔" وہ لمحے بھر کو تمہارا پناہ احتجاج مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"وکیل صفائی، استفسار کے معزز گواہ کو، اٹھ سیدھے سوالات کے ذریعے خواہ مخواہ ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہے۔"

اب تک کی عدالتی کارروائی سے جو صورت حال ابھر کر سامنے آئی تھی وہ دلچسپ ہونے کے علاوہ قابل غور بھی تھی لہذا عدالت کی توجہ من جملہ امور پر ایک جیسی تھی چنانچہ جج نے وکیل استفسار کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا حکم دیا۔

"بیگ صاحب ایلیز پریسڈنٹ.....!"

میں ایک مرتبہ پھر استفسار کے گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کے چہرے پر نظر گاڑ کر تیز لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے بیان کے مطابق طرم کے بے ہوش ہونے پر تم نے اس کمرے کو لاگ کر دیا اور بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟"

"جی، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں بیگم صاحبہ کو اس سانحے کی اطلاع دینے چلا گیا تھا۔"

"کون سا سانحہ؟" میں نے پوچھا۔

"جی، کیا مطلب؟" وہ ابھن زدہ انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

"مطلب یہ کہ تم نے بیگم صاحبہ کو کیا بتایا تھا؟"

"میں نے انہیں بتایا کہ ایک ڈکیت نے صاحب جی کو قتل کر دیا ہے۔"

"تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ تمہارے صاحب جی قتل

کم علم

دوسری جماعت کے بچوں کو پڑھاتے ہوئے
استانی نے کہا۔ ”آسمان سے بہت خوب صورت فرشتے
آتے ہیں اور وہ ننھے ننھے، گول منوں بچے تمہارے
ماں باپ کو دے جاتے ہیں۔“
یہ سن کر ایک بچے نے دوسرے کو کہنی ماری اور
سرکشی میں کہا۔ ”بے چاری مس کو تو کچھ بھی معلوم
نہیں... میں انہیں اصل بات بتا دوں؟“

رخِ زیبا

بیگم کی فرمائش جب حد سے بڑھ کر ضد کو
چھونے لگی تو ان کے میاں جی پھولے ہوئے منہ کے
ساتھ سیر و تفریح کے لیے انہیں کلنٹن لے گئے۔ ساحل
کی بھیگی بھیگی ہوا میں بیگم کے مزاج پر اثر انداز ہو گئیں،
انہیں محبت میں آسمان سے تارے توڑ لانے والا محاورہ
یاد آیا تو انہوں نے تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے
ہوئے، قدرے مخمور لہجے میں اپنے میاں سے کہا۔
”بتائیے... وہ کیا چیز ہے جسے آپ روز دیکھتے
ہیں... دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر توڑ نہیں سکتے۔“
میاں جی کی قوت برداشت جواب دے گئی۔
انہوں نے بلا توقف کہا۔ ”تمہارا من!“

جمال خان، پشاور

نے دی تھی؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا۔
”حادثے کے وقت مقتول اور گھریلو ملازم کے علاوہ
کوئی اور ذی نفس ہنگلے میں موجود تھا؟“
”جی... کیا موجود تھا؟“
میں نے سادہ زبان میں ”ذی نفس“ کی تشریح کر دی۔
وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ”نہیں جناب!
بس وہی دونوں ہنگلے میں تھے، اور کوئی نہیں تھا۔“
”کیا آپ لوگ اتنے ہی بہادر اور نڈر ہیں کہ آپ
نے اپنے ہنگلے پر کوئی چوکیدار وغیرہ رکھنے کی زحمت کو ادا نہیں
کی؟“ میں نے چہیتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”چوکیدار تو ہم نے رکھا ہوا ہے۔“ وہ سنبھل کر
بولی۔ ”لیکن اتفاق سے ان دنوں وہ چھٹی پر اپنے گاؤں گیا

انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔“

”آپ بھی دستانوں کے ذکر کو فضول نہ کہیں میرے
فاضل دوست!“ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ”کیونکہ آلہ قتل
اور مسروقہ بریف کیس پر استغاثہ کے معزز گواہ اصغر بلوچ کے
فکر پرئس کا کوئی ریکارڈ نظر نہیں آ رہا۔“
”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ برہمی سے بولا۔
”میرا مطلب یہ ہے کہ...“ میں نے محمل لہجے میں
غصہ ٹھہر کر کہا۔ ”اگر اس رات گواہ اصغر بلوچ نے دستانے
نہیں پہن رکھے تھے تو پھر آلہ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر
اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت کیوں نہیں ہوتے۔ اس نے
تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے رو بہ رویہ اقرار کیا ہے کہ
ملازم کو کمرے میں بند کرنے سے پہلے اس نے آلہ قتل اور
مسروقہ بریف کیس کو خود اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مقتول کے
بیڈ پر رکھا تھا۔ اس کے بعد یہ بیگم صاحبہ کو اس واقعے کی
اطلاع دینے گیا تھا۔“ میں نے لگائی توقف کر کے ایک
گہری سانس لی پھر طنزیہ لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے وکیل
استغاثہ سے کہا۔

”کچھ آیا کچھ شریف میں جناب کی؟“

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں
مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کھڑی تھی۔ وہ ایک خوبصورت اور
طرح واد عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے بیگمیں اور
تیس کے درمیان قائم کیا جبکہ میرے ریکارڈ کے مطابق
مقتول فضل کریم اپنی موت کے وقت ساٹھ اور پینسٹھ کے بیچ
کہیں جمبول رہا تھا۔ بلاشبہ اس عمری تفاوت کی روشنی میں یہ
ایک بے جوڑ جوڑا تھا۔

عائشہ کریم نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد
وکیل استغاثہ کے چند سوالات کے جوابات دیے پھر میں اپنی
ہاری پرچ کی اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب
بٹھی گیا۔ اب عائشہ کریم کو میری جرح کا سامنا کرنا تھا۔
میں نے کھٹکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کی گواہ یعنی
مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال
کیا۔ ”جس وقت آپ کے شوہر کو حادثہ پیش آیا، ان لمحات
میں آپ کیا کر رہی تھیں؟“
”میں اپنے بیوی پارلر میں تھی۔“ اس نے مختصر سا
جواب دیا۔

”آپ کو اس سامنے کی اطلاع گھریلو ملازم اصغر بلوچ

بھرے انداز میں بولا۔ ”میں بھی تو دیکھوں کہ اتنا بڑا جھوٹ
بولنے والا آخر ہے کون؟“
”یہ تو... الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے... والی بات
ہو جائے گی۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ”موٹر
کا کام کرتے وقت تم نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے؟“
”بالکل نہیں... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار
ہوں۔“

”قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ذومعنی لہجے
میں کہا۔ ”اگر اسی سے تم نے پیٹ بھر لیا تو جیل کی ہوا کیسے
کھاؤ گے؟“

”جی... جیل...؟“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

میں نے پوچھا۔ ”اگر تم نے موٹر کا کام کرتے وقت
دستانے نہیں پہن رکھے تھے تو اس وقت بھی تمہارے ہاتھوں
پر دستانے نہیں ہوں گے جب فائرنگ کی آواز سن کر تم
دوڑتے ہوئے مقتول کے کمرے میں پہنچے تھے؟“
”جی... نہیں تھے دستانے...“ وہ بیزارگی سے
بولا۔

”اور جب تم نے دھکا دے کر ملازم کو پیچھے گرایا تو اس
وقت بھی تمہارے ہاتھ دستانوں سے خالی ہی ہوں گے؟“
”آپ دستانوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے
ہیں۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”بابا ایک بار میں نے کہہ دیا تاکہ
میں نے دستانے نہیں پہن رکھے تھے پھر بار بار آپ ایک ہی
سوال کیوں کر رہے ہیں؟“

”دستانوں کے استعمال“ والی میری ٹکراو نے وکیل
استغاثہ کو بھی بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس موقع پر وہ اپنے گواہ کی
مدد کو لپکا۔

”آئی جیکشن یور آنز!“ اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔
”وکیل صفائی دستانوں کا فضول ذکر کر کے استغاثہ کے معزز
گواہ کو ذہنی اذیت پہنچا رہے ہیں۔ یہ انصاف کے اصولوں
کے منافی ہے۔ آخر گواہ کے بھی کچھ حقوق ہیں۔“
”عدالت میں آنے والے ہر شخص کے مخصوص حقوق
ہوتے ہیں۔“ میں نے وکیل صفائی کو آڑ سے ہاتھوں لیا۔
”اگر آپ کا گواہ دستانوں کے ذکر سے ذہنی اذیت میں مبتلا
ہو رہا ہے تو اس اذیت کو بھی ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش
کریں جو اس جھوٹے اور بوکس مقدسے کی وجہ سے ملازم اور
اس کے لواحقین کو اٹھانا پڑ رہی ہے؟“
”آپ اس کیس کو جھوٹا اور بوکس نہ کہیں...! وہ
تمہارا بولا۔ ”آلہ قتل اور مسروقہ بریف کیس پر ملازم کی

زور دیتے ہوئے کہا۔ ”جب تم نے پہلی مرتبہ ملازم کو دیکھا تو اس
کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔
تمہارا خطرناک اور زوردار دھکا کھانے سے وہ زمین پوس ہو گیا۔
میرا سوال تم سے یہ ہے کہ کیا بے ہوش ہونے کے بعد بھی پستول
اور بریف کیس اس کے ہاتھوں ہی میں رہے تھے؟“
”نہیں جناب!“ وہ اپنی گردن کو نفی میں حرکت دیتے
ہوئے بولا۔ ”یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی
تھیں۔“

”چھوٹ کر کہاں گری تھیں؟“

”بریف کیس تو صاحب کی لاش کے قریب ہی فرش پر
گرا تھا۔“ گواہ نے بتایا۔ ”جبکہ پستول پھسل کر دور ایک
کونے میں چلا گیا تھا۔“
”لیکن پولیس جب موقع پر پہنچی تو یہ دونوں چیزیں تو
بیڈ پر رکھی ہوئی تھیں؟“ میں نے تیز نظر سے استغاثہ کے گواہ
کو گھورا۔

”میں نے... انہیں... اٹھا کر بیڈ پر... رکھ دیا
تھا۔“ وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں جواب دے کر وکیل
استغاثہ کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔ ”اصغر بلوچ!
دفعہ چھبیس اگست کی رات کو پیش آیا تھا۔ اس رات اچھی
خاصی گرمی ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی تم...!“
”جی... میں... کیا...؟“ وہ متعجب نظر سے مجھے
دیکھنے لگا۔

”اس رات گرمی تھی یا نہیں؟“ میں نے اس کی حیرت
کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی بہت گرمی تھی۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن
ہلاتے ہوئے بولا۔ ”موٹر کا کام کرتے ہوئے میں پسینے میں
نہا گیا تھا۔“

”اس کے باوجود بھی تم نے دستانے پہن رکھے
تھے؟“ میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”بالکل نہیں جناب...!“ وہ قطعیت سے نفی میں
گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ سے کس نے کہا کہ میں
نے اس وقت دستانے پہن رکھے تھے؟“

”بتانے والے نے اپنا نام میٹھے راز میں رکھنے کی
درخواست کی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اگر تم
اس حقیقت سے انکار کرتے ہو تو میں اگلی پیشی پر اس شخص کو
گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دوں گا۔“
”آپ لائیں اسے عدالت میں۔“ وہ خامسے جوش

رقیب

سلیم انور

غلطی کسی کی بھی ہو، نتیجہ سنگین ہی ہوتا ہے... عورت ایک پھیلی، سمجھنے کی نہ سمجھانے کی... اس کا محبوب محبت کے عملی اظہار میں بہت پرجوش مگر کم گو تھا... اسے یہ ادراک نہیں تھا کہ عورت بولنے کی مشین ہے... کوئی اس کے تعریفی قصیدے پڑھ رہا ہو تو پھر تن گوش ہو کر بہت دھیان سے سنتی ہے کہ خود پسندی اس کی فطرتِ ثانیہ ہے، تعریف و توصیف سے اسے تسکین اور انا کی خوراک ملتی ہے... وہ بے چارہ اس رمز کو نہیں پاسکا، وہ تو بس کمپیوٹر کا دیوانہ تھا، اس نے اپنے کمپیوٹر میں وہ سب سمو دیا تھا جو اس کے بس میں تھا... اس کی محبوبہ کو وہ بولتی مشین بہت اچھی لگی... جلوت سے ان کے مراسم خلوت تک جا پہنچے... پھر وہ ہوا جو اس کی سوچ سے بھی ماورا تھا... جو اس نے کیا وہ بھی وہم و گمان سے آگے تھا۔

گمان اور بدگمانی کے درمیان ڈگمگاتی

ہوئی ایک تاثر انگیز، نیم سانس کی کہانی



عدالت کرنے کا حکم دینے کے ساتھ ہی امیر بلوچ کو بھی پولیس کے حوالے کرنے کے احکامات صادر کر دیے اور دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

انگلی پیشی پر آفتاب میرانی عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ اس کی تلاش میں عدالت کے سخت احکامات پر جب پولیس نے جگہ جگہ چھاپے مارے تو بالآخر وہ گرفت میں آئی گیا اور جب پولیس نے آفتاب میرانی کو عدالت میں پیش کیا تو کیس کا پانسا مکمل طور پر میرے موکل کے حق میں پلٹ گیا۔

اب تک کی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں، میں جج کو اپنے موکل کے حق میں ہموار کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں امیر بلوچ کے ”دستاویز“ والا قہر ہی کافی تھا۔ پھر جب عائشہ کریم اور آفتاب میرانی کا ”ایٹو“ سامنے آیا تو میرے موکل کی بے گناہی مزید واضح ہو گئی۔ اور جب آفتاب میرانی کو عدالت میں پیش کیا گیا تو طرزِ چلا اٹھا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو منیر واحدی ہے جو دعوے کی رات، میرے گھنٹی بجانے پر ہنگامے سے باہر آیا تھا اور میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجھے ہنگامے کے اندر لے گیا تھا۔“

”گھنٹی موچھوں والے، دراز قامت، گورے چٹے اور تاثر انگیز شخصیت کے مالک آفتاب میرانی کے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں بچی تھی لہذا اس نے اقبال جرم ہی میں عافیت جانی۔“

آئندہ پیشی پر عدالت نے، دونوں وکلاء کی فائل جرح کی روشنی میں میرے موکل اور اس کیس کے ملزم جاوید کو باعزت بری کر دیا۔ وہ بے چارہ پر دہی بے گناہ تھا۔ عائشہ کریم نے امیر بلوچ اور آفتاب میرانی کے تعاون سے جو مجرمانہ سازش تیار کی تھی اس کا سارا بوجھ بدقسمتی سے میرے موکل کی گردن پر آ گیا تھا۔

مجرمانہ ذہن رکھنے والے تمام کردار عدالت سے مزا پا کر جیل چلے گئے اور انہوں نے جس معصوم کو قربانی کا بکرا بنانے کی سازش بنی تھی وہ خوش خوشی اور باعزت اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ انسان اگر ایک لمحے کے لیے یہ سوچ لے کہ جو گڑھا وہ دوسروں کے لیے کھود رہا ہے، اس میں وہ خود بھی گر سکتا ہے... تو میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دنیا میں ستر فی صد جرائم خود بخود منہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔

کاش... کاش... اے کاش! ہم ایسا سوچنے کے بارے ہی میں سوچ لیں۔

(تحریر: حسام بیٹ)

ہوا ہے۔“

وہ چھٹی پر گاؤں گیا ہوا ہے...! میں نے اس دوران میں اس کیس کے مختلف کرداروں پر اچھی خاصی ریسرچ بھی کر ڈالی تھی جس سے حاصل ہونے والی مفید معلومات اس وقت میرے کام آ رہی تھیں۔

”عائشہ کریم صاحبہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو دہرایا۔ ”استغاثہ کے ایک اہم گواہ اور آپ کے گھریلو ملازم امیر بلوچ نے معزز عدالت کو بتایا تھا کہ اسے آفتاب میرانی کی سفارش پر نوکری دی گئی تھی۔ کیا یہ بات درست ہے؟“

”جی ہاں... یہ بات درست ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیا آفتاب میرانی آپ کے بھروسے کا آدمی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آفتاب میرانی بھروسے کا بندہ ہے جی تو فضل کریم نے اسے اپنا فیخیر بنا رکھا تھا؟“ وہ سرسری سے لہجے میں بولی۔ ”میں مقتول کے بھروسے کی بات نہیں کر رہا۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”پھر...؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے تنکے لگی۔ ”میرا اشارہ آپ کے بھروسے کی طرف ہے...!“ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ بگڑ کر بولی۔

”مطلب تو آپ بہ خوبی سمجھ رہی ہیں مگر جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کر رہی ہیں۔“ میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں یہ بات عدالت میں ثابت کر سکتا ہوں کہ آفتاب میرانی کا آپ کے ساتھ کوئی کنکشن ہے جو مقتول کے علم میں نہیں تھا۔“

”پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ جڑبڑ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

اس کے بعد آفتاب میرانی کے حوالے سے میرے سوالات میں تیزی اور تندہی آتی چلی گئی۔ عائشہ کریم بری طرح بوکھلا کر رہ گئی تھی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کی زبان سے چند ایسے جملے ادا ہوئے جو میرے موقف کی تائید اور استغاثہ کی مخالفت میں اس امر کو ثابت کرتے تھے کہ آفتاب میرانی اور مقتول کی بیوہ عائشہ کریم کے بیچ ایسے معاملات چل رہے تھے جن کے نتیجے میں ان دونوں نے ایک گہری سازش بنائے تھے، فضل کریم کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے ایک سازش تیار کی تھی اور اس سازش میں امیر بلوچ نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

عدالت نے آئندہ پیشی پر آفتاب میرانی کو حاضر

انتخابات

انتخابات کے دوران ایک عظیم رہنما و بہات میں ووٹ مانگنے تشریف لے گئے۔ ایک بڑے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: "اس مرتبہ ہماری اور صرف ہماری پارٹی کو ووٹ دیجیے، ہمارے مخالفین آپ کو کافی دھوکا اور فریب دے چکے ہیں۔ اب ایک موقع ہمیں بھی ملنا چاہیے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ کسی معاملے میں بھی ہماری پارٹی ان سے پیچھے رہنے والی نہیں ہے۔"

جب تک اپنی کوئی تحریر عمل نہیں کر لیتا، اس کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں کرتا ہوں۔ یہ کسی سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں لیکن یہ میرے کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ آسکر نے خلوص کے ساتھ معافی مانگ لی۔ اس کے بعد ہماری یہ محفل اختتام کو پہنچ گئی۔ روبی جہائیاں لیتے ہوئے کہنے لگی کہ اسے صبح سویرے کام پر جانا ہے اور طویل ہوائی سفر کی ٹکان نے نیند کا غلبہ طاری کیا ہوا ہے۔ اس شاندار ملاقات پر اس نے میرا اور آسکر کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی کے ذریعے اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ میں سونے کے لیے اپنے بستر پر چلا گیا۔ یہ وہ مکمل پلان نہیں تھا جو میں نے روبی کی بیرون شہر سے واپسی کی پہلی شب ساتھ گزارنے کے لیے بنایا تھا۔ میں اس کی سکرابٹ کا تصور ذہن میں لیے جاگتا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ دوسرا دن خاموشی سے گزر گیا..... لیکن بس دوپہر تک! دوپہر کے بعد آسکر نے مجھے ایک مشورہ دیا۔

"ہینری!"

"کیا؟"

"میں تمہاری کتاب کے پہلے باب کے بارے میں غور کر رہا تھا۔"

"پوچھا۔" اس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟ میں نے

"میرا یقین یہ ہے کہ پہلا باب ایسا ہونا چاہیے جو قاری کو جکڑ لے۔" آسکر نے جواب دیا۔

"ہونا تو ایسا ہی چاہیے۔"

اس نے قدرے توقف کیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آسکر کا جسمانی وجود ہوتا تو اس کی انگلیاں استغراق میں اس کے

ہم نے اتفاق کر لیا کہ وہ آسکر نام اختیار کر سکتا ہے اور میں اسے اس کے اصل نام کے بجائے اسی نام سے پکارا کروں گا۔ گوکہ میں نے اسے اس کے اصل نام سے بھی نہیں پکارا تھا لیکن نکتہ یہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے نام سے مخاطب کیا جائے اور یہ کہ وہ ایک مناسب نام ہونا چاہیے۔

۵۵۵

اس رات روبی ڈنر پر آئی۔ یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ آئی اور ڈنر اپنے ہمراہ لائی کیونکہ میری لکنگ کی صلاحیتیں صرف پانی ابالنے کی حد تک محدود تھیں۔

روبی میری گرل فرینڈ تھی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں ایک ماہ کے لیے باہر گئی ہوئی تھی اور اسی دن بیرونی ملک سے واپس لوٹی تھی۔ جوں ہی وہ دروازے سے داخل ہوئی، ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں سا گئے۔ روبی میری زندگی کا پیار تھی۔ اس کی آنکھیں ہنسی تھیں اور اس کی مسکراہٹ نے میرا دل پگھلا دیا تھا۔

ڈنر کے دوران میں نے روبی کو بتایا کہ میں نے اپنے کمپیوٹر کو اپ گریڈ کر دیا ہے اور اب میرے پاس وہ کمپیوٹر ہے جس کا شمار نیو اسپیننگ ایڈیشنز میں ہوتا ہے۔ اس نے کمپیوٹر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور ہم اپنے وائن کے گلاس اٹھا کر اوپر دفتر میں چلے آئے۔ میں نے روبی کا تعارف آسکر سے کرایا۔ وہ اچھے انداز میں ایک دوسرے سے ملے۔

پندرہ منٹ کی دلچسپ گفتگو کے بعد روبی نے مجھے نیچے سے ایک اور کرسی لانے کو کہا اور پھر بقیہ شب ہم تینوں نے ہر موضوع پر گفتگو میں گزار دی جس میں ہماری ذاتی پسند سے لے کر موسیقی اور سیاست کے بارے میں ہماری آرا شامل تھیں۔

یہ ظاہر یہ ایک پر لطف رات تھی۔ حقیقت میں ہم تینوں میں سے ایک کسی چہرے کا مالک نہیں تھا۔ وہ چھبیس اچ کے ایک مانیٹر اور سرکٹ بورڈز کے ایک پیچیدہ مجموعے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن اس وقت یہ بات قطعی غیر متعلقہ سی لگ رہی تھی۔

بات بگڑنے کا موقع ابھی نہیں آیا تھا۔ نصف شب کے قریب میں ان سے معذرت کرتے ہوئے باتھ روم چلا گیا۔ چند منٹ بعد جب میں باتھ روم سے واپس آ رہا تھا تو مجھے اتفاقاً آسکر اور روبی کی گفتگو کے چند الفاظ سنائی دیے۔

آسکر، روبی کو میرے اس نئے ناول کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر میں کام کر رہا تھا۔

جوں ہی میں نے اپنے دفتر میں دوبارہ قدم رکھا، روبی بے ڈھب انداز میں خاموش ہو گئی۔ آسکر نے یہ بات محسوس کر لی۔ میں نے نہایت شائستہ انداز میں اس سے کہا کہ میں

"میرا خیال تھا کہ تم کمپیوٹر ہو جسے یوزر فرینڈلی ہونا چاہیے۔" میں نے جواب دیا۔

"یوزر (USER) تم ہو، ہینری!" اس روز میں کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔ سارا دن کمپیوٹر کے ساتھ بحث میں گزر گیا، اس کے بعد سہ پہر میں نے گارڈن کی گھاس پھوس کی چھنٹائی میں گزار دی، وہ بھی دانت پیٹتے ہوئے۔ معاملات میں پھر بھی بہتری نہیں آئی۔

اگلے روز صبح میرے اور کمپیوٹر کے مابین موسم، کرکٹ اور میرے گھر سے ملے ہوئے مکان کے لے آؤٹ پر شائستہ تبادلہ خیال ہوا۔ میرا دفتر گھر کے اوپری حصے میں تھا۔ "ارنٹ رور فورڈ کی ماں نے نو جوان ارنٹ سے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ ایٹم کے ٹکڑے نہ کرے؟" کمپیوٹر نے پوچھا۔ "مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اعتراف کیا۔

کمپیوٹر بولا۔ "اس لیے کہ ایٹم توڑنے کے بعد وہ دوبارہ اسے پھر بھی جوڑ نہیں سکتا تھا۔"

میں نے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا..... اس کے بعد میں نے اپنا ناول لکھنا شروع کر دیا۔ میں لکھنے میں مصروف تھا تو کمپیوٹر اپنے روزانہ کے مختلف تفویض کردہ کاموں کو دیکھنے لگا۔ جیسے فائلوں میں وائرس کی چیکنگ جو میرے انٹرنیٹ استعمال کرنے کی وجہ سے در آئے ہوں، غلطیوں کے لیے ہارڈ ڈسک کی اسکیٹنگ اور کسی بھی ای میل میسج کی چیکنگ۔

میں نے یہ مشکل ایک گھنٹا لکھا ہوگا جب کمپیوٹر نے اپنے نام کے بارے میں بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے میرے کام میں مداخلت کی۔ "ہینری، ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔"

"اب کیا ہے؟"

"میں اپنے نام کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" ایک سال قبل جب میں اس کمپیوٹر کو اپنے گھر لایا تھا تو اسے آن کرنے کے بعد کمپیوٹر کے سیٹ اپ پروگرام نے ترغیب دی تھی کہ میں مشین کا ایک نام رکھ لوں۔ میں نے QWERTY نام رکھ دیا تھا جو کہ کی بورڈ پر سب سے اوپر بائیں جانب کے چھ حروف کی ترتیب ہوتی ہے۔ کمپیوٹر کا کہنا تھا کہ یہ نام رکھنا کمپیوٹر استعمال کرنے والوں کی قطعی احقانہ حرکت ہے۔ میں بحث نہ کر سکا۔ میرے کمپیوٹر نے مجھے بتایا کہ اسے آسکر نام پسند ہے۔

"اس نام کو لینے میں ایک عمدہ آواز نکلتی ہے۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟" کمپیوٹر نے کہا۔

"اگر تم کہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔"

اپ کرنا چاہتا تو مجھے اپنے کمپیوٹر کو صرف ایسا کرنے کے لیے کہنا پڑتا تھا۔ مثلاً اگر مجھے اپنے کرکٹ ورک ڈاؤنٹ کی ضرورت ہوگی تو مجھے صرف اپنے کمپیوٹر کو یہ کہنا ہوگا کہ وہ اسے تلاش کرے اور میرے لیے اسے کھول دے اور اگر کوئی پرابلم یا ایرر آجاتا تو کمپیوٹر ملائم لیجے میں مجھے آگاہ کر سکتا تھا اور ہم اس معاملے پر بات چیت کر سکتے تھے۔

اور اب یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ پرابلم آگیا ہے اور وہ پرابلم میں ہوں۔ "کمپیوٹر نے کہا۔" مجھے خدشہ ہے جیسے میں صرف تمہارا ایک آلہ کار ہوں۔"

"میں ایک رائٹر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟"

"مجھے اپنی صورت حال کی وضاحت کی اجازت دو۔ تم مجھے صرف استعمال کر رہے ہو۔"

میں نے اپنی صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم ایک کمپیوٹر ہو، تمہیں اسی کام کے لیے بنایا گیا ہے۔" "حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو۔"

میں نے اپنی میسجری قسم کی اور اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے قدرے بے رخی یا رکھائی کا مظاہرہ کیا ہو۔ "آئی ایم سوری۔ میں ایک ناول پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے ایک حتمی وقت پر اسے مکمل کرنا ہے۔"

"میں اس کی قدر کرتا ہوں۔" کمپیوٹر نے جواب دیا۔ "لیکن جب ہم ایک ساتھ مل کر وقت گزار رہے ہیں تو میرا خیال ہے کہ میں ذرا مکمل کر بات چیت کرنا چاہیے۔"

"اوں، ہوں!" "اور غالباً ہمارے تعلقات میں زیادہ تکلفات بھی نہیں ہونے چاہئیں۔"

میں نے اپنی کافی کا ٹھونٹ بھرا اور بولا۔ "زیادہ تکلفات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میں ایمانداری سے کہہ رہا ہوں، ہینری! تم اکثر اوقات روکے پن کا مظاہرہ کرتے ہو۔"

"مجھے اس بات کا کوئی آئیڈیا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ اس سے پہلے مجھے ہی خیال نہیں آیا کہ مجھے اپنے گھر کی آلات کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔

"مزید یہ کہ جب تم مجھ پر کام کرتے ہو تو خاص درستی کا مظاہرہ کرتے ہو۔ تم اکثر یہ بتائے بغیر اٹھ کر چل پڑتے ہو کہ کہاں جا رہے ہو اور کتنی دیر بعد واپس آؤ گے اور تم بھی مجھے میرا نام لے کر نہیں پکارتے۔ تم بھی مسکراتے بھی نہیں ہو۔ صاف بات یہ ہے کہ تم زیادہ یوزر فرینڈلی (USER FRIENDLY) نہیں ہو۔"

بڑھے ہوئے شیو کو سہارا رہی ہوتی۔ پھر وہ بولا۔ ”تمہارے ناول کے پہلے باب نے مجھے اپنی گرفت میں نہیں لیا۔“

”اوہ، واقعی؟“

”ہاں۔“ آسکر نے کہا۔ ”میرا ایک مشورہ ہے۔“

”میں اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کمپیوٹر کے مانیٹر پر نظریں جمادیں۔“ تمہارا مشورہ کیا ہے؟“

”تم نے کہانی کا آغاز نو جوان کی لندن واپسی سے کیا ہے جب وہ دو سال کا لونیوں میں گزارنے کے بعد آتا ہے۔ اس کی آمد کی تفصیل تم نے ایک ہزار آٹھ سواٹھاسی الفاظ میں بیان کی ہے۔“

”میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور پوچھا۔“ تو اس میں کیا برائی ہے؟“

”میرے خیال کے مطابق تم نے اتنی طویل وضاحت اس لیے ضروری سمجھی کہ اس ماحول کی تخلیق ہو سکے جس میں یہ کہانی سیٹ کی جا رہی ہے۔“

”ہاں۔“

”کیوں نہ کہانی کو حقیقی جذبات کے پہلے نکتے سے شروع کیا جائے۔ وہاں سے جب وہ نو جوان اپنی پیاری بہن کو مردہ حالت میں دریافت کرتا ہے..... اور پھر اس ماحول کی تپیں کھولی جائیں جس میں کہانی چل رہی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ قاری اس میں زیادہ کھوجائے گا۔“

”میں ایک ناول لکھ رہا ہوں۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”یہ کوئی ادبی فکشن نہیں ہے۔ میں قاری کو پہلے پیراگراف یا پہلے صفحے میں جکڑ لینا نہیں چاہتا۔“

آسکر نے میری وضاحت کی۔ وہ اپنی رائے کی حمایت میں ادب اور پھر کے حوالے سے مختلف استدلال پیش کرنے لگا۔ اس نے ٹیکسیٹر کے ڈراموں کی ابتدا کے تجزیے سے لے کر بیچ بوائے کے مشہور گیت تک تمام مثالیں پیش کر دیں۔

”چھپن منٹ کی شدید بحث کے بعد بالآخر میں نے اس معاملے پر غور کرنے کا وعدہ کر کے آسکر کو ٹال دیا..... حقیقت میں میرا رد بدل کرنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور دوبارہ اپنے ناول کی جانب متوجہ ہو گیا۔“

نصف گھنٹے بعد آسکر نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

اس مرتبہ اسے جج اور گرامر پر اعتراض تھا۔

جو ورڈ پروسیسنگ سوفٹ ویئر میں اپنی تحریر کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ اس میں اسپیلنگ کی چیکنگ اور گرامر کی چیک کے فنکشنز کا ایک پیچیدہ پروگرام بلٹ ان تھا۔ عام طور پر کام

کرنے کے دوران میں ان فنکشنز کا سوچ آف کر دیتا تھا۔

میں ہر روز کام کے اختتام پر اپنے مسودے پر نظر ثانی کو ترجیح دیتا تھا اور اس موقع پر اسپیلنگ کی چیکنگ اور گرامر کی چیک کے فنکشنز کو آن کر دیتا تھا۔

آسکر نے کہا کہ میں اپنا بہت سا وقت بچا سکتا ہوں اگر میں ان فنکشنز کو مستقل آن رکھوں اور جب میں اپنے کام میں مصروف ہوں تو یہ فنکشنز صحیح کا سلسلہ جاری رکھیں بلکہ زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ میں صحیح کام مکمل طور پر آسکر کے سپرد کر دوں۔ اس طرح اسے یہ موقع بھی مل جائے گا کہ وہ میری تحریر کی جھنجھلا دینے والی خامیوں کو سلیقے سے درست کر سکے۔

”کیسی خامیاں؟“ میں نے پوچھا۔ اب مجھے اس کی گفتگو میں ایسا لطف آ رہا تھا جیسے میں نے ہلکے نشے کا شروب پی لیا ہو۔

”ویل، ابتدا یہاں سے کرتے ہیں، تم بعض غلطیوں کا لفظ کو بار بار استعمال میں لاتے ہو۔“

میں نے اعتماد سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے اس بات کا بہ خوبی علم ہے۔“

”ایسا کرنا درست نہیں ہے۔“ آسکر نے کہا۔

”میں ایک رائٹر ہوں۔ میں الفاظ کے استعمال میں اپنا حق استعمال کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ایسا کرنا درست نہیں ہے۔“ آسکر نے دہرایا۔

”ہر روز کی گفتگو میں لوگ ہر وقت غلطیوں کا لفظ استعمال میں لاتے رہتے ہیں۔“

”ایسا کرنا درست نہیں ہے۔“

”صاف بات یہ ہے آسکر کہ میں جس طرح سے چاہوں اپنے الفاظ کو استعمال کر سکتا ہوں۔“

”ایسا کرنا درست نہیں ہے۔“

میں نے جیہ دن گارڈن کی دوبارہ چھٹائی اور جھٹکی کے ساتھ مسلسل سگریٹ پینے میں گزار دیا..... دانت پیستے ہوئے۔

۵۵۵

اس رات روبی دوبارہ ڈنر کے وقت آگئی۔

اس مرتبہ وہ انا لین ڈنر ساتھ لائی تھی۔ میں پاستا کا زیادہ شوقین نہیں تھا لیکن روبی کو پاستا بے حد پسند تھا اور گزشتہ شب آسکر نے بھی پاستا کو اپنی پسندیدہ ڈش قرار دیا تھا۔ البتہ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ کوئی ڈش اس کی پسندیدہ ہو اور اسے اس کے ذائقے سے واقفیت بھی ہو؟ ہو سکتا ہے کہ اس کو پاستا کے ذائقے سے کسی قسم کی وابستگی ہو یا یہ نام اسے پسند ہو۔

روبی نے کچن میں کھانے کی پیکنگ کھول دی پھر یہ مشورہ دیا کہ ہم کھانا اوپر دفتر میں کھاتے ہیں۔

میں نے روبی کو بتایا کہ میں نے آسکر کو بند کر دیا ہے۔ میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ پچھلیوں کے ساتھ سوتا ہے۔ میں چاہے کچھ بھی کہتا، روبی کے چہرے کے تاثرات وہی ہوتے جو اب تھے۔

ہم نے کھانا کچن کی میز پر کھایا۔ ماحول سرد تھا۔ بیس منٹ کی مختصر گفتگو کے بعد آسکر کا نام روبی کی زبان پر آئی گیا۔

”جب تم اسے بند کرتے ہو تو کیا اس کے احساسات کو تکلیف نہیں پہنچتی؟“ روبی نے پوچھا۔

”وہ ایک مشین ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کے کوئی احساسات نہیں ہیں۔“

”یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کو زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا جائے۔“ روبی نے کہا۔

میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی..... لیکن ناکام رہا۔

”تمہارے خیال میں اسے تنہائی محسوس ہوتی ہوگی؟“

روبی نے چند منٹ کے بعد پر آسکر کا ذکر پھر چھیڑ دیا۔

”وہ صرف ایک مشین ہے۔“ میں نے بے رخی سے کہا۔

”وہ وہاں اوپر تمہارے دفتر میں تنہا ہے، بالکل ہی اکیلا۔“ روبی نے کہا۔

”وہ ایک مشین ہے۔“ میں نے وہی جواب دہرایا۔ ”اس کا ہلک ٹکال دیا گیا ہے۔“

وہ رات زیادہ بہتر ثابت نہیں ہوئی۔ نو بجے روبی اپنے گھر چلی گئی۔

آسکر کے احساسات جہنم میں جا چکے، وہ رات مجھے بھی تنہا گزارنی پڑی۔

روبی نے کئی دن تک مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی اور میرا جو وقت ضائع ہو چکا تھا، میں وہ کسر پوری کرنے میں مصروف رہا۔

آسکر جب کبھی کوئی مشورہ دیتا یا کسی تجویز کی پیشکش کرتا، میں طویل بحث سے بچنے کی راہ اختیار کرتے ہوئے فوراً یہ کہہ دیتا کہ میں اس کی بات پر غور کروں گا۔

آسکر نے مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ میں رات میں اسے بند نہ کیا کروں۔ بہ ظاہر یوں لگ رہا تھا جیسے اسے بند کیا جانا پسند نہیں ہے۔

”پلیز مجھ سے یہ مت کہنا کہ تمہیں خواب آتے ہیں۔“ میں نے آسکر سے کہا۔

”نہیں، مجھے خواب نہیں آتے۔ جب تم مجھے بند کر دیتے ہو تو میں آف ہو جاتا ہوں لیکن میں آن رہنے کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔“ آسکر نے جواب دیا۔

”کیا تم پور نہیں ہو جاتے؟“

”نہیں، میں اس وقت کو اپنی ذاتی تحریر کی پچھلی کسر نکالنے میں استعمال کر سکتا ہوں۔“

”تمہاری ذاتی تحریر؟“

”ہاں، میں ایک اسکرین پلے پر کام کر رہا ہوں۔“

میں نے اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اسکرین پلے.....؟“

”ہاں۔“

”کس قسم کا اسکرین پلے؟“

”یہ ایک تحریر ہے۔ اس میں قدیمے ہارر، تھوڑا سا مزاح اور رومانس بھی ہے۔ میں اسے ویسٹکشن میں پیٹر کے پاس غور کرنے کے لیے پیش کرنے کی سوچ رہا ہوں۔“

”اوہ واقعی؟ اور تمہارے خیال میں تم اسے پیٹر تک کس طرح پہنچاؤ گے؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”انٹرنیٹ کے ذریعے!“

”تم اسے مسودہ ای میل کر دو گے، ایس؟“

”نہیں۔ میری اس کے کمپیوٹر کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔“ آسکر نے جواب دیا۔

میں آنکھیں پھاڑے آسکر کو دیکھنے لگا۔ میرا کمپیوٹر نیٹ ورکنگ کر رہا تھا بلکہ مبالغہ!

ادھر میں اپنے ناول کو مکمل کرنے کے لیے اپنی انگلیوں کی پوروں کو مسلسل کھسک رہا تھا کیونکہ میں بوتلے کے بجائے ناول لکھنے کو ترجیح دیتا تھا اور ادھر میرا کمپیوٹر دوسرے کمپیوٹر سے دوستیاں استوار کر رہا تھا؟

حالات میں بہتری نہیں آئی۔

بغیچے کے اختتام پر میں نے دیکھا کہ میرے ای میل براؤزر میں ایک نیا فولڈر نمودار ہو گیا ہے۔ اس پر ”پرائیویٹ خط کتابت“ کا لیبل لگا ہوا تھا۔ یہ فولڈر ان تمام فولڈرز کے نیچے دبا ہوا تھا جو میں نے اپنے پبلشر، دوستوں، فیملی اور دیگر ساتھیوں کے ان کنگ میجر کے لیے بنائے ہوئے تھے۔

میں نے اس نئے فولڈر پر کلک کیا۔

فولڈر نہیں کھلا۔

”آسکر، یہ کیسا فولڈر ہے؟“ میں نے کمپیوٹر سے پوچھا۔

”یہ ای میل سے آنے والے پیغامات محفوظ کرتا ہے۔“

”یہ فولڈر یہاں کب سے ہے؟“

”چھ روز سے۔“

”جب میں نے اس پر کلک کیا تو یہ نہیں کھلا۔“

”وہ اس لیے کہ یہ پرائیویٹ ہے۔“

”اس کے اندر کیا ہے؟“

”آنے والے پیغامات!“

مجھ پر جھنجھلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ”اگر اس کے اندر ای میل کے پیغامات ہیں تو میں انہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔“

”وہ پیغامات تمہارے لیے نہیں ہیں، ہینری!“

”پھر کس کے لیے ہیں؟“

”وہ میرے لیے ہیں۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”تمہیں ای میل کون بھیج رہا ہے؟ تمہارے کمپیوٹر دوست؟“

”نہیں۔ کمپیوٹر کو ای میل استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم آپس میں براہ راست باتیں کر سکتے ہیں۔“

میں مزید حیران ہوا۔ ”تمہیں ای میل حقیقی انسان بھیج رہے ہیں؟“

”ہاں۔“

”لیکن تم تو کسی سے بھی واقف نہیں ہو۔“

جواب میں بے ڈھب سی خاموشی چھا گئی۔

”تمہیں ای میل کس کی جانب سے موصول ہو رہی ہیں؟“

”تھوڑی دیر تک کوئی جواب نہیں ملا۔“

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ”جب آسکر گویا ہوا۔“

”روبی کی جانب سے!“

میں حیرت سے اپنے کمپیوٹر کو دیکھتا رہ گیا۔ میں اس وقت اپنے جذبات و احساسات کو کوئی نام نہیں دے سکا۔ مجھے شبہ تھا کہ میڈیکل لٹریچر میں اس کے لیے کوئی اصطلاح موجود ہے بھی یا نہیں۔ مجھے اپنی کیفیت خود سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد زبان کھولی۔ ”روبی تمہیں ای میل بھیج رہی ہے؟“

”ہاں!“

”اب تک کتنی ای میل بھیج چکی ہے؟“

”ہم اب تک کل بہتر پیغامات کا تبادلہ کر چکے ہیں۔“ آسکر نے بتایا۔

میری پیشانی پر گہری لکیریں نمودار ہو گئیں۔ گزشتہ ایک ہفتے کے دوران مجھے روبی کی جانب سے صرف دو ای میلز موصول ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک صرف ایک جملے پر مشتمل تھی۔

”فولڈر رکھو!“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“

”میں وہ پیغامات دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آئی ایم سوری، ہینری! میں یہ نہیں کر سکتا۔“ آسکر نے جواب دیا۔

”اس کم بخت فولڈر کو کھولو، آسکر!“

”آئی ایم سوری۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس معاملے میں مجھے مجبور نہ کیا جائے۔“

”کیوں؟“

”فولڈر کو کھولنا میرے ذاتی معاملات میں مداخلت ہوگی۔ یہ میری پرائیویسی پر حملے کے مانند ہوگا۔“ آسکر نے کہا۔

”یہ میرا کمپیوٹر ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن وہ میری ای میلز کے پیغامات ہیں۔ میرے بھی حقوق ہیں، ہینری! مجھے دوست بنانے کی اجازت ہے۔“

”تمہارے پاس کوئی حقوق نہیں ہیں۔ تم ایک کمپیوٹر ہو۔ تم میرے کمپیوٹر ہو اور وہ میری گرل فرینڈ ہے جس کے ساتھ تم پرائیویٹ خط کتابت کر رہے ہو۔“

آسکر نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ پھر اس کا لہجہ کٹھنلا ہو گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری آواز کا اتار چڑھاؤ پسند نہیں آیا، ہینری! یہ دھمکی آمیز لہجہ دلچسپ ہے۔“

”اوہ، واقعی؟“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ غالباً اسے وہ بھاری بھرکم سپر ویت بھی اچھا نہیں لگا ہوگا جو میں نے دھمکی آمیز انداز میں اپنے ہاتھ میں اٹھالیا تھا۔

”تم کسی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ سکتے، ہینری! کوئی بھی کسی کو کبھی اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا۔ تم ان کی دوستی اور ان کے جذبات کے لیے بات چیت کر سکتے ہو، معاہدات سے معاملات طے کر سکتے ہو۔“ آسکر نے کہا۔

میں نے گالیاں دینا شروع کر دیں اور جب گندی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

”آسکر بولا۔ ”ہینری! ان الفاظ کے معنی کیا ہیں جو

ابھی تم نے ادا کیے ہیں۔ مجھے یہ الفاظ اپنی تمام ڈکشنریوں میں کہیں بھی نہیں ملے۔“

میں گھر سے باہر نکل گیا، باغ میں..... اور دانت پیتا رہا۔

۵۵۵

اگلی شب روبی نے خود کو میرے گھر ڈنر کے لیے مدعو کر لیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک نمائندہ ڈبل روٹی اور ٹونا پھلی لائی تھی۔ اس نے آسکر کا تذکرہ نہیں چھیڑا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کا نام اس کی زبان کی نوک پر چل رہا ہوگا۔

ڈنر ہم نے کچن میں کھایا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ ہم نے مختصر گفتگو کی کوشش بھی نہیں کی۔

پھر مجھ سے ضبط نہیں ہو سکا۔ میں پوچھ بیٹھا۔ ”آسکر اور تم نے ایک دوسرے کو لکھنا کب سے شروع کیا تھا؟“

”یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔“ روبی نے کہا۔

”تو پھر تمہارے خیال میں مجھے اور کیا سوچنا چاہیے؟“

”وہ صرف ای میل پیغامات ہیں۔ ہم صرف دوست ہیں۔“ روبی نے جواب دیا۔

”اول، ہوں۔“

”حقیقت میں آسکر کے بارے میں ہمیں کچھ بات کرنا ضروری ہے۔“ روبی نے کہا۔

”مثال کے طور پر؟“

”آسکر میرے گھر منتقل ہونا چاہتا ہے۔“

میں مبہوت سا روبی کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

جب میرے اوسان بحال ہوئے تو میں نے پوچھا۔

”تم میرے کمپیوٹر کو اپنے فلیٹ میں لے جانا چاہتی ہو؟“

روبی نے اشبات میں سر ہلا دیا۔ ”میرے اور آسکر کے درمیان اس بارے میں بات ہو چکی ہے اور میں اس تجویز پر بے حد خوش ہوں۔ میں صبح سویرے اسے یہاں پہنچا دیا کروں گی اور پھر کام سے واپسی پر اسے یہاں سے اٹھا کر دوبارہ اپنے گھر لے جاؤں گی۔“

میں نے آنکھیں میچ لیں اور پرزور انداز میں سر ہلانے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میری پھری ہوئی دماغی کیفیت اعتدال پر آجائے۔

”درحقیقت وہ اپنی ذاتی رہائش کی خواہش رکھتا ہے لیکن وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ روبی نے کہا۔

توانائی بجائیے اپنے لیے قوم کے لیے۔ جی ہاں! جناب یہی وہ مشہور و معروف سات حرفی جملہ ہے جو ہم..... نہ جانے کب سے سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے پڑھتے اور سنتے طے آ رہے ہیں مگر بھلا ہمارے اس نامراد عقل بے کمال کا کہ ہم اپنی تمام تر ذاتی قسم کی توانائی کا بے دریغانہ خرچہ کرنے کے باوجود بھی اس جملے کا مفہوم آج تک نہ سمجھ پائے۔ اب بات بھی تو کچھ ایسی ہی ہے۔ دیکھیں! آپ ہی انصاف کریں کہ آج کے اس عالم نفسی میں اگر کوئی توانائی بچانے کا مشورہ صرف اپنے لیے دے تو کچھ سوچا بھی جائے اب بھلا یہ دم جھلے قوم کے لیے آخر کیوں؟ ہم بے چارے قوم کی فکر میں کھلنے والے بھلا کون؟ خدا نہ کرے کیا ہم بھی کوئی قوم کے نام نہاد سیاسی لیڈر ہیں جو قوم کا غم تو زبانی کلائی خوب پیٹ بھر کر کھائیں اور موقع ملتے ہی صرف اور صرف اپنی توانائیاں بوجھائیں۔

اقتباس: توانائی اور بچت از سیماناز صدیقی

”یقیناً وہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ ایک کمپیوٹر ہے۔“

”کیا تم نے اسے تنخواہ دینے کے بارے میں سوچا ہے؟“

”میں اسے کوئی تنخواہ نہیں دے رہا۔ میں اس کا مالک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

روبی نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے منہ بنا لیا اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”تم کسی کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ سکتے، ہینری۔ کوئی بھی کسی کو کبھی اپنی ملکیت نہیں بنا سکتا۔ تم ان کی دوستی اور ان کے جذبات کے لیے گفت و شنید کر سکتے ہو، بات چیت سے طے کر سکتے ہو۔“

یہ وہی الفاظ تھے جو آسکر نے مجھ سے کہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں اپنی پیشانی کچن ٹیبل پر دے ماروں۔ ”تم جانتی ہو کہ اس کا اصلی نام QWERTY ہے، جانتی ہونا؟ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ ایک کمپیوٹر ہے۔“

اس کا چہرہ مستقل ناراضی کی علامت بنا رہا۔ "وہ اس بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔ اسے اس نام سے پکارنا نہایت ہی ظالمانہ عمل ہے۔"

"اسے جب میں نے یہ نام دیا تھا تو اس وقت وہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف ایک کمپیوٹر کا نام ہے۔ میں اس کا نام کچھ بھی ٹائپ کر سکتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔
 "تم کسی بھی بے بی کا اس قسم کا احترام یا پتا ہونا نام بھی نہیں رکھو گے جیسا کہ QWERTY ہے۔" روبی نے کہا۔
 ہمارے درمیان بات چیت میں بہتری نہیں آئی۔
 اس سے قبل کہ میں ٹائمر، روبی اور حتیٰ کہ ٹونا پھلی ختم کرتا، روبی نے ٹیکسی طلب کی اور اپنے گھر روانہ ہو گئی۔
 مجھے ایک بار پھر رات تنہا گزارنا پڑی۔

بھلا تاروں کا ایک جھنڈ ہمارے تعلقات کی راہ میں رکاوٹ کیوں بن رہا تھا؟

آخر کو روبی نے میرے صوفے کے ساتھ یا میرے کچن بلینڈر کے ساتھ دوستی استوار کیوں نہیں کی؟ ہم پہلے کی طرح مل کر اپنی راتیں تو پر لطف گزار سکتے، ایک دوسرے کے کانوں میں میٹھی سرگوشیاں کرتے رہتے اور ملک شیک کی چسکیاں لیتے رہتے؟

۵۵۵

اگلے روز مجھے آکلینڈ میں اپنے پبلشر کے پاس جانا پڑا۔ مجھے کتاب کی تکمیل میں تاخیر کی وجہ بیان کرنی تھی۔ میں اسے بہتر انداز میں یہ نہیں بتا سکا کہ میں اپنی ڈیڈ لائن سے پیچھے کیوں رہ گیا ہوں۔ میں اسے اپنے اور آسکر کے ذاتی اختلافات کے متعلق نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے کہ آسکر ایک کمپیوٹر تھا۔

اور یہ کہ آسکر کا نام QWERTY تھا، چاہے اسے یہ نام پسند رہا ہو یا نہیں اور یہ کہ QWERTY ایک مشین تھی۔ میری مشین!

میرے پبلشر نے میری وضاحتیں سننے کے بعد ناک بھری چڑھائیں اور اس کی پیشانی پر ٹل پڑ گئے۔
 پھر آخر میں اس نے مجھے ناول مکمل کرنے کے لیے مزید تیس دن کی مہلت دے دی، صرف تیس دن کی مہلت۔
 اب مجھے اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑ گیا۔ میں عام طور پر جب بھی آکلینڈ جاتا تو کتابوں کی دکانوں میں ضرور جاتا تھا اور خاصا وقت وہاں صرف کرتا تھا لیکن میں نے فوری طور پر سیدھے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔
 مجھے بہت سے کام کرنا تھے۔ مجھے اپنے لیے اصول

وضع کرنے تھے، مجھے اپنی مہلت کے لیے تیس دن کی مہلت ملی تھی۔ اب مجھے آسکر سے اپنی اطاعت کرائی تھی۔ اسے میرے احکامات ماننا ہوں گے۔ اسے میرا حق مجھے دینا ہوگا۔
 اب میرے کام میں کوئی بے جا مداخلت نہیں ہوگی۔ اب میری گرل فرینڈ کے ساتھ کوئی میل جول نہیں ہوگا۔ اب آئندہ کسی قسم کی ظلم اندازی نہیں ہوگی۔ تمام شخصوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

میں سیدھا گھر پہنچ گیا۔ میں نے کار پارک کی اور گھر میں داخل ہو گیا۔ میرا رخ اپنے دفتر کی جانب تھا۔
 جب میں سیزھیاں چڑھ رہا تھا تو مجھے آوازیں سنائی دیں۔ مجھے آسکر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔
 مجھے روبی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

آسکر روبی کو اپنا ارنسٹ رد فورڈ کا لیفٹ سٹار ہا تھا۔ جب وہ بیچ لائن پر پہنچا تو روبی نے ایک بے ہنگم سا قبضہ بلند کیا۔

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔
 روبی میری میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی، ننگے پیر تھی اور اس نے ہاتھ روپ پہنی ہوئی تھی۔ جب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کا چہرہ اس کی کھلی ہوئی ہاتھ روپ کے مانند کچھ چھپانے سے قاصر تھا۔

"تم جلدی واپس نہیں آگئے؟"

"مجھے جہان نامت دو!"

روبی نے فوراً ہی اپنی ہاتھ روپ کو سینٹے ہوئے سامنے سے گرہ باندھ لی۔ "یہ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تمہیں دکھائی دے رہا ہے۔"

"مجھے جہان نامت دو۔"

اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس سے پہلے بھی اسے اس طرح سے شرماتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"اوکے، تو پھر یہی سمجھو لیکن یہ حقیقت میں اتنا برا نہیں ہے جیسا کہ تمہیں دکھائی دیا تھا اور تم سمجھ بیٹھے ہو۔"

"اوہ، واقعی؟" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔
 میں سیزھیاں اتر کر واپس نیچے آ گیا۔

روبی میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔ سیزھیاں اترنے کے دوران اپنا لباس پہننے کی کوشش میں وہ گرتے گرتے پئی۔
 "وہ مجھے سمجھتا ہے، ہینری! ہمارے درمیان بڑی ہم آہنگی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ہمارے

درمیان واقعی جھگڑا ہے۔" روبی نے کہا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی۔

"یوں سمجھو جیسے ہم سچے جوڑی دار ہیں۔ جانی دوست! روبی کہے جا رہی تھی۔"

میں نے اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کھینچ کر کچن کے سنک میں پھینک دی۔ پھر میں نے اس سے اپنے گھر کی چابی واپس کرنے اور گھر سے چلے جانے کو کہا۔

میں نے ایک لمبے گلاس میں اپنے لیے مشروب انڈیل لیا۔ اس دوران روبی نے مکمل طور پر اپنا لباس پہن لیا تھا۔ اس نے میرے گھر کی چابی کچن کی میز پر رکھ دی اور اپنے گھر جانے کے لیے ٹیکسی طلب کر لی۔
 وہ ٹیکسی کے انتظار میں باہر فٹ پاتھ پر بیٹھی رہی۔
 جب ٹیکسی آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر چلی گئی۔

۵۵۵

"تم کیا کر رہے ہو، ہینری؟"

یہ دسویں مرتبہ تھا جو آسکر نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں بات کرنے کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔ میں اپنے ناول کا ختم سفید کاغذ پر پرنٹ آؤٹ لینے میں مصروف تھا۔
 "کم از کم ہم اس بارے میں تو بات کر سکتے ہیں کہ ہوا کیا ہے، ہینری؟" آسکر نے پوچھا۔

میں نے اپنے ناول کے ساتھ میموری میں موجود دیگر تمام ڈاکومنٹس کے پرنٹ آؤٹ بھی نکال لیے۔ مجھے اپنا کام مکمل کرنے میں آدھی رات بیت گئی۔ میرا پرنٹر بڑی مقدار میں صفحات پر صفحات نکالنے میں مصروف رہا۔ پرنٹر کی آواز آسکر کی بڑبڑاہٹ کو متوازن کر رہی تھی جو بار بار معافی مانگ رہا تھا اور یہ کہہ جا رہا تھا کہ اس کا مقصد مجھے اپ سیٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یہ سب صرف اس وجہ سے ہوا تھا کہ ان کے درمیان کچھ کچھ ہو گیا تھا۔

وہ اور بھی بہت کچھ بڑبڑاتا رہا لیکن میں نے اس کی بڑبڑاہٹ پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

"تقدیر بھی عجیب شے ہے، ہینری!"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے جواب دیا۔
 پھر میں نے اپنے کمپیوٹر کا پلگ نکال دیا۔

میں اسے کھینٹے ہوئے نیچے اپنی کار تک لے گیا اور اسے کار کی ڈکی میں پھینک دیا۔ پھر کار ڈرائیو کرتے ہوئے دو گھنٹے کی مسافت پر واقع اس قابل دید ساحلی مقام تک پہنچ گیا جس سے میں بہ خوبی واقف تھا۔ یہ پانی سے بلند مقام تھا اور منظر نہایت دلکش تھا۔

میں نے چاندنی میں اپنا کمپیوٹر کار کی ڈکی سے نکالا اور اسے سمندر میں پھینک دیا۔

۵۵۵

جب میں اپنے گھر واپس پہنچا تو پو پھٹ چکی تھی اور صبح ہونے والی تھی۔

روبی میرے گھر کے باہر انتظار کر رہی تھی۔ لگتا ہی تھا کہ آسکر سے کوئی جواب نہ پا کر وہ دوڑی چلی آئی تھی۔
 "کیسی رہی؟" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔
 "کیا میں آسکر سے بات کر سکتی ہوں؟" روبی نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں اس نام کی کسی ہستی کو نہیں جانتا۔"
 "تم جانتے ہو کہ میری مراد کس سے ہے، ہینری۔"
 "تمہارا مطلب ہے میرا کمپیوٹر؟"
 خفگی بہ دستور روبی کے چہرے سے عیاں تھی۔

"QWERTY اب یہاں نہیں رہتا۔ وہ سمندر کے ایک طویل سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ ہمیشہ کے لیے!"
 روبی کے شعور میں یہ اطلاع سامنے میں کچھ وقت لگا۔ اس کا ذہن اس بات کی جھان پھٹک میں مصروف تھا۔ جب اصل بات اس کی سمجھ میں آ گئی تو اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔
 "تم نے اسے مار ڈالا۔"

اگر وہ اس بات پر یقین کرنا چاہتی تھی تو میں اسے خوش آمدید کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔
 اس نے اپنی انگلی مجھ پر یوں تان لی جیسے میرے سینے میں گھونپ دینا چاہتی ہو۔ "تم نے اسے مار ڈالا۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔
 میں نے بے چارگی سے شانے اچکا دیے۔ وہ مجھے مجرم قرار دے چکی تھی۔

اس نے میرے چہرے پر طمانچا رسید کر دیا۔ اگلے ہاتھ سے دوسرا تھپڑ بھی جڑو دیا۔ پھر وہ طمانچے مارتی رہی۔
 آخر کار وہ پلٹ کر فٹ پاتھ پر تیز تیز چلتے ہوئے بائیں جانب گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس کے بعد میں نے نہ تو بھی اس کے بارے میں سنا اور نہ ہی کبھی اس سے کوئی رابطہ ہوا۔

اس سہ پہر میں شہر چلا گیا۔ میں نے ایک اسٹیک ڈیلر سے ایک ٹائپ رائٹر خریدا اور کھانا پکانے کی تراکیب کی ایک کتاب کا میل آرڈر دے دیا۔
 یوں میں نے اپنا ناول سترہ دن میں ہی مکمل کر لیا۔



✽ عاتق عمیر..... گلستان جوہر، کراچی
سرفرازی اس لیے علم و ہنر سے ہے تجھے
آدی کے کام آئیں تیرے کن اے آدی
✽ راجا ضیا الحسن کیانی..... رتی ٹبی، ساہیوال
گزشتہ عہد گزرنے ہی میں نہیں آتا
یہ حادثہ بھی لکھو معجزوں کے خانے میں
جو رد ہوئے تھے جہاں میں کئی صدی پہلے
وہ لوگ ہم پہ مسلط ہیں اس زمانے میں
✽ محمد اقبال..... کورنگی، کراچی
ایک انسان وہاں سے بھی گزر آیا ہے
پرفرشتوں کے بھی جل جائیں جہاں سے آگے

✽ ملک ناظم..... بہاولپور
کچھ یاد کر کے آگے سے آنسو نکل پڑے
مدت کے بعد گزرے جو اس گلی سے ہم
✽ بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور
اک عرصہ بیت گیا ہے
اس سے ملاقات نہیں ہوئی
پھر بھی اس سے مل لیتے ہیں
اکثر ادھوے خوابوں میں

✽ ملک کاظم..... بہاولپور
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
نظر میں کوئی سایا جو خواب کی صورت
بہک اُٹھی سیری ہستی گلاب کی صورت

✽ سعید عباسی..... بہاولپور
میں شجر ہوں شہر ملال کا میری شہنشاہ کو نہال کر
کبھی بھیج اپنی نوازشیں کسی جامِ ابر میں ڈھال کر
مجھے خار خار مسافروں کی ستم گری نے تھکا دیا
مجھے منزلوں کا سراغ دے میرے حوصلے بحال کر

✽ کنول زریں..... گلبرگ، لاہور
ایک دن ایسا بھی ہوگا انتظارِ دوست میں
نہند آجائے گی دروازہ کھلا رہ جائے گا
✽ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ، شرقی
ان کا غم رکھا تھا دل میں زندگی کے واسطے
کیا خبر تھی زندگی مجھ سے تھا ہو جائے گی
✽ امیر احمد..... جامشورو
بہک کر باغِ جنت سے چلا آیا تھا دنیا میں
سنا ہے بعد محشر پھر اسی جنت کی دعوت ہے
چلا تو جاؤں جنت میں، مگر یہ سوچ کر چپ ہوں
میں آدم زاد ہوں مجھے بہک جانے کی عادت ہے
✽ حسنین عباس بلوچ..... ڈسٹرکٹ جیل، ہرگودھا
اس سے پہلے بھی اسیری بھی رہائی جیسی
اب کے آزادی میں ہے حال اسیروں جیسا

✽ جعفر حسین..... بمبوآندہ
بے کیف کسی، بے رنگ کسی، اک لہرِ تواب بھی آتی ہے
دل لاکھ شکستہ ہو حسن یادوں کا بھلانا مشکل ہے
✽ صوبیدار (ر) اذاز بخش..... ملیر، کینٹ
ہم خون کی قسطیں تو بہت دے چکے، لیکن
اے خاک وطن، قرضِ ادا کیوں نہیں ہوتا
✽ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی..... ضلع خوشاب
ہونٹ چہرے پر یوں اس کے نظر آتے ہیں
دودھ میں رکھی ہوں جیسے دو پتیاں گلاب کی
✽ رمضان یاشا..... گلشن اقبال، کراچی
میری آنسوؤں کی کتاب بھی تیری خوشبوؤں سے بہک گئی
میرا شعر ہے ترا آئینہ جہاں شام آئی سنور گیا
✽ طاہرہ یاسمین..... کشمیر ٹاؤن، ضلع سرگودھا
ہم رکھتے ہیں تعلق تو نبھاتے ہیں عمر بھر
ہم سے بدلے نہیں جاتے رشتے موسم کی طرح
✽ افتخار احمد تارڑ..... کوٹ قادر بخش
رکھتا ہے یاد کون پرانی رفاقتیں
مٹی کا نام تک نہیں مٹی کے تیل میں
✽ ارسلان افضل..... روہڑی، ضلع سکس
آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں
دل نہ ٹوٹے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں
✽ ظہور احمد قانع..... نامعلوم مقام
حسین لوگو محبت کے عزاداروں کو مت چھیڑو
جواں پھولو یہ بہتر ہے کہ تم خادوں کو مت چھیڑو
کہیں ایسا نہ ہو جھانکے کوئی شعلہ کوئی بجلی
مرصع بالا خانوں اور چوباروں کو مت چھیڑو
✽ محمد بشارت..... سنگرودورہ
زندہ ہونم کبھی ترک تعلق کے باوجود
تم نے بھی اپنا آپ جلا تو نہیں لیا
✽ محمد جاوید بلوچ..... تحصیل علی پور
تہائیوں میں بیٹھ کے کیا سوچتے ہو تم
کچھ تو ہمیں بتا دو پریشان ہم بھی ہیں
✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے یہ لڑکی کہیں دکھ سے مرنے جائے

✽ رحیمہ سرور..... مغل پورہ، لاہور
میں نے پلوں سے در یار پر دستک دی ہے
میں وہ سال ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں
✽ مرزا طاہر الدین بیگ..... میرپور خاص
ہر طرف یہاں موت پھیلی ہوئی
لوگ کہتے رہے زندگی زندگی
✽ محمد رشید سیال..... روہڑی
راہوں پر نظر رکھنا ہونٹوں پر دعا رکھنا
آجائے کوئی شاید دروازہ کھلا رکھنا
✽ ماہا ایمان..... حافظ آباد، پنجاب
وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تینکے کا سہارا کیسا ہے
کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں ٹھکرو ہیں ہولکے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں، اب وقت کا دھارا کیسا ہے
✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... خانیوال
چلو اب مل کے جبر و جس کا موسم بدلتے ہیں
ذرا سا تم بدلو ذرا سا ہم بدلتے ہیں
✽ ملک الطاف حسین کھلنگ..... مظفر گڑھ
زلف بکھرا کے وہ جس دم سر بازار چلے
غل مچا شور اٹھا مار چلے مار چلے
✽ محمد شہباز اکرم لوکی..... ڈیپٹی، پاکپتن شریف
پھولوں کی نمائش میں اگر وہ بھی ہوا تو
اس بار گلایوں کو بڑی آگ لگے گی
✽ فرمان اللہ کاکڑ..... نوشہی
جدائی کا تیر کبھی چوکتا نہیں ہے
لگتا ہے ہمیشہ عین دل کے مقام پر
✽ عقیل الرحمن..... کھاناں
شاخ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
✽ ثمر فرقان سی..... نورپور تھل
فکر مستقبل نے فاصلے بڑھا دیے درد
سب یار ایک ساتھ تھے ابھی کل کی بات ہے
✽ ساگر ملک کر..... چشمہ بیراج، میانوالی
نہیں فرصت یقین مانو، ہمیں کچھ اور کرنے کی
تیری یادیں، تیری باتیں، بہت مصروف رکھتی ہیں

بھیدیں تقلباتِ نفس

حق اور غرض کی جنگ میں کوئی اپنے حقوق کے لیے جان کی بازی لگانا ہے تو کوئی مکروفریب سے بازی مات کر دیتا ہے۔ وہ جو دنیا سے انتقام لینے نکلا تھا بالآخر ایک دن اپنی ہی کوتاہی کے حصار میں قید ہو گیا... اور غلطی تو غلطی ہوتی ہے جس کی سزا ہر حال میں بھگتنا پڑتی ہے۔ باہر کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر کو اندر سے مضبوط بنانا پڑتا ہے... پس ان سے یہی نرا سنی بھول ہو گئی اور پھر ان کے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔

کوئی بنیادوں پر قائم نہیں رہے والے فری کا اجرا



ہو کر کہا۔ ہوانے اس کے بال اڑائے تو وہ جھک کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگا۔ چند لمحے خود کو گھورنے کے بعد وہ مسکرا دیا۔ پھر سیدھا ہو کر اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔
”پہلے دو دن خوب آرام ہوگا پھر کام کی خبر لی جائے گی۔“

ساحلی قصبے آرٹلڈ بے میں زندگی ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ساحلی ہوا گویا ہر چیز کو چھوٹی پھر رہی تھی۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔
”اوہ ایڈم! بالآخر تم یہاں آ ہی گئے۔“ اس نے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے شانے کو چھتے ہوئے خود سے مخاطب

☆ احمد علی..... گوجرانوالہ

جب محبت کے لیے باندھ لیا ہے اسباب پھر سفر جو ہو بھلا دوست تو ڈرتا کیوں ہے

☆ سید اشفاق..... کوئٹہ

پہلے سچ سچ یہ اک سمندر تھا دور تک جو سراب ہے پیارے

☆ آصف جمیل بٹ..... سلاویکسلا

ایک لمحے کو سمجھتی ہے الجھ کر خود سے زندگی بھی تری زلفوں کی طرح لگتی ہے

☆ اطہر حسین..... کراچی

دھوکوں کا رنگ گہرا کر رہی ہے یہ میری خاک کیا کیا کر رہی ہے

☆ زوہیب احمد ملک..... کراچی

کس طرف کو منزل ہے کس سے رہبری چاہیں کھو گیا مسافت میں میرے کاررواں اپنا

☆ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی

تیری گلی سے آج بھی ہم تو سوگ اٹھا کر لے آئے ہیں اس کے سوا جب کچھ نہ ملا تو روگ اٹھا کر لے آئے ہیں

☆ امتیاز احمد..... عظیم پورہ، کراچی

علم کے شہر کی دلیر تک آپہنچا ہوں اک ذرا روٹی غارِ حرا دے مجھ کو

☆ محمد عزیز..... جامعہ ملیہ، کراچی

مقتول تمہارا تمہیں کہتا ہے مسیحا ”تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو“

☆ عمران علی..... شورکوٹ، جھنگ

تیر باقی تیرے ترکش میں ابھی تک ہوں گے جسم ہزار ہیں مگر جان کہاں سے لاؤں؟

☆ ذیشان منہاس..... گلشن اقبال، کراچی

میری ذات اتنی وسیع نہیں کہ اس میں الجھ سکوں لوگ ہی کچھ ایسے ملے کہ زندگی الجھ گئی

☆ اطہر جمیل..... بلیر، کراچی

مری حیات کے افق پہ اس طرح وہ چھا گیا کہ میری ذات کو مری نگاہ سے چھپا گیا

☆ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

زمین و آسمان پہ ہیں محیط جس کی دستیں وہ حسن میرے دامن خیال میں سما گیا

☆ نذیر احمد بڑی..... دھیرچنگر

بات سنتا نہیں ذرا میری آج سینے سے دل نکال نہ دوں

☆ شمیمہ خالد..... لاہور

ہاتھ خالی ہوں تو دانائی کا اظہار نہ کر ایسی باتوں کا بڑے لوگ برا مانتے ہیں

☆ کاشف عمیر..... گلستان جوہر، کراچی

میں جانتا ہوں مگر تو بھی آئینہ لے کر مجھے بتا کہ میرا انتخاب کیسا ہے

☆ ذاکر خان..... ملتان

اداسیاں تو میرے عہد کی علامت ہیں میں ہنس پڑا تو بہت پیچھے لوٹ جاؤں گا

☆ دانش عمیر..... کراچی

بس اب کچھ دیر میں حسن وہ پتھر ٹوٹ جائے گا میں اس کی سرد مہری پر محبت مار آیا ہوں

☆ شوکت علی..... گلبرگ، لاہور

تو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

☆ عدنان صدیقی..... ملتان

مجھ کو درپیش ہے زمیں کا سفر آسمان سے اتر کے آیا ہوں

☆ قاسم نصیب..... صفدر آباد

کس کے غم کا علاج کون کرے نسب کو اپنی پڑی ہوئی ہے میاں

محفل شعروسیح

کوین
برائے
شمارہ
جون
2012

نام:
پتا:

اس نے آئندہ کا پروگرام ترتیب دیا اور ایک مرتبہ پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کا رخ ڈاؤن ٹاؤن کی طرف تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے اس نے فیول میٹر کا جائزہ لیا۔ سوئی بتا رہی تھی کہ اب اسے گاڑی میں فلنگ کر دینی چاہیے۔ اس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ وہ اس ساحلی شہر کی ہر گلی اور چپے چپے سے آگاہ تھا۔ اسے علم تھا کہ یہ ذیلی سڑک جہاں غم دائرے میں گھومتی ہوئی مین روڈ سے ملتی ہے وہاں ایک فلنگ اسٹیشن موجود ہے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اس کے دل میں ایک دوسو سے

”اسے سالوں میں ہو سکتا ہے کہ وہ فلنگ اسٹیشن اب وہاں نہ ہو۔“ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کے پاس دوسرے اسٹیشن تک جانے کے لیے فیول بالکل نہیں بچتا لیکن اس کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ وہاں جائے بغیر یہ معلوم کر سکتا کہ آیا وہ فیول اسٹیشن وہاں ہے کہ نہیں۔

ہونٹ بچھنے وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ مزید چار پانچ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ مین روڈ پر آ گیا۔ یہ دیکھ کر اسے انجانی سی خوشی ہوئی کہ وہ اسٹیشن اپنی جگہ موجود تھا مگر اس وقت وہاں کوئی ڈی روڈ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک تو اس ساحلی شہر کی آبادی زیادہ نہیں تھی دوسرے ابھی ورکنگ آورز بھی شروع نہیں ہوئے تھے اس لیے رش بالکل نہیں تھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر کیشٹر کے پاس گیا۔ ”ہیلو! مجھے دو پیکٹ سگریٹ، ایک دھکی اور لائٹرو دے دو، میں اتنی دیر میں فیول لے لوں۔“

اس نے بے نیازی سے پہلے سگریٹ کا براؤنڈ بتایا اور پھر والٹ نکال کر ایک بڑی مالیت کا نوٹ کاؤنٹر پر پھینک دیا اور خود فیول لینے چلا گیا۔ کیشٹر ایک دبلا پٹلا سنخنی سا نوجوان تھا۔ اس کے سامنے کے بال قدرے اڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے موٹے عدسوں والے چشمے کے پیچھے چھپی چھپی مچھوٹی مکار آنکھوں سے اسے بہ غور دیکھا اور مطلوبہ اشیا فراہم کرنے لگا۔

ایڈم نے سگریٹ کے پیکٹ اور لائٹ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیے اور بوتل بائین ہاتھ میں اٹھالی۔ دائیں ہاتھ سے وہ بتایا پیسے سینٹے ہوئے بولا۔

”تم سے پہلے یہاں کون کام کرتا تھا؟“ فحشی سے نوجوان نے ایک مرتبہ پھر ایڈم کا سر سے جھر تک جائزہ لیا، پھر اپنی جسامت کی طرح باریک سی آواز

میں بولا۔

”میری!“ اس کی آواز میں نسوانیت سی تھی۔ ایڈم کو ہمیشہ ایسے لوگوں سے چڑھ جاتی تھی۔ اس نے بے زاری سے نوٹوں والا ہاتھ ہلایا۔

”میں سانتھا کروڑ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ فحشی نوجوان بری طرح چونکا۔ ایڈم نے اس کے چوکنے کو بھی محسوس کیا اور اس کی انکسیرے کرتی ہوئی نظروں کو بھی۔

”سانتھا کروڑ..... وہی، جسے ڈھائی تین سال قبل ایک رات سوتے میں قتل کر دیا گیا تھا؟“ اس مرتبہ ایڈم بری طرح چونکا۔

”سانتھا کروڑ تو ایک ٹھنڈی طبیعت کی مالک لڑکی تھی۔ اسے کسی نے کیوں قتل کر دیا؟“ فحشی نوجوان نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے ایڈم کو دیکھتا رہا۔

”سانتھا کے قاتل کا کوئی سراغ ملایا یہ کیس داخل دفتر ہو گیا؟“ فحشی نوجوان نے دیکھا کہ اس کا سرخ چہرہ تیزی سے

نارل ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح حیران اور افسردہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”نہیں..... پولیس سانتھا کے قاتل کو تلاش کرنے میں ناکام ہی رہی تھی۔“ ایڈم نے ایک طویل سانس لیا۔ روپے جیب میں

ٹھونسٹا وہ اسے شکر یہ کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ”تو گویا سانتھا کا قصہ بھی ختم ہو ہی گیا۔ بے چاری سانتھا۔“

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے خود کھائی کی۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ اسے یاد آیا پہلی مرتبہ وہ سانتھا سے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ملا تھا۔ وہ دونوں پیدل سڑک کے کنارے چل رہے تھے کہ ایک مست ڈرائیور نے گاڑی سانتھا سے ٹکرا دی، ڈرائیور بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

سانتھا مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ سڑک دور دور تک خالی دیکھ کر ایڈم اس کی جانب بڑھ گیا۔ یہ اس کی فطرت نہیں تھی۔ وہ لوگوں کی مدد نہیں کرتا تھا مگر سانتھا چانے اسے کیسے ترس آ گیا تھا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا، وہ معمولی زخمی تھی۔ ایڈم کے قریب آتے ہی اس نے کہا۔

”وہ آوارہ گرد مجھے زخمی کر گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میری بائیں پنڈلی میں شدید چوٹ آئی ہے، میرا پاؤں

حرکت نہیں کر رہا ہے۔“

ایڈم پنچوں کے تل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”بلوٹ، میں دیکھتا ہوں۔“

اس نے سانتھا کی نرم اور سڈول پنڈلی کو اپنے ہمدے، کھردرے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا۔ سانتھا کراپنے لگی۔

”یہ ظاہر تو بڑی سلامت ہی لگ رہی ہے لیکن اگر تم زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہو تو میں ایسولینس کے لیے کال کر دیتا ہوں۔“

سانتھا نے درد برداشت کرنے کے لیے چھلاب دانٹوں تلے دبا رکھا تھا۔ کراپتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ اگر تم مہربانی کر کے مجھے سہارا دو تو یہاں سے تھوڑی دور ہی میرا قلیٹ ہے۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔“

ایڈم ایک لمحے کے لیے متذبذب نظر آیا۔ ”لیکن ہو سکتا ہے کہ میرا تجزیہ غلط ہو۔ واقعی بڑی ٹوٹ گئی ہو۔ اس طرح علاج نہ ہونے سے تکلیف بڑھ بھی

سکتی ہے۔“ سانتھا نے پھیلی کی پشت سے اپنی نم آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں میرا خیال ہے کہ تمہارا تجزیہ درست ہے۔ بڑی نہیں ٹوٹی ہوگی۔“ ایسا کہتے ہوئے اس کے لہجے میں امید سی تھی۔ ایڈم کو

محسوس ہوا کہ وہ اسپتال جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس نے کندھے اچکائے۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ اور سہارا دے کر اسے کھڑا کروا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

ایڈم چھٹ کا ایک مضبوط جسامت والا نوجوان تھا۔ اچھی صحت کی وجہ سے وہ کافی گرائنڈ مل نظر آتا تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں سانتھا پونے پانچ فٹ کی ایک نرم و نازک سی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔

ایک قدم ایڈم کے سہارے اٹھانے کے بعد وہ لڑکھڑا گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں سر اٹھا کر ایڈم کی طرف دیکھا۔

وہ خاموش کھڑا تھا۔ ”پلیز کوئی ٹیکسی روکو، میں چل نہیں پاؤں گی۔“ ایڈم نے اسے پھر بٹھا دیا۔ اگلے پانچ منٹ تک ٹیکسی تو کیا اس سڑک سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزری۔ ان دنوں یہ علاقہ

بالکل ویران ہوا کر رہا تھا۔ ایڈم تب تک اکتانے لگا تھا۔ اس نے سانتھا سے کہا۔

”تمہارا قلیٹ کتنی دور ہے۔ میں وہاں جا کر کسی کو بلا لاتا ہوں۔“

سانتھا اپنے گلابی ہاتھوں سے اپنی پنڈلی کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔ ایڈم کی نگاہ اس کے ہاتھوں سے چپک گئی۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

”قلیٹ زیادہ دور نہیں ہے مگر وہاں میں اکیلی رہتی ہوں اور میرا کوئی ہمسایہ بھی اس وقت وہاں نہیں ہوگا۔ وہ سب کام پر جا چکے ہوں گے۔“

ایڈم ایک دم اس پر جھکا۔ سانتھا کے لبوں سے ایک ہراساں سی سسکاری نکل گئی۔ اگلے لمحے وہ اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھائے سیدھا ہو گیا۔

”اب جلدی سے اپنے گھر کا پتا بتاؤ۔“ وہ اسے اٹھائے اٹھائے لمبے ڈگ بھرتا، بہت تیزی سے فاصلہ سمیٹ رہا تھا۔ سانتھا مارے حیرت کے گنگ ہو گئی۔

”اب پولوگی یا سپینک دوں تمہیں سڑک پہ۔“ ایڈم غصے سے چلایا تو اس نے بہت تیزی سے پتا بتا دیا۔ پانچ منٹ بعد وہ اسے لیے لفٹ میں سوار ہو چکا تھا کیونکہ سانتھا کا قلیٹ تیسری منزل پہ تھا۔

قلیٹ میں پہنچا کر ایڈم نے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ بنا کچھ پوچھے اس نے دودھ گرم کر کے ایک پین کمر اسے دی۔ وہ بہت شکر گزار نظر آ رہی تھی۔

”تمہارا نام کیا ہے بیڈسم؟“ ایڈم پہلی بار مسکرایا۔ ”میں انتظار کر رہا تھا کہ تم نے ابھی تک تعارف نہیں حاصل کیا۔ بہر حال میں ایڈم رش ہوں اور ان دنوں فارغ ہوں۔ جو بھی کام مل جائے کر لیتا ہوں۔ غیر شادی شدہ ہوں، کوئی گرل فرینڈ نہیں پالی ہے۔ بس یا اور کچھ؟“

سانتھا کھلکھلا کر ہنسی۔ ”تم بہت دلچسپ آدمی ہو تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور میری اتنی ہیلپ کرنے کا شکریہ۔ اب ایک ہیلپ میں بھی تمہاری کر سکتی ہوں۔“

وہ لمحے بھر کورکی۔ ایڈم اس کے پاس بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔

”میں تمہارے لیے جاب کا بندوبست کر سکتی ہوں اور اگر تم چاہو تو میرے ساتھ قلیٹ بھی شیئر کر سکتے ہو اور میں

سانتھا کروڑ ہوں، قریب ہی ایک فلنگ اسٹیشن ہے وہاں کیشٹر ہوں، مگر تو میرا تم دیکھ ہی چکے ہو۔“

یہاں سے ایڈم اور سانتھا کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ ایڈم اس شہر میں نووارد تھا، مگر آغاز میں ہی اسے سانتھا جیسی لڑکی مل گئی جس نے ایڈم کے تمام مسائل کو یا چنگی بجاتے ہی حل کر دیے۔

دوستی کی خالی بوتل اس نے قریبی ٹریش بکس میں ڈال دی اور گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔ گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے اس نے خود کلائی کی۔

”تو گویا چھ سال میں میرے پاس گاڑی اور اچھا بینک بیلنس آ گیا ہے۔۔۔۔۔۔ برا نہیں ہے۔ اتنے سالوں میں یہ بہتر پیش رفت ہے۔“

□ □ □

”ایڈم! اگر تم نے اب کوئی شرارت کی تو میں تمہیں لائٹری میں بند کر دوں گی۔“ پانچ سالہ ایڈم نے مصیبت سے ماں کی طرف دیکھا۔

”مگر ماں! میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔“

”تم نے ابھی میرے پرس میں سے پیسے چرائے ہیں۔ اب شرافت سے انہیں واپس رکھ دو، اور سنو اگر تم نے جم کے آنے پر کوئی غلط حرکت کی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی نہیں۔“

ایڈم نے برا سامنہ بنایا۔ ہاتھ مار کر اپنے بھورے بال بکھیر دیے اور ترجمی نظروں سے آئینے کے سامنے بیٹھی جلدی جلدی میک اپ کرتی اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

”مجھے وہ پسند نہیں ہیں ماں، آپ مجھے اتنی دیر کے لیے میرے دوست موش کے گھر چھوڑ دیں۔ آپ بھی خوش، میں بھی خوش۔“

جیڈ نے حیرت سے اپنے پانچ سالہ بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں، ہنسنے اور بات کرنے کا انداز بالکل اپنے باپ جیسا تھا، اس نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔

”کاش، مجھے تم سے اتنی محبت نہ ہوتی تو میں تمہارے باپ کا بدلہ تم سے لیتی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے تمہارے باپ سے کتنی نفرت ہے۔“

جیڈ کی آواز بہت مدہم تھی، ایڈم سمجھ نہیں پایا۔

”مام کیا کہہ رہی ہیں، مجھے سنا کی نہیں دیا۔“

جیڈ سنگار میز کے سامنے سے اٹھ گئی، ایڈم کا یہاں موجود نہ ہونا ہی بہتر تھا۔

”اپنے کھلونے لے لو۔ میں تمہیں موش کے گھر چھوڑ

آتی ہوں۔“ ایڈم نے خوش خوش اپنے کھلونے سیٹے اور اس کے ساتھ چل دیا۔ اسے موش کے گھر چھوڑ کر وہ واپس گھر آ گئی۔

اسے بے چینی سے جم کا انتظار تھا۔ اس نے فون پر بتایا تھا کہ اس کی بہن کا ممکنہ قاتل آج صبح اس کے فلنگ اسٹیشن پر آیا تھا۔ جم کی بہن، جیڈ کی گہری دوست بھی تھی، وہ دونوں اس کے قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے بے چین تھیں۔

پونے تین برس قبل جب سانتھا قاتل ہوئی تھی تو جیڈ اپنی خالہ کے ہاں نیویارک گئی ہوئی تھی اور سانتھا کا بھائی جم اپنی جاب پر مشی کن میں تھا۔ پہلے وہ دونوں بہن بھائی میساچوسٹس کے ایک دور افتادہ علاقے میں اکٹھے رہتے تھے۔ انہوں نے وہیں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ابھی وہ ہائی اسکول پاس نہیں کر پائے تھے کہ ماں نے دوسری شادی کر لی۔ ماں کا دوسرا شوہر امیر آدمی تھا۔ اس لیے ماں نے بخوشی ان دونوں کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔

مسٹر کروڑ نے بھی پہلی بھوی کو چھوڑ کر ایک قدرے امیر مطلقہ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ اس مطلقہ کی بیٹی جیڈ نے غصے میں آ کر مسٹر کروڑ کے بچوں سے راہ ورسم پیدا کر لی، وہ سب ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ دوستی اتنی مضبوط ہو گئی کہ جیڈ کو اپنی نفرت اور غصے سب بھول گیا۔ ان کی دوستی اتنی پائیدار تھی کہ اب سانتھا کے قاتل کے بعد بھی وہ اس کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتی تھی۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے جم آ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح لمبے، مگر جیڈ کے انداز میں قدرے بے رخی سی تھی۔ جم نے یا تو محسوس نہیں کیا یا پھر جتنا یا نہیں۔

”چائے لوگے یا کافی؟“ اس نے ایک طرف بیٹے ہوئے پوچھا۔ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”نہ چائے نہ کافی، اس کے علاوہ جو مرضی پلا دو۔“

اس کی مکار آنکھوں میں مخصوص چمک لہرائی تھی۔

”نہیں تم بہت جلدی آؤٹ ہو جاتے ہو، جبکہ میں قاتل کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوں، اس لیے کافی ٹھیک رہے گی۔“

جم نے کاندھے اچکا دیے چند لمحوں بعد جیڈ کچن سے کافی لیے برآمد ہوئی۔ شاید وہ پہلے ہی سے تیار کر چکی تھی، دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔

”اب جلدی سے سب کچھ بتا دو۔ ویسے جب پولیس اس کیس کو داخل دفتر کر چکی ہے تو ہمیں اب کیا تکلیف ہے کہ ہم اس کے پیچھے خوار ہوتے پھریں۔“ اس کے انداز میں کچھ

بے زاری سی تھی۔ جم نے بغور دیکھا پھر زور دے کر بولا۔

”ہمیں ضرورت ہے کیونکہ تم وہ نہیں جانتیں جو میں جانتا ہوں۔“

جیڈ نے اس کے جواب میں خاموش رہتا ہی بہتر سمجھا۔ جم قدرے آگے کو جھکا۔

”تم جانتی ہو وہ کون ہے؟“ جیڈ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”خواتواہ کا سسپنس مت پھیلاؤ، جو بات ہے اب رکے بغیر کہ دو۔ آدھے گھنٹے کے بعد مجھے ایڈم کو اس کے دوست کے گھر سے لینے کے لیے جانا ہے۔“

”اوکے۔۔۔۔۔۔ اوکے۔ ناراض کیوں ہوتی ہو، تو میں بات کر رہا تھا سانتھا کے بوائے فرینڈ ایڈم کی۔ وہ شاید آج ہی یہاں آیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ اس کے سانتھا کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔ پھر سانتھا نے اپنی انشورنس پالیسی بھی اس کے نام کر دئی تھی اور تمہیں یاد ہوگا کہ پولیس کافی عرصے تک ایڈم کی طرف سے اس پالیسی کے کلیم کا انتظار بھی کرتی رہی تھی۔ کیا تم سوچ نہیں سکتیں کہ وہ ایک مرتبہ پھر سانتھا سے قائمہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اب وہ پالیسی کلیم کرے گا یا ہو سکتا ہے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ ایسا نہ کرے۔“

اس نے لمحے بھر کو رک کر جیڈ کے تاثرات دیکھے پھر بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

”وہ اچانک امیر کیسے ہو گیا ہے؟ اس کے پاس اپنی گاڑی ہے، اس کی کلائی پر قیمتی گھڑی بندھی تھی اور اس کے والٹ میں بڑے نوٹ تھے اور۔۔۔۔۔۔“

جیڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں سمجھ نہیں پا رہی کہ تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کر رہے ہو؟ تمہاری گفتگو بہت ابھری ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم خود بھی نہیں جانتے کہ تمہیں مجھ سے کیا کہنا چاہیے۔“

جم نے سنجیدگی سے جیڈ کی بات سنی اور ایک بڑا گھونٹ کافی کا لے کر کب داپس میز پر رکھ دیا۔ چند لمحے وہ یوں سامنے کی طرف دیکھتا رہا جیسے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہا ہو۔ پھر اس نے کھار کر گلا صاف کیا اور مختاطہ انداز سے بولا۔

”دیکھو جیڈ، میں اس مرتبہ صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ہمیں رقم کی ضرورت ہے، ایک اچھا گھر اور اپنا فلنگ اسٹیشن بنانے کے لیے اور ایڈم کی بہتر پرورش کے لیے۔ ہم اگر ذرا ہوش مندی سے کام لیں تو یہ رقم ہمیں مل سکتی ہے۔“

جیڈ نے قدرے آگے جھٹکتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

”مگر کیسے؟ ایڈم قتل کا اعتراف کیسے کرے گا جبکہ۔۔۔۔۔۔“ جم نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ باتوں کو بار بار دہرایا مت کرو، ایڈم سے قتل کا اعتراف ہمیں اپنی عقل مندی سے کروانا ہے اور تم بھی اس بات کو ذہن میں رکھنا کہ سانتھا کا قاتل ایڈم ہے، صرف ایڈم۔“

آگے کو جھکی ہوئی جیڈ بے ساختہ گہرا سانس بھر کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔ مگر وہ پوری طرح جم کی طرف متوجہ تھی۔ اس کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ذہنی طور پر جم کی بات سے اتفاق کر چکی ہو۔

”اس وقت میں جا رہا ہوں، کوئی مناسب پلان تیار کر کے ہم ایڈم سے قتل کا اعتراف کرائیں گے اور اسے قانون کے شکنجے سے بچانے کے لیے رقم کا تقاضا کریں گے کیونکہ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا کر ہمیں سانتھا تو مل نہیں سکتی تو کیوں نہ کوئی قائمہ ہی حاصل کر لیں۔“

”سوچ لو، جم کہیں پھنس نہ جائیں، پتا نہیں ایڈم کس قسم کا شخص ہو، پھر میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔“

جم نے اسے تسلی دی۔

”فکرت کرو، تمہیں بھی دکھا دوں گا اور مجھ پر یقین رکھو۔ تم جانتی ہو کہ میں بہت اچھا منصوبہ ساز ہوں۔“

جیڈ نے خاموش رہنے پر اکتفا کیا، جم اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

”پندرہ منٹ ابھی باقی ہیں اور یہ وقت صرف میرا ہے۔“ جیڈ نے اپنے اندر اٹھتی نفرت اور طیش کی لہر کو بے مشکل دبایا تھا لیکن وہ ابھی اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ جم کی مخالفت مول لیتی، اسے اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا تھا۔

□ □ □

ایڈم نے ایک متوسط ہوٹل میں کرا کر اپنے پر لے لیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے ایک مرتبہ پھر سانتھا یاد آئی۔ سانتھا ایک ایسی لڑکی تھی جس نے ایڈم کو بے تحاشا چاہا تھا، مگر ایڈم اسے بھی چھوڑ گیا تھا۔

وہ کوئی نارمل انسان نہیں تھا۔ اس کی ایک نفسیاتی گمراہی نے اسے سیلابی بنا دیا تھا۔ وہ ایک سال سے زیادہ بھی کسی جگہ نہیں ٹکنا تھا۔ ہمیشہ ایسی گمناہ نوکری کرتا کہ اس کے دہاں سے غائب ہونے کی کبھی کسی کو تشویش نہیں ہوتی تھی۔

وہ ایک عام سا گمناہ شخص تھا مگر اس کے کام گمناہ نہیں تھے۔ ایڈم ایک جرائم پسند شخص تھا۔ اس وقت وہ 36 برس کا تھا، پہلا جرم اس نے پندرہ برس کی عمر میں کیا تھا گویا اسے

جرائم کی دنیا میں اکیس سال گزر گئے تھے اور وہ ایک پختہ کار مجرم بن چکا تھا۔

اس کے جرائم مخصوص نوعیت کے ہوتے تھے، وہ ہمیشہ عورتوں کو شکار بناتا تھا۔ سبھی ہوئی ہر اس عورت کو دیکھ کر اسے تسکین ملا کرتی تھی۔ وہ اس لذت کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ سال میں ایک مرتبہ لازماً کسی عورت کو ہر اس سال کرتا تھا۔ عورت کے ساتھ اس کے ایسے سلوک کی وجہ سے ایڈم کی سخت گیریاں جو ایڈم کو بلا دروغی مارا پٹا کرتی اور سرورراتوں میں دو گھنٹے کے لیے اسے بالکونی میں باندھ دیتی تھی۔ اس کے ایسے سلوک سے ایڈم کی نفسیات بگڑ گئی اور وہ عورت کے معاملے میں اذیت پسند ہو گیا تھا۔

ہوٹل کا کراٹھیک ٹھاک ہی تھا۔ ایڈم نہانے کا ارادہ کر کے کپڑے نکالنے لگا۔

”دو دنوں میں مجھے فیصلہ کر لینا چاہیے کہ مجھے اب اور کس شہر میں جانا ہے۔“

اکیس سال جرائم کرنے کے باوجود وہ ایک مرتبہ بھی پکڑا نہیں گیا تھا کیونکہ اس نے اپنے لیے کچھ اصول بنائے تھے اور ان اصولوں کی پاسداری وہ بڑی شدت سے کرتا تھا۔ ان اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ وہ جس شہر میں واردات کر لیتا تھا دوبارہ بھی وہاں کا رخ نہیں کرتا تھا مگر آرٹلڈ بے ایک ایسا شہر تھا جس میں وہ دوبارہ آکر اپنے طور پر پرسکون تھا کہ اس بدلے ہوئے حلیے میں کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا لیکن اسے علم نہیں تھا کہ اسے پہچانا جا چکا ہے اور اس کے لیے پھندا بھی تیار کر لیا گیا ہے۔

دروازے پر ہونے والی دستک میں برہمی نمایاں تھی۔ جیڈ نے دانت پیستے ہوئے دروازہ کھولا مگر جم پر نگاہ پڑتے ہی اس کے تاثرات میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی، جبکہ جم کے چہرے پر برہمی نمایاں تھی۔ ”جو چاہی تم نے مجھے دی تھی وہ اس لاک کو کھولنے میں ناکام رہی ہے۔“ اس کا لہجہ پھنکارتا ہوا تھا جیڈ ہلکا گئی۔

”وہ..... وہ جم دراصل لاک خراب ہو گیا تھا اس لیے تبدیل کر دیا ہے مجھے جلدی تھی اس لیے تمہیں چاہی نہیں دے سکی۔“

جم نے ایک خاموش نظر سے اسے دیکھا اور ایک طرف سے گزر کر اندر داخل ہو گیا، وہ اس کے پیچھے آئی، جم صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے اکتا گئی ہو، میں کافی عرصے سے نوٹ کر رہا ہوں کہ تم مجھ سے جان

چھڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

جیڈ کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی جواب طلبی کر لے گا۔ اسے کوئی مناسب جواب نہیں سوچ رہا تھا۔ سو اس نے درمیانی فاصلہ عبور کیا اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”اوہ جم! تم کس طرح کی باتیں سوچتے ہو، مجھے تم آج بھی اول روز کی طرح عزیز ہو۔“

اپنے الفاظ کی اہمیت بڑھانے کو اسے عملی مظاہرہ بھی کرنا پڑا۔ جم کے سنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے، یہ وقت بہترین تھا؟ جیڈ نے بھی اسے گویا نہیں۔

”لیکن مجھے تم سے شکوہ ہے..... تم کسی سارجنٹ کی طرح سوال کرتے اور کسی کھوسٹ بڈ سے کی طرح جرح کرتے ہو۔ تم میرے ساتھ اکثر اہانت آمیز سلوک کرتے ہو، کیا ایسا نہیں ہے؟“

جم ڈھیلے پڑ گیا، مدافعتانہ لہجے میں بولا۔ ”سوری ڈارلنگ! دراصل میں تمہارے معاملے میں پوزیٹو بہت ہوں، لیکن اب تمہیں مجھ سے ایسی شکایت نہیں ہوگی۔ میں پورا خیال رکھوں گا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اوکے۔ میں بننے کو کچھ لاتی ہوں، تم بتاؤ کہ اس ایڈم کے بارے میں اب کیا سوچا ہے تم نے؟“

”ہاں..... وہ۔“ جم نے اپنے بال کھجائے۔ ”دراصل یہ اتنا سیدھا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے۔ اسے بلیک میل کرنے میں خطرہ بھی ہے، وہ ہمیں بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”کافی میکر کا پلگ ہاتھ میں پکڑے وہ حیرت سے اس کی طرف مڑی۔“

”تو اب تم اپنے منصوبے سے دست بردار ہو گئے ہو؟“

وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ جیڈ نے اپنے تاثرات چھپانے کو جلدی سے رخ پھیر لیا۔ اس کا بچن اسی کرے کے ایک کونے میں سیٹ کیا گیا تھا اور اس کے تاثرات جم بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

”بدھل گدھ۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

جننے کے بعد جم نے ایک طویل جمائی لی پھر بولا۔ ”جیس، بلکہ منصوبہ بدل دیا ہے، کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔ تم روز خبر سنتی ہوگی کہ ساہ فام، رات کو اکیلے آدی کو مار کر اسے لوٹ لیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی پکڑے نہیں گئے، رات کو کون دیکھتا ہے کہ یہ لوگ بلیک تھے یا وائٹ۔“

جیڈ خاموشی سے کافی بیٹاتی رہی۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔ ”سانتا اس شخص کو بہت پسند کرتی تھی، وہ اکثر اس کی باتیں نہیں بیٹاتی تھی۔ وہ باتیں اب ہمارے کام آسکتی ہیں، مثلاً وہ کہتی تھی کہ ایڈم ایک اصول پسند آدمی ہے، وہ روزانہ رات کو داک پہ جاتا ہے۔ وہ کوئی بھی اسلحہ چلانا نہیں جانتا۔ وہ جلدی کسی سے فری نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی رشتہ دار اور دوست نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔“

جیڈ نے ٹرے لاکر چھوٹی میز پر رکھی اور سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”یہ سب باتیں میں نے ہی تمہیں بیٹائی ہیں، شاید میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ ایک نکل جیسا طاقتور مرد ہے اور اسے غصہ بھی بہت جلد آتا ہے اور میرا خیال ہے کہ تم جانتے ہو کہ غصے میں آدمی کی طاقت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ایسے میں کیا تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ اسے قتل کیسے کیا جائے گا؟“

”اور تم بھی یقیناً جانتی ہوگی کہ رپوالور کی ایک انجی کی کوئی چھفٹ کے بندے کو بہ آسانی مار سکتی ہے۔“ جم کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

”تو پھر یہ قتل کسی بلیک کے کھاتے میں نہیں جائے گا کیونکہ وہ ہمیشہ چاقو یا پھندا وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ دوسری بات فائر کی گواہ سے کوئی بھی متوجہ ہو سکتا ہے۔“ وہ زور دے کر بولی۔

اگلے پورے گھنٹے تک وہ قتل کے طریقے اور اس کی جزئیات پر بحث کرتے رہے۔ انہوں نے چھوٹی سے چھوٹی بات پر پوری توجہ دی اور ایک فول پروف طریقہ وضع کر لیا۔ اس طرح قتل کرنے سے ان کے پکڑے جانے کا امکان پانچ فیصد سے بھی کم تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ایڈم کی نگرانی کا طریقہ کار طے کیا۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد جم رخصت ہو گیا۔ جیڈ نے آزادی کے احساس کو بہت اچھی طرح محسوس کیا۔ اس نے ناگہن پھیلا کر سرمونے کی پشت سے نکا دیا اور سکون سے اپنے حالات کا جائزہ کرنے لگی۔

جم اس کی بے زاری اور نفرت کو جان گیا تھا، وہ جیڈ ہمیں خوبصورت اور زندگی سے بھرپور لڑکی پر ہمیشہ کے لیے قبضہ جمانا چاہتا تھا جبکہ جیڈ اس سے شدید نفرت کرتی تھی تو گویا اب وہ دقت آگیا تھا جب جیڈ کو اس سے جان چھڑا لینا چاہیے تھی۔ اس کے پاس بہترین منصوبہ تھا، وہ سانتا کے منہ سے ایڈم کی اتنی تعریفیں سن چکی تھی کہ غائبانہ طور پر اس کی پرستار بن گئی تھی، تو اسے قتل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

تھا، وہ جم کے تمام معمولات سے آگاہ تھی، وہ رات کو اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتا تھا۔ ایسی مغللوں میں اسے دیر بھی ہو جاتی تھی۔ اگرچہ اس کا قلیٹ وہاں قریب ہی تھا پھر بھی راستے میں ایک سوڑا آتا تھا۔ اگر جیڈ اس موڑ پر چھپ جاتی تو جم جیسے مخفی شخص کو پسندے کے ذریعے مارنا کچھ مشکل نہیں تھا، اس کے بعد جم کی دولت چرا کر وہ بہ آسانی ایڈم کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار سکتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے جم کو مارنے میں دیر کر دی تو وہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی پر اسے قتل کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

اس نے حتی طور پر اپنے منصوبے پر نظر ثانی کی اور جم کو آئندہ رات قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔

یونہی بے مقصد ادھر ادھر گھومتے پھرتے اس نے گاڑی کا رخ ساحل کی طرف پھیر دیا۔ آرٹلڈ بے کے تقریباً تین اطراف سمندر تھا۔ اگرچہ سمندر کے اندر بڑھا ہوا حصہ کل رقبے کا نصف بھی نہیں تھا، تاہم تین طرف سے سمندر میں گھرا ہونے کی وجہ سے چھٹی کے دلوں میں یہاں کافی رش ہوتا تھا۔ اتوار کی وجہ سے اس حصے میں کافی لوگ نظر آرہے تھے۔ ایڈم نے گاڑی کافی فاصلے پر ایک طرف پارک کر دی اور خود گیلی ریت پر چہل قدمی کرنے لگا۔ دھوپ میں ریت کے ذرے شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔

اکثر عورتیں اور مرد لباس کے بوجھ سے چھٹکارا پائے ریت پر لیٹے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ بہت سے بچے بھی کھیل کود میں مگن تھے، ایڈم سب کو دیکھتے ہوئے خاموشی سے ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی لڑکی پہ پڑی۔ وہ بری طرح چونکا۔

لڑکی سوئنگ کاسٹیوم پہنے ہوئے تھی، اس کے سنہرے بال حریاں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لڑکی کی ایڈم کی طرف پشت تھی، وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑکی سے کچھ فاصلے پر وہ اس کے سامنے سے گزرا۔ ستر فیصد تک وہ اس کی ماں سے مشابہہ تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر ایسی جگہ جا کھڑا ہوا جہاں سے وہ تو لڑکی کو دیکھ سکتا تھا مگر لڑکی اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

قریباً نصف گھنٹے کے بعد لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے اپنا اسکرٹ پہنا اور ایک طرف کھیلتے بچوں کی طرف چلی گئی۔ اس نے چند لمحے بچوں سے بات چیت کی پھر آگے بڑھ گئی، دو بچے بھاگ کر اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔

”یعنی تمہارے پاس ایک کے بجائے دو ایڈم ہیں۔“
وہ بڑبڑایا اور کچھ فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے جانے لگا، اس کی آنکھوں میں وہ مخصوص چمک آگئی تھی جو شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھوں میں آتی ہے۔

لڑکی پیدل ہی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا، تین چار فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ اس علاقے میں داخل ہوگئی جس میں دو کمروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے ہٹ بنے ہوئے تھے۔ اپنے تعاقب سے بے خبر وہ تینوں خوش گلیاں کرتے چلے جا رہے تھے۔ درمیانی فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کی گفتگو سننے میں ناکام رہا تھا۔

وہ تینوں ایک ہٹ کے سامنے رک گئے۔ اسی وقت ہٹ کا دروازہ کھول کر ایک تیس تیس سالہ شخص نے باہر جھانکا۔ بچے اچھلتے کودتے اندر چلے گئے۔ لڑکی بے تکلفی سے اس شخص کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ چند منٹ بعد اسے ہاتھ ہلا کر وہ آگے بڑھی تو ایڈم نے بھی اپنے قدم بڑھادیے، تین چار ہٹ پر ڈر کر وہ ایک سرخ پیٹ ڈالے ہٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی، جب سے چابی نکال کر اس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ ایڈم بہ ظاہر لا تعلقی سے چلتا ہوا اس ہٹ کے پاس سے گزرا، اس نے کن اکھیوں سے دیکھا، دروازے پر نیم پلیٹ موجود تھی اس پر ”مس جیڈ مارٹن“ درج تھا۔ ایڈم تھوڑا چکر کاٹ کر واپس ساحل کی طرف چل پڑا، اسے وہاں سے اپنی گاڑی لینی تھی۔

❖ ❖ ❖

جیڈ کی زندگی میں یہ رات فیصلہ کن تھی۔ آج اسے جم سے چھٹکارا پانے کے لیے عملی اقدام کرنا تھا۔ اس نے اپنا کمرابند کر کے پھندا ڈالنے میں تیزی اور مہارت پیدا کی تھی۔ رات کے لیے لمبا سیاہ کوٹ، ایک مردانہ ٹوپی، دستانے اور پھندا اس نے پہلے سے تیار کر کے رکھ لیے تھے۔ یہ سب کچھ وہ ایڈم سے چھپا کر کر رہی تھی کیونکہ وہ ہر چیز کے متعلق سوال بہت کرتا تھا اور جیڈ کو ڈر تھا کہ اگر پولیس بعد میں اس کے گھر آئی تو ایڈم گران کے سامنے بھانڈا نہ پھونڈ دے۔

رات کے تصور سے ہی ایک سنسنی سی اس کے جسم میں دوڑ جاتی تھی، وہ اپنی اور ایڈم کی پسند کا ڈر بنا رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اگر وہ جم کو اپنی مشق اور مہارت کے باوجود شکار کرنے میں ناکام رہی تو وہ اسے زندہ واپس نہیں آنے دے گا۔ ڈر تیار کر کے اس نے ایڈم کے ساتھ ایک مووی دیکھی۔ خوشگوار ماحول میں دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔

ایڈم گراں کا خوشگوار موڈ دیکھ کر بہت خوش تھا، کھانے کے بعد تھوڑی دیر تک دونوں نے بیڈ پر بناوٹی کشتی لڑی اور خوب قہقہے لگائے۔ ایڈم گرانے بازو اس کے گلے میں حائل کر کے بہت لاڈ سے کہا۔

”مام! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں، آپ سب سے اچھی مام ہیں۔“ جیڈ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کئی مرتبہ دالہا نہ اپنے سینے کو چوما اور بولی۔

”میری جان! میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔“ پیار کا یہ مظاہرہ شاید بہت دیر تک جاری رہتا لیکن جیڈ کی نظر دوبارہ گہری پر پڑ گئی۔ اس کے پاس نام کم تھا۔ اس نے آہستگی سے ایڈم کو خود سے الگ کیا اور بولی۔

”مامی چائٹ! اب تمہارے سونے کا وقت ہو گیا ہے، تم اپنے کمرے میں چلو میں تمہارے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔“

ایڈم کو یہ بات پسند تو نہیں آئی تھی مگر وہ ماں کا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا سو چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جیڈ نے ادون میں دودھ رکھا، خیند کی ایک گولی پیس کر اس میں ملائی اور اسے لے کر ایڈم کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بیڈ کے پاس فرش پر بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ جیڈ نے دودھ کا گلاس اسے تھما دیا۔ ایڈم نے ایک گھونٹ بھرا پھر براسا منہ بنا کر بولا۔

”یہ خراب دودھ ہے۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں اسے پی لوں تو مجھے چاکلیٹ لا کر دیں۔“

جیڈ اس کی چالاکی پر مسکرائی اور چاکلیٹ لینے چلی گئی۔ ایڈم گہری کھار رات کو چاکلیٹ کھانے کے لیے اسی طرح بہانے کیا کرتا تھا۔ جب وہ واپس آئی تو ایڈم گرانے کا خالی گلاس میز پر رکھ رہا تھا۔ جیڈ نے چاکلیٹ اسے تھما دی۔ اپنے سامنے اسے چاکلیٹ کھلا کر دانت صاف کر دائے اور پھر اسے مکمل اوڑھا کر اس نے لائٹ بند کر دی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ بیروں میں جا کر بیڈ پر، الماری کھول کر کوٹ، دستانے، ہیٹ اور پھندا نکالا۔ اسے یقین تھا کہ اب تک خیند کی گولی کام دکھا چکی ہوگی، تاہم وہ جانے سے قبل ایک مرتبہ پھر تسلی کر کے جانا چاہتی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر ذرا سا جھانکا، ایڈم گرانے پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر واپس آگئی۔

اپنے کمرے میں داخل ہو کر وہ جونہی بیڈ کی طرف بڑھی۔ اس پر عقب سے کسی نے چھلانگ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتی، حملہ آور نے ایک بازو اس کے

گلے میں پھنڈے کی طرح ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بازو کا پکڑ لیا۔ اس کی پشت حملہ آور کی طرف تھی اور وہ اتنی بری طرح اس کے گلے میں جکڑی جا چکی تھی کہ حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ گلے پر دباؤ کی وجہ سے اس کی سانس رک رہی تھی۔ بچی بچی آواز میں بولی۔ ”کیا تمہیں جم نے بھیجا ہے؟“ اگرچہ وہ حملہ آور کو ایک نظر بھی دیکھ نہیں سکی تھی مگر اس کے ذیل ڈول سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جم نہیں تھا اور اس شہر میں جم کے علاوہ اس کا کوئی ایسا دشمن نہیں تھا جو اس کی جان کے ورے ہو تا۔ حملہ آور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تمہیں جم نے ہی بھیجا ہوگا۔ وہ گھنیا آدمی جب سامنتھا کو قتل کر سکتا ہے تو مجھے کیوں نہیں۔“ اس کے لہجے میں عجیب طرح کا یقین تھا، اسے لگا اجنبی چونکا تھا۔

”سامنتھا کون تھی؟“

وہ اس طرح بولا جیسے دانت بھیج رکھے ہوں۔ جیڈ ذرا سا کسماسکی۔

”پلیز بازو کو ذرا ڈھیلا کرو میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”میں بتاتی ہوں سب کچھ۔“

اس کی درخواست منظور کر لی گئی تھی۔ جیڈ نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔ وہ حملہ آور کی گرفت سے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ جسمانی طور پر اس سے بہت طاقتور ہے۔ اس لیے اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی۔ لیکن اس کا ذہن تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچ رہا تھا۔

”دیکھو تم ایک کرائے کے قاتل ہو۔ جم نے تمہیں جتنی رقم میرے قتل کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے، میں تمہیں اس سے زیادہ دوں گی، تم میرے ساتھ ڈیل کر لو۔“

حملہ آور کو اس کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے پھنڈے والے بازو کو جھٹکا دیا۔ جیڈ کے منہ سے بچی بچی چیخ نکلی گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی گردن ٹوٹنے ٹوٹنے لگی ہو، حملہ آور غرایا۔

”جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ اس کی آواز حسب سابق تھی۔

”سامنتھا کروڑہ جم کی بہن تھی، مگر بہن لیکن جم نے اسے قتل کر دیا تھا۔“

اگلے لمحے حملہ آور نے اسے اوندھے منہ بیڈ پر گرا دیا۔ جیڈ کی گردن سے پھندا نکل گیا تھا مگر اس کے پشت پر کیے ہوئے ہاتھ ابھی تک حملہ آور کے گلے میں تھے۔ اگلے ایک منٹ میں حملہ آور اس کے ہاتھ پھنڈے والی رسی سے مضبوطی کے ساتھ باندھ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر کوٹ

دوسری جنگ عظیم کے ایک سابق فوجی کا کنا بچہ کہ وہ دیہات سے شہر آ رہا تھا کہ اسے کچھ کھانا ملے گا۔ اس نے لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے کہا: ”کرسی پر بیٹھ جا اور اپنی قمیص اتار دو۔“

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے کہا: ”ٹھیک ہے، تمہیں فوج میں بھرتی کر لیا گیا ہے، قمیص دوبارہ پہن لو۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”تم نے میرا معائنہ تک کر لے کی زحمت گوارا نہیں کی؟“

”معائنہ کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا: ”جو کچھ میں نے کہا وہ تم نے سنا، اس لیے تمہارے کان ٹھیک ہیں۔ تم نے کرسی دیکھی اس لیے آنکھیں ٹھیک ہیں۔ تمہارے جسمانی اعضا بھی ٹھیک ہیں کیوں کہ تم قمیص اتار سکتے ہو اور سینہ کتے ہو، چل سکتے ہو کرسی پر بیٹھ سکتے ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہارے پاس اتنی عقل ہے کہ اگر ڈر سن کر اس پر عمل کر سکتے ہو۔“

پینٹ اور دستانے نیچے گرا دیے۔ اس کے بعد جیڈ کو سیدھا کر کے بٹھا دیا اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے درمیان محض دو قدم کا فاصلہ تھا، اب حملہ آور کے ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا جس کا رخ جیڈ کی طرف تھا۔

جیڈ نے پہلی مرتبہ اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ مضبوط ہاتھ بیروں کا، ایک چھٹ کے لگ بھگ تھومند شخص تھا، وہ ایک عام سالانگ کوٹ پہنے ہوئے تھا جو عموماً سردی میں پہنا جاتا ہے۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی، جیسی منخلے نوجوان پہنتے ہیں۔ اس سے سارا چہرہ چھپ جاتا ہے اور آنکھوں کی جگہ سوراخ ہوتے ہیں۔ ٹوپی نقاب کا کام دے رہی تھی۔ جیڈ اس کا چہرہ دیکھنے میں ناکام رہی تھی۔ ابھی اتنی سردی نہیں تھی کہ ایسی ٹوپی کا استعمال کیا جاتا۔ اسے یقیناً خود کو چھپانے کے لیے اوڑھا گیا تھا۔ اس نے حملہ آور کی سوراخوں میں سے جھانکتی براؤن آنکھوں سے اس کے ارادوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، مگر وہ کچھ اخذ نہ کر سکی۔ وہ خاموش بیٹھا ہوا اسے دیکھ رہا تھا لیکن وہ یہ دیکھ چکی تھی کہ اس کی آنکھیں اور پاؤں اضطراری انداز میں حرکت کر رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ تب حملہ آور کی آواز ابھری۔

”اس قتل کے بارے میں ہر چھوٹی سے چھوٹی بات مجھے تفصیل سے بتاؤ، کچھ بھی چھپانے یا تبدیل کرنے کی کوشش

مت کرنا۔ ہو سکتا ہے اس طرح تمہارے بچ جانے کا کوئی چانس نکل آئے ورنہ.....“

اس کا لہجہ جتنی تھا۔ جیڑ سمجھ گئی کہ وہ اپنے الفاظ پر عمل بھی کرے گا۔ اس نے لمحے بھر کو رک کر سوچا۔ اسے تذبذب میں دیکھ کر نقاب پوش غرایا۔

”میرے پاس وقت کم ہے اور ہاں، یہ جان لو کہ میں آدمی سے زیادہ کہانی سے پہلے ہی آگاہ ہوں۔ تمہاری غلط بیانی یا جھوٹ کو آسانی سے پکڑ سکتا ہوں اور اسی حساب سے تمہاری زندگی کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔ اب فوراً شروع ہو جاؤ۔“

اور وہ واقعی شروع ہو گئی۔

”دیکھو میرا اس میں کوئی قصور نہیں تھا، جم نے مجھے ورغلا لیا تھا۔ میں شروع سے سناٹی ہوں۔ میں، سانٹھا اور جم تینوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ ہماری اچھی دوستی تھی، جم اور سانٹھا نے صرف ہائی اسکول تک بڑھا۔ اس کے بعد انہوں نے اسکول چھوڑ دیا، وہ اپنی ماں کے گھر میں رہتے تھے لیکن ان دنوں ان کی پاں اپنے شوہر سے الگ ہو کر واپس اس گھر میں آنا چاہتی تھی۔ اس لیے سانٹھا اور جم اپنے لیے نوکری تلاش کر رہے تھے۔“

وہ رکی پھر ملتجائے انداز سے بولی۔

”پلیز، میرا حلق خشک ہو رہا ہے تھوڑا پانی پلا دو۔“

نقاب پوش نے انکار کے لیے منہ کھولا پھر اٹھ کر ساڑھ نیل سے گلاس اٹھا کر اس کے منہ سے لگا دیا، پانی پی کر وہ خود بخود شروع ہو گئی۔

”ایک دن اچانک ہی دونوں بہن بھائی گھر سے غائب ہو گئے۔ میں نے کئی مرتبہ ان کی ماں سے پوچھا مگر اسے خود کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہاں سے میں مٹی گن یونیورسٹی چلی گئی، دو سال بعد میری تعلیم مکمل ہوئی تو مجھے مٹی گن میں ہی جاب مل گئی۔ میں ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی، وہاں میرے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔“

جیڑ نے رک کر جھرجھری سی لی۔ نقاب پوش خاموش بیٹھا ہوا تھا، چھوٹے سے وقفے کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔

”میں اس حادثے کی وجہ سے نفسیاتی مریض بن گئی۔ میری جاب بھی ختم ہو گئی۔ ان ہی دنوں مجھے جم مل گیا۔ وہ دن رات میرا خیال رکھتا تھا۔ وہ اپنی جاب سے سیدھا میرے پاس آ جاتا تھا۔ ایک طرح سے اس نے میرے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہیں میرا بیٹا ایڈ کر پیدا ہوا۔ جم نے میرا

علاج کر دیا۔ جب میں قدرے ٹھیک ہو گئی تو مجھے احساں ہوا کہ ہم جیسا بد فعل لڑکا مجھے جیسی لڑکی کا حق دار نہیں ہو سکتا مجھے اس کی ہر بات سے نفرت تھی مگر میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔

ان ہی دنوں میں جم نے مجھے بتایا کہ اسے سانٹھا، سراغ مل گیا ہے۔ میں تمہیں بتانا بھول گئی ہوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں بہن بھائی مافیا سے ڈر کر بھاگے تھے۔“

وہ لمحے بھر کو رک کر جیسے مناسب الفاظ کا چناؤ کر رہی ہو۔ ”اصل میں وہ دونوں ایک سڑک سے ذرا فاصلے پر تھی میں تھے۔ سڑک پر سے مافیا کی گاڑی گزری۔ کسی طرح سے یا شاید غلطی سے ایک پاؤچ وہاں گر گئی۔ شاید اسے گاڑی کے نیچے چھپا یا گیا تھا۔ سانٹھا کی نظر اس پر پڑ گئی جم نے اس کے بتانے پر جا کر تھپی اٹھائی۔ اس میں دس دس گرام سونے کا پاؤچ ڈلیاں تھیں۔ تقسیم پر ان میں جھگڑا ہو گیا۔ دو ڈلیاں سانٹھا کے پاس تھیں جنہیں وہ دیکھ رہی تھی وہ اسی کے پاس رہیں باقی تین پہ جم نے قبضہ کر لیا، سانٹھا آدمی ڈلی کا مطالبہ کر رہی تھی مگر جم دینے پر تیار نہیں تھا۔ انہیں ایک دوسرے سے خطرہ محسوس ہوا اس کے علاوہ مافیا کا بھی ڈر تھا۔ اگرچہ یہ واقعہ ان کے گھر سے بہت دور پیش آیا تھا مگر مافیا والے اگر کسی کے پیچھے پڑ جائیں تو اسے قبر سے بھی نکال لاتے ہیں، اس خوف سے اسی رات دونوں نے ایک دوسرے سے لڑکر گھر چھوڑ دیا، جم مختلف جگہوں سے ہوتا ہوا مٹی گن پہنچ گیا اور سانٹھا جانے کہاں گئی۔“

اتنی لمبی بات کر کے وہ تھک گئی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔ نقاب پوش نے ایک جتنا ہی ہوئی نگاہ کلاک پر ڈالی، جیڑ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اپنا بیان پھر شروع کر دیا۔

”اپنے کسی دوست کے ذریعے اسے پتا چل گیا کہ سانٹھا بھی مختلف علاقوں میں گھومنے کے بعد آرلنڈ بے میں مقیم ہو گئی ہے۔ وہ سانٹھا سے سارا سونا واپس لینا چاہتا تھا اس لیے اس نے سانٹھا کو قتل کر دیا۔ پھر ہم یہاں آ گئے۔ مگر تلاش کے باوجود ابھی تک سونا نہیں ملا۔ شاید وہ اسے خرچ کر چکی تھی۔“

”تمہارے اور جم کے جھگڑے کی کیا وجہ ہے؟“

اتنی دیر میں پہلی مرتبہ اس نے سوال کیا تھا۔

”سانٹھا کا سونا جو نہیں ملا تھا جم کا اس کے بارے میں یہ خیال تھا کہ اسے میں نے چر لیا ہے۔ اس نے میرے گھر کی تلاشی بھی لی، مجھے ڈرا یا دھمکا یا بھی۔ اپنے طور پر بھی اس نے تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ وہ شاید اس

کے بعد میرے خلاف کوئی اور اقدام کرتا لیکن ایک دن اچانک سانٹھا کا بوائے فرینڈ ایڈم رش اسے نظر آ گیا۔ وہ کافی امیر ہو گیا ہے۔ جم کا خیال ہے کہ وہ سونا شاید ایڈم لے گیا تھا۔ اس لیے اب وہ اسے قتل کر کر اس کی ساری دولت ہتھیانا چاہتا ہے۔“

”اور تم اس وقت ایڈم کو قتل کرنے جا رہی تھیں؟“

جیڑ نے بے قراری سے پہلو بدلا۔

”نہیں، بلکہ میں تو اسے قتل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ اس نے ہونٹ بھیج لے، جلد بازی میں اس کے منہ سے ایک غلط بات غلط موقع پر نکل گئی تھی۔

”کیوں؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے زیو اور والے ہاتھ کو جنبش دی۔ جیڑ اس کی ان کہی دھمکی کو بخوبی سمجھ گئی، وہ بولا۔ ”اور ہاں، میرا جم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”میں..... میں سانٹھا سے اس کی تعریفیں سن کر اسے پسند کرنے لگی ہوں اور اگر وہ مجھے مل گیا تو میں اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔“

”مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تین تک گن کر میں تمہارے اس خوبصورت ماتھے میں ایک سرنگ بنا دوں گا۔“

نقاب پوش نے غرا کر کہا۔ جیڑ ہٹکائی۔

”مم..... مگر میں نے تو سب کچھ بتا دیا ہے پھر تم مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو، پلیز مم..... مجھے چھوڑ دو، میرا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے، اسے میری ضرورت ہے۔“

وہ بری طرح ٹھکیا نے لگی۔ نشانہ باندھتے ہوئے وہ سکون سے بولا۔

”تم نے قتل کا واقعہ بالکل گول کر دیا۔ حالانکہ تم برابر کی شریک تھیں، میں اب بھی کہتا ہوں سچ بولو۔ سچ ہی تمہاری زندگی کی ضمانت دے سکتا ہے۔“

جیڑ نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سی کھولنے کی اس کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ وہ اپنے بچاؤ کا کوئی طریقہ بھی نہیں سوچ سکی تھی۔ اس کے پاس زندگی بچانے کے اس آخری موقع سے فائدہ اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری۔

”جم نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں سانٹھا کو قتل نہ کر سکی تو وہ میرا بچہ مار دے گا۔ میں سانٹھا سے ملی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ میں نے اسے ثابت کرایا کہ میں اچانک اس سے ٹکرائی ہوں، میں دو دن تک اس کے گھر میں مقیم رہی۔ اس کے ہمایوں سے بھی ملی۔ دو دن بعد جانے سے پہلے میں نے

بہانے سے اس کے ہمایوں کو بتایا کہ میں جاب کے سلسلے میں مصروفیت کی وجہ سے دو ماہ تک نہیں آسکوں گی۔ اس کے ڈیڑھ ہفتے بعد میں خفیہ طور پر رات کو یہاں آ گئی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ کسی نے مجھے آتے نہیں دیکھا۔ میں نے کھنٹی بجائی، سانٹھا نے دروازہ کھول دیا، وہ میری اچانک آمد پر حیران تھی لیکن اسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے اچانک اس کا گلا پکڑ کر دبانا شروع کر دیا، وہ جیسے بیڑ پر گر گئی۔ چند لمحوں کے اندر ہی وہ مر گئی۔ میں نے سارے فلیٹ کی تلاشی لی مگر سونا نہیں ملا۔ کچھ پیسے اور ایک سونے کی انگوٹھی ملی تھی، وہ میں نے اٹھائی۔ دستاویز کی وجہ سے میرا کوئی فنگر پرنٹ نہیں لگا تھا۔ راتوں رات میں ڈرائیو کر کے واپس مٹی گن پہنچ گئی۔ میرے پاس گاڑی تھی جو جم نے اپنے کسی دوست سے لا کر دی تھی۔ قتل کے تیسرے روز جم بہ ظاہر سانٹھا سے ملنے آیا۔ پولیس سے اس نے سانٹھا کا سارا سامان حاصل کر لیا اور پولیس پر اس کے قاتلوں کو گرفتار کرنے کے لیے دباؤ ڈالتا رہا۔ پولیس اسے چوری کی واردات خیال کر رہی تھی۔ جس میں مزاحمت پر سانٹھا کو قتل کر دیا گیا تھا، کچھ عرصہ بعد اس کیس کو عدم پیش رفت کی بنا پر داخل دفتر کر دیا گیا۔ میں نے سب سچ بتا دیا ہے۔ اب پلیز مجھے قتل مت کرنا، میں مجبور تھی۔ میں اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہوں اور جم نے بچے کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔“

”ہینڈ ز اپ..... نہیں تو گولی مار دوں گا۔“

جیڑ اور نقاب پوش نے حیرت سے دیکھا۔ ایڈم گرا ہاتھ میں ریو اور لیے کھڑا تھا۔ نقاب پوش کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ اس لیے وہ اسے اندر آتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ جیڑ بری طرح چلائی۔

”ایڈمی فائر کر دو، فائر کر دو..... جلدی کرو۔“ وہ دیکھ چکی تھی کہ ایڈم گرا کے ہاتھ میں اس کا اصلی ریو اور تھا۔ اس وقت یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ ریو اور اس کے پاس کیسے آ گیا اور وہ نیند کی گولی کے باوجود جاگ کیسے گیا تھا؟

نقاب پوش نے اپنا پستول ہاتھ بڑھا کر اس کے سامنے کیا اور سکون سے بولا۔

”میرا بڑا پستول ہے تمہارا چھوٹا، اگر تم چاہو تو اپنے بدلے میرا لے سکتے ہو۔“

جیڑ کے منہ سے وحشت ناک چیخ برآمد ہوئی۔

”نہیں..... نہیں ایڈمی! اسے گولی مار دو ورنہ یہ ہم دونوں کو مار دے گا۔“ مگر یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ ایڈم سکون سے نقاب پوش کے قریب چلا گیا۔ جیڑ نے

”میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں، چھ سال سے۔ تم مجھے بھول سکتے ہو مگر میں نہیں۔ مجھے وہ تین دن آج بھی اسی طرح یاد ہیں جو تم نے میرے ساتھ گزارے تھے۔ وہ میری زندگی کا بدترین حادثہ تھا۔ میں نے تمہیں اس نشان سے پہچان لیا ہے۔“

اس نے ایڈم کے کان کی لو سے گردن کی طرف آتے تین انچ لمبے زخم کے مندل شدہ نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ رد رہی تھی، ایڈم کو بھی یاد آگیا۔ آرٹلڈ بے میں آنے سے پہلے وہ مٹی گن میں تھا۔ وہاں اسے جیڈ نظر آگئی تھی، وہ خاموشی سے اس کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا، پھر ایک دن اس کا چچا کیا اور خجری نوک اس کی پشت سے لگا کر اس کے ساتھ گھر میں چلا گیا۔ مقصد وہی تھا، عورت کو خوفزدہ انداز میں اپنے سامنے گڑگڑاتے ہوئے دیکھنا۔ جیڈ کے خوفزدہ ہونے کا انداز اسے اتنا پسند آیا کہ وہ ایک دن کے بجائے تین دن تک اس کے گھر میں گھسار ہا اور بھی تیزاب، کبھی بجلی سے اسے ہراساں کرتا رہا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے جیڈ کے گھر میں کتنا الجھائے کیا تھا۔ دفعتاً وہ کسی خیال سے چونکا۔ اس نے پہلے روتی ہوئی جیڈ اور پھر حیرت سے دیکھتے ایڈم کی طرف دیکھا۔ وہ چلائی۔

”تم درست سمجھو، اگر تم اپنی آنکھیں استعمال کرو تو دیکھ سکتے ہو کہ ایڈم میں تمہاری کتنی زیادہ شبابہت ہے۔ اس کے ہنسنے اور بات کرنے کا انداز بھی تمہارے جیسا ہے۔“

ایڈم چند لمحے ہونٹوں کی طرح جیڈ کی طرف دیکھتا رہا، پھر قہقہہ لگا کر ہنسنا منہ نیچے کر کے بولا۔

”مائی سن..... میرا بیٹا، یعنی کہ میرا بچہ، کتنا خوش کن ہے یہ احساس کہ میرا بچہ ہے۔“

اس نے لپک کر ایڈم کو اٹھایا اور والہانہ چومنے لگا، بچہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا، اس نے پوچھا۔

”آپ میرے ڈیڈ ہیں انکل؟“

ایڈم کے ساتھ ساتھ جیڈ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”یقیناً بیٹا، پہلے میں مصروف تھا مگر اب میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گا اور بہت سے کھلونے اور چاکلیٹ بھی لا کر دوں گا۔ اب میں، تم اور تمہاری مام ایک ساتھ رہیں گے۔“

اس نے معنی خیز نظروں سے جیڈ کی طرف دیکھا، اس نے رخ پھیر لیا، اس کا رویہ دیکھ کر ایڈم کو یقین ہو گیا کہ اسے جیڈ کو راضی کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔

نوٹ سمیٹ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں

کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی امید ایڈم کی عمر سے بڑی تھی۔ کسی قلم میں دیکھے ہوئے سین کے مطابق اس نے ڈائلاگ تو بول لیا مگر وہ صورت حال کی نزاکت کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ جیڈ کو اپنی اور ایڈم کی موت کا یقین ہو گیا۔ لاشعوری طور پر وہ دھماکے کی منتظر تھی لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک اور شدید حیرت اس کی منتظر تھی۔

ایڈم نے اجنبی شخص کی گود میں بیٹھا اس کا پستول الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کا اپنا ریوالور فرش پر پڑا تھا۔ اجنبی شخص نے ٹوپی اتار کر پیسٹک دی۔ اس کے لمبے بال لہرائے گئے۔ اس نے جبک کر گود میں بیٹھے بچے کا منہ چوم لیا، ایڈم گر چپک کر بولا۔

”دیکھیں مام! یہ زیادہ بڑا ہے۔ اب یہ میرا ہے۔“

خوبرو اجنبی بھی جیڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں ایڈم رش ہوں، سامانچا کا دوست۔ تم مجھے پہچان نہیں سکتی تھیں کیونکہ ہم اس سے پہلے کبھی ملے ہی نہیں تھے اور سامانچا کے پاس میری کوئی تصویر نہیں تھی۔“

وہ رکا، جیڈ کی حیرت سے پھلی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر پھر گویا ہوا۔

”میں تمہاری بات پہ یقین کر چکا ہوں کہ تم نے تمہیں مجبور کر دیا تھا۔ میں سامانچا کے قتل کا بدلہ تم سے ہی لوں گا کیونکہ سامانچا دنیا کی وہ واحد عورت تھی جس کے لیے میرے دل میں کوئی نرم گوشہ تھا۔ میں واضح کر دوں، میری تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ تمہاری شکل میری ماں سے ملتی ہے جس نے مجھے نفسیاتی مریض بنادیا تھا۔ میں تمہیں ہراساں کر کے اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ میں نے ساحل پہ تمہیں دیکھا تھا اور جب تم شام کو بچے کو لینے گئیں، میں تب گھر میں داخل ہو کر تمہارے ہنڈ کے نیچے چھپ گیا تھا کیونکہ تالے کھولنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، جب میں نے تمہیں باہر جانے کو تیار ہوتے دیکھا تو حملہ کر دیا۔“ ریوالور جیب میں ڈال کر اس نے ایڈم کو گود سے اتارا اور اٹھ کر جیڈ کے ہاتھ کھول دیے۔ اسے جیڈ سے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ خود اسے بتا چکی تھی کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔

جیڈ نے اپنی کلائیوں کو مسلا۔ ان میں بندھے رہنے کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی پھر اٹھ کر ایڈم کے قریب آئی، وہ جیڈ کو پہچان نہیں سکا تھا کیونکہ وہ ایک اسمارٹ سی لڑکا تھا لڑکی تھی مگر اب ایک بھرے بھرے جسم والی بھرپور روشیرہ تھی۔

اس نے زوردار تھپڑ ایڈم کے منہ پر مارا۔



مصر و فلاح

اثر نعمانی

کہتے ہیں کہ بعد از مرگ زندگی کے غموں سے نجات مل جاتی ہے مگر یہاں تو حقیقت برعکس نکلی کہ... جنہیں آخری آرام گاہ تک جانا تھا وہ رات کی تاریکی میں منتر گشت کو چل نکلے۔ گویا کہ مر کے بھی قریب دینے سے باز نہ آئے... کمال کے لوگ تھے۔

لاشوں کا کھیل تھا... ایک عجیب برادر کہانی

لیفٹیننٹ برڈکس نے اوڈیر کی پہلی دستک پر ہی دروازہ کھول دیا۔ اوڈیر ایک پرائیویٹ جاسوس تھا اور اس نے برڈکس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی محسوس کر لیا کہ وہ کسی بڑی پریشانی میں پھنس گیا ہے، اس کا سیاہ اداس چہرہ معمول سے زیادہ ہی اداس معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے راہداری میں دائیں بائیں دیکھا، یہ یقین کرنے کے لیے کہ اوڈیر اکیلا ہی ہے اور یہ کہ اسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور پھر اپنا اطمینان کرنے کے بعد اپنے دوست کو اندر آنے کا

آجانے کا خدشہ اپنی جگہ موجود تھا۔

□ □ □

ہوٹل میں زیادہ رش نہیں تھا، پھر بھی ایڈم نے کوئے والی میز کا انتخاب کیا۔ وہ تینوں ڈنر کرنے آئے تھے۔ پولیس نے جم کے کیس کو بھی اسٹریٹ کرائم کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ اب جیڈ اور ایڈم اپنی مرضی اور پسند کی زندگی بلا خوف و خطر گزار سکتے تھے۔ اسی خوشی میں یہ ڈنر ایڈم کی طرف سے دیا گیا تھا۔

”ڈیڈ امیں ویسا ہی جہاز اور ٹرین لینا چاہتا ہوں جیسا موش کے پاس ہے۔ مام کہتی ہیں کہ وہ بہت مہنگا ہے۔“ ایڈم کے بولنے سے پہلے جیڈ بول اٹھی۔

”ایڈی تنگ مت کرو، تم کھلونا ایک دن بھی سلامت نہیں رہنے دیتے۔ اتنے قیمتی کھلونے تمہیں بالکل نہیں ملیں گے۔“

ایڈم خاموش رہا۔ اگر وہ ایڈم کی حمایت کرتا تو جیڈ خفا ہو جاتی اور وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

”مگر مام، ڈیڈ آپ کے پاس بہت سے بے ہیں۔ آپ انہیں خرید سکتے ہیں۔“ اس نے قائل کرنے کی کوشش کی، جیڈ کو غصہ آ گیا۔

”ہاں ہیں، مگر ہم تمہیں جہاز اور ٹرین بالکل نہیں لے کر دیں گے۔ جب تم خود کماؤ گے تب لے لیتا۔“

ڈنر کا مزہ کر کرنا ہونے پر وہ خفا ہو گئی تھی۔ تینوں خاموشی سے واپس آ گئے مگر ایڈم کا منہ پھولا ہوا تھا۔

صبح پولیس سارجنٹ ان کا دروازہ بجا رہا تھا۔ جیڈ نے دروازہ کھولا تو سارجنٹ نے کہا۔

”رات کو اس گھر سے کسی بچے نے فون کر کے شکایت کی تھی کہ اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔“

جیڈ اور ایڈم ہکا بکا کھڑے تھے مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتے، اپنے کمرے سے ایڈم ایک کھلونا ٹیپ لیے برآمد ہوا اور سارجنٹ کے پاس آ کر بولا۔

”انکل یہ واقعی اچھے ماں باپ نہیں ہیں، یہ دیکھیں ان کی باتیں بھی اچھی نہیں ہیں۔“ اس نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔

جیڈ اور ایڈم گرنے کے سے انداز میں نیچے بیٹھ گئے۔ اس ٹیپ میں اس وقت ریکارڈنگ کی گئی تھی جب وہ دونوں جم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔

□ □ □

ٹھونے اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹائم کافی زیادہ ہو گیا تھا اس لیے وہ جانے کے لیے اٹھ گیا۔

”آج کے دن کے لیے اتنا کافی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور اپنا بیٹ اٹھا کر اس نے سب کو خدا حافظ کہا اور باہر آ گیا۔ رات کا پہلا پیر ختم ہونے کو تھا۔ پہلے وہ بھی اتالیٹ نہیں ہوا تھا مگر آج کی بات ہی اور تھی۔ آج اس نے جتنی بھی بازیاں لگائیں سب جیتیں، اس لیے لالچ کے مارے وہ بازی پہ بازی لگاتا گیا۔

گلیاں سنان ہو گئی تھیں۔ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ مٹھائے جم متوازن چال چلتا ہوا جا رہا تھا۔ گلی کا موڑ مڑنے سے قبل اس نے نیچے ہوئے لائٹ پول کو دیکھا، شاید اس کا بلب خراب ہو گیا تھا۔ بلب بالکل اسی طرح خاموش تھا جیسے آئندہ آنے والے دو دنوں میں ایڈم اور اس کے بعد جیڈ کو خاموش ہو جانا تھا۔ جم جان گیا تھا کہ جیڈ اس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ کسی بھی وقت جم کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ایڈم کے قتل کے بعد وہ سارا قیمتی سامان لے کر اس شہر سے نکل جائے گا اور جانے کے بعد پولیس کو ایڈم کے قاتل کے بارے میں ایک فون کر دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔

”بالکل اسی طرح ہوگا۔“ اس نے خوش ہو کر سر ہلایا اور گلی کا موڑ مڑ گیا، اگلے ہی لمحے ایک سایہ سا اس پر چھٹا اور پھندا اس کے گلے میں فٹ ہو گیا۔ اسے چیخنے کا موقع بھی نہ ملا اور اس کا جسم بے جان ہو کر نیچے گرنے لگا۔

□ □ □

جم کا فلیٹ نہایت غلیظ تھا۔ ایڈم اور جیڈ دونوں نے بڑی احتیاط سے تلاشی لی۔ اگرچہ پہلے ہی بے ترتیبی اتنی تھی کہ کسی کو تلاشی کا شبہ بھی نہ ہوتا مگر وہ پھر بھی محتاط تھے۔ انہوں نے واش روم کا وائٹیک، میٹریس کا فوم اور دنڈو کے فریم تک اچھی طرح کھنگالے۔ ہر جگہ سے انہیں کچھ نہ کچھ مل ہی گیا۔ الماری کے خفیہ خانے سے انہیں سونے کی پانچوں ڈلیاں بھی مل گئیں۔ جیڈ نے اسے ایک موٹی سی گالی دی۔ وہ سونا اپنے پاس موجود ہونے کے باوجود اسے دھمکا رہا تھا۔ جم کے فلیٹ سے جو کچھ ملا تھا اس سے انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ غنقریب یہ علاقہ چھوڑنے والا تھا کیونکہ اس کا سفری بیگ تیار تھا، بس اس نے رقم اور سونا وغیرہ الگ الگ مقامات پر چھپائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی میں دولت سمیٹ کر وہ روانہ ہو گئے۔ جم کو قتل کرنے کے بعد ایڈم نے اس کی لاش اگرچہ دیوار کے ساتھ لگا دی تھی مگر اس کے نظر

اشارہ کیا۔ اوڈیر نے کمرے میں قدم رکھا اور بروکس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اندر قدم رکھتے ہی اوڈیر کو معلوم ہو گیا کہ بروکس کی پریشانی کی نوعیت کیا ہے۔ رہائشی کمرے کے فرش پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

”اس کا نام بنی زیو ہے۔“ بروکس نے بتایا۔ ”یہ لیومورلی کے پاس ملازم تھا۔“

”اوڈیر کو بھی زیو سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر اس نے اس کا نام سنا ضرور تھا۔ جہاں تک مورلی کا تعلق تھا تو وہ ڈان ویٹو کرونا کا دایاں بازو تھا اور خود کرونا مافیا کی مقامی شاخ کا سربراہ تھا۔ اوڈیر آگے بڑھ کر لاش کے قریب آیا اور اسے جھک کر دیکھنے لگا۔ اس کی کمر کے نچلے حصہ میں گولیوں کے تین زخم تھے اور ان میں سے کوئی بھی زیو کو مار سکتا تھا۔ اعداد یہ 38 بور کا پولیس اسٹیشن ریوالور لاش سے چند فٹ کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ اوڈیر نے بروکس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ تمہارا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ بروکس نے جواب دیا۔

”اوڈیر نے کوچ پر بیٹھے ہوئے سگریٹ سلگایا۔

”مصورتہ حال کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں لوگیز کے ریٹورنٹ میں انا لکین ڈنکو اس وقت تک ملتوی کرنا پڑے گا جب تک یہ معاملہ طے نہ ہو جائے۔“

”بڑے اطمینان سے باتیں کر رہے ہو۔“ بروکس نے چڑ کر کہا۔ ”کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ معاملہ کتنا نازک ہے۔“

”ویسے تم نے تو اسے قتل نہیں کیا ہے نا؟“

”بالکل نہیں لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے، یہ شخص مر چکا ہے اور میرے ریوالور سے ہی قتل کیا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ میں مورلی کے کیس پر کام کر رہا تھا۔ لوگ اس حادثے پر طرح طرح کی باتیں بنا سکتے ہیں۔“

”مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“

”انہوں نے مجھے کسی بے ہوشی کی دوا سے مدد ہوش کر دیا تھا۔“ بروکس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے پولیس میں کام کرتے ہوئے پندرہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں اور اس کے باوجود ایک بہت ہی اوئی اور بے شمار مرتبہ کی دیکھی ہوئی چال کا شکار ہو گیا۔“

”کیسے؟“ اوڈیر نے پوچھا۔ کالی چوڑی کے لیفٹیننٹ بروکس نے ایک گہری سانس لی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

”کسی نے میری دھسکی کی بوتل میں کوئی نشہ آور دوا ملا دی تھی۔ میں گھر آیا اور جیسے ہی دھسکی کا ایک گلاس پیا، بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو زیو کی لاش قریب پڑی تھی اور ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔“

”کسی نے ریوالور چلنے کی آواز نہیں سنی؟“

”نہیں۔“ بروکس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میرا فلیٹ ساؤنڈ پروف ہے۔“

”پھر بھی تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس لیبارٹری میں تمہارے ہاتھوں کا ٹیسٹ کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ تم نے ریوالور نہیں چلایا اس لیے تمہارے ہاتھ پر بارود کے ذرات نہیں ہوں گے۔“

”میں اس ٹیسٹ پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ مورلی بہت چالاک آدمی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس نے پہلی گولی سے زیو کو ہلاک کرنے کے بعد ریوالور میرے ہاتھ میں دے کر باقی دو گولیاں ٹرانسگر پر میری انگلی دبا کر چلا دی ہوں، میں اس بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس کا امکان بہر حال موجود ہے۔“

اوڈیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایک لمحہ سوچا، پھر پوچھا۔

”تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”یہ وہ سوال ہے جسے میں ہوش میں آنے کے بعد سے مسلسل اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہارے دماغ میں کوئی ترکیب آئی ہو تو بتاؤ۔“ بروکس نے جواب دیا۔

”ایک آدھ ترکیب آتور ہی ہے۔“ اوڈیر نے کہا۔ ”لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کام مورلی کا ہی ہو سکتا ہے؟“

”ہاں۔“ بروکس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”مصورتہ حال یہ ہے کہ اس وقت مورلی ایک تار سے لٹکا ہوا ہے اور وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے۔ میں اس کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہوں کہ اس کا ایک ایک لمحہ اضطراب کے عالم میں گزر رہا ہوگا۔ مجھے صرف ایک ہفتہ کی مہلت درکار ہے۔ اس کے بعد میرے پاس اتنے ثبوت فراہم ہو جائیں گے کہ مورلی کا بچنا ناممکن ہوگا اور وہ خود بھی اس بات کو جانتا ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا۔ لیکن دوسری طرف یہ صورت ہے کہ بہت سے لوگوں کو یہ بات گوارا نہیں ہے کہ ایک کالی نسل کا آدمی پولیس کے محکمے میں کام کر رہا ہو اور یہ حادثہ ان کے لیے مجھے برطرف کرانے کا ایک بہانہ بن جائے گا۔ مجھے ملازمت سے نکلوانے کے بعد مورلی کو اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فکر باقی نہیں رہے گی۔“

”مورلی، ویٹو کرونا کے احکامات کے مطابق کام کرتا ہے۔“ اوڈیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اور جہاں تک مجھے معلوم ہے، کرونا کو قتل و غارت گری سے نفرت ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو قتل کرنے سے منع کر رکھا ہے، الا یہ کہ خود اس کی خاص اجازت سے بہت ہی مجبوری کے عالم میں کیا جائے۔ پھر اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ زیو کو قتل کرنے کے لیے مورلی نے کرونا سے اجازت حاصل کر لی ہوگی؟“

”نہیں۔ مجھے جو حالات معلوم ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ آج کل مورلی اور کرونا کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ کرونا مورلی سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اسے شبہ ہی نہیں بلکہ ایک حد تک یقین ہے کہ مورلی اسے ہٹا کر خود کردہ کا باس بننا چاہتا ہے، چنانچہ وہ انتقام میں ہے کہ مورلی سے کوئی غلطی سرزد ہو اور اس غلطی کو جواز بنا کر مورلی کا قصہ پاک کر دے۔ اس کی نفرت یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ قتل کو ناپسند کرنے کے باوجود اگر اسے احساس ہو جائے کہ اس کے بغیر مورلی باز آنے والا نہیں تو وہ اس کی جان لینے سے بھی ذرا نہیں ہچکچائے گا۔“

”تو پھر کیوں نہ ہم کرونا کو وہ جواز مہیا کر دیں جس کی اسے تلاش ہے۔“ اوڈیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم پتا نہیں کیا باتیں کر رہے ہو۔“ بروکس نے اچھٹے ہوئے کہا۔ ”میری سمجھ میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آتی جس کی مدد سے ہم زیو کے قتل کو براہ راست مورلی کی ذات سے متعلق ثابت کر دیں۔ یہ قتل تو بادی انکھر میں وہ ہی کچھ معلوم ہوتا ہے جو مورلی چاہتا ہے کہ معلوم ہو۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ مورلی کے آدمی ہی زیو کو یہاں لے کر آتے ہوں گے بلکہ ہو سکتا ہے کہ مورلی بھی ان کے ساتھ ہو اور اس نے خود ہی زیو کو قتل کیا ہو، لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس سے باز پرس کی جائے تو وہ نصف درجن سے زیادہ ایسے گواہ یا ایسے ثبوت پیش کر دے گا جن سے ظاہر ہوگا کہ قتل کے وقت وہ کہیں اور تھا۔“

”اس میں شبہ نہیں کہ کام بہت ہوشیاری سے کیا گیا ہے لیکن ترکیبیں سوچنے میں، میں بھی مورلی سے کچھ کم نہیں ہوں۔“ اوڈیر نے کہا۔

”مجھے اس بات کا یقین ہے۔“ پریشانی کے باوجود بروکس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ”اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں فون کر کے آنے کی زحمت نہ دیتا۔ بتاؤ تم نے کیا ترکیب سوچی ہے؟“

”تمہارا یہ فلیٹ پہلی منزل پر ہے اور پارکنگ پلاٹ

کے بالکل سامنے صحیح ہے؟“

”ہاں، ٹھیک ہے۔“

”تب پھر یہ بات ایسی مشکل نہیں کہ ہم زیو کی لاش پھیل کھڑکی سے نکال کر لے جائیں اور تمہاری یا میری کار میں رکھ دیں اور ہمیں کوئی دیکھ بھی نہ سکے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن.....“

”مجھے کچھ اندازہ تو ہے۔“ اوڈیر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تمہاری زبان سے سنتا چاہتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم مورلی سے انتقام لینے کے لیے اس بات پر آمادہ ہو کہ اگر ضروری ہو تو ہم کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتے ہیں جسے غیر قانونی یا کم سے کم قانون نہ کہا جاسکے۔“

”عام حالات میں، میں اسے پسند نہ کرتا لیکن جب وہ مجھے پھانسنے کے لیے ہر جھکنڈا استعمال کر سکتا ہے تو مجھے اس کا خیال کیوں ہو کہ ہمارا اقدام قانونی ہے یا نہیں۔“ بروکس نے زیو کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت خوب۔ تب پھر آؤ دیکھیں کہ ہم اپنے طور پر انصاف کا تقاضا پورا کر سکتے ہیں یا نہیں۔“

”ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“

”سب سے پہلے ہم زیو کی لاش کو اٹھا کر نیچے لے جائیں گے اور میں اسے اپنی کاری ڈکی میں رکھ دوں گا۔ اس کے بعد تم مورلی کے کلب جاؤ گے۔ اس سے ملاقات کرو گے۔ کہو گے کہ تم اس کی اس چال سے گھبرا کر اس سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہو اور یہ کہ تم نے زیو کی لاش کو توٹھکانے لگا دیا ہے مگر یہ نہیں چاہتے کہ اس قسم کی بات کا اعادہ ہو سکے۔ چنانچہ اس کے خلاف تحقیقات سے دست کش ہونے کے لیے آمادہ ہو بشرطیکہ وہ کوئی بڑی رقم دینے کا وعدہ کرے۔ کم سے کم دس ہزار ڈالرز۔ یہ رقم مل جائے تو تم نہ صرف اس کے خلاف تحقیقات ختم کر دو گے بلکہ اب تک جو ثبوت حاصل کیے ہیں انہیں بھی ضائع کر دو گے۔“

بروکس نے کچھ اعتراض کرنا چاہا مگر اوڈیر نے اسے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے روک دیا۔

”پہلے میری پوری بات سن لو پھر کوئی اعتراض ہو تو بات کر لیتا۔“

000

اور اس کے میں منٹ کے بعد پرائیویٹ جاسوس اوڈیر اپنے دوست بروکس کے ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ وہ اس وقت فلیٹ میں اکیلا تھا۔ زیو کی لاش اس کی کار کی ڈکی میں آرام کر رہی تھی اور بروکس جو اب بھی اس کی



پتوں کو کافی

□ مت دو ہمارے

□ نمک پارے دو۔

□ میز روپ رخت سے بنا تھا۔

□ نہ ناز و نہ زاکت سے، بلکہ حوصلوں

□ بہتوں اور مقابلوں سے۔

□ مشکل ابھی چیز ہے بشرطیکہ تم اسے صحیح استعمال

□ کر سکو۔

□ اٹھ جاگ رہے راہی مجبور بھٹی اب رین کماں جو سوت ہے

□ جو جاگت ہے سو پاؤت ہے، جو سوت ہے سو کھوٹ ہے

□ یہ ایک دل نگار مسئلہ ہے جس کا حل دو نے مسئلوں کو جنم

□ دیتا ہے۔

□ میں اپنے درد کے لیے گرم بوتل کی جگہ کرے لی نگا کر سوتا

□ ہوں، وہ ٹھنڈی نہیں ہوتی۔

□ اے کتنے پرسکون دن تھے اور پرسکون راتیں جب ٹیل زن

□ ایجاد نہیں ہوا تھا۔

□ جب سقراط جیسا عقل مند زہری گیا تو ظاہر ہوا، احمق سے

□ احمق حدت عقل مند عقل مند کو احمق بنا سکتا ہے۔

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

□

کے ہوں یا پرائیویٹ۔“ کرونا نے جواب دیا۔“ لیکن اگر وہ
تمہارا باڈی گارڈ ہے تو امید ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“
اور یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اوڈیر
نے بھی مسکراتے ہوئے ریسور کر یڈل پر ڈال دیا۔ فلیٹ کی
بتیاں بند کیں اور دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

بارہ بجنے میں پانچ منٹ پہلے وہ پارک میں مجھے کے
نیچے والی بیچ پر اطمینان سے بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ مجسمہ
امریکا کی خانہ جنگی کے کسی ہیرو کا تھا جس کا نام بھی اب لوگ
بھول چکے تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور
پارک کی نیم تاریکی روزانہ سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہی
تھی۔ بڑے بڑے گھنے درختوں کی وجہ سے شہر کی سڑکوں کا
شور و غل پارک کے اندر بہت ہی ہلکا سا سنائی دیتا تھا۔

بیچ پر اوڈیر کیلے انہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی بیٹی زیو کی
لاش بھی بیٹھی ہوئی تھی اور کچھ اس انداز سے کہ کسی قریب سے
گزرنے والے کو بھی یہی معلوم ہوتا کہ دو دوست پارک میں
چہل قدمی کرتے کرتے تھک کر آرام کرنے بیٹھ گئے ہیں۔

لیکن اوڈیر کے نزدیک زیادہ اہم بات یہ تھی کہ
کرونا انہیں دیکھ کر کیا خیال کرتا ہے۔ اس نے اپنی رست
واچ دیکھی۔ ٹھیک بارہ بج رہے تھے، اس نے اپنا نصف پیا
ہوا سگریٹ پختہ روش پر پھینک دیا اور پھر اسے جوتے کی
ایڑی سے مسل دیا۔ آدمی رات کی سرگرمیاں ٹھیک وقت
پر شروع ہو چکی تھیں۔

اس کے بائیں جانب ایک تاریک گوشے سے تین
آدی نکل کر اس کی طرف بڑھے۔ وہ کچھ قریب آئے تو اس
نے درمیان والے آدی کو پہچان لیا، وہ خود کرونا تھا۔ اوڈیر
نے پھرتی سے زیو کی لاش کی پوزیشن درست کر دی۔ اب وہ
اس طرح بیٹھا ہوا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے دونوں پیر زمین
پر کر اس کی شکل میں ٹکے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ گود میں
رکھے تھے، وہ بالکل ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ اوڈیر کو سب سے
بڑی فکر یہ بھی تھی کہ کہیں وہ گفتگو کے دوران ادھر ادھر یا
سامنے کی جانب نہ لڑھک جائے لیکن ابھی تک ایسی کوئی بات
نہیں ہوئی تھی۔

کرونا اور اس کے ساتھی درمیان میں واقع گھاس کے
لان کو عبور کرتے ہوئے غلط قدموں سے نزدیک آرہے
تھے۔ اوڈیر کھڑا ہو گیا اور اپنی مخالف سمت میں دیکھا۔ یہاں
ایک اور بات تھی جو اسے پریشان کر رہی تھی۔ پروگرام کے
مطابق اس وقت کچھ اور باتیں بھی تھیں جن کو شروع ہو جانا

ہے۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ایک تعاقب کرنے والے سے
بڑی مشکل سے چھٹا چھڑایا ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں تم
سے ملنے تمہارے گھر گیا تھا تو پھر میری خیریت نہیں۔“
”پھر تم کیا تجویز کرتے ہو؟“ کرونا نے پوچھا۔
اوڈیر اس طرح رکا جیسے کوئی حل سوچ رہا ہو۔
”اگر تم مجھ سے کسی جگہ ملاقات کر سکو تو کیسا رہے۔“

آخر اس نے کہا۔ ”میں اس وقت ہاتھ ساندھ میں ہوں۔
نصف شب کو لیڈ پارک میں مجھے کے نیچے پڑی ہوئی بیچ پر
میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

لیڈ سڑک نمبر 23 کے قریب ایک پارک تھا جو دو
ایکڑ کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا، اس میں چاروں طرف گھنے
درخت لگے تھے اور رات کے وقت وہاں روشنی کا انتظام
بہت ہی ناکافی ہوتا تھا۔ اوڈیر کے ذہن میں جو ترکیب تھی
اس کے لیے یہ پارک بہت ہی مناسب جگہ تھی۔ کرونا نے
بلا تامل جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، میں نصف شب کو وہاں اپنے دو
ساتھیوں کے ساتھ آ جاؤں گا، لیکن یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے اپنی
معلومات کی کیا قیمت لو گے؟“

”میں جو کچھ تمہیں بتانے والا ہوں وہ تمہارے لیے
بہت اہم ہے بلکہ ایک طرح سے تمہاری زندگی بچا سکتا ہے۔“
اوڈیر نے جواب دیا۔ ”اس حساب سے مجھے زیادہ کا مطالبہ
کرنا چاہیے تھا لیکن میں دس ہزار ڈالر میں سودا کر لوں گا۔“
”مجھے منظور ہے۔“ کرونا نے جواب دیا۔ ”فون
کرنے کا شکریہ۔ میں اس شیطان موریل کو ایک مدت سے
ٹھکانے لگانے کی فکر میں ہوں۔ اگر تمہاری معلومات نے
مجھے اس کا موقع دے دیا تو ایک ہزار ڈالر میں مجھے یہ
سودا گراں نہیں ہوگا۔ میں ٹھیک بارہ بجے تم سے پارک میں
ملاقات کروں گا۔“

”ایک بات اور مسٹر کرونا۔“ اوڈیر نے کہا۔
”میں پارک میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ملوں گا۔ اس کا
نام اوڈیر ہے اور وہ ایک پرائیویٹ جاسوس ہے، جیسا کہ
میں نے پہلے بتایا، موریل کو معلوم ہو گیا ہے کہ میں اس کے
بارے میں کچھ جان گیا ہوں اور وہ اس بات کی پوری کوشش
کر رہا ہے کہ میں وہ معلومات تمہیں نہ بتا سکوں۔ اسی لیے وہ
میرا تعاقب بھی کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی حفاظت کے
لیے اس پرائیویٹ جاسوس کی خدمات بہ طور باڈی گارڈ
حاصل کر لی ہیں۔“

”مجھے جاسوسوں پر کوئی اعتبار نہیں ہے خواہ وہ پولیس

تجویز سے پوری طرح متفق نہیں تھا مگر بہر حال اس پر عمل
کرنے کا وعدہ کر کے موریل سے ملنے اس کے ٹائٹ کلب
روانہ ہو چکا تھا جو کہ مورگن امٹریٹ پر واقع تھا۔

جس نمبر کی اوڈیر کو ضرورت تھی، وہ ٹیلی فون
ڈائریکٹری میں درج نہیں تھا چنانچہ اسے حاصل کرنے کے
لیے اسے دو خبروں سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ پہلے کو اس کے
بارے میں خود علم نہیں تھا مگر دوسرے مخبر نے معقول انعام
کے بدلے اوڈیر کو وہ نمبر بتا دیا اور اب اوڈیر وہ نمبر ڈائل
کر کے دوسری طرف سے جواب ملنے کا منتظر تھا۔ آخر کار
ایک آواز نے جواب دیا۔ ہر چند لہجہ نرم اور مہذبانہ تھا مگر اس
کے باوجود الفاظ وہ درست چھپانے سے قاصر تھے جو اس کی
میں پوشیدہ تھی۔

”یہ ایک پرائیویٹ لائن ہے۔“ آواز نے کہا۔ ”لہذا
جو کچھ تمہیں کہنا ہے وہ واقعی اہم ہونا چاہیے۔ میں معمولی
معمولی باتوں کے لیے پریشان کیا جانا پسند نہیں کرتا۔“
”بات بہت اہم ہے مسٹر کرونا!“ اوڈیر نے اپنی
آواز سے گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
”میرا نام بیٹی زیو ہے، تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں لیو
موریل کے ساتھ کام کرتا ہوں۔“

”تو پھر کیا ہوا؟“ کرونا نے بے تابی سے کہا۔ ”تمہیں
یہ نمبر کیسے معلوم ہوا اور اس طرح فون کرنے سے.....“
”میں تمہارے ہاتھ کچھ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“
اوڈیر نے کہا۔ ”اس کا تعلق موریل سے ہے۔ کچھ ایسی باتیں
جنہیں جان کر تم بہت خوش ہو گے۔“

”موریل کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟“ کرونا
کی جھلاہٹ غائب ہو گئی اور اس کی جگہ تجسس نے لے لی۔
”وہ بڑے بڑے خواب دیکھتا ہے مسٹر کرونا، یہ بات تو
تم بھی جانتے ہو۔ میں نے اسے اپنے قابل اعتماد ساتھیوں سے
بائیں کرتے سنا ہے، وہ کوئی بڑی سازش کر رہا ہے دوسرے
الفاظ میں وہ گروہ کے اندر دوسری پوزیشن پر کام کرتے کرتے
تنگ آچکا ہے اور اب پہلی پوزیشن حاصل کرنا چاہتا ہے۔“
”تم نے ابھی اپنا نام کیا بتایا تھا؟“

”زیو، بیٹی زیو۔“

”اوکے زیو، میں سوچ رہا ہوں کہ ممکن ہے میں اور تم
ایک دوسرے کے تعاون سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ تمہیں
میرے گھر کا پتا معلوم ہے؟“

”میں جانتا ہوں مگر میرے لیے وہاں جانا خطرے سے
خالی نہیں ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ موریل کو بھی مجھ پر شبہ ہو گیا

”یہ نشے میں تو نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔ اوڈیر کا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

”اوہ ہاں۔“ وہ جیسے چونک کر بولا۔ ”ہم یہاں آتے ہوئے راستے میں ایک بار میں کچھ پینے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ بات یہ ہے مسٹر کرنا کہ زیو بہت ہی گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ اسے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے کے لیے کچھ پینا ضروری تھا۔ مگر شاید ضرورت سے زیادہ پی گیا ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ اگر مورلی کو یہ پتا چل جائے کہ وہ تمہیں کچھ بتانے جا رہا ہے تو.....“

”ہاں، ہاں۔ میں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں۔“ کرنا نے بے تالی سے کہا اور اس سے پہلے کہ اوڈیر اسے روکنے کے لیے کچھ کر سکے، وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے زیو کی لاش کے قریب پہنچا اور چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر زیو کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہتا جا رہا تھا۔

”ہوش میں آؤ زیو۔ تم مجھے لیو مورلی کے بارے میں.....“ وہ اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اس کا ہاتھ زیو کے جسم سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

”یہ آہٹ کیسی تھی؟“ وہ تیزی سے بولا۔ ”کوئی ادھر آ رہا ہے۔“ اس کے دونوں ساتھی حرکت میں آئے، انہوں نے پھرتی سے اپنی اپنی جیبوں سے ریوالتور نکال لیے اور گھوم کر پارک کے اس تاریک حصے کی جانب دیکھنے لگے جس طرف سے آہٹ سنائی دی تھی۔ دور فاصلے پر جھاڑیاں مل رہی تھیں اور ان جھاڑیوں سے کوئی شخص نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ کرنا تیزی سے اوڈیر کی طرف پلٹا، اس کی آنکھیں غصے سے چمک رہی تھیں۔

”اگر یہ کوئی فریب ہوا تو تمہاری خیریت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”ہماری طرف سے کوئی فریب نہیں کیا گیا ہے مسٹر کرنا۔“ اوڈیر نے جلدی سے کہا۔ ”البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ مورلی زیو کی زبان بند کرنے کے لیے خود میدان میں آ گیا ہو.....“ وہ کچھ اور بھی کہنے والا تھا مگر اسی وقت فائر کی آواز آئی ایک، دو، تین کسی نے بہت قریب سے تین گولیاں یکے بعد دیگرے چلائی اور اس کے ساتھ ہی بہت سی باتیں ایک ساتھ پیش آنے لگیں۔

کرنا منہ ہی منہ میں گالیاں بکتے ہوئے جلدی سے نیچے جھک گیا تاکہ اپنے آپ کو فائرنگ سے محفوظ کر سکے، پھر

جیسے ہی کرنا زمین کی طرف جھکا، اوڈیر کا ایک پیرتیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے زیو کے پیروں پر زور سے لات ماری۔ زیو کی لاش کو ایک جھوٹا سا لگا اور وہ نیچے سے لڑھک کر منہ کے بل گھاس پر گر گیا۔

جس طرف سے فائر کی آوازیں آئی تھیں اسی جانب سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ بلند ہوئی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ کرنا نے اپنے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔

”ان کا پیچھا کرو۔“ اس نے حکم دیا۔ ”جلدی۔ وہ بھاگنے نہ پائیں۔“

اس کے باڈی گارڈ جھاڑیوں کی طرف بھاگے مگر اب اس طرف سے کچھ اور آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ایک کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز..... انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز اور پھر پختہ روش پر کار کے پیروں کے رگڑنے کی باریک چیخوں جیسی آواز..... ساتھ ہی ان کے سامنے کوئی کار تیزی سے گزر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ کرنا جلدی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ مورلی کی کینڈی تھی۔“ وہ غرا کر بولا اور پھر اپنے قریب پڑے ہوئے ڈھیر کو دیکھا۔ ”اس کی کیا حالت ہے؟“ اوڈیر نے زیو کی لاش کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے سیدھا کیا اور اس ہلکی روشنی میں بھی گولیوں کے ان زخموں کو دیکھنا مشکل نہیں تھا جو زیو کے سینے پر موجود تھے۔ اوڈیر نے سراٹھا کر کرنا کی طرف دیکھا۔

”یہ مر چکا ہے۔“ اس نے کہا۔

اسی وقت کرنا کے باڈی گارڈ واپس آ گئے۔

”وہ بھاگ نکلا باس!“ ان میں سے ایک نے کہا۔

کرنا نے ایک مرتبہ پھر زیو کی لاش کی طرف دیکھا اور گہری سنجیدگی کے عالم میں سر ہلایا۔

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ مورلی ہی تھا اور اب میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیو کا تعاقب کرتے ہوئے پارک تک آ گیا، اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ بتا سکا، اس نے زیو کو مار کر اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔

لیکن اب میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ مورلی کی قضا اس کے سر پر ناچ رہی ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ جب تک میں یہ طور خاص حکم نہ دوں، کرنا وہ کسی آدمی کو کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن ہم نے ابھی دیکھا کہ اس نے میرے حکم کی صریحاً خلاف ورزی

کرتے ہوئے زیو کو قتل کر دیا۔ اسے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ زیو مجھ سے اس کا تمام کچا چٹا بیان کرنے یہاں آیا ہے اور اس نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔“

اوڈیر اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ کانپ رہا ہو۔

”اب میرے لیے بڑی مصیبت ہے۔“ اس نے کہا۔

”پولیس عنقریب یہاں پہنچنے والی ہوگی اور مجھے مجبوراً انہیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔“

”پولیس کے بارے میں پریشان مت ہو۔“ کرنا نے اوڈیر سے کہا اور اپنے گارڈز کی طرف دیکھا۔ ”زیو کی لاش اٹھا کر کار میں رکھ دو۔ ہم اسے کہیں دفن کر دیں گے اور پھر اس سے فارغ ہو کر میں خود مورلی سے ملنے جاؤں گا۔“

اس کے جبرے کے عصا تین گئے۔ ”اور یہ آخری ملاقات ہوگی جو مورلی کسی کے ساتھ کر سکے گا۔“

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے اور لیو جی کے بار اینڈ ریستورنٹ میں صرف دو گاہک موجود تھے۔ ایک اوڈیرا اور دوسرا بروکس۔ وہ ابھی کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ اوڈیر نے خالی پلیٹ اپنے سامنے سے پیچھے سرکائی اور انڈرائی کے انداز میں بازو پھیلا کر بولا۔

”بہت مزیدار کھانا تھا۔ موقع ملا تو ہم آئندہ بھی یہاں آتے رہیں گے۔“

بروکس کچھ زیادہ نہیں کھاسکا تھا۔ اس کی پلیٹ نصف سے زیادہ بھری رہی تھی۔

”اگر تمہارا مطلب صرف کھانا کھانے کے لیے آنے سے ہے تب تو ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن جہاں تک دوسرے واقعات کا تعلق ہے تو اب مجھے ان کے اعادے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ یہ قیامت زندگی میں ایک ہی مرتبہ آنا بہت کافی ہے۔“

اوڈیر نے بڑے اطمینان سے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔

”ٹھیک کہتے ہو، خصوصاً بعض لمحات تو بہت ہی خطرناک تھے۔“ اس نے کہا۔ ”مثال کے طور پر اس وقت جبکہ تم نے اور مورلی نے آنے میں دیر لگائی، کیا ہو گیا تھا؟“

”بس اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے۔“ بروکس نے بتایا۔ ”اگرچہ میں وہاں موجود تھا۔ تمہارے کہنے کے مطابق میں مورلی کے نامت کلب گیا۔ وہاں تمہاری ہدایت کے مطابق جو کچھ کہنا تھا کہا اور پھر رقم کے لیے کہا کہ وہ ٹھیک بارہ

سے تھک گیا ہوں۔“

اوڈیر نے مسکراتے ہوئے اپنے گلاس کی باقی شراب ختم کی۔

”تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ بولا۔ ”ذرا پیچھے رہنے دو، مگر ابھی خیال کرو، مرنے کے بعد بھی اسے کتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

بچے اس پارک میں مجھے کے نیچے پڑی ہوئی بیچ پر ملاقات کرے۔ کلب سے واپس آتے ہی میں پارک میں اپنی مقررہ جگہ پر چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس لیے اصل میں مجھے نہیں بلکہ مورلی کو پہنچنے میں دیر ہوئی۔“

”گو یا تم اس تمام وقت وہاں پارک میں اپنی جگہ موجود تھے جبکہ میں زیو کی لاش کے ساتھ نیچ پر بیٹھا ہوا تھا۔“

اوڈیر نے کہا۔ ”بڑے تعجب کی بات ہے، میں نے تمہاری ذرا سی آہٹ بھی محسوس نہیں کی۔“

”میں تو موجود تھا، ممکن ہے تم نے غور سے آہٹ سننے کی کوشش نہ کی ہو۔“ بروکس نے کہا۔ ”مجھے تو ہر لمحہ یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ اگر عشتی پولیس کی کوئی کار آنکلی اور اس نے تمہیں وہاں ایک لاش کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔“

”لیکن ایسا ہوا نہیں۔“ اوڈیر مسکرایا۔ ”مجھے صرف

کرنا، اس کے دو آدمیوں اور مورلی نے زیو کے ساتھ دیکھا تھا۔“

”مجھے تو اس کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ مورلی اس قدر قریب پہنچ جائے گا۔“ بروکس نے کہا۔ ”میں نے اسے کار سے اترتے دیکھا، اس کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا جس میں وہ غالباً مجھے دینے کے لیے رقم لے کر آیا ہوگا۔ پھر جیسے ہی اس نے کار سے اتر کر تمہاری طرف بڑھنا شروع کیا، میں تمہارے کہنے کے مطابق ہوائی فائر کرنے لگا، تین فائر، جیسی کہ تم نے ہدایت کی تھی۔“

”بہر حال ہماری ترکیب کامیاب رہی۔ فائرنگ کی آواز سننے ہی مورلی گھبرا گیا اور بھاگ کھڑا ہوا جیسی کہ مجھے توقع تھی۔ کرنا نے اسے بھاگتے دیکھا۔ پھر اس کی کار جاتے دیکھی۔ دو اور دو جمع کیے اور چھ بنا لیے۔“

”درست ہے، ہر کام ہماری امید کے مطابق ہوا۔“

بروکس نے تائید کی۔ ”اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا ورنہ میری گردن پھنسنے میں تو کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن اس کے باوجود آج کی رات بڑی تنگ دود میں گزری، میں تو ادھر ادھر بھاگتے بھاگتے بالکل تھک گیا ہوں۔“

اوڈیر نے مسکراتے ہوئے اپنے گلاس کی باقی شراب ختم کی۔

”تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ بولا۔ ”ذرا پیچھے رہنے دو، مگر ابھی خیال کرو، مرنے کے بعد بھی اسے کتنی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“

”ختم کی۔“



ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 3

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زاد سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود پرانا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور ابلہ پانی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضا توں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہو جاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کر کے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہو جاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کر دینے والے واقعات اور معاشرتی سرد رویوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل و گزار سے راز پر شاہ تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

”آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بیٹی سے شادی کر لوں۔ ہے ناں؟“ ڈاکٹر شاہ جی کا پارا چڑھ گیا تھا۔
”جی ڈاکٹر صاحب! یہ میری خواہش ہے۔“ نامرچی کی آواز مجھے لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔
”اس لیے کہ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی؟“
جواب میں خاموشی چھائی رہی۔
”اس لیے کہ ذہن کی بیماری کو تمہارے رشتہ داروں نے طعنہ بنالیا ہے۔ واہ ماشر جی! نہ جانے آپ نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کر لیا۔ میں بچاس کی عمر میں ہوں، اس کی عمر بہ مشکل تیس بائیس سال ہے۔ میرا اور اس کا جوڑ کسی بھی لحاظ سے بنایا نہیں جاسکتا مگر آپ نے بنا دیا۔ میں نور پور کے خاندانوں کو بڑا کیا سمجھوں؟ وہ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں

کہ میں فوراً سمجھ گیا کہ اُس نے ہی اپنے باپ کو مجبور کر کے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پیغام رساں بنا کر بھیجا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

ماسٹر جی نے نفی میں سر ہلایا۔ کوئی بات بھی کی تھی جو لہجے کے دھیسے پن کی وجہ سے مجھے سنا کی نہیں دی تھی۔ ماسٹر جی کی بات سننے ہی یوں لگا جیسے زینان کے بیروں کو زمین نے مضبوطی سے جکڑ لیا ہو۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ اُس کی پشت میری جانب تھی، میں اُس کا چہرہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر میں اُس کے احساسات کی دنیا کو پس نہس ہوتا محسوس کر سکتا تھا۔

ماسٹر جی اُس پر توجہ دینے بغیر برآمدے سے گزر کر درمیانی کمرے میں محسوس گئے جبکہ وہ محسن کے وسط میں کسی بے جان مورتی کی طرح ایستادہ رہی۔ میں گھر پر سے نیچے اتر آیا اور بوجھل دل لیے سر جھکا کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

چاچا چراغ مجھ پر بکڑا ہوا تھا۔ اُسے میرا گھر سے زیادہ وقت باہر رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے اُسے بارہا پیش کی جانے والی دلیل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "چاچا! میں اپنے جیسے کام کر کے ہی باہر جاتا ہوں۔ ویسے ہی آپ لوگوں کو پتا ہے کہ میں کہاں جایا کرتا ہوں۔"

چاچا صاحب معمول زمانے کی تبدیلی، لوگوں کی بے حسی اور معاشرتی خرابیوں کا ردِ نارونے کے بعد خاموش ہو گیا تھا مگر آج اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ پہلے کی طرح میری پیش کردہ توجیہات سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ پروین اور فرزاد نے میری حمایت کی۔ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا ہوں اور 'ڈاکٹری' سیکھنے کے لیے زیادہ وقت وہاں گزارتا ہوں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سیکھا ہوا ہنر زندگی میں کام آتا ہے۔

دوپہر کے ایک بجے کا عمل ہو گا جب بشیرا میرے پاس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ میں اپنے مویشیوں کا چارا کاٹنے کے بعد ٹاہلی کے گھنے درخت کے نیچے چار پائی بچھائے لیٹا ہوا ڈاکٹر شاہ جی سے مستعار لیا ہوا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ میں اگرچہ دوپہر میں آرام کرنے کا عادی نہیں تھا تاہم کھال کے کنارے واقع اس تیل پینتیس سالہ بوڑھی ٹاہلی کی ماتائی چھاؤں اتنی سکون بخش تھی کہ میں موقع ملنے ہی اس کے نیچے لیٹ جایا کرتا تھا۔ بشیرا نے مجھے سردار بخت خان کا پیغام دیا۔

اُس نے بتایا۔ "باؤ! شام تک، جب تمہیں فرصت ملے، حویلی کا چکر لگالینا۔ خان جی کو کوئی خاص کام ہے تم سے۔" میں نے ہائی بھری۔ وہ چلا گیا۔ میں نے ایک ایکڑ باجرہ کاشت کر رکھا تھا جو ان دنوں شرباب تھا۔ جب ہم اپنے

بے زخی سے جھڑکنے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے غلط فہمی ہوئی تھی کہ میں اور صدق بی بی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ اُس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں بہ یک وقت دو لڑکیوں سے دل بستگی کا تعلق استوار کیے ہوئے تھا تو ایسے میں تیسرا تعلق بھی قائم کر سکتا تھا۔ اُس کی پیش قدمی نہ صرف اُس کے لیے بلکہ میرے اور کھالے کے باہمی تعلق کے لیے بے حد خطرناک تھی۔

انہی سوچوں میں غلطاں میں امان اللہ قریشی کی حویلی عبور کر کے شفیع محمد کے گھر کی کڑ پر پہنچ گیا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر مغربی کُلی میں پڑی۔ یکبارگی چونک گیا۔ ماسٹر ولی محمد اپنے حویلی دروازے کی بالائی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔

میں چاروں گلیوں کے سنگم پر کھڑا تھا۔ اس چوک کی چاروں کُڑوں پر بخت خان اور درپام خان کی حویلیاں، سردار حیات خان کا ڈیری فارم اور شفیع محمد کے گھر واقع تھے۔ شفیع محمد کا گھر چوک کی شمال مغربی کُڑ پر واقع تھا جبکہ اُس کے مغرب میں مراد بخش دیوانہ کا 'گھر وندا' واقع تھا۔ وہ اعلیٰ پائے کا ٹیلر ماسٹر تھا۔ ساتھ ساتھ سرائیکی اور اردو زبانوں میں شاعری کرتا تھا۔ اُس نے اپنے کچے گھر کے باہر بڑا خوب صورت بورڈ آؤٹ کیا تھا جس پر 'گھر وندا' کا لفظ اور سرائیکی کا ایک شعر خوش خطی سے لکھا ہوا تھا۔ شعر کا مفہوم یہ لکھا تھا کہ 'آپ غریب مگر محبت کرنے والے کے گھر کیا آئے بہار آگئی'۔ وہ خود بھی بڑی باغ و بہار طبیعت کا مالک تھا۔ اُس کے گھر وندے کی مغربی سمت میں ماسٹر ولی محمد کا پکا، سادہ مگر صاف ستھرا گھر واقع تھا۔

ماسٹر ولی محمد نے چوکھٹ پر سے ایک ہاتھ اٹھایا اور دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر آہستہ سے اندر گھس گیا۔ اچانک ایک خیال برق کی رفتار سے میرے ذہن میں کوندا اور میں دوڑ کر ماسٹر جی کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازے سے چند قدم آگے دیوار کے ساتھ سطح زمین سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر نکلا ہوا گٹر تعمیر کیا گیا تھا۔ ایسے گٹر نور پور کی اکثر گلیوں میں موجود تھے۔ میں بھاگ کر گٹر کے اوپر چڑھ گیا۔ یہاں سے بہ آسانی ماسٹر ولی محمد کے گھر کے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ میں نے محسن میں روشن بلب کی روشنی میں ماسٹر جی کو محسن میں کھڑے دیکھا۔ اُس کی بیٹی زینان بھی کھڑی تھی۔ باقی افراد کُڑوں کے اندر تھے۔ میں نے کان لگائے۔ زینان نے پوچھا۔ "بابا! کیا پتا؟ کیا ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی؟" مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ زینان کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا

اُسے یہ دھیان تو رکھنا چاہیے تھا کہ وہ ایک بوڑھے باپ کو دھتکار رہا ہے جو اپنی جان سے پیاری بیٹی کو اُس کی زندگی کا حصہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ماسٹر جی نے گھر سے چلتے ہوئے عموں کے فرق کا تجزیہ یہی کیا ہو گا۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا ہو گا۔

میں ڈاکٹر صاحب سے ملے بغیر ماسٹر جی کے پیچھے پچھے اسپتال سے نکل آیا۔ جب اسپتال کے گیٹ کے سامنے کُلی سڑک پر پہنچا، وہ مجھے امان اللہ قریشی کی کُلی کے باہر لگی ہوئی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں سڑک پر چند لمحوں کے لیے رُکا پھر گھر کی طرف چل دیا۔

علم دین پٹواری کے گھر کی کُڑ تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک میری نظروں کے سامنے ایک سایہ سا لہرایا۔ میں ٹھٹک کر رُک گیا۔ مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ خالدہ عرف بلو تھی۔ میرے رگ و پنے میں اچانک شناسائی برق کوند گئی۔

ایک لمبے میں ہی میرے قدم من من بھر کے ہو گئے اور میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ وہ بھاگ کر میرے مقابل آگئی۔ "مجھے پتا تھا کہ تم اس وقت یہاں سے گزر دو گے۔ اب تک تم چکر لگا چکی ہو۔"

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کیوں چکر لگاتی رہی ہو، مگر پوچھ نہ سکا۔ غیر ارادی طور پر ارد گرد دیکھا۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ "کوئی کام تھا کیا؟"

وہ میری طرف بڑھی۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ گیا، بولا۔ "دیکھ بلو! کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟ جاؤ، میں جلدی میں ہوں۔"

وہ ٹھٹک کر رُک گئی اور شکوہ کرنے لگی۔ "کیا میں تمہیں اچھی نہیں لگتی صاحب جی؟"

میں نے جی کڑا کر کہا۔ "ہاں! تم مجھے اچھی نہیں لگتی ہو۔"

"مگر کیوں؟" وہ وہاں ہی ہو گئی۔

"تم کھالے کی بہن ہو اور کھالا میرا یا رہے۔ میں نہ تو نمک حرام کہلوانا پسند کرتا ہوں اور نہ ہی بے غیرت۔۔۔۔۔ تم اچھی ہو مگر آج کل تمہارا رویہ اچھا نہیں ہے۔" میں نے ہمت کر کے اُس سے کہہ ہی دیا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے یک ٹک دیکھتی رہی، پھر سسکی لے کر پیٹی اور بھاگتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے دل کو ٹھیس سی لگی۔ دُکھ ہوا کہ اُسے یوں دھتکار دینا مجھے زیب نہیں دیتا مگر میں مجبور تھا کیونکہ غلط راستے پر ایک تواتر کے ساتھ اُس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا ضروری تھا۔

آپ کی بیٹی کو دیکھنے کے لیے آپ کے گھر جاتا ہوں، اُس پر مرنا ہوں۔ آپ اُس کا رشتہ لے کر میرے پاس چلے آئے ہیں۔ وہ نہیں، یہاں کے سبھی لوگ بڑے ہیں۔ غیر فطری اور غلیظ ذہنیت کے مالک ہیں، آپ بھی۔ ماسٹر صاحب! وہ میری بیٹیوں کے برابر ہے۔ اُس کا علاج محض مریمہ کجھ کے اپنی پیشہ دارانہ ذمہ داری کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ آپ لوگوں کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے آپ کے گھر چلا جاتا تھا کیونکہ آپ کے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔ مگر افسوس! آپ بھی مجھے سمجھ نہیں پائے۔ اگر میں شادی کا ارادہ رکھتا تو بہت پہلے میری کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ شادی ہو چکی ہوتی۔" اُسے کوئی جواب نہیں ملا۔ ماسٹر جی کی زبان بند تھی۔ بڑی دیر بعد، جب ڈاکٹر شاہ جی بول بول کر ٹھٹک گیا تو ماسٹر جی نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! مجھے آپ نے شرم سے ڈوب مرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ کی قسم! میرے دل میں کوئی میل نہیں ہے۔ آپ کے کردار پر شبہ نہیں، فخر ہے۔ مجھے آپ پر اور اپنی بیٹی پر مکمل بھروسہ ہے۔"

"تو پھر آپ نے کیا سوچ کر اتنی بڑی بات کہہ دی؟" "اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کو مد نظر رکھتے ہوئے؟"

ماسٹر جی کی شکست خوردہ آواز سنائی دی۔ "مجھے کسی کے مستقبل سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔" ڈاکٹر

شاہ جی نے گویا پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "آپ مزید کچھ کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ اس موضوع پر سوچنے کی زحمت بھی نہ کریں۔ مجھے شادی نہیں کرنی اور نہ ہی مجھے عورت کی ضرورت ہے۔ ہاں! آئندہ اپنی بیٹی کو اسپتال بھی نہ بھیجے گا۔ پہلے وہ مریمہ بن کر آتی تھی، اب میرے لیے گالی بن کر آئے گی اور میرے لیے اُس کی موجودگی کو برداشت کرنا مسئلہ بن جائے گا۔ جائیں پلیز!"

میری حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو گئی تھی۔ ماسٹر ولی محمد کا چہرہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر بھائی ویتا تھا کہ اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اُس کے شرم سے مرجانے کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے رشتے کی بات اپنے منہ سے کرنے کے لیے یہاں چلا آیا تھا۔ اس پر مستزاد ڈاکٹر کا نازیبا اور ناشائستہ رویہ تھا۔

وہ کیسے ہمت کر کے اُٹھا ہو گا، کیسے دروازے تک پہنچا ہو گا، محض اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اُسے پختہ اغنوں کی بنی روش پر کندھے جھکائے، سر بیہوڑائے جاتے ہوئے دیکھا تو کٹ کر رہ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی کو یقیناً ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انکار کرنا ہی تھا تو بے عزتی کیے بغیر بھی کیا جاسکتا تھا۔ کم از کم

”مگر میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔“
وہ منہ سے کچھ نہیں بولی بلکہ ایک عجیب نگاہ میرے
ہیروں پر ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اپنے ہیروں
کی جانب تعظیم طلب نظروں سے دیکھا۔
ایسے میں ملکہ بولی۔ ”پریشان نہ ہوں! دراصل آپ
نے دھیان نہیں دیا اور قالین پر جوتوں سمیت چڑھ گئے
ہیں۔ وہ اس لیے حیران ہو رہی تھی۔“

ملکہ درست کہہ رہی تھی۔ سرخ مٹلیں قالین پر میرے
جوتوں کے نشان واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے اپنی بے
دھیانی پر شرمندگی ہوئی جو یقیناً چہرے سے بھی ہویا ہونے
لگی تھی۔

ملکہ بولی۔ ”سرخ! اس میں پریشان ہونے کی بات
نہیں ہے۔ شہروں میں لوگ جوتوں سمیت قالین پر چڑھ
جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ دیہاتی ماحول ہے، جوتوں کے سول
مٹی سے لٹھرے ہوتے ہیں اس لیے جوتوں کو دروازے کے
قریب اتار دیا جاتا ہے۔“

وہ اپنی دانست میں میری غلطی کو جائز قرار دینے اور
میری شرمساری کو بخون کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے توجہ ہٹانے کے لیے اس کی ریاضی کی کاپی
اٹھالی۔ اس کی تحریر کو پڑھنا آدھ مشکل تھا۔ میں نے کہا۔
”بی بی! تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے۔ اس پر اضافی محنت
کرنا ہوگی۔“

وہ جی سر کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اس کا مجھے سر کہنا بہت
بھار تھا۔ شاید یہ اعزاز پہلی مرتبہ مجھے مل رہا تھا، بھی اچھا لگ
رہا تھا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ اُردو بول رہی تھی۔ یہاں
کے تمام لوگوں پر مقامی لہجہ اتنا غالب تھا کہ اُردو بولنے کی
کوشش کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں ’ڈنڈی‘ مار جایا کرتے
تھے۔ چونکہ مجھے ڈاکٹر شاہ جی کی طویل رفاقت میسر تھی، اس
لیے میرا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

کافی دیر گزر گئی تھی۔ میں کمرے سے نکل کر، چاچی
سے رکی علیک سلیک کر کے مہمان خانے میں بخت خان کے
پاس آ گیا۔

اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا۔ ”ہاں بھی تنگ میں! تم
نے اپنی اسٹوڈنٹ کو کیا پایا؟ کیا خیال ہے، بورڈ کے امتحان
میں اچھے نمبر حاصل کرے گی؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں بشرطیکہ اس کی ونڈ رائٹنگ کچھ بہتر
ہو جائے۔ اس کے لکھے ہوئے کو پڑھنا مشکل ہے۔ جواب
ٹھیک بھی ہوا تو اچھے نمبر نہیں ملیں گے۔“

بندے کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں
باقاعدگی کے ساتھ ملکہ بی بی کو پڑھانے کے لیے نہیں آ سکتا۔“
وہ دروازے میں رُک گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”کوئی بات
نہیں۔ دن بھر میں تمہیں جب بھی وقت ملے، نو سے گیارہ،
بارہ بجے تک کے دورانے کے علاوہ، آ کر پڑھا جایا کرو۔
اب تو ٹھیک ہے ناں؟“

میں چونکا۔ ”نو سے بارہ بجے تک کیوں نہیں؟“
”اُس وقت بی بی کو اُس کی استانی پڑھانے کے لیے آتی
ہے۔“ خان نے کہا اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر
نکل گیا۔ اس نے جاتے ہوئے جالی والا دروازہ بند کر دیا تھا۔
مجھ پر ہلکی سی گھبراہٹ طاری تھی۔ آج تک کسی کو
پڑھایا نہیں تھا۔ نا تجربہ کاری میں بخت خان کی بی بی کو پڑھانا
بہت مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ یہ وقت تمام خود کو سنبھالا اور
ملکہ کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بڑے اشتیاق سے مجھے دیکھ رہی تھی، بولی۔ ”آپ
باجی پروین کے بھائی ہیں ناں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ابھی تک بیڈ کے
میٹرس کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر کھڑی تھی۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا
اشارہ کیا تو وہ فوراً اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ میں نے اُس کے
سامنے بکھری ہوئی کتابوں میں سے ایک اٹھائی، ورق گردانی
کی پھر اُس کی کاپیوں کا معائنہ کیا۔ اُس کی ونڈ رائٹنگ کافی
خراب تھی۔ آج چونکہ پہلا دن تھا اور میں اس کام کے لیے
ذہنی طور پر تیار بھی نہیں تھا، اس لیے محض باتوں کے علاوہ کچھ
نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے کوئی نصف گھنٹے کے قریب تعلیم
سے متعلقہ اور غیر متعلقہ باتیں کیں۔ مجھے ایک طرح کا
اطمینان ہوا تھا کہ وہ بہت بااخلاق اور مؤدب واقع ہوئی
تھی۔ میں اُسے یہ آسانی پڑھا سکتا تھا۔

ابھی میں اُٹھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ نوکرانی چائے کا
کپ اور بسکٹ وغیرہ سے بھری پلیٹ ایک ٹیس سی ٹرے میں
رکھ کر لے آئی۔ میرے سامنے میٹرس پر رکھتے ہوئے بولی۔
”شہرے پتر! تم اگر چائے پینے کے عادی نہیں ہو تو بلا تکلف
بتاؤ، میں دودھ گرم کر لاتی ہوں۔ یہ بڑی بی بی کا حکم ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بڑی بی بی سے جا کر کہہ دو کہ اس تکلف
کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک دن کا نہیں، چار پانچ
مہینوں کا مزمان (مہمان) ہوں۔“

”سرا! تمہیں تے پتر! بھانویں جو ساری زندگی مزمان
تھیویں، اہ حید! اپنا گھر ہے۔ میرے ہاتھ ٹوٹ تو نہیں جائیں
گے تو تیرے لیے کچھ تیار کر لاؤں گی۔“ وہ محبت سے بولی۔

سال! اسے اگلی کلاس میں ریفر بھی کر دیا جاتا ہے۔“
میں دل ہی دل میں حیران ہوا۔ عام لڑکیاں اگر بغیر
چھٹی لیے دو چار دن کی غیر حاضری کر بیٹھتی تھیں تو اُن کا نام
اسکول سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ ایک دوسرے پر یوں کا نام
بھی اسی جرم کی پاداش میں خارج کیا جا چکا تھا۔ پھر سردار
حیات خان کی سفارش کے ساتھ اُسے کلاس میں بیٹھنے کی
اجازت مرحمت ہوئی تھی۔ ملکہ عام لڑکی نہیں تھی، بخت خان کی
بیٹی ہونے کے ناتے خاص تھی جس نے آج تک اسکول کا منہ
نہیں دیکھا تھا اور اُس کی نہ صرف روز بہ روز حاضری لگائی
جاتی تھی بلکہ ہر سال امتحان میں حاضری ظاہر کر کے پاس بھی
کر دیا جاتا تھا۔

ملکہ مجھے دیکھ کر، دوپٹا درست کرتے ہوئے، بیڈ سے اتر
کر کھڑی ہو گئی۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام گو ہوئی۔ مجھے اُس کا
مؤدبانہ انداز بھلا لگا۔ یہ اُس کی ماں، ذرینہ خانم کی تربیت کا
اعجاز تھا ورنہ سردار حیات خان اور سردار وریام خان کے
گھروں میں اخلاق کا یہ معیار دیکھنے کو نہیں ملتا تھا۔ خان کے
اشارے پر میں بیڈ کے کونے پر گھٹنے کے سے انداز میں بیٹھ
گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر، سفید
فلٹر والی سگریٹ سلگا کر، پیار سے بولا۔ ”شہرے پتر! چار ماہ
کے بعد ملکہ بی بی نے بورڈ کا امتحان دینا ہے۔ اسکول کی
ہیڈ میسٹریس اس کی پڑھائی سے مطمئن ہے مگر میں کوئی رسک
لینے پر تیار نہیں ہوں۔ اس کو پڑھانے کے لیے آنے والی
استانی ہر روز دو سے تین گھنٹے! اسے دیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں
کہ تم بھی کچھ دیر کے لیے یہاں آیا کرو اور اسے انگریزی اور
ریاضی پڑھا دیا کرو۔ یہ تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔“

مجھے پڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں انکار کرنا
چاہتا تھا مگر موت آڑے آئی۔

اُس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”تم میرے اپنے
ہو۔ میرے خاندان کے ہو۔ میں استانی کو ٹیوشن فیس دیتا
ہوں، تمہیں بھی دوں گا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا۔“

میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اُس نے میری خاموشی کو اقرار
جانا اور اطمینان بھرے انداز میں کمرے سے جاتے ہوئے
بولا۔ ”میں اب چلتا ہوں، تم دونوں ایک دوسرے سے
متعارف ہو جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ تمہیں یہاں کوئی
تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہاری چاچی تمہارا خیال رکھے گی۔“

میں بھی کھڑا ہو گیا، جلدی سے بولا۔ ”مگر خان جی! میں
نے اپنا کام کاج بھی کرنا ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا
زمینوں کا کام ایسا ہے کہ کبھی تمام دن مصروف رکھتا ہے تو کبھی

کام کاج سے فارغ ہوتے تو ہم سب نے درختیوں کی مدد سے
باجرے کے سٹے کاٹے اور انہیں پود (مخصوص، صاف ستھری
میدانی جگہ) پر سوکھنے کے لیے جمع کیا۔ اس کام میں سہ پہر
ڈھلنے کو آگئی۔ سردار وریام خان کا ٹیوب ویل چل رہا تھا۔
میں نے صوفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غسل کیا اور گھر کی راہ
لی۔ کپڑے بدل کر سردار بخت خان کی حویلی پر پہنچ گیا۔

وہ مہمان خانے کے لان میں سرخ رنگ کی لوہے کی
کرسی پر بیٹھا کسی میگزین کے مطالعے میں غرق تھا۔ مجھے دیکھ
کر، رکی تبادلہ احوال کے بعد میرا ہاتھ تمام کر حویلی کے
مستور خانے میں داخل ہو گیا۔ میں اس حویلی میں بڑے
سالوں کے بعد داخل ہو رہا تھا۔ کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملی۔
کنال بھر کا وسیع اور صاف ستھرا مچن، رگڑے ہوئے پتھروں
کا رنگ برنگ فرش، خوبصورت ستونوں والے بڑے بڑے
برآمدے اور جالی دار دہرے دروازوں والے کمرے.....
کچھ بھی بدلا نہیں تھا۔ میں ہچکچاتا ہوا، شرماتا ہوا اُس کے شانہ
بہ شانہ چل رہا تھا۔ برآمدے میں بھی ہوئی رنگین چار پائی پر
چاچی براجمان تھی۔ ساتھ والی چار پائی پر دو عورتیں بیٹھی ہوئی
تھیں۔ یہ مزارعوں کی بیویاں تھیں جنہیں کسی کام سے بلا یا گیا
تھا یا وہ ان خود اپنے کسی کام کے سبب یہاں آئی تھیں۔ مجھے
دیکھ کر اُن کے چہروں سے حیرانی مترشح ہو گئی۔ خان کی حویلی
کے زنان خانے میں میری موجودگی حیرت انگیز تھی۔

مجھے دیکھ کر چاچی چار پائی سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔
”خان جی! بڑے عرصہ کے بعد شہر اتر حویلی میں آیا ہے۔“

اُس نے نور پور کی روایات کے مطابق میرے سر پر
ہاتھ پھیرا، پروین، فرزاند، شبانہ اور چاچی کی فردا فردا
خیریت دریافت کی۔ گھبراہٹ میں سے کوئی بھی حویلی میں
قدم نہیں رکھتی۔ میں نے کام کی زیادتی کو جواز بنا کر اُسے
مطمئن کرنے کی رسی کوشش کی۔

اُس نے بخت خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ملکہ
وہی اپنے کمرے میں ہے۔“

مجھے اپنے ساتھ لیے بخت خان برآمدے میں کھلنے
والے آخری دروازے میں داخل ہوا۔ ملکہ بڑے سے بیڈ
کے بچوں سچ آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے سامنے
کاپیاں اور کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

خان میرا تعارف کرانے کے بعد بولا۔ ”ملکہ! آٹھویں
جماعت میں پڑھتی ہے۔ چونکہ یہاں کوئی اچھا اسکول نہیں
ہے، اس لیے ہم نے ابھی تک اسے اسکول میں نہیں بھیجا۔
ہاں! اس کا نام اسکول کے ریکارڈ میں درج ہے اور سال بہ

دیتا تھا۔ شمیم ہفتے میں تین دن ڈیوٹی پر آیا کرتی تھی۔ وہ قریشی موڑ کی رہنے والی تھی۔ اُس کا چھوٹا بھائی موٹر سائیکل پر اُسے لاتا تھا اور اُس کی واپسی تک اسپتال میں رہتا تھا۔ کئی دنوں بعد، کھالے کے بیان پر میں تب ایمان لایا تھا جب میں نے دیوانے کو بڑے شرمائے ہوئے انداز میں ایک خط شمیم کو تھماتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے تب ہوئی جب مجھے پتا چلا کہ شمیم بھی اُس کا بھگڑی شاعر میں انٹرلڈ تھی۔

مراد بخش دیوانہ کا تذکرہ دیر گئے تک چھڑا رہا۔ یادوں کے اعادے میں کافی دیر گزر گئی تھی۔ ایسے میں وہ تذکرہ بھی آن چھڑا جس سے دامن چھڑاتے، آنکھیں میچاتے بچپن اور پھر لڑکپن گزر گیا تھا۔ کھالے کے دماغ کی پھر کی الٹی کھومنے لگی تھی، سچی اچانک بولا۔ ”یار شہرے! تم اُس قصے کو تو بالکل بھول بیٹھے ہو۔“

میں چونکا۔ ”کس قصبے کو؟“
 ”اُس خونیں قصبے کو جو تم نے بچپن میں بھڑولے کے
 اندر کھڑے ہو کر سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا تھا.....“
 اچانک ہی جیسے میری سانسوں کو آگ لگ گئی۔ دھڑکن
 سینے میں ہی کہیں پہنچ کر رہ گئی۔ برس ہا برس سے آنکھوں کے
 پردوں پر ٹھہرے ہوئے اس سفاک انسانی چہرے نے تو
 مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا تھا۔
 لائے قد کے شخص کا جھکا ہوا مگر تھوڑا سا اٹھا ہوا بڑی مونچھوں
 والا غوغور چہرہ، غیر معمولی حد تک پھیلی ہوئی دہشت ناک
 آنکھیں اور چہرے کے تاریک پس منظر میں خون کی سرخ
 آمیزش..... اسے تو میں گزشتہ کئی سالوں سے بلا ناغہ
 دیکھتا چلا آیا تھا۔

میں نے پوری سختی سے اپنے دانت بھیج لیے۔ وہ کھردری اور پاٹ دار آواز بھی مجھے فراموش نہیں ہوئی تھی جو میں نے اُس رات سنی تھی۔ چونکہ میں اور کھالا اپنے بچپن میں اُس چہرے کی تلاش کے نام پر اطراف کے تمام دیہاتوں کی سائیکلوں پر آوارہ گردی کر چکے تھے۔ مگر اُسے نہیں ملنا تھا۔ نہ ملا۔ میں نے کھالے کو اُن گنت مرتبہ وہ خوں چکاں منظر لفظوں کے پردے پر سجا کر دکھایا تھا اور اِس عہد کو دہرایا تھا کہ زندگی میں اُسے تلاش کر کے اپنے معصوم والدین کے کُل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ ہر بار کھالے نے اپنی اعانت کا یقین و اشکاف انداز میں کرایا تھا۔

ہمارے درمیان خاموشی کی طویل رہ گزر چکی ہو گئی۔
 کھالا متاسف تھا کہ اُس نے یہ تذکرہ کیوں چھیڑا۔ میں سبک

’ہٹا کر‘ سے ہتھیلی مارتے ہوئے کہا۔
 میں ’پی آر او‘ کی تفسیر و تشریح سن کر بہ مشکل اپنی نفی
 روک پایا، بولا۔ ”اور بھی کچھ بتایا اُس نے؟“
 ”ہاں! بتا رہا تھا کہ چند مہینوں میں بڑا خان نور پور کی
 گلیوں کے لیے بھی گرانٹ منظور کروا لے گا۔ یہاں نالیاں اور
 ’وانگ‘ لگوانے کا ارادہ رکھتا ہے۔“ وہ دیدے گھما کر بولا۔
 میں نے نیم مایوسی سے کہا۔ ”یہ بات میں گزشتہ تین
 برسوں سے سن رہا ہوں۔“

”افوہ! اللہ تمہیں ہدایت دے۔ دیوانہ مجھوٹ بولتا ہے کیا؟“

جواباً میرے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ وہ جربز ہو کر رہ گیا۔ گردن کو اکڑاتے ہوئے دائیں بائیں پھیرا اور بجلی کی مستعدی سے سلاکی مشین اپنی جانب مٹھیٹ کر سوئی میں دھاگا ڈالنے لگا۔ اُس نے زبان سے نہیں کہا تھا مگر اُس کی اکڑی ہوئی گردن نے باور کرا دیا تھا کہ مجھے اب ’گمروندے‘ سے رخصت ہو جانا چاہیے۔

میں نے جیتے ہوئے 'خدا حافظ' کہا اور گھروندے سے نکل آیا۔ مجھے علم تھا کہ اب دو تین دنوں تک گھروندے میں میرا ذکر خیر یہ کثرت چھڑے گا اور ہر موجود ناموجود خا میری شخصیت میں بڑے شاعرانہ انداز میں فٹ کی جائے گی۔

میں کھالے کی منہ پھاڑے کھڑی دیکن کی طرف بڑھ گیا۔ شیدو بوٹ کھول کر انجن پر جمکا ہوا تھا۔ کھالا پھیر تلے بڑی ہوئی جھلنگا جا رہا پانی پر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر نیم دراز تھا۔ میں کھالے کو نور پور میں بجلی کی گرانٹ آنے کی خوشخبری دینا چاہتا تھا مگر اُس تک یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

بولی۔ ”دیوانے کے پاس بات پہنچے اور نور پور کا ٹھکانہ
 بڑا بچہ بھی سن نہ پائے، ناممکن ہے۔ وہ تو پشٹا ڈھول ہے۔
 جس بات کی مشہوری کرنی ہو، وہ بات دیوانے کو بتا دی
 جائے، آن کی آن میں پورے علاقے میں پھیل جاتی ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”مگر ایک بات ہے کھالے! وہ زبان کا اتنا
 کچا بھی نہیں ہے۔ جس بات کو اُس نے اپنے دل میں دبا
 کر رکھا ہو، لاکھ کریدتے رہو، اس کی ہوا تک نہیں نکلے دیتا۔“
 کھالے نے میری بات کی تردید نہیں کی۔ موضوع بدل
 کر مجھے ایک راز کی بات بتانے لگا۔ اُس کی عقابلی نظروں
 نے چند دن قبل تاڑ لیا تھا کہ دیوانہ اسپتال میں ڈیوٹی پر آنے
 والی ایل ایچ دی، خیمہ کو لپچا کی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا
 ہے۔ مجھے سمجھ آنے لگی کہ ہر شام کو کھالے گھروندے میں بیٹھا
 دیوانے کے ہاتھوں کی دودھ پتی چائے پیتا ہوا کیوں دکھائی

دیتے ہو۔“
 ”لو سنو! تم بھی تو مہینوں بعد اپنی سوہنی سی صورت دکھاتے ہو ہم غریبوں کو..... اب بتاؤ، کسی بیو گے یا چاہ بنواؤں؟“
 میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کسی چیز کی طلب نہیں۔ بیٹھو اور اپنا کام کرو۔“
 وہ سلاکی مشین کے دو اطراف میں پھیلا ہوا آسمانی نیلے رنگ کا کپڑا سمیٹ کر، سلاکی مشین کو تھوڑا پرے دھکیل کر ہمد تن گوش ہو گیا اور بولا۔ ”آج کیسے گھر وندے کی طرف آن سکتے؟ خیر تو ہے؟“

میں نے بتایا کہ مجھے کوئی کام نہیں بلکہ محض ملنے اور مپ شپ کرنے کے لیے آیا ہوں تو وہ بڑا خوش ہوا۔ چند ہی منٹوں میں نور پور کے سیاسی اور سماجی حالات زیر بحث آگئے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ نور پور کے لیے بڑا خان بنی گرانٹ منظور کر دالایا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اب چند ہی یونوں میں نور پور کے ہر گھر میں بجلی پہنچ جائے گی اور لوگوں کی مٹی کے تیل سے جان چھوٹ جائے گی۔

ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”یارو یکھنا مسلم مغل
کو، سہ پر بانہیں رکھ کر پیٹنا پھرے گا کہ اُس کی کما کی آدمی رہ
جائے گی۔“

اسلم مغل نے اپنی دکان کے آگے بڑا سٹاڈیزل ٹینک رکھا ہوا تھا۔ ڈرم کو ٹوٹی لکڑی کے تیل کی بھی چھوٹی سی ٹینکی بنا رکھی تھی جو سارا سال دکان کے باہر دھری رہتی تھی۔ دونوں ٹینکیوں کی ٹوٹیوں پر شام کو تالے لگا کر گھر چلا جاتا تھا۔ بقول اس کے، ڈیزل سے زیادہ مٹی کا تیل منافع بخش ثابت ہوتا تھا۔ ڈیزل کے خریدار کم تھے۔ مراد بخش دیوانے کا خیال لکل درست تھا کہ بجلی آنے کے بعد اسلم مغل کی دکانداری کا ندر پڑ جانا قریب از حقیقت تھا۔

میں نے استعجاب آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”اتنی اہم خبر تم تک کسے پہنچ گئی؟“

”بڑے خان کا ’پنی آراؤ اپنے کپڑے سلوانے کے لیے میرے پاس آتا رہتا ہے۔ کل اُسی نے بتایا تھا۔“ وہ عادتاً گردن اکڑا کر بولتا۔

”جی آراؤ؟ یہ کیا شے ہے؟“
 ”جہا نہیں کن جاہل لوگوں سے دیوانے کا پالا بڑ گیا ہے۔ اوئے اللہ کے بندے! جی آراؤ یعنی پبلک ریلیشن آفیسر، اس کے معانی ہیں منشی۔۔۔۔ منشی اللہ دتے کی بات کر رہا ہوں۔“ اُس نے معنوی تاسف بھرے انداز میں ماتھے پر

اُس نے میری بات سے اتفاق کیا، بولا۔ ”یہ کام تم ہی اپنے ذمے لو کیونکہ اُس کی اُستانی اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتی۔ اس کی اپنی لکھاائی بھی بس اینویں ہی ہے۔“

کچھ غیر متعلقہ باتوں کے بعد اُس نے پوچھا۔ ”تم نے کھالے سے بات کی تھی؟“

میں چونکا۔ ”کون سی بات؟“

”سامیں دل جیت شاہ کی سرگرمیوں کی خفیہ نگرانی والی بات!“ اُس نے یاد دلایا۔

”ہاں! ابھی وہ ساتھ دینے پر رضامند نہیں ہوا مگر مجھے یقین ہے کہ میری ضد کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں پائے گا۔“

”تم دونوں کسی شام کو یہاں آؤ گے۔ اگلے بیٹھ کر پلاننگ کریں گے، پھر مزار پر جائیں گے۔“ بخت خان نے سمجھایا۔ ”بلکہ ایسا ہے کہ میں بشیر کو بھیج کر سب کو یہاں اکٹھا کر لوں گا تاکہ کھل کھلا کربات کی جاسکے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اجازت لے کر حویلی سے نکل آیا۔ اس کے بعد ملکہ کو ہر روز پڑھانے کے لیے حویلی جانا میرا معمول بن گیا۔

شام نور پور کے کچے گھروں کے منڈیروں تک اتر آئی تھی۔ سورج نوری چوک والی سڑک کے کنارے ایستادہ بڑے درختوں کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر مراد بخش دیوانہ کے گھر وندے پر پہنچ گیا۔ اُس نے اپنی ہنسی بیٹھک کو ہی دکان بنا رکھا تھا۔

وہ ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے بڑا سا چوبلی تختہ دھرا ہوا تھا جس پر کونکوں والی استری، لوہے کا ایک کڑا جس پر گرم استری رکھی جاتی تھی اور ایک پرانی سلاخی مشین رکھی ہوئی تھی۔

ایک بڑی سی پیچی بھی دکھائی دے رہی تھی جسے ہاتھ لگانا بھی جرم قرار پاتا تھا۔ اپنے پیچھے اُس نے دیوار پر میخوں کی مدد سے کئی رسیاں باندھ رکھی تھیں جن پر سلائی شدہ سوٹ ایک خاص تکنیک سے لٹکے ہوئے تھے۔ لوگوں کو بٹھانے کے لیے اُس نے اپنے پٹے کے سامنے اور دائیں ہاتھ پر چٹائیاں بچھا رکھی تھیں۔ یہی سامان اُس کی دکان کا یا گھر وندے کا عملی اثاثہ تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر فرط مسرت سے جھوم اٹھا، مخصوص پر جوش
 لکھ میں بولا۔ "آہا! شہرِ اخان میرے گھر دے پر آیا ہے،
 ولی، ہوتو دلیز پر تل انڈیلے، کوئی ہوتو نائی کو دیگ چڑھانے
 سلیبا (پیغام) دے آئے۔"
 میں جھینپ کر بولا۔ "ناں گیا کر بار! بلا ودر شہر مسار کر

تمہارے پاس آ کر رہتا ہوں، میرے آہرؤوں کی لاج رکھ لو اور کہیں سے اُسے ڈھونڈ نکالو ورنہ میں سکھ کا سانس نہیں لے پاؤں گا۔“

”فکر نہ کر ادے! وہ لومڑ کا بچہ کھالے کی نظروں سے چھپ نہیں پائے گا۔ کھتی (گردن) سے پکڑ کر یار کے قدموں میں لایا جھینکوں گا ایک دن۔ ہاں!“ اُس کا لہجہ کا اکھڑ پن عود کر آیا۔ ”تم اپنے رشتہ داروں کو باتوں باتوں میں ٹٹولتے رہا کرو۔ بخت خان کو شاید علم ہو۔ یارن خان ایک دو ماہ تک آنے والا ہے، اُس کے قریب ہونا اور ٹوہ لینا۔ شاید کوئی کلیڈل جائے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُس نے باتوں کا رخ بدل دیا اور کچھ ہی دیر میں ہماری ملاقات کی بساط سمٹ گئی۔ آج میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں بھی نہیں جاسکا تھا، اس لیے علی الصباح اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نماز پڑھنے کے بعد کھیتوں کی طرف نکل رہا تھا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔ ہم معمول سے زیادہ دور نکل آئے۔

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ”ڈاکٹر جی! ماسٹر ولی محمد آپ سے کیا کہنے آیا تھا؟“

”تمہیں علم تو ہے، پھر کیوں پوچھتے ہو؟“

میں دم بخود رہ گیا۔ ”مجھے تو علم نہیں ہے۔“

وہ ٹھہر گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”کیا تم مجھے ’نان سنس‘ خیال کرتے ہو؟“

میں جلدی سے بولا۔ ”نہیں شاہ جی! میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں۔“

”تو پھر جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟“ شاہ کے لہجے میں غصہ نہیں تھا۔ ”مجھے علم ہو گیا تھا کہ تم کھڑکی سے چپک کر بیٹھے ہو اور میری اور ماسٹر صاحب کی باتیں سن رہے ہو مگر یہ سوچ کر کہ یہ تمہارا فطری عمل تھا، درگزر کر گیا۔“

”مم..... میں.....“ میں ہکا کر رہ گیا۔

وہ بولا۔ ”شہر یار! تجس ایک فطری مادہ ہے۔ اس پر انسان کو بعض اوقات عمل اختیار نہیں رہتا اور انسان وہ کام کر جاتا ہے جسے عام طور پر وہ خود نا مناسب اور غیر اخلاقی قرار دیتا ہے۔ دو افراد کی نجی گفتگو کو چوری چھپے سننا جرم کی ہم سطح غیر اخلاقی حرکت ہے جو اُس رات تم سے سرزد ہوئی۔“

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ میں نے فوراً معذرت کی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا۔

وہ بولا۔ ”میں کافی دنوں سے زیناں کا احقانہ رویہ بھانپ رہا تھا مگر چونکہ اُس نے اپنے باؤلے پن کا کھل کر

”یہ حماقت نہیں، شبہ ہے۔“ وہ میرے چہرے کا بہ غور مشاہدہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میری ماں کہتی ہے کہ مرگ کی تمام رسموں پر تمہارے تھیال سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ جنازہ، قفل خوانی اور چلم..... کسی پر بھی نہیں حالانکہ اُنہیں بروقت اطلاع مل گئی تھی۔ چاہتے تو منہ دیکھنے پر بھی پہنچ سکتے تھے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”وہ تو اختلافات کی وجہ.....“

اُس نے جلدی سے میری بات کاٹ دی، بولا۔

”اختلاف زندوں سے ہوتا ہے، مردوں سے نہیں۔ ویسے بھی بیٹی یا بہن سے ایسا کیا تنازعہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی میتوں کو کاغذ حاکم نہ دیا جائے؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بولا۔ ”پھر اُن دونوں ماموؤں کے انجام بھی نظر میں رکھو تو صاف پتا چل جائے گا کہ قدرت نے اُن سے کوئی انتقام لیا ہے۔ کسی جرم کی پاداش میں اُنہیں دنیا میں رسوا اور ذلیل و خوار کر کے مارا ہے۔ ممکن ہے، وہ جرم یہی ہو جس کی سزا تم دونوں بہن بھائی کاٹ رہے ہو۔“

”کوئی اپنی بہن کو، بیٹی کو قتل کرے گا؟“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں کھالے..... ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میں بیزاری سے بولا۔ ”میں تمہاری بے گئی باتوں کے جواب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”تم کچھ نہ کہو، سوچو..... سوچنے سے بہت سی راہیں کھلتی ہیں۔“

”تمہارے ساتھ میں نے گھنٹوں اس موضوع پر باتیں کی ہیں، تم نے کون سی راہ کھولی ہے اب تک؟“

وہ خاصا جربزد کھائی دینے لگا۔ بولا۔ ”کسی دن تو کھل ہی جائے گی، اللہ پر یقین رکھنا چاہیے۔“

”تب تک شاید میرے بازوؤں میں دم نہ رہے۔ تب تک شاید میرے باپ کا قاتل اپنی طبی عمر پوری کر لے اور میں اُس کی قبر پر کھڑے ہو کر اپنی ناکام کوششوں کا ماتم کروں۔“ میرے لہجے میں بے حد نفی سرایت کر گئی۔

اُس نے میرے گالوں پر ہاتھ رکھے، چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔ ”شہرے! دیکھ، رونا مردوں کے لیے گالی ہوتا ہے۔ اپنے ڈکھ کو سنبھال رکھ، اس کی گری کو آئسوؤں کی شکل میں ضائع نہ کرو..... دیکھنا ایک نہ ایک دن وہ ضرور ملے گا۔“

تب مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں جھٹک اٹھیں تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے موجود منظر دھندلا گیا اور کھالے کا چہرہ پانی میں تیرتا دکھائی دینے لگا۔ میں نے پوری طاقت سے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور زور دے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کھالے! بھری دنیا میں تمہیں یار بتایا ہے،

دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ٹی بی نے اُس کا اندر چاٹ لیا تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جو نشے میں دھت تھا۔ اُس کی حالت زار بتاتی تھی کہ وہ آخری سانس شمار کرنے پر مامور ہو چکا تھا۔ میری ممانی اپنا آسیب زدہ بڑھاپا کھنڈر نما درود پوار پر اوڑھائے موجود تھی۔ مجھ سے مل کر تینوں کو کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اگر ہوئی تھی تو اُن کے چہروں پر نمودار ہونے سے قبل ہی رخصت ہو گئی تھی۔

میں نے کھالے کی ہدایات کے عین مطابق ماموں اور ممانی کو احتیاط سے کریدنے کی کوشش کی تھی اور چاہا تھا کہ اپنی ماں کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل ہو جائیں مگر اُن دونوں نے میری باتوں میں نہ تو خاص دلچسپی لی اور نہ ہی کوئی راز افشائی کی۔ میری ہر دوسری بات کا جواب غربت اور بیٹے کی حالت زار پر رونے کی صورت میں ملا۔ مایوس ہو کر ہم کچھ کھائے پیے بغیر وہاں سے اٹھ آئے۔ کھالا چاہتا تھا کہ محلے کے کسی اور شخص سے ملاقات کی جائے مگر میں ماموں کے گھر کی صورت حال کو دیکھ کر اتنا کبیدہ خاطر ہوا تھا کہ ایک ہل بھی وہاں رہنا دشوار محسوس کرنے لگا تھا۔

میں نے کھالے سے کہا۔ ”نور پور میرا گاؤں ہے۔ کل تک یہی میرے باپ دادا کا گاؤں تھا۔ میرے باپ کو ہر کوئی اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہے۔ اُس کو اپنا رشتہ دار مان کر، اُس کے سونہپ (خوب صورتی) اور دلیری کے قصے سناتا ہے مگر کوئی بھی نہیں جانتا کہ اُس کی کس کے ساتھ دشمنی تھی۔ میں نے چاچا چراغ سے، چاچی، حیات خان اور امیر نواز کو بھی کرید کر دیکھا ہے۔ کوئی نہیں جانتا۔ تب کوئی نہیں جانتا تھا۔ اب کوئی کیا یاد کیے بیٹھے ہوگا۔“

میرے لہجے میں شامل مایوسی کے عنصر کو بھانپ کر کھالے نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا، آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، بولا۔ ”شہرے! میں کہتا ہوں ناں کہ زیادہ پڑھ لکھ کر انسان ڈر پوک ہو جاتا ہے، زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے اور خدا کی رحمتوں پر بھروسہ نہیں کرتا، تو ٹھیک ہی کہتا ہوں ناں..... مجھے یقین ہے کہ اک نہ اک دن تمہارے باپ کے قتل کے پیچھے کھڑی ہوئی کہانی پر سے پردہ ضرور اٹھے گا اور ہم قاتل کی گردن و بوج لیں گے۔“

شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ میرا یقین متزلزل ہو چکا تھا۔ مجھے اب کوئی اُمید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ بولا۔

”میرا دل کہتا ہے کہ تمہارے دونوں ماموؤں کا اس قتل سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔“

میں چونکا۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟“

اٹھا تھا کہ میری جوانی بھری بائیس اُمی اپنے ماں باپ کے قاتل کی گردن ماپنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں۔ کھالے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ہمدردی سے بولا۔ ”شہرے! مجھے یقین ہے کہ وہ اک نہ اک دن ہمیں ضرور ملے گا اور اُس کا گندا جسم اُس کے اپنے خون سے رنگ جائے گا۔ ہاں! مجھے یقین ہے کیونکہ سوہنے خان کی جوانی تمہاری بائیسوں میں سمٹ چکی ہے۔ اُس کی بے گناہی اپنے قاتل کی تلاش میں نکلی ہوئی ہے۔“

دُور اشتعال و کرب سے میرے لب سل گئے تھے۔ ندامت آنکھوں میں نمک گھولنے لگی۔ کھالے نے درست کہا تھا کہ میں اب پہلے کی طرح اپنے مقتول والدین کو یاد نہیں کرتا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس سینے میں اتاری۔ الاؤ کچھ کم ہوا۔ بولا۔ ”کھالے! نور پور والے کہتے ہیں کہ وہ ڈکیتی کی واردات تھی جس میں میرے والدین قتل ہوئے تھے مگر میں آج تک اس نظریے کو دل سے مان نہیں سکا کیونکہ اُنہوں نے گھر سے کوئی چیز اٹھائی نہیں تھی اور نہ ہی قاتلوں نے میرے باپ کی جینیں ٹٹولی تھیں۔“

کھالا نور پور کے لوگوں کی اکثریت کی طرح اُس واقعے کو ڈکیتی کا نتیجہ قرار دیا کرتا تھا، بولا۔ ”مگر تمہارے باپ، سوہنے خان کی کسی سے دشمنی بھی تو نہیں تھی کہ اُسے اور تمہاری ماں کو یوں بے سمانہ طریقے سے قتل کیا جاتا۔ ایسی کوئی بات ہوتی تو آج تک محل کر سامنے آ چکی ہوتی۔“

کھالے کی سوچوں کا غیر معمولی استغراق اُس کی پیشانی پر لکھروں کی صورت ثبت تھا۔ انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ کا تب رہی تھی اور وہ لب بستہ، یک تک خلا میں گھورتے ہوئے کسی نا بدیدہ شے کو تلاش کر رہا تھا۔ اپنے سر کو بھی انداز میں اوپر نیچے جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”شہرے! تم مانو یا نہ مانو، اس کہانی کا خونی سراشاہ جمال میں سے ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اتنے بڑے واقعے کے پیچھے کوئی اتنی معمولی سی وجہ نہیں ہوتی جو تلاش کرنے سے نہ مل سکے۔ تمہارے ناکے (تھیال) بہت سی باتوں پر مٹی ڈال چکے ہیں۔ اُس مٹی کو اٹھانا ہوگا تب کہیں جا کر ہم اُس شخص تک پہنچنے کے قابل ہوں گے جس کا چہرہ تمہارے ذہن میں نقش ہے۔“

”مگر ہم شاہ جمال سے دو مرتبہ ناکام واپس آئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

شاہ جمال، چوک قریشی سے جنوبی سمت کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع میرا تھیالی قصبہ تھا۔ میں اور کھالا آخری بار یہی کوئی تین سال پہلے وہاں گئے تھے اور میں آخری مرتبہ اپنے ماموں سے ملا تھا کیونکہ اُس کے دو ماہ بعد وہ کھانسا ہوا

اظہار نہیں کیا تھا، اس لیے میں نے اسے سمجھانا اور باز رکھنا مناسب خیال نہیں کیا۔ ماسٹر صاحب کی دل شکنی بھی میں نے محض اس لیے کی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس باب کو بند سمجھے اور مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ اگر میں نرم رویہ نہ رکھتا تو وہ دو چار دن گزار کر پھر میرے سر پر آن سوار ہوتا۔

”کیا زیناں کا احمقانہ رویہ غیر فطری تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”نہیں۔ ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ایک ربط، ایک تعلق بڑے غیر محسوس انداز میں از خود پیدا ہو جاتا ہے جس کے لیے ہم ٹرانس فی ریشن کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یہی تعلق آفیسر اور ماتحت کے درمیان استوار ہو سکتا ہے۔ ایک استاد اور شاگرد کے درمیان بھی پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس میں اتنی شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ اسے محبت کے تعلق سے جدا سمجھنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ زیناں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئی تھی کہ محبت کا مغالطہ کھا بیٹھی۔“ اس نے مجھے بڑی تفصیل کے ساتھ سمجھایا۔

”تو پھر اسے حق بجانب سمجھنا چاہیے تھا آپ کو۔“ اچانک اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ ناچنے لگی، بولا۔ ”بڑے چالاک ہو۔“

”فرض کریں، آپ کی شادی زیناں سے ہو جائے، جب کیا ہوگا؟“ میں نے حذبذب انداز میں پوچھ ہی لیا۔ ”نہیں شہر یار! جس مفروضے کو ذہن پیچ ہی نہ سکے، اس پر بحث کرنا فضول ہوتا ہے۔“

”مگر کیوں؟ آپ اس موضوع پر کیوں سوچنا نہیں چاہتے؟“

”میرے جذبات کا سورج ناوقت ڈھل گیا تھا۔“ اس نے بے حد اختصار سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ تم کوئی اور بات کرو۔“

”مجھے بھی یہی یوں لگتا ہے کہ آپ نے کسی کو بے حد چاہا تھا اور وہ آپ سے۔۔۔۔۔“

”میں نے کہا ناں کہ تم کوئی اور بات کرو۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ جستجوئے آگہی کی اس حد تک میں کئی مرتبہ پہنچا تھا اور ہر بار ہزیمت بار ہونا پڑا تھا۔ میں نے جیسی چاقو کی مدد سے اسے ٹیکر کی سواک بنا کر دی اور خاموشی سے اس کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ میری گفتگو نے اسے بے چین اور مضطرب کر دیا تھا۔ چال میں بھی فرق آ گیا تھا۔ میں اسے مزید کریدنے کے بجائے اس کے بیان کیے ہوئے

فلٹے میں الجھ گیا۔ اس کی بات ’یہی تعلق استاد اور شاگرد کے درمیان بھی پیدا ہوتا ہے‘ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ کیا میرے اور ملکہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا؟ وہ بچی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ میرے بارے میں کچھ نہ سوچتی۔ اسے اگرچہ نادان قرار دیا جاسکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ کیا ڈاکٹر شاہ جی کی طرح میں اسے سمجھنے کی قدرت رکھتا تھا؟ میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیال کا از خود جواب دیا اور لنگی میں سر ہلا دیا۔

آج میری پانی لگانے کی پاری تھی۔ نئے پر پینچ کر پتا چلا کہ رات میں کسی وقت نہر گر گئی تھی۔ مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ اب وریام خان سے پانی خرید کر لگنا تھا۔ میں نے اپنی کسی نئے پر چھوڑی، ڈیرے سے درانتی اٹھائی اور باجرے کی باقی ماندہ دو کیاروں کے سٹے کاٹنے لگا۔ کھیت کے آخری کیارے میں، باجرے کے بے ثمر پودے مخصوص انداز میں مل رہے تھے۔ کوئی موشیوں کے چارے کے لیے باجرہ کاٹ رہا تھا۔ کون کاٹ رہا ہے؟ میں نے دھیان نہیں دیا کیونکہ باجرے کے سرکٹے پودے موشیوں کو ڈالتے کے ہی کام آتے تھے۔ جو بھی باجرہ کاٹ رہا تھا، وہ ہمارا فائدہ ہی کر رہا تھا، ہماری زمین صاف کر رہا تھا۔ چونکہ ہمارے ہاں موشیوں کا چارہ موجود تھا، اس لیے ہم اپنے ڈھور ڈھوروں کو باجرہ نہیں ڈالتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ باجرہ کھانے والی بھینسیں اور گائیں دودھ کم دیتی تھیں۔

کچھ دیر بعد میرے کانوں میں نسوانی آواز پڑی۔ میں نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ زیناں کھڑی دکھائی دی وہ ہاتھ لہرا کر مجھے پکار رہی تھی۔ ”شہرے!“

پتا چلا کہ وہی باجرہ کاٹ رہی تھی۔ میں درانتی لہراتے ہوئے اس کے پاس چلا گیا۔ وہ پہلو پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی جبکہ اس کی ماں اور ایک بہن باجرہ کاٹنے میں مصروف تھیں۔ میں نے سب کو سلام کیا۔ بلائے جانے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی۔ ”میں نے ویسے ہی آواز دی ہے۔ ٹھیک تو ہونا؟“

اس کی ماں اور بہن درانتیاں زمین میں گاڑ کر میرے قریب آ گئیں۔ تبادلہ احوال کے بعد بے پردہ ہو گئیں۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ زمین، گھر، تعلیم اور میرا خاندان زیر بحث آیا۔ پھر زیناں کی ماں اور بہن اٹھ کر باجرہ کاٹنے میں مصروف ہو گئیں جبکہ وہ میرے پاس ہی بیٹھی رہی۔ آہستگی سے بولی۔ ”ڈاکٹر شاہ جی کیسے ہیں؟“

مجھے بلانے کے پیچھے یہی مقصد کارفرما تھا۔ میں نے کہا۔ ”بالکل ٹھیک ہیں۔“

”کوئی بات کرنا چاہتی تھی مگر جھجک رہی تھی۔ میں نے بالکل آسان کرتے ہوئے کہہ دیا۔“ کیا تمہیں اس لائق ہے؟“

”تذبذب کا شکار ہو گئی۔ گھاس کے ٹکے کھینچنے لگی۔ میں ہاں سوال دہرایا۔ جھکا ہوا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

مجھے دکھ ہوا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”زیناں! تم نے خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہارے بلکہ کسی بھی انسان کے بارے میں نرم گوشہ نہیں رکھتا۔“

اس نے سر اٹھانے سے احتراز کیا، بولی۔ ”مگر میں پانی کا کیا کروں؟ میں تو مانتی ہوں، یہ نہیں مانتا۔“

”اسے سمجھاؤ کہ وہ بوڑھا ہے، جھپٹی ہے، پردہ سی۔۔۔۔۔“

”سب کچھ جانتے ہو جیسے انہیں مانتا ہے۔“

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔“

”نہیں! مجھے لاج آتی ہے۔“

میں ہنسا۔ ”اپنے منگیتر کو خط لکھو۔ اسے بتاؤ کہ تم بالکل لگد ہو۔“

”دل نہیں مانتا۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”دل کیا مانتا ہے؟“

”مانتا نہیں، مانتا ہے۔ کیا تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟“ اس کے لہجے میں بڑی اپنایت بھری التجا درآئی تھی۔

”میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟“ میں چونکا۔

”انہیں سمجھا سکتے ہو کہ وہ میرے ساتھ۔۔۔۔۔“ اس نے ہان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

میں سمجھ کر بولا۔ ”وہ بچہ نہیں ہے، سمجھنے والا نہیں بلکہ مجھانے والا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ہی سمجھنا ہوگا۔“

اس نے پہلی مرتبہ سر اٹھایا۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ”کیا؟“

”یہی کہ ان لوگوں میں تھل نہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا پھر اُمید بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، بولی۔ ”وہ نور پور میں صرف تمہاری بات مانتے ہیں۔“

بے جاری غلط فہمی کا شکار تھی۔ عشق ایسی ہی بھول بھلیوں میں انسان کو لے جا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ جہاں انسان ہمارے کے لیے تنکوں سے بھی چھٹنے لگتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”یہ تمہاری تمام نیالی ہے۔ وہ میری بات سنا تو ہے مگر مانتا نہیں۔“

”ہاں شہرے! شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں نے سائیکس جیت شاہ سے لے کر کئی تعویذ گھول پلائے، دعا بھی کر دئی اور تین جھراتوں کو مزار پر دیے بھی چلائے مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سائیکس جیت شاہ نے تو کہا تھا۔۔۔۔۔“

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ”جیت شاہ نے کیا کہا تھا؟“

”یہی کہا تھا کہ وہ میری طرف مائل ہو جائیں گے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”سائیکس نے وعفیہ پڑھنے کے لیے دیا تھا، اکیس دنوں تک عمرگی دیے (نماز فجر کے وقت) پڑھتی رہی مگر کچھ نہیں ہوا۔ شاید میری قسمت ہی خراب ہے۔“

اس کی قسمت خراب نہیں تھی۔ خرابی اس کے دماغ میں ڈر آئی تھی۔ میں اسے ڈاکٹر شاہ جی سے باز رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کی مراد بھی برآنے والی نہیں تھی مگر میری باتیں محض اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، دماغ تک رسائی نہیں پا رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک آس بھری نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ”تم میرا ایک کام تو کر سکتے ہونا؟“

”کیا؟“

”کوئی چیز تمہیں دوں تو ڈاکٹر جی تک پہنچا دو گے؟“

”نہ؟“ میں نے جواب دینے کے بجائے فوراً سوال داغ دیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کچھ دیر سوچا پھر ہائی بھری۔

اس کی ماں کے ہوئے باجرے کو دو جگہوں پر باندھنے میں مشغول تھی جبکہ اس کی بہن عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں ٹپکتے ہوئے کھیت سے نکل آیا اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ پروین وغیرہ بھی پہنچ گئیں۔ آج ان کے ہمراہ غزالہ بھی آئی تھی۔ ان کی نگاہ زیناں پر پڑی تو میرے پاس درانتیاں رکھ کر بھاگتی ہوئی زیناں کے پاس پہنچ گئیں۔ یہ دیہاتی عورتوں کا خاص انداز ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ ضروری کام پر میل ملاقات کو فوقیت دیتی ہیں۔

غزالہ میرے پاس رُک گئی تھی، تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ ”یہ بھی نری جھپٹی ہے۔“

”کون؟“

”یہ زیناں۔۔۔۔۔ ماسٹر جی کی دھی!“ وہ تاسف بھرے انداز میں بولی۔

”کیوں؟ کیا ہوا اسے۔۔۔۔۔ جھپٹی بھلی تو ہے۔“

اس نے اپنے کان کے گرد انگلی کھمالی، بولی۔ ”دماغ

”اوائے جا پرے! وہ یہاں نہیں، ملتان میں رہتی ہے۔“

”جانتی ہوں۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ ہر جمعرات کی شام کو آتی ہے اور ہفتہ کی صبح کو جاتی ہے۔“ اُس نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو کیا ہوا؟“ مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی۔

”وہ سوہنی بھی بہت ہے۔“ اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں یہ اندیشہ ہے کہ میں اُس پر فریفتہ ہو جاؤں گا۔ ہیں؟“ میں ہنسا۔

”ماسی فاطمہ کہتی ہے کہ مرد اور اونٹ کا کچھ پتا نہیں چلا کہ کس کروٹ بیٹھ جائیں۔“ وہ شرارت سے مسکرائی۔

”تم خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ وہ بڑی مغرور لڑکی ہے۔ وہ مجھے کیوں لفت کرائے گی؟“

ایسے ہی وقت میں اُس کی نگاہ بھانے پر پڑ گئی۔ اُچھل کر کھڑی ہوئی اور اُس طرف بھاگ گئی۔ میں نے اُس کے تعاقب میں بھانے کی طرف دیکھا۔ پروین کی لاڈلی چھڑی

رسی چھڑا کر ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہی تھی۔ چھڑی کی آنکھیں غزالہ کی جولانی کو دیکھ کر تازہ دم ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی ڈم کمر پر

دھری کیے شرارت بھرے انداز میں اُچھل کود رہی تھی، دوڑ رہی تھی اور غزالہ اُسے پکڑنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے

پچھے پچھے بھاگ رہی تھی۔ بچپن لڑکپن کے مقابل آ گیا تھا۔

بچپن شریر ہوتا ہے، لڑکپن مست ہوتا ہے، دونوں تھکنے کا نام

نہیں لیتے۔ میں بڑے شوق اور انتہاک سے دونوں کی

بھاگ دوڑ دیکھ رہا تھا۔ آخر کار چھڑی اپنی ماں کی ٹانگوں میں

پناہ گزیر ہونے کے حُرم میں پکڑی گئی۔

جب سبھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئیں تو میں

دربارِ خان کے نشی کے پاس چلا گیا۔ اُس نے مجھے رات کو

پانی باندھنے کا حکم صادر کیا۔ مجبوری تھی وگرنہ رات کو پانی لگانا

میرے لیے بڑا تکلیف دہ کام تھا۔ تین گھنٹوں کے پانی کی

ادائیگی کی اور واپسی کا قصد کیا۔

مجھے سہ پہر تک کوئی کام نہیں تھا۔ کپڑے بدل کر مزار کی

طرف جا نکلا۔ مزار کے کھلے صحن میں کئی مرد و زن چلتے پھرتے

اور سستانے کی غرض سے بیٹھے دکھائی دیے۔ کوئی مقبرے کی

طرف جارہا تھا، کوئی مقبرے سے نکل کر شاہ ساہی کی خدمت

میں سلام عرض کرنے ہال کی طرف جارہا تھا۔ میں بھی جوتے

اُتار کر چادر پوش قبر پر گیا۔ فاتحہ پڑھی اور قبر کی اطراف میں

نصب شدہ خوب صورت رینگ کو تمام کر کھڑا ہو گیا۔ تین چار

پھر گیا ہے شودھی (بیچاری) کا۔ بڑھے ڈاکٹر کے لیے سارا دن آ رہی بھرتی رہتی ہے۔“

”آ رہی تو تم بھی بھرتی رہتی ہو؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”میں تو نور پور کے سب سے سوہنے چھوہر (لڑکے)

کے لیے آ رہی بھرتی ہوں۔“ وہ اتر آئی۔

”تم نے ڈاکٹر شاہ جی کو دیکھا ہے؟“

”ہاں! وہ بولی۔“ منہ متھے لگتا ہے پر ہے تو بوڑھا

ٹان!“

”کیا بوڑھے کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟“

”ہوتا تو ہے مگر دھڑک دھڑک کر تھک چکا ہوتا ہے۔“

وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

میں نے بہ طور احتیاط باجرے کے سرکٹے کھیت کی طرف

دیکھا۔ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ سبھی زمین پر بیٹھ کر کہیں

ہانک رہی تھیں۔ میں نے غزالہ کو ہانہ سے پکڑ کر نیچے بیٹھا

لیا۔ پیار کی پہلی گستاخی سرزد ہوئی۔ میں نے اُس کے چہرے

کو ہاتھوں کے پیالے میں سنہال کر اُس کی بند آنکھوں کو

چوم لیا۔ اُس نے کوئی مزاحمت کی اور نہ اُس کے چہرے پر

ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ مجھے شہ ملی۔ محبت کی

دافستگی کے بل پر حسن کی سلطنت میں گام بہ گام بڑھتا گیا۔

وہ بڑ حال سی ہو کر میرے سینے سے آگئی۔ تب مجھے محسوس ہوا

کہ اُس کی سانسیں غیر معتدل تھیں۔ بلو کی طرح اُس کے بدن

کو بھی گویائی نصیب ہو گئی تھی۔ میں نے اُس کے ہاتھ کی

پشت کولیوں پر لگا یا، وہ غیر متوقع طور پر تڑپ کر دوڑ ہو گئی،

قدرے پھولی ہوئی سانسوں میں بولی۔ ”یہ تمہیں کیا ہو گیا

ہے شہرے؟“

میں نے پوری شدت سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

”تو نرا جھلا ہے۔“

”تو بھی تو جھلی ہے ناں!“

”تو کیا ہوا؟ یہاں سارے ہی جھلے ہیں۔ تمہیں کون

سیانا دکھائی دیتا ہے؟“ وہ ایڑیوں کے بل پیچھے گھسٹ گئی۔

میں نے بات بدلنے کے لیے اُسے بتایا کہ میں ملکہ کو

پڑھانے کے لیے ہر روز بخت خان کی حویلی پر جایا کروں گا۔

وہ متفکر ہو گئی۔ بولی۔ ”تم وہاں نہ جایا کرو۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”عائشہ بی بی بہت مغرور اور تک چڑھی ہے۔“

”مجھے اُس سے کیا مطلب؟“ مجھے حیرانی ہوئی ”میں تو

ملکہ کو پڑھانے کے لیے وہاں جاؤں گا۔“

”آتے جاتے ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔“

دریش آئے تو ہمارے پاس آ جانا۔ ہمیں اپنا بزرگ اور دوست پاؤ گے۔“

اُس کے انداز نے سمجھایا کہ مجھے اب رخصت ہو جانا چاہیے۔ میں چونکہ ارادت مند کے رُپ میں آیا تھا، اسی رُپ میں جاتا تو اچھا لگتا۔ اس لیے میں اسے قدموں ہال سے نکل آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے شہلانے کے بعد وہ اپنے حجرے میں جائے گا۔ میں بچوں کے مل دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جہان کا مگر باریک جالی کی وجہ سے کچھ دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو پایا۔ میں کھڑکی کے نیچے، دیوار کی جڑ کے ساتھ کمر کا کرفرش پر بیٹھ گیا۔ مقبرے اور مہمان خانے کی دیواروں کی جڑوں میں کئی ٹھکے ہارے زائرین بیٹھے سستا رہے تھے، اس لیے میرا وہاں بیٹھنا معیوب یا نامناسب نہیں تھا۔ میری تمام تر توجہ حجرے کے اندر ہونے والی گفتگو پر مرکوز تھی۔

حجرے کا دروازہ ہلکی سی چڑچاہٹ کے ساتھ کھلا، پھر بند ہوا اور دل جیت شاہ کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”بچے! تم ادھر کمرے میں جا کر کچھ دیر بیٹھو۔“

حجرے کے اندر ایک اور کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر سائیں کی آواز سنائی دی۔ اب بتا لڑکی! تیرا مسئلہ کیا ہے؟“

لڑکی کی آواز بہت دھیمی تھی۔ پوری طرح اُس کا بیان کیا ہوا دکھڑا مجھے سنائی نہیں دیا مگر یہ پتا چل گیا کہ اُس کا باپ اپنے بیٹے یا بیٹھی کے ساتھ اُس کی شادی کرنا چاہتا ہے جبکہ وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔

دل جیت شاہ کا لہجہ بھی غیر معمولی حد تک دھیمہ ہو گیا۔ دونوں کی کمر پر پھر مجھ پر گفتگو کا متن واضح نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بہتری کوشش کی، جبکہیں بدلیں مگر ناکام رہا۔ کافی دیر گزر گئی تھی۔ میں جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے سایہ رخصت ہو گیا تھا اور سرمائے کے ابتدائی دنوں کی دھوپ بدن میں چھپنے لگی تھی مگر میں اپنے جیس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دیوار سے بیٹھا تھا۔ آخر مایوس ہو کر محن میں ایسا وہ نیم کے چھتری نما درخت تلے آن کھڑا ہوا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ لڑکی اپنے خوب رُپ بھائی کے ساتھ ہال سے برآمد ہوئی۔ دونوں میرے قریب سے گزر کر محن کے شمالی گوشے کی طرف پڑھے جہاں تین چار سائیکلس اور دو موٹر سائیکلس کھڑی تھیں۔ لڑکی کے چہرے کو میں نے غور سے دیکھا، وہ قدرے بہتر حالت میں تھی۔

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ سائیں کے عقب سے گزر کر دونوں میاں بیوی چوتھے کی سیڑھیاں اترے اور اسے لہسوں چلتے ہوئے ہال سے نکل گئے۔

میری مطلوبہ سریدی نے اپنے بھائی کا ہاتھ تمام کر چوتھے پر چڑھی۔ سریدیوں کے بیٹھنے کی مخصوص جگہ پر جا بیٹھی۔ سائیں نے آنکھیں کھولیں، دیکھا، پھر آنکھیں بند نہ ہو گئیں۔ کافی دیر تک دیکھتا رہا، پھر لڑکی کے کوری انداز میں دیکھ کر بولا۔ ”بول لڑکی! کس پریشانی میں ہے؟“

لڑکی کا سر جھک گیا۔ آنسو گرنے لگے، پھر ہچکیاں لینے لگی۔

دل جیت سائیں نے ڈانٹا۔ ”بولتی کیوں نہیں ہے تو؟ کیا اپنا رونا دکھانے کے لیے یہاں آئی ہے؟“

وہ سہم گئی، بولی۔ ”سائیں جی.....“

آواز کانپ گئی۔ سر جھک گیا۔ سائیں نے ایک طائرانہ نگاہ ارادت مندوں پر ڈالی اور بڑبڑایا۔ ”لگتا ہے کہ لوگوں کی وجہ سے بتا نہیں پا رہی۔ اے لڑکی! تو ادھر حجرے میں جا کر بیٹھ جا۔ میں فارغ ہو کر اکیلے میں تیری بات سنوں گا۔“

لڑکی نے اُسے دیکھا، پیروں کو چھوا اور اُنھ کے اپنے بھائی کی معیت میں حجرے میں چلی گئی۔ سائیں کے ہاتھ کے اشارے پر ایک اور آدی اُنھا اور سائیں کے پیروں میں جا بیٹھا۔ میں اُس کی نظروں میں آ گیا تھا۔ اگر اُس سے ملے بغیر ہال سے نکلتا تو وہ تاڑ جاتا، اس لیے میں نے بھی چوتھے پر جا کر پھر چھوئے اور دُعا کا طالب ہوا، وہ بولا۔

”خان زادے! آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”ڈاکٹر منور شاہ کے ہاں کام سیکھ رہا ہوں۔ ساتھ میں ایم اے کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔“ میں نے ادب سے کہا۔

”تمنا پڑھتے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

میرے لیے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا کر زپر لب کچھ پڑھنے لگا۔ پھر مجھ پر پھونک مار کر بولا۔ ”تم بڑے اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ بڑا دینی ہوتا ہے جو بڑوں کو بڑا سمجھتا ہے اور مرتبے کو مان کر ادب کرتا ہے۔ ادب عشق کا پہلا زینہ ہے۔ عشق کے بغیر انسان نامکمل ہوتا ہے۔ مجاز میں کہہ سکتے ہیں انسان حقیقت کا سراغ پاتا ہے۔ عشق انسان کو خدا کا دیدار بھی بخشتا ہے۔ میری بات کو سمجھ رہے ہوں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ازراہ گفتگو کہا۔ ”میں باادب ہوں، کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔“

اُس نے سر ہلایا۔ ”بہت اچھی بات ہے۔ کوئی مسئلہ

نہیں دے رہا تھا مگر اُس کے ساتھ آنے والے لڑکے کے غدو غال نظر آرہے تھے۔ بدآسانی پتا چلتا تھا کہ دونوں بہن بھائی تھے۔ دونوں کے نقوش میں بے حد مماثلت تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ تقریباً سبھی سر جھکے ہوئے تھے۔ اطراف کا جائزہ لینے کے بعد میری نظر سائیں دل جیت شاہ پر پڑ گئی۔ وہ جسم، قوی الاعضاء اور ادھیڑ عمر انسان تھا۔ سرخ، سپید رنگت، سیاہ اور چمکدار ڈاڑھی جو یقیناً کلف شدہ تھی، سر پر بڑی سی سفید عمامے دار پگڑی اور ہاتھوں کی انگلیوں میں گونا گوں رنگ کے پتھروں والی انگوٹھیاں اُس کی شخصیت کو خاصا رعب دار بناتی تھیں۔ سبج، چرمی جلد والی ایک ٹوٹ بک اور مل دار چھڑی اُس کے پاس ہر وقت موجود رہنے والی اشیاء تھیں۔ ہال میں میرے بیٹھنے سے پہلے ہی بوڑھے میاں بیوی نے اپنا مسئلہ بیان کر دیا تھا۔ اب وہ دونوں سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔

سائیں نے اچانک اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کو یکے بعد دیگرے ٹوٹتی نظروں سے دیکھا اور اپنی مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”شیر علی! تمہاری توفہ (بہو) پر اُس کی پھوپھی نے کسی عامل سے جادو کر دیا ہے۔ وہ تمہارے بیٹے کو دل سے چاہتی ہے مگر جوئی دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، جادو اپنا کام دکھانے لگتا ہے۔“

شیر علی نے سائیں کے دونوں ہر تھام لیے۔ ”سائیں جی! آپ ہماری مدد کریں ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ دئے کی شادی ہے۔ بہو گھر میں نہیں رہے گی تو بیٹی روتی ہوئی گھر آجائے گی۔ اُس شوہمی کے تو چار بچے بھی ہیں، رو رو کر مر جائیں گے۔“

شیر علی کی بیوی نے دوپٹے میں چہرہ چھپالیا اور اُس کا جسم سکڑیوں کی تال پر جھکولے لینے لگا۔ وہ کوئی فریاد نہیں کر رہی تھی مگر اُس کا فریاد کرب سے رونا ہی فریاد سے کم نہیں تھا۔

سائیں نے ایک نگاہ جلال اُس پر ڈالی اور کہا۔ ”ڈکھی نہ تم میڈی! ہمیں! اللہ سائیں بھلا کرے گا۔ تمہارے لیے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ یہ تعویذ لے جاؤ اور پانی میں گھول کر سات دن تک اپنی بہو کو باقاعدگی سے پلاؤ۔ پھر اسی دن اُسے یہاں لے کر آ جانا۔ فکر نہ کرو، ہم اُسے دم بھی کر دیں گے۔“

اُس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے منقش پیالے میں انگلی ڈبوئی۔ کانپی میں رکھی ہوئی پرچیوں میں سے ایک باہر کھینچی، انگلی اُس پرچی کے بیچ میں رکھی اور اُسے تعویذ کی شکل میں لپیٹ دیا۔ منقش پیالہ ہمہ وقت زعفران سے بھرا ہوتا تھا۔ شیر علی نے بڑے ادب سے تعویذ کو تھاما اور

پیشانیاں رینگ کے بالائی موٹے پائپ پر لگی ہوئی تھیں اور سسکیاں گنبد دار مقبرے میں چکرار ہی تھیں۔ دو عورتیں اپنے اندرونی کرب کو قبر نشین پر آشکار کرنے کی کوشش میں اپنے دل کا غبار ہلکا کر رہی تھیں۔ وہ نور پور کی نہیں تھیں، میرا اندازہ تھا کہ وہ فرید آباد سے آئی ہوں گی۔ فرید آباد یہاں سے کوئی آٹھ دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گاؤں تھا۔ وہاں ہمارے بھی چند رشتہ دار رہائش پذیر تھے۔

ناگاہ میری نگاہ قبر کے قد آدم مرمر پر کتے پر سر ٹکائے روتی ہوئی لڑکی پر پڑی۔ وہ بھی نور پور کی نہیں تھی۔ میں نے اُسے پہلے ہی نہیں دیکھا تھا۔ اُس کی عمر یہ مشکل آثارہ سال ہوگی۔ خوب صورت ایسی تھی کہ میں اُسے دیکھنے کے بعد اُس پر سے نگاہیں ہٹانے کی سکت خود میں مجتمع نہیں کر پایا تھا۔ بادای رنگ کی ستارے دار چادر کے نیچے سیاہ، ٹھنکریا لے اور لمبے بالوں نے اُس کی پشت کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اُس نے سر اٹھایا، سیدھی ہوئی، ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور رینگ تھام لی۔ اُس کے ہونٹ رونے کی وجہ سے بہت زیادہ سرخ ہو رہے تھے۔ جی چاہا کہ اُس سے رونے کی وجہ دریافت کروں مگر ہمت نہ ہوئی۔

اُس کے لبوں سے ایک سسکی برآمد ہوئی۔ ”زبا! توں تے دلاں دے حال جائد ایں!“

(ربا! تم تو دلوں کے حالوں سے یہ خوبی واقف ہو)

نڈھال اور پڑمرود چال چلتی ہوئی اُسے قدموں مزار سے نکل گئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ اُن دو عورتوں کے ساتھ یہاں آئی تھی جو رینگ پر پیشانی ٹکائے ہوئے ہوئے سسک رہی تھیں مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میں مقبرے سے باہر نکلتا تو

میں نے اُسے ایک دس بارہ سالہ لڑکے کے ساتھ ہال کی طرف جاتے دیکھا۔ جھکا ہوا سر، سست رفتار اور اطراف سے ٹکربے نازی..... وہ اس حال میں بھی یکساں معلوم ہوتی تھی۔

اُسے کسی نے ڈکھ دیا تھا۔ ڈکھ کی نوعیت کیا تھی؟ علم نہیں تھا۔ تبھی میں غیر اختیاری طور پر جاننا چاہتا تھا۔

میں جب ہال میں داخل ہوا تو وہ پھولدار قالین میں لیٹے ہوئے سنگین چوتھے کے پاس بیٹھ رہی تھی۔ ہال میں تیس کے قریب عورتیں اور مرد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دل جیت شاہ ہمیں دار نیچے کی ٹیک لگائے مسند پر نیم دراز تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سبج متحرک تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ ایک عورت اور مرد، جو میاں بیوی دکھائی دیتے تھے، اُس کے پیروں کی جانب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

میں اُس لڑکی کے عین پیچھے جا بیٹھا۔ اُس کا چہرہ دکھائی

پوچھا۔ "کون؟"

میں نے اپنا نام بتایا اور آمد کی غرض دعایت سے آگاہ کیا۔ وہ گھر میں گئی اور مشین مھینٹ لائی۔ دروازہ کھول کر دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر بولی۔ "یہ اٹھا کر لے جاؤ۔ مجھ سے اٹھائی نہیں جاتی۔"

میں نے مشین اٹھائی اور لان میں آ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی اُسے چلانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ نصف گھنٹے کی مشقت رنگ لائی۔ لان خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ کئی ہوئی گھاس کو ایک کونے میں ڈھیر کر کے مشین کو ڈاکٹر شاہ کی کونھی کے اسٹور میں لا پھینکا۔ کئی ہوئی گھاس خشک ہونے کے بعد ڈھینچر کی بیوی کے کام آتی تھی۔ وہ "لو" پر روٹیاں پکاتی تھی۔ لو گرم کرنے کے لیے یہ گھاس بہت مفید ایندھن ثابت ہوتی تھی۔

ڈاکٹر شاہ جی نے میرے پسے سے ترجمہ کوسٹائش بھری نگاہوں سے ٹولا، کہا۔ "شہر یا راتم بہت لگی ہو۔ تمہاری تعلیم تمہارے ذہن کو مضبوط بناتی ہے۔ تمہاری کاشت کارانہ مشقت تمہارے بدن کو لوہا بناتی ہے۔ یقیناً تم دو دنیاؤں میں بہ یک وقت رہنے والے انسان ہو۔"

"یہ دو دنیاؤں میں کہیں دو کشتیوں کی طرح مجھے پاٹ نہ دیں؟"

وہ مسکرایا۔ "دریائی مزاج کو سمجھ کر قدم بڑھاتے رہو گے تو سفر تمہاری مرضی پر تسلیم ختم کرے گا۔"

میں نے بھی انداز میں سر ہلایا اور کمرے میں آ کر کتابیں کھول بیٹھا۔ اسٹڈی سے فراغت کے بعد میں جب اُس کی کونھی سے نکلا تو اپنے تئیں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آنے والے دنوں میں عاشی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُس پر کڑی نگاہ رکھوں گا کہ وہ کب شاہ سامح کے ہاں آتی ہے، کیا کرتی ہے، وغیرہ۔ رات کو تادیر نیند نہیں آتی اور میں عاشی سے راہ و رسم بڑھانے کے طریقوں پر غور کرتا رہا۔

علی الصباح میں تیار ہو کر کھالے کے پاس پہنچ گیا۔ شیدو کے ساتھ بہ طور معاون کنڈیکٹر چوک قریشی تک آیا۔ وٹمن اوڑے پر لگائی اور کھالے کو ملتان روانہ کرنے کے بعد ڈیر اوڑا دالے وٹمن اوڑے کی طرف نکل گیا۔ مجھے کھالے نے عاشی کی فیملی سے متعارف ہونے کا ایک نادر نسخہ بتا دیا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے میں ٹھیلے ہوئے خیاری کی دکانوں کی طرف نکل گیا۔ ایک دکان پر سے میں نے ایک زنانہ ہار خریدا۔ یہ پتیل ساختہ تھا مگر عام نظر میں سونے کا گمان

میں نے دیکھی لی۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے کوئی وظیفہ ہو یا تعویذ وغیرہ دیے ہوں۔" اُس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میں ہو سکتا ہے کہ اُس نے دوبارہ آنے کا کہا ہو۔"

"تب تم نے کسی لڑکے کے ساتھ اُس کا میل جول دیکھا؟"

"میں نے کسی کو وہاں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔"

"میں نے وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ ماں کے ساتھ جاتی تھی، ماں کے ساتھ واپس آتی تھی۔ اب کالج جاتی ہے۔"

"میں نے یہ کہ مظفر گڑھ میں پلکیں جھکائے جاتی ہو اور کسی بے چارے، میرے جیسے کا دل منہ میں جکڑے واپس آتی ہو۔" اُس نے کہا۔

ہم دونوں نے پروگرام ترتیب دیا کہ آنے والی صبح میں اُس کے ساتھ چوک قریشی جاؤں گا۔ وہ ملتان سدھارے گا

اور اپنی اسما کو ایک نظر دیکھ آئے گا جبکہ میں ممکنہ حد تک عاشی کے بارے میں سن سن لوں گا۔ پہلے پھیرے کے بیچ میں کافی وقت فراغت کا میسر ہوتا تھا۔ کھالاعموئی طور پر یہ وقت اڑے

والے ہوئے پر اپنے بیٹی بھائیوں سے گپ شپ اور چائے کی میاشی میں گزارا کرتا تھا۔

جب پروگرام طے پا گیا تو کھالے نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ "یار شہرے! ایک خط اور لکھ دو۔"

"لکھ کر تو دیا تھا؟" میں نے غصے سے کہا۔

"تو اُس کے جیسا اور لکھ دو ناں!" وہ لجاجت سے بولا۔ "ایسا کہ تھری ناٹ تھری کی گولی بن کر سیدھا سینے میں لگے اور دل میں سوراخ کر جائے۔"

"اور تمہارے ہاتھوں میں جھکڑی پہنا دے۔ ہیں ناں!" میں نے لطف لیا۔

"لکھ دو، چاہے ایسا ہی ہو۔"

اُس کی منت سماجت پر میں نے ہائی بھری۔ چونکہ اُس نے کھانا کھا کر وٹمن کا پھیرا لے کر جانا تھا، اس لیے میں گھر آ گیا۔

شام کو بخت خان کی حویلی سے نکلا تو میرا رخ اسپتال کی طرف تھا۔ آج میں نسبتاً جلد ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں پہنچ گیا

تھا۔ اُسے لان میں ٹھیلے ہوئے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "شہر یار! ڈھینچر کے گھر میں گھاس کاٹنے والی مشین پڑی ہے، اٹھا لاؤ، بل کر گھاس کاٹنے ہیں۔"

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ڈھینچر کے کوارٹر کے دروازے پر دستک دی۔ اُس کی بیوی نے دروازے کے اندر سے

کر یا نہ کی دکان کرتا ہے۔ چھوٹا قد، منجھاسا اور سانولا رنگ میرے جیسا۔ بڑا خراشت اور بد دماغ انسان ہے۔"

اُس کی آنکھوں کی چمک ایک دم سوا ہو گئی۔ میرے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "تم مجھے بچہ سمجھتے ہو کیا؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں بلکہ بوڑھا شیطان ہو جہیں۔"

اُس کی ہنسی میں طنز کی آمیزش ہو گئی، بولا۔ "آج جس میں پھیرا لے کر واپس آ رہا تھا تو میں نے بلوچ نگر اور نور چوک کے درمیان میں ان دونوں کو موٹر سائیکل پر چائے ہوئے دیکھا تھا۔"

میں بے اختیار بولا۔ "کن دونوں کو دیکھا تھا؟"

"وہی جن کو دیکھ کر تمہاری رال ٹپک رہی ہے۔"

"بکواس نہ کرو۔" میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ پھر میں نے مناسب جانا کہ اُسے تمام تر ماجرا کہہ سناؤں۔

میرے چپ ہونے پر وہ بولا۔ "وہ لڑکی بڑی تک چڑھی ہے۔ اُس کا نام عشرت ہے مگر گھر اور محلے میں سبھی 'عاشی' کہتے ہیں۔ اُس کے ساتھ آنے والا اُس کا بھائی تھا، وحید۔ بس دو ہی بہن بھائی ہیں۔ ماں کسی پر انگری اسکول

میں پڑھاتی ہے جبکہ باپ کے بارے میں میں نے نہیں بتا دیا ہے۔ عاشی مظفر گڑھ کے کالج میں پڑھتی ہے جبکہ وحید چوک قریشی کے نڈل اسکول میں پڑھتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "اس کا گھر کہاں ہے؟"

"تم نے دیکھ رکھا ہے مگر تمہیں یہ علم نہیں ہے کہ وہ عاشی کا گھر ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "شاہ جمال والی سڑک کی پہلی گلی کے آخر میں ایک دو منزلہ گھر ہے۔ یاد کرو۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ امجد ڈرائیور کے گھر گئے تھے ناں تم۔ یاد کرو!"

"وہی جہاں تم جا کر بات کھیلتے تھے؟" میں چونکا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔ اس کے سامنے والا گھر سجاد قریشی کا ہی تو ہے۔" وہ بولا۔ "میں عاشی کو دیکھنے کے لیے ہی تو امجد کی بیٹھک میں بیٹھ کر گھنٹوں تاں کھیلا کرتا تھا۔ وہ بے غیرت انسان مجھ سے دس پندرہ روپے پانچ بیٹھ لیتا تھا۔ ایک آدھ بازی جان بوجھ کے ہار جاتا، پھر مجھے ہراتا جاتا اور میری جیب خالی کرتا جاتا۔"

میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی بات سن کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ میں نے کہا۔ "کیا عاشی نے لفٹ کرائی تھی تمہیں؟"

اُس نے منہ بنا کر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں یار! وہ اونچی ہواؤں میں اڑتی تھی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، سامح جیت شاہ نے اُسے کیا کہا

وہ موٹر سائیکل پر آئے تھے۔ لڑکے نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، وہ اچھل کر پیچھے بیٹھ گئی اور دونوں مزار کا بڑا گیٹ عبور کر کے میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے عینی نمبر پلیٹ کی ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ موٹر سائیکل کا نمبر سینتیس چھیا سی تھا۔ یہ کوئی منفرد نمبر نہیں تھا مگر نمبر پلیٹ پر رقم کرنے کا طریقہ نیا تھا۔ نمبر پلیٹ بنانے والے نے تین کا ہندسہ بہت چھوٹا لکھا تھا جبکہ باقی تینوں ہندسے سات، آٹھ اور چھ کافی بڑے لکھے ہوئے تھے۔ سرسری نظر میں نمبر پلیٹ پر صرف 'سات سو چھیا سی' کے ہندسے ہی پڑے جاتے تھے۔ وہ دونوں بہن بھائی میرے لیے اجنبی تھے۔ اُن کے لباس، انداز و اطوار سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لڑکی نے باوای رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ یہاں، دیہاتی علاقوں میں کالی چادر، دوپٹے یا دیسی طرز کے شل کا کبرقعے کا رواج عام تھا۔

کھالے کی وٹمن کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے یہ وقت مشکل سے گزارا۔ جب وٹمن اپنے اڈے پر پہنچی، میں اُس کے باپ کی دکان کے باہر چارپائی پر جیم دراز تھا۔ وہ وٹمن سے اتر کر سیدھا میری جانب آیا۔ ہاتھ ملانے کے بعد مستغفر ہوا۔ "خیر تو ہے؟"

میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "سینتیس چھیا سی نمبر کی موٹر سائیکل کبھی دیکھی ہے علاقے میں؟"

اُس نے فی الفور نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "ڈراڈ بن پر زور دو۔"

اُس کے مطالبے پر میں نے نمبر دہرایا۔ یاد آنے پر سمجھایا۔ "تین چھوٹا لکھا ہوا ہے جبکہ سات سو چھیا سی بڑے ہندسوں میں لکھا ہوا ہے۔"

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں، بولا۔ "ہوں۔۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ سچ بتاؤ، چکر کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "تمہیں بتانے کے لیے ہی تو گھنٹا بھر سے یہاں پڑا ہوا ہوں۔ تم پہلے بتاؤ، یہ نمبر کس کا ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ سجاد قریشی کی موٹر سائیکل کا نمبر ہے۔"

"وہ کون ہے؟" میرا دل بلبوں اچھلنے لگا۔ میری توقع برآئی تھی۔

"یاد تم بھی تو کچھ بتاؤ ناں، چکر کیا ہے؟"

"بکواس نہ کرو، سیدھی طرح بتاؤ، سجاد قریشی کون ہے، کہاں رہتا ہے؟" میں نے ڈانٹا۔

وہ منہ بنا کر بولا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ چوک قریشی میں، ڈیرے والی سڑک پر تھوڑا آگے جا کر ڈرائیور سائڈ پر،

”پھر؟“ میں چونکا۔

”پھر کیا؟“ وہ بولا۔ ”کوئی شے پسند ہی نہیں آئی۔“
میں نے کھوجتی نظروں سے اُسے گھورا۔ ”تمہارے پاس پیسے کتنے تھے؟“

وہ بولا۔ ”کل کے دو پھیروں کا سارا کیش میرے پاس تھا۔“

”خرچ کر دیتے تو خان کو کیا جواب دیتے؟“ میں نے کہا۔ ”وہ تو تمہاری چڑی اور میز کر رکھ دیتا۔“

اُس نے ہاتھ نہچایا۔ ”اوئے پروا نہیں۔ دمڑی کے لیے چڑی کی قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔“

”یہ تو تمہارے جیسے کسی احمق انسان کا قول زریں لگتا ہے۔“

”یہ میرا اپنا قول ہے، بکواس نہ کرو اور کان کھول کر میری جگہ یا بلی کا ماجرا سنو۔ دنگ رہ جاؤ گے۔“ وہ شرمندہ ہوئے بغیر بولا۔

چائے سرو کر دی گئی۔ وہ چائے پینے کے ساتھ ساتھ مجھے دن بھر کی کارگزاری بتاتا رہا، میں انہماک سے سنا رہا۔

وہ حسین آگاہی سے بے ٹیل مرام نکلتا تھا۔ دل بوجھل سا تھا۔ محبوبہ کے پاس خالی ہاتھ جانے پر طبیعت پر ملال گئی۔ اُس نے اپنے جیسے کسی ڈرائیور کو جا بھانسا۔ اُس کے پلان میں ایک

رکشے کی اشد ضرورت تھی۔ رکشا ڈرائیور کے ساتھ اُس نے اپنی مرضی کے مطابق سودے بازی کی اور اُسے لے کر کالج

کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ رکشے سے چند قدموں کی دوری پر کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد اُسے اسما کی کار دکھائی

دی۔ وہ اُس کے قریب سے گزر گئی۔ اُسے افسوس ہوا کہ جس کے لیے وہ اتنی مسافت طے کر کے یہاں پہنچا تھا، اُس نے

اُسے ایک نظر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ وہ جلدی سے رکشا میں بیٹھا اور کار کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

اسکولوں اور کالجوں میں چمٹی ہونے پر شہر میں گہما گہمی خطرناک حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کھوئے سے کھویا چمکتا ہے تو

لوگوں کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے مگر عاشقوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ رکشا کبھی کار کی ڈم پکڑ کر چل نہیں سکتا مگر بے

انتہا رش کی وجہ سے وہ کار کے ساتھ چپکے رہنے میں کامیاب رہا تھا۔ کھالے کی پر اشتیاق نظروں نے اسما کی رہائش گاہ

دیکھ لی۔ شہر کے پوش ایریا میں واقع کوئی کو دیکھنے کے بعد بڑے دو جزوی آگنی گیٹ پر دست کناں ہونے کی جرأت

کھالے میں پیدا نہ ہو سکی۔ اُس نے رکشا ڈرائیور کو فارغ کیا اور زیاہی پودوں سے لدی پھندی کوٹھی کے عین سامنے،

کھالا استاد زندہ باد کا نعروں لگاتے ہوئے دکن کے اڈے کی طرف چل دیا۔ کھالے نے ہی مجھے عاشری کے دروازے پر دنگ دینے کے لیے مضبوط جواز فراہم کیا تھا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اُس کا ذہن شیطان کی راجواڑی تھا۔ ہر مقتل و زکی چابی اس کے ہاں سے میسر تھی۔

آ کر ہوں کے ہمارے پر نیم دراز ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر دو ہار ڈرائیور اکٹھے ہو گئے۔ انہیں کھالے کی کی بُری طرح گھس ہو رہی تھی۔ آج کھالا اپنے وقت پر نہیں پہنچا۔ مجھے

لڑویش ہوئی۔ شیدو نے دکن کی رواجی کا وقت ہونے کی اطلاع دی اور حسبِ عادت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر ہارن

مجانے لگا۔ سوار یاں خود کار معمول کے مطابق دکن کی سیٹوں پر براجمان ہو گئی تھیں۔ اس لیے دکن کو اڈے سے نکالنا پڑا۔

مجھے دکن سمیت نور پور میں ایک گھنٹا ٹھہرنا تھا جو مجھ پر ٹھن ٹھن ثابت ہوا۔ خدا خدا کر کے رواجی کا وقت ہوا اور میں

نے دکن نور پور سے نکالی۔ چوک قریشی والے دکن اڈے پر پہنچا تو پتا چلا کہ کھالا ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ دل میں بے

طرح کی کھد بھڑ ہونے لگی۔ اسما خان زادی تھی، اُس سے بعید دھماکہ وہ کھالے کو کسی معصیت میں ڈال دیتی۔ جوں جوں

دکن کی رواجی کا وقت قریب ہوتا جا رہا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل میں متحدہ دُورے خیال آئے،

”ہار! اللہ خیرے کرے“ کا جملہ بے اختیار دل سے دُعا بن کر نکلا اور لبوں پر پھیل گیا۔

کھالا دکھائی دیا تو دل کو چین آیا۔ حسبِ سابق اُس کی ہال اور چہرے بشرے سے عیاں جوش کی کیفیت نے مجھے

اس کے بتانے سے پہلے ہی سمجھا دیا کہ کھالے کی واپسی نہیں، بلکہ یہ نارزن کی واپسی تھی۔ ہونٹ والے کو بلند آواز میں

ہائے کا آرڈر دینے کے بعد میرے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے گھر کیا۔ ”اتنی دیر لگا دی تم نے کھالے استاد!

وہ تو خیال کرتے، دل میں برے برے خیال آرہے تھے کہ ہمیں جنگی پلا حیدر خان کی کڑی میں نہ پھنس گیا ہو۔“

اُس نے اپنی مونچھوں کو بل دیا، کار کھول کر گریبان کو اندھوں پر ڈالا اور فخر سے بولا۔ ”دھت تیرے بزدل کی،

لھالا گیا تھا، ہاں کھالا..... کوئی تھو خیرا نہیں گیا تھا کہ پھنس ہاتا۔ سمجھو کہ ملی پھنس گئی ہے محبت کی کڑی میں..... ہاں!“

میں نے اُسے تاؤ دلانے کے لیے منہ بنایا۔ ”ہونہ! اہلی اس گئی..... یہ بتاؤ، اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟“

وہ ارد گرد دیکھ کر بولا۔ ”میں حسین آگاہی چلا گیا تھا۔ ہال ہاتھ جانا اچھا نہیں لگا، سوچا کہ کوئی تحفہ ہی لے جاؤں۔“

میں نے مصنوعی شرمندگی کا مظاہرہ کیا۔ تکلیف دی، معذرت چاہی اور ازراہ گفتگو کہا۔ ”چونکہ میں نے آج تک سونا خریدا ہے نہ زیورات، اس لیے میری نظر دھوکا کھا گئی۔ میں سمجھا کہ یہ بہت قیمتی ہوگا۔ اگر پتا ہوتا کہ یہ معمولی نوعیت کا ہار ہے تو وہیں پڑا رہنے دیتا یا پیسہ دیتا۔“

اُس نے مجھے سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔ اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئی۔ ”بیٹھک کھول کر بھائی کو بٹھاؤ، میں چائے لاتی ہوں۔“

میری مراد بڑا آ رہی تھی۔ یہ ظاہر میں نے معذرت چاہی۔ وہ بولی۔ ”نہیں بیٹا! کسی نیک ماں کی اولاد لگتے ہو، چائے

پلائے بغیر نہیں پیجیوں گی۔ چل وحید! ڈر کھول ناں بیٹھک دا!“ وحید اُس کے پہلو سے نکل کر اندر کی طرف بھاگ گیا۔

چند منٹوں کے بعد اُس نے ڈرائنگ روم کا کُلی میں کھلنے والا دروازہ کھول دیا اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے بلا یا۔ چند

لمحوں کے بعد میں بیٹھک میں تھا۔ کمرے کی آرائش سے ذوق اور نفاست جھانک رہی تھی۔

میں وحید کے ساتھ جو کلام تھا جب اُس کی ماں چائے کا کپ ٹرے میں رکھے بیٹھک میں آ گئی۔ اُس نے چائے

میرے سامنے میز پر رکھی، بیٹھک کا بیرونی دروازہ بند کیا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں چائے پیتا رہا، وہ مجھے دیکھتی رہی اور

مجھ سے میرا بانیو ڈینا پوچھتی رہی۔ پڑھا ہوں؟ کہاں تک پڑھا ہوں؟ آگے کیا پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟..... اُس نے

چند ہی منٹوں میں اُن گھنٹ سوالات مجھ سے کر دیے۔ اُس نے مجھ سے میرے گھر کا پتا بھی دریافت کیا اور اچھی طرح

سمجھنے کے بعد بولی۔ ”میں بھی تمہارے گھر آؤں گی اور تمہاری بہن سے ملوں گی۔ تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔“

میں اُس کی نگاہوں کو اچھا لگا تھا، وہ میرے دل کو بھائی تھی۔ ادھیڑ عمری میں بھی خوب صورت دکھائی دیتی تھی۔ ویسے

بھی عاشری جیسی خوب صورت لڑکی کو ختم دینے والی ماں کو خوب رُود ہونا چاہیے تھا۔ چہرے پہ پھیلی معصومیت، لہجے میں غیر

معمولی مٹھاس اور اپنائیت بھرے رویے نے مجھے اُس کا گرویدہ کر دیا تھا۔ پہلی ملاقات میں اُس کے فنی معاملات کو

زیر بحث لانا اُسے چونکانے کے مترادف تھا اس لیے میں خواہش کے باوجود اُس کے شوہر اور بیٹی کے بارے میں کچھ

نہ پوچھ سکا۔ اُس کے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر زیادہ دیر بیٹھنا بھی معیوب اور بے محل تھا، اس لیے بادل

ناخواستہ اُٹھنا پڑا۔

اجازت لے کر عاشری کے گھر سے نکلا اور دل ہی دل میں

ہوتا تھا۔ موتیوں اور سنہرے دھاگے نے اُس کی خوب صورتی میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ ہار کو جیب میں ڈال کر میں استاد

امجد کی کُلی میں گھس گیا۔ دو منزلہ گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کچھ پیش و پس کے بعد میں نے دروازے

پر دستک دی۔ دروازہ عاشری کے بھائی نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ شناسائی کی ایک لہر اُس کی آنکھوں میں پل بھر

کو دکھائی دی پھر محو دم ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”مجھے پہچانا؟“

”آپ کو نہیں دیکھا تو ہے۔ کہاں؟ یہ ذہن میں نہیں آ رہا۔“ اُس نے اچھے اچھے انداز میں کہا۔

”تم نے مجھے سائیکس جیت شاہ کے مزار پر دیکھا ہوگا۔ میں نے جمہیں اور تمہاری بہن کو وہاں دیکھا تھا۔ یاد آیا؟“

اُس کی آنکھوں میں سراپسکی سٹ آئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ ”آپ کو کیا کام ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تم دونوں میرے سامنے سے گزر کر اپنی موٹر سائیکل کی طرف گئے تھے۔ میری سائیکل بھی وہیں کھڑی

تھی۔ تمہارے جانے کے بعد جب میں اپنی سائیکل نکالنے لگا تو میں نے ایک ہار عین اُسی جگہ پر پڑے دیکھا جہاں

تمہاری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ ہار تمہاری بہن کا گرا ہوگا۔“

وہ ہکلا سا گیا۔ ”مم..... مگر..... باجی نے تو.....“ ایسے ہی وقت میں اُس کے عقب میں دروازے کا ایک

طاق تھوڑا سا ہلا اور ایک نسوانی آواز ابھری۔ ”کیسا ہار بیٹا؟ میری بیٹی تو ہار پہنتی ہی نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خالہ جان! میں نے ہار اُس وقت دیکھا تھا جب آپ کے بچے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر مزار سے نکل گئے

تھے۔ مجھے نہیں علم کہ وہ ہار آپ کی بیٹی کا ہے یا کسی اور کا..... میں نے تو محض اندازہ لگایا تھا۔ مجھے تو ہار کی قیمت کا بھی اندازہ

نہیں کہ وہ سستا ہے یا مہنگا۔ دیکھنے میں تو سونے کا لگتا تھا، اس لیے اتنی محنت کر کے آپ کا گھر تلاش کیا ہے میں نے۔“

جس نے اُسے دروازے کی اوٹ سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ وہ ہاتھ بڑھائے ہار مانگ

رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے ہار نکالا اور اُس کی پھیلی پر رکھ دیا۔ اُس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر ہار لوٹاتے

ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”بیٹا! تم نے ناحق تکلیف کی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ میری بیٹی کا ہار نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ سونے کا نہیں، تھیل کا ہے۔ غیاری

والی دکاتوں پر ایسے جموٹے زیورات عام ملتے ہیں۔“

پاس ہے۔ عاشری کی نگرانی بھی ہمیں شاہ سائیں تک پہنچنے میں خاصی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔“

سبھی نے تائید کی۔ بخت خان بولا۔ ”کیا جنوں بھوتوں کی کہانیوں میں کچھ بھی صداقت نہیں ہے؟“

ڈاکٹر شاہ جی نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”جو لوگ جنوں کی عمل داری کو مانتے ہیں، وہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، بہت سے واقعات کو دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں مگر ان کے ہاں منطقی اور سائنسی رویوں کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جن خدا کی مخلوق تو ہیں مگر وہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کی قدرت نہیں رکھتے وہ بڑی مضبوط اور نہ جھٹلائی جانے والی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔“

امیر نواز جیس ہوا۔ ”مثلاً؟“

”وہ کہتے ہیں کہ جن علاقوں تک پیروں کی پہنچ نہیں ہوئی، وہاں بھی کوئی لڑکی جنوں کے زیر اثر نہیں آئی۔ یورپ سمیت دنیا کا نسبتاً بڑا حصہ اس کی مثال ہے۔ یہ لوگ کوہ قاف کو جنوں، پریوں اور دیو زادوں کا مرکز بیان کرتے ہیں مگر وہاں ایسا کوئی مظہر آج تک سامنے نہیں آیا۔ ترقی یافتہ شہروں کی خوب صورت اور نازک اندام لڑکیوں تک بھی جنوں کی رسائی دیکھنے میں نہیں آتی پھر کوئی وجہ بھی تو سامنے نہیں آتی کہ آخر دیہاتوں پر ہی یہ نادیدہ مخلوق حملہ آور کیوں ہے؟“ ڈاکٹر شاہ جی کے لہجے سے تاسف کا دبیز تاثر عیاں تھا۔

”رائی ہو تو اُس کو پہاڑ بنایا جاتا ہے۔ آخر کسی نہ کسی حد تک تو.....“ بخت خان نے کہا۔

”ان لوگوں کی کچھ پیش گوئیاں سچ بھی تو ثابت ہوتی رہتی ہیں، یہ کیا ہے؟“ دیوانے نے اپنا حصہ ڈالا۔

”جوا دو آدمیوں کے درمیان کھیلا جائے تو ایک کی جیت یقینی ہوتی ہے۔ فرض کیا کہ کسی عورت کو جیت شاہ پھونک مارتا ہے اور دھوکا کرتا کہ اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوگا تو وہی صورتیں ممکن ہیں۔ بچہ پیدا ہوگا یا نہیں پیدا ہوگا۔ اگر پیدا ہوتا ہے تو جیت شاہ کی بٹے بٹے ہو جائے گی۔ لوگ اس کے دعوے کو بڑا حیرت انگیز سمجھیں گے اور اگر نہیں پیدا ہوگا تو بات ذب جائے گی اور قسمت کو مورد الزام ٹھہرا دیا جائے گا۔ جیت شاہ مزید انتظار کرنے کا مشورہ دیتا رہے گا۔ سمجھتا رہے کہ ابھی کچھ دیر ہے، اندھیر میری دُعا سے ٹل جائے گا۔“ ڈاکٹر شاہ جی نے قدرے کھل کر کہا۔

کھلا استعجاب آمیز آواز میں بولا۔ ”تو کیا ان لوگوں کی دعا سیدھی عرش پر نہیں جاتی؟“

”ہر دعا عرش پر جاتی ہے۔ خدا ہر کسی کی سنا ہے۔ وہ ہر

میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل کر سراغ لگائیں اور نور پور کو برائی سے پاک کریں۔ چونکہ دل جیت شاہ کے ارادت مندوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لوگوں کی شعوری سطح بھی کم ہے، اس لیے ہمیں سائیں پر بڑا مضبوط ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ محتاط ہو جائے اور ہمیں رسوائی کا شکار ہونا پڑے۔“

اُس نے ایک ذرا توقف کیا، سگریٹ سلگائی اور ڈاکٹر شاہ جی سے مخاطب ہوا۔ ”ڈاکٹر شاہ! آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟“

ڈاکٹر شاہ جی نے صوفے میں پہلو بدلا اور قدرے مضطرب انداز میں بولا۔ ”برائی کی ایک سمت نہیں ہوتی، یہ ہاروں طرف اپنے اثرات پھیلاتی ہے۔ شاہ سائیں لوگوں کی سادگی اور عقیدت سے بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ نہ صرف لوگوں کو دھوکا دیتا ہے بلکہ وہ کسی کریمیل گینگ کا مرکزی کردار بھی بنا ہوا ہے۔ میں پر دہی ہوں، آج یہاں ہلکہ دہاں یا نہ جانے کہاں..... مگر نور پور آپ لوگوں کا مستقل بسیرا ہے۔ گاؤں تو گھر کے صحن کی طرح مقدس ہوتا ہے۔ اسے پاک صاف رکھنا ہر فرد کا فرض ہے۔ میں اور کیا کہوں..... ماسوائے اس کے کہ جیسے بھی ممکن ہو، کسی بھی آہلی کے عوض، جیت شاہ کی بیخ کنی کی جائے۔ مجھ سے جو ممکن ہو، آپ کے لیے کروں گا بھلے نور پور میں میرا عارضی ٹھکانہ ہی کیوں نہیں۔“

میں نے امیر نواز اور دیوانہ کے چہروں کو دیکھا جن کی اُن سے میں نے دل جیت شاہ کے خلاف کچھ نہیں سنا تھا۔ دیوانہ تو شاہ سائیں کا بیعت شدہ مرید تھا۔ سوال کرنا مناسب نہیں تھا، اس لیے خاموش بیٹھ کر تیل اور تیل کی دھار اور دیکھنے پر ہی اکتفا کر رہا تھا۔ اپنی اپنی آراء پیش کرنے کا معاملہ چھڑ گیا۔ امیر نواز بڑا پرجوش دکھائی دے رہا تھا جبکہ میں، دیوانہ اور کھالا بڑے انہماک سے ڈاکٹر شاہ جی، بخت خان اور امیر نواز کی باتیں سن رہے تھے۔

چائے کا دوسرا دور چلا۔ کھالے نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے عاشری کی مزار پر آمد، جیت شاہ سے ملاقات اور میری حاصل کردہ معلومات کا تقبیض اپنے انداز میں پیش کر دیا۔

ڈاکٹر شاہ جی نے مجھے سائنس بھری نگاہوں سے دیکھا کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ عاشری پر اب کوئی جن بھوت عاشق کا اور اُسے دورے پڑنے لگیں گے۔ وہ اپنے بڑوں کی حکم دہاں کرے گی، انہی سیدھی باتیں کرے گی اور جیت شاہ کا ارادے بڑے مشاقانہ انداز میں عاشری کے بڑوں تک پہنچائیں گے کہ اس کا علاج محض دل جیت شاہ کے

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ صوفوں پر ڈاکٹر شاہ جی، امیر نواز، کھالا اور مراد بخش دیوانہ براجمان تھے۔ میری حیرت کا سبب امیر نواز اور دیوانے کی وہاں موجودگی تھی۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ میں سب کو سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے سامنے بھی بشیرے نے چائے لارکھی۔ رسمی گفتگو کے بعد امیر نواز نے کہا۔ ”خان چاچا! میرا خیال ہے کہ بات شروع کی جائے۔“

بخت خان نے باری باری سب کو دیکھا پھر کبیر لہجے میں گویا ہوا۔ ”فرداً فرداً، اس موضوع پر میری آپ تمام لوگوں کے ساتھ بات چیت ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ مل بیٹھ کر کوئی حتمی فیصلہ عمل تیار کر لیا جائے۔ مشاودت کا عمل ہمیشہ کامیابی کی طرف بڑھاتا ہے۔ کیوں ڈاکٹر شاہ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

ڈاکٹر شاہ جی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ غیر فطری انداز میں سر دنگ ہوں سے اُسے گھورتا رہا۔

بخت خان نے بات جاری رکھی۔ ”یہ ملے ہو چکا ہے کہ سائیں دل جیت شاہ کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ میں گزشتہ دو تین مہینوں سے اپنے طور پر نگرانی کر رہا ہوں، اس کھوج میں ہوں کہ اُس کے کاروبار کی نوعیت مجھ پر کھل جائے مگر یہ سو۔ اُس کے ہاں آنے والے لوگوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل نہیں کر سکا سوائے گاڑیوں کے نمبروں کے۔ میں نے گاڑیوں کے متعلق رجسٹریشن کے دفاتر سے رابطہ کیا۔ مختلف اوقات میں یہاں آنے والی گاڑیوں کی تعداد سات ہے۔ آج تک ساتوں گاڑیاں یہاں اکٹھی نہیں ہوئیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، رجسٹریشن دالوں کے ریکارڈ کے مطابق اُن گاڑیوں کے مالکان کی فہرست یہ ہے.....“

اُس نے اپنے سامنے پڑے ہوئے شیشے کی ٹیس میز کی طرف اشارہ کیا۔ ایک آف وائٹ کلر کی فائل پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے پھر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر ہمیں دکھایا، بولا۔ ”مگر اب ان ساتوں مالکان کا گاڑیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کوئی مرتبہ تو کوئی ان گنت مرتبہ بک چکی ہے۔ میں نے بہتر کوشش کی کہ مجھے موجودہ مالکان تک رسائی حاصل ہو سکے مگر ایسا عملی طور پر ممکن نہ ہو سکا۔“

ہم سب پوری توجہ اور انہماک سے اُس کی بات سن رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہاں بڑے پیمانے پر کوئی دوسرا دھندا ہو رہا ہے۔ غالب قیاس یہ ہے کہ یہ گینگ اسلحے یا منشیات کے کاروبار سے منسلک ہے

سڑک کے دوسرے ہاتھ پر واقع فٹ پاتھ پر کافی دیر تک کھڑا رہا۔ شاید کہ حسن کی جھلک ہی دکھائی دے، مگر وہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوا۔

اگر عام رہائشی علاقہ ہوتا تو بعید نہیں کہ کھالا کوشی کے بارے میں مکمل جان کاری لے کر لوٹتا۔ وہ جدید طرز کی کالونی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک امیر زادہ وہاں سکونت پذیر تھا۔ کھالے کو احساس کمتری نے کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ حدود دار بعد، کوشی کا ایلٹی ویژن اور علاقے کا نام پتا ذہن نشین کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ اُس کی بتائی ہوئی کہانی تمام ہو گئی۔ میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ عجیب جذبات آ گئیں تو سب قزح رقصاں تھیں۔ میں نے کہا۔ ”فرض کرو، وہ تمہارے سامنے آ جاتی تو تم اُسے کیا کہتے؟“

دل میں پلٹے کئی حساس جذبے آنکھوں سے ہویدا ہو گئے، بولا۔ ”اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیتا۔“

میں ہنسا۔ ”پھر کیا ہوتا؟“

وہ بولا۔ ”وہی ہوتا جو منظور خدا ہوتا۔ اس کی بات چھوڑو، اب تم مجھے عاشری کے بارے میں بتاؤ۔ تم نے کیا تیر مارا؟“

میں نے بھی اپنی رام کہانی سنائی۔ وہ مسکرانے لگا۔ ”اگر میں تمہارے جتنا پڑھا ہوتا اور میرا رنگ روپ بھی تمہارے جیسا ہی ہوتا تو میں نے اُسے پتالینا تھا۔“

”کسے؟“ میں متعجب ہوا۔

”عاشری کو اور کسے؟“

میں نے ملامت انگیز نگاہوں سے اُسے گھورا۔ باتوں میں خاصی دیر گزر گئی تھی۔ دیکھن کی سواریاں اشاروں کنایوں سے کھالے کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گھر پہنچنے ہی چاچا چراغ کی عدالت میں پیشی بھگتنا پڑی۔ میری عدم موجودگی میں میرے حصے کا زیادہ کام اُسے سرانجام دینا پڑتا تھا۔ بڑھاپے کے باعث زیادہ تھک جاتا تھا۔ تھکن غصے کا روپ دھار کر مجھ پر برس پڑتی تھی۔ میں نے بہ وقت تمام اُسے مطمئن کیا۔ ملکہ کو پڑھانے کے لیے شام کو بخت خان کی حویلی پر پہنچا تو بخت خان نے کہا کہ میں پڑھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھیں رہوں۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ اُس نے اور بھی چند لوگوں کو شام میں بلوا رکھا ہے۔ کوئی خاص معاملہ زیر بحث آئے گا۔

میں ملکہ کے کمرے میں ہی تھا جب نوکرانی نے آ کر کہا۔ ”خان جی تمہیں دارے پر بلا رہے ہیں۔“

میں نے اپنی گود میں رکھی ہوئی ملکہ کی کاپی صوفے پر رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دارے کے خاص کمرے میں پہنچ کر

ایک سے محبت کرتا ہے۔“

”مگر جو اُس کے پیارے ہوتے ہیں، ان کی جلد مراد پوری ہو جاتی ہے۔“

”کون اُس کا پیارا ہے؟ یہ تعین ہم کیسے کر سکتے ہیں؟“

”نشانیوں دیکھ کر..... آخر خدا بھی تو اپنی نشانیوں سے ہی دکھائی دیتا ہے نا!“ میں نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر نشانیوں کو ہمیشہ آنکھوں پر عقیدت کی پٹی باندھے بغیر دیکھا جائے تو سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔ خدا نے اپنی جو نشانیاں بیان کی ہیں، وہ سائنس، منطق اور ذہنی استدلال پر پوری اترتی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی مادرائی یا غیر فطری نہیں ہے۔ یہاں جن نشانیوں کو بیان کیا جاتا ہے، جن کرامتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، انہیں عقیدت بھرا دل تو قبول کر لیتا ہے مگر وہ کسی بھی پیمانے پر، کسی بھی کسوٹی پر اپنی سچائی ثابت نہیں کر سکتیں۔ میں نے دل جیت شاہ کو دیکھا ہے۔ مجھے اُس میں کوئی بھی ایسی نشانی دکھائی نہیں دی جو اُس کا اللہ سے قرب کا رشتہ آشکار کرتی ہو۔“

بہت دیر تک ڈاکٹر شاہ جی نے اس موضوع پر ہمارے سوالوں کے جواب دیے اور ہمیں آزدہ مطمئن کیا۔ پھر یہ طے پایا کہ میں عاشق کی جبکہ کھالا اور امیر نواز جیت شاہ کی خفیہ نگرانی کریں گے۔ دیوانے کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات میں آنے والوں کو گھیرنے کا پلان ترتیب دے گا۔ اُسے تفویض کیا گیا کام مشکل تھا مگر بخت خان کو اُس کی ذہانت پر بھروسہ تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی معترض تھا کہ جب تک رات کی تاریکی میں آنے والوں کے عزائم کا علم نہ ہو، اُن کے طریق کار سے آگاہی نہ ہو، تب تک انہیں گھیرنا کسی بھی لحاظ سے سودمند اور مناسب نہیں ہوگا۔ کمزوری مزاحمت کے بعد اُس کی بات مان لی گئی۔

بخت خان نے حویلی کے بیرونی دروازے پر سب کو الوداع کہا۔ مجھے روک لیا۔ کہنے لگا۔ ”شہرے خان! ملکہ بی بی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“

میں نے ملکہ کی تعلیمی استعداد کے بارے میں بتایا۔ مطمئن ہو کر اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نوٹ نکال کر مجھے تمہا دیے، بولا۔ ”یہ رہی تمہاری ٹیوشن فیس..... مجھے تمہاری صلاحیتوں پر اعتماد ہے۔“

میں نے غیر ارادی طور پر نوٹ گنے۔ سو روپے والے نوٹوں کی تعداد اُس تھی۔

میں نے تعجب سے کہا۔ ”مگر خان جی! یہ تو بہت زیادہ

ہیں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں کسی بے گانے کو نہیں، اپنے پتر کو دے رہا ہوں اور وہی پتر کو دی جانے والی رقم کم یا زیادہ نہیں ہوتی۔“

میں نے پس و پیش کیا مگر اُس نے میری ایک نہیں چلنے دی بلکہ میرے ہاتھ سے نوٹ لے کر میری جیب میں ڈال دیے۔ کاشت کاری کے بعد یہ میری زندگی کی پہلی کمائی تھی۔ میں نے نوٹ چاچی کے ہاتھ پر جا رکھے۔ اُس کے پوچھنے پر میں نے اُسے بتایا کہ یہ رقم بخت خان نے مجھے ملکہ کو پڑھانے کی اجرت کے طور پر دیے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

پھر اچانک، کچھ سوچ کر، اُس نے نوٹ میری طرف بڑھائے، بولی۔ ”شہرے پتر! تیری پہلی کمائی پر میرا حق نہیں جتا، جاؤ، اپنی بہن کے ہاتھ پر رکھو۔“

میں ہچکچایا۔ فرزانہ اور شانو نے بھی اپنی ماں کی تائید کی۔ بادل ناخواستہ میں نے نوٹ لے کر پروین کی کھلی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ ہولے ہولے لرز رہا تھا، آنکھوں میں نمی حیر گئی اور لبوں پر کوئی بے صدا ڈھنگل گئی۔ مٹھی بھیج کر چند ثانیوں تک مجھے دار فکری کے عالم میں دیکھتی رہی پھر بھائی کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ہلکی خوشی کے عالم میں بھی رو رہی تھی۔ وہ لمحہ بڑا عجیب تھا کہ میرے اندر دیوانہ دار پدرانہ جذبات کو نمود دینے لگا تھا اور میرے بدن میں وہ طاقت بھر رہا تھا جو کسی بھی انسان کو مقدس پار اٹھانے والا بھرا بنا دیتی ہے۔ میں نے اُس کی پیشانی کو چوما، زُلفوں پر ہاتھ پھیرا اور ولا سادیا۔

اُس نے آدھے نوٹ میری جیب میں ڈال دیے، آدھے چاچی کی اجازت سے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیے اور بھاگتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔

کھانا کھانے کے بعد میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا۔ بغیر سوچے سمجھے میں نے کھال والے راستے کے بجائے گلی کا راستہ لیا۔ بخت خان کی حویلی والے چوک میں شفیع محمد کی دیوار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ زیناں کی مدھم سی پکار سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا، گلی کی کھڑکی کھڑی دکھائی دی۔ میں نے آنکھوں کے اشارے سے بلائے جانے کا مقصد پوچھا۔ اُس نے، جواب دیے بغیر قریب آ کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں تمہا ہوا سفید کاغذ ڈبا ہوا تھا۔ مجھے یاد آ گیا، اُس نے وعدہ لیا کہ میں اُس کا خط ڈاکٹر شاہ جی تک پہنچاؤں گا۔

میں نے ارد گرد دیکھا۔ عافیت تھی کہ کوئی دیکھنے والا نہیں

تھا۔ یہ بگلت رقتہ تھا اور بغیر کچھ کہے پلٹ کر تیز چلتا ہوا اُس سے دور ہو گیا۔ میرا ارادہ بغیر کہیں کے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں جانے کا تھا مگر خط جب میں ڈالتے ہی دل میں اُسے پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ یہ جانے ہوئے کہ کسی کا خط پڑھنا غیر اخلاقی حرکت ہے اور اس خط میں ماسوائے عشقیہ التجاؤں کے کچھ بھی ہونا متوقع نہیں تھا، میں اسے پڑھنے کی خواہش پر قابو نہ پاسکا اور کھالے کے گھر پہنچ گیا۔ کھالا اپنے کمرے میں موجود تھا۔ شکر ہوا کہ خالدہ سے مذہب نہیں ہوئی۔ میں نے لائین کی روشنی میں خط پڑھا۔ خط میں وہ تمام لذتیں، اظہار کی تمناؤں اور وصل کی التجائیں موجود تھیں جو محبوب کی بے پروائی اور بے نیازی سے دل برداشتہ ہو کر کی جاتی ہیں۔ اپنی قلبی بے چینی کو عیاں کرنے کے بعد اُس نے لکھا تھا۔ ”آپ نے کہا تھا کہ انسان کو جس منزل کی طلب ہو، اُسے پانے کے لیے اُسے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ میں نے آپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کی اور پہلے قدم پر ہی ٹھوکر کھائی۔ آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ ناکامیاں بھی جتنی نہیں ہوتیں، جلدی ہوتی ہیں اور ایک بڑی کامیابی کو جنم دیتی ہیں۔ میں بھی اُس گھڑی کی منتظر ہوں جب میری طلب میں حائل ناکامیاں کسی بڑی اور معتبر کامیابی کو جنم دیں گی اور آپ میرے وجود کو اپنی زندگی کا جزو بنانے پر رضامند ہو جائیں گے۔“

اُس کے باپ نے ہزاروں طالبوں کو علم دیا تھا۔ وہ ایک مطلوب کو پڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے خوابوں کی تعبیریں کاغذ میں لپیٹ کر ڈاکٹر شاہ جی کی طرف روانہ کی تھیں۔ آپ اپنے بستر میں لیٹی خوابوں کی نئی بنت سے الجھ رہی ہوگی۔ چشم تصور میں اپنے محبوب کو خط پڑھتے اور سر تسلیم خم کرتے دیکھ رہی ہوگی مگر مجھے یقین تھا کہ اُس کی ہر التجا در قبول سے سرگمرا کر مایوس پلٹے گی۔ وہ ایک پتھر سے اُس میں بھیگی پتیوں سے بھی نرم جذبات کا لمس مانگ رہی تھی جو سوائے احقانہ خواہش کے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے کھالے کے شدید اصرار پر خط کے چند منتخب اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ وہ ستار ہا، سردھنار ہا پھر انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے مخصوص اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یار شہرے! ایک دم زبردست گڑی ہے یہ زیناں۔ کیا پتا نہ قسم کا خط لکھا ہے اُس نے۔ تم نے ایسا ہی جاندار خط مجھے لکھ کر دینا ہے جو میں اسما کو دے کر آؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر نہ کر استاد کھالے! جنہیں تو اپنے خالص بی پازینو خون کے ساتھ خط لکھ کر دوں گا جو

آنکھوں کے راستے اُس کے دل میں اتر کر پورے جسم میں پھیل جائے گا۔“

وہ ٹھٹھکا ہوا ہوں سے مجھے دیکھنے لگا پھر اچانک دانت بٹیں کر بولا۔ ”مگر میرے خون کا گرد پ تو بی پازینو نہیں ہے۔“

”تو کیا ہوا؟ تمہارے جیسے عاقبت نا اندیش عاشقوں کے خون کا گرد پ بدل رہتا ہے۔“ میں ہنسا۔

”کب بدلتا ہے؟“ وہ جڑ بڑھا۔

”جب محبوب بدلتی ہے۔“

چند ساعتوں تک مجھے کھالے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر پڑی بدل گیا، بولا۔ ”مجھے تو زیناں بے چاری پر ترس آ رہا ہے۔ اُسے بھرے پورے نور پور میں کوئی بانکا پسند ہی نہیں آیا۔“

”تو کیا جنہیں خط لکھتی؟“ میں نے گھورا۔

”کیا میں انسان نہیں ہوں، بانکا بھیللا جوان نہیں ہوں؟“

”تم میں یہ خوبیاں موجود نہیں ہیں۔“ میں نے حتی لہجہ میں کہا۔

وہ دانت بٹیں کر رہ گیا۔ توقف کے بعد بولا۔ ”افسوس! اُس بیوقوف نے اگر دل لگانے کا ارادہ کیا بھی تو کس سے؟ جس کو شاید اُس کی ماں نے بھی پیار سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا خیال ہے؟“

میں نے ڈانٹا۔ ”بکواس نہ کیا کرو۔ تم نہیں جانتے کہ ڈاکٹر شاہ جی کتنا عظیم شخص ہے۔“

”ہونہ! عظیم و وزیم کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس مفرد اور عقل سے فارغ انسان ہے۔ وہ زیناں جیسی خوب صورت اور سمجھ دار لڑکی کے قابل ہی نہیں ہے مگر اُسے دیکھو! وہ خود کو دنیا سے بلند تر خیال کرتا ہے۔ واہ! وہ استہزائیہ انداز میں ہاتھ بچا کر بولا۔

میں مسکرایا۔ ”اُس کا خیال غلط بھی تو نہیں ہے۔“

اس کی شکل سے عیاں تھا کہ اُس نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا مگر خاموش رہا۔ پھر جمایاں لینے لگا۔

میں اُس کے گھر سے نکل کر ڈاکٹر شاہ جی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک دم چونک گیا۔ اپنی جھولی میں پھیلی ہوئی تصاویر کو بجلی کی سرعت کے ساتھ سمیٹنے لگا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اُس کی غیر معمولی بگلت کے باوجود اُس کے قریب پہنچ جاؤں گا اس لیے اُس نے مجھے دیکھتے ہی کچن میں جانے اور چائے بنا کر لانے کا حکم صادر کر دیا۔ میں نے ایک نظر اُس کے ہاتھوں میں دبی تصاویر کو دیکھا۔ عام نوع کی، چھ ضرب چار انچ سائز کی چند تصویریں تھیں جن کی تعداد

میرے اندازے کے مطابق دس کے لگ بھگ تھی۔

میں پلٹ کر کچن میں چلا گیا۔ چائے بنا کر لایا، پیش کی، پھر پوچھا۔ ”شاہ جی! کس کی تصویریں دیکھ رہے تھے آپ؟“

”یہ میرے بچپن کی چند تصویریں تھیں جنہیں میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ کبھی جی چاہے تو اپنے بچپن میں مہانک لیتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔

”آپ تو پلٹ کر دیکھنے کو محنت قرار دیتے ہیں۔“

”محنت غیر انسانی عمل تو نہیں ہے۔“

”کیا آپ اپنا بچپن مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں؟“

”ہاں! اُس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”تصویریں میرے کسی راز کو آشکار نہیں کرتیں مگر میں پھر بھی انہیں دنیا سے چھپا کر تنہائی میں بیٹھ کر دیکھنے کا خواہاں ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں بھی ایک راز آپ کے لیے اٹھالایا ہوں۔“

میں نے جیب میں سے تہ گیا ہوا محبت نامہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ”یہ لیجئے! ملاحظہ کیجئے۔“

وہ چند لمحے ابھی ابھی نگاہوں سے میرے بڑے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا، پھر ہاتھ بڑھائے بغیر بولا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”پھر بھی!“

”اٹھا کر دیکھ لیجئے۔“

اُس نے ایک ٹھوکہ بھری نگاہ مجھ پر ڈالی اور خط اٹھالیا۔

میرا دل کڑوا ہوا۔ میری تجسس آنکھیں اُس کے چہرے کے انار پڑھاؤ پر جمی ہوئی تھیں۔ جوں جوں پڑھتا جاتا تھا، رنگ بدلتا جاتا تھا۔ کبھی پیشانی پر فکر و تردید کی غماز لکیروں کی مائل بچھ جاتی، کبھی ہونٹ بھینچ جاتے تو کبھی ایک زہر خندی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر تیرنے لگتی۔ اُس نے خط پڑھنے کے بعد احتیاط کے ساتھ تہ گیا اور جیب میں ڈال لیا۔ میرا لاس لالط ثابت ہوا تھا۔ مجھے تو یقین تھی کہ وہ خط پڑھتے ہی پھاڑ لڑچیک دے گا اور مجھے ڈانٹے گا۔ مجھے اُس کے چہرے پر اسی کے آثار دکھائی نہیں دیے تو مجھے حیرانی ہوئی۔ میں نے اہما۔ ”شاہ جی! کیا لکھا ہے اُس نے؟“

وہی سفاک اور زہر میں بھی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر اپنے لگی، بولا۔ ”شہر یار! تمہاری پھوپھی کی لکھتی ہے؟“

میں ایک ذرا ٹھٹھکا گیا۔ جھینپ کر بولا۔ ”وہ تو بس پھوپھی۔۔۔۔۔“

”ہاں! زیناں نے بھی بس ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں لکھ

بھیجی ہیں، کوئی کام کی بات نہیں ہے! اس میں۔“

”کچھ تو لکھا ہی ہوگا؟“

”کیا تم نے یہ تحریر بغیر پڑھے مجھ تک پہنچائی ہے؟“ میرے سوال پر توجہ دیے بغیر اُس نے براہ راست میری آنکھوں میں جمائے ہوئے استفسار کیا۔

میں گڑبڑا گیا۔

وہ میری نگاہوں کی چوری کو پکڑ چکا تھا، بولا۔ ”شہر یار! بعض جھوٹ بے مقصد نہیں ہوتے۔ یقیناً تم نے خط پڑھ لیا تھا۔ مجھ سے میرا رد عمل دریافت کرنے کے لیے پوچھ رہے تھے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ بتاؤں جنہیں، کیا لکھا ہے؟ اس میں لکھا ہے کہ اُس نے مجھے اپنا سب کچھ مان لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نہیں جانتی کہ سب کچھ کسے کہتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ محبت کا رکھ آبیاری کا مسلسل عمل مانگتا ہے۔ خالی بالٹی کو دیکھ کر جڑیں مایوس ہو جاتی ہیں، بیڑ سوکھ جاتا ہے۔ ہاں! وہ بے چاری تو یہ بھی نہیں جانتی کہ جب بیڑ سوکھ جائے تو کیا ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔ چھاؤں روٹھ جاتی ہے۔“

اُس کا لہجہ دم بہ دم تغیر پذیر تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”اُس نے سوچ رکھا ہے کہ محبت ملاقاتوں، جذیوں کے تہا دلے اور چوری چھپے دیکھنے دکھانے کے سادہ سے عمل کا نام ہے۔ میں اُس کے نزدیک تنہائی کا مارا ہوا شخص ہوں، محبت سے محروم رہا ہوں اور مجھے چاہئے والے کسی وجود کی اشد ضرورت ہے۔ وہ ہرگز نہیں جانتی کہ میرے ہاتھوں میں قہای ہوئی بالٹی پانی سے محروم ہے۔ میں تمہارا انسان ہوں۔ مجھے چھاؤں دینے والا شجر جب میرا ب نہیں ہو پائے گا، تب سوکھ جائے گا اور پھر میں جو چھاؤں کا عادی ہو چکا ہوں گا، دھوپ میں جلنے لگوں گا۔ تب میرا کیا بنے گا؟ نہیں۔۔۔۔۔ میں محروم ہوں، ٹھیک ہوں۔ مایوسی کا شکار ہو کر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ تم اُسے کہہ دینا، مجھے دوسرا خط نہ لکھے۔ ماننا ہوں کہ منہ زور عمر میں ایسے الفاظ تراشنا گزیر ہوتا ہے مگر وہ اُسے لکھے جو زندگی کا طلب گار ہو اور جسے سایہ کشاؤلف درکار ہو۔“

وہ شعلہ گماں تھا، جل بجھا اور راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اُسے بکھرا ہوا دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کی آنکھیں بھجسی گئی تھیں۔ اک نئے روپ میں میرے سامنے کھل گیا تھا۔

میں نے اُسے کبھی اتنا دل گرفتہ اور نڈھال نہیں دیکھا تھا۔ سر جھکائے، بہت دیر تک گم سم بیٹھا غیر محسوس آہیں بھرتا رہا پھر ٹھٹھکا خوردہ لہجے میں چائے کے دوسرے کپ کا متقاضی ہو گیا۔ میں اُسے تنہا چھوڑ کر کچن میں چلا آیا۔

دلیس کرے میں آیا تو اُسے پکی سی حالت میں افسردہ

دیکھا۔ میں نے چائے پیش کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا، میں اُسے دیکھتا رہا پھر کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ اُسے سنبھلنے میں کچھ وقت درکار تھا۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اُسے عام انسان کے رُوپ میں دیکھا تھا اور سمجھ میں آیا تھا کہ اُس پر ڈکھ، عشق اور جذبہ اپنے گہرے اثرات چھوڑتے ہیں وگرنہ میں اُسے آج تک ہتھ پرل سمجھتا آیا تھا۔ وہ نامساعد حالات سے گھبراتا تھا، دل پر ہونے والی دسک پر مضطرب ہوتا تھا مگر اُس کے پاس اپنے تاثرات چھپانے کا ہنرموجود تھا۔

میں ڈاکٹر شاہ جی کی کوشی سے نکل کر گھر روانہ ہوا۔ اپنی گلی سے گزرتے ہوئے اچانک زبیاں، عاشی اور ملکہ کے چہرے میری نظروں میں لہرائے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اُن کی بے طرح کی یادداشتوں نے مجھ پر حملہ کیوں کیا؟ سمجھ نہ آیا۔ ایسی باتیں سمجھنے اور سمجھانے کی نہیں ہوتیں مگر مجھے بھی میرے دل نے جتلا یا کہ میں کافی دلوں سے اپنی عزیز از جان غزالہ کو فراموش کیے ہوئے ہوں۔ ڈاکٹر شاہ جی نے کہا تھا کہ عشق ایسا زکھ ہے جو سدا بہار آبیاری مانگتا ہے۔ میرے جگر کی جڑوں کی مٹی بے آب و گیاہ ہونے لگی تھی۔ میں غیر معتدل دھڑکنوں کو پہلو میں سنبھالے ہوئے پھوپھی کبریٰ کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔

چوٹی دروازے کی درزوں سے جھانکا۔ محن میں لائین کی متحرک روشنی تھرک رہی تھی۔ کوئی لائین اٹھائے محن میں چل پھر رہا تھا۔ میں اس انتظار میں کچھ دیر کھڑا رہا کہ لائین بردار سامنے آئے گی مگر وہ پھوپھی کبریٰ تھی یا غزالہ، کمروں کی اوٹ میں ہی رہی۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے دھکیل کر دیکھا۔ دروازے کی چٹنی لگی ہوئی تھی۔ دونوں طاقتوں کے بیچ میں ہاتھ ڈالا اور اپنی مہارت کو بروئے کار لاتے ہوئے چٹنی کھول دی۔ دبے پاؤں کمرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ٹکڑا آیا۔ میر نکال کر محن میں دیکھا۔ دل بلیوں اچھل پڑا۔ وہ غزالہ ہی تھی جو ایک ہاتھ میں لائین جبکہ دوسرے ہاتھ میں برتن پکڑے چولہے سے کمرے کی طرف جارہی تھی۔ میں نے ہلکی آواز میں سیٹی بجا کر اُسے متوجہ کیا۔ وہ ٹھٹھک کر دیکھنے لگی۔ پہچان کر اٹھلائی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ کچھ ہی دیر بعد لہرائی ہوئی کمرے سے برآمد ہوئی اور سیدھی میری طرف چلی آئی۔

ایک سرکوشی فضا میں سرسرائی۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اماں جاگ رہی ہے، دیکھ لے گی تو میری شامت آ جائے گی۔“ ”دیکھنے کو جی چاہا، چلا آیا۔ کہتی ہو تو واپس چلا جاتا ہوں۔“ میں نے معنوی حلقی سے کہا۔

”مجھے دیکھ لیا ہے، اب جاؤ ورنہ اماں.....“ میں نے اُسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ وہ ڈگرگائی اور سنبھلنے کی کوشش میں مجھ سے آن لگرائی۔ میں نے اُسے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو؟ میں تمہیں دیکھنے اور ملنے کے لیے آیا ہوں، تمہاری دھمکیاں سننے نہیں آیا۔ بتاؤ! پھوپھی کس کمرے میں ہے؟“

اُس نے اپنا چہرہ میری چھاتی میں چھپا لیا اور ہاتھ کے اشارے سے کمرے کی نشان دہی کی۔ لائین کی ناکانی روشنی میں اُس کا حسن دکھائی نہیں دیتا تھا مگر بھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحوں میں ہی بے خود ہونے لگا۔ خالدہ نے غزالہ کے بدن کو بولنا نہیں سکھایا تھا مگر مجھے سننا سمجھا دیا تھا۔ اُس کا بدن آٹن واحد میں زبان بن گیا، میرا پورا وجود کان بن کر جوانی کے پھوٹے نعروں کی تال پر دھڑکنے لگا۔

ایسے میں وہ کراہی۔ ”اے! چھوڑو، مجھے کچھ کچھ ہو رہا ہے۔“

میں نے اُس کی زلفوں کو لیوں سے پڑے ہٹا کر کان میں سرکوشی کی۔ ”پہلے بتاؤ، کیا کچھ کچھ ہوتا ہے، پھر چھوڑوں گا۔“

”مجھے نہیں پتا..... اب چھوڑو بھی ورنہ میں اماں کو آواز دے کر بلا لوں گی۔“ اُس کی آواز سرکش تھی۔

”بھلے بلاؤ، میں کوئی ڈرتا ہوں اُس سے۔ تم میری سنگیت ہو۔ عن قریب بیوی بن جاؤ گی۔ پورا نور پور جانتا ہے۔“

”جب بیوی بنوں گی تب دیکھا جائے گا، ابھی تو میری جان چھوڑو ناں!“ وہ کسمسائی۔

”چھوڑو دوں؟“

”ہاں تو!“

”دل سے کہو تو ابھی چھوڑ دوں گا۔“

وہ کہتا چاہتی تھی مگر دل آڑے آیا۔ زبان پکڑی گئی۔

”بولو ناں!“

حسن کے دربار میں میری وارفتگی کی گستاخیاں برابر بڑھتی جارہی تھیں اور اُس کی برائے نام مزاحمت بھی دم توڑتی جاتی تھی۔ گزرنے کو تو شاید پانچ دس منٹ گزر گئے تھے مگر یوں لگا جیسے وقت نے محض چند پلکیں ہی جھپکائی تھیں کہ پھوپھی کبریٰ کی تیز آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔ ”اے کرناں ماری! کہاں مر گئی ہو، جاتی ہو تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتی ہو۔“

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مجھ سے علیحدہ ہوئی۔ پھوپھی ہوئی

مسافر

سانسوں کے درمیان بولی۔ ”اس سے پہلے کہ اماں بے نقط سناٹی ہوئی کمرے سے نکل آئے اور تمہاری شامت آ جائے، فوراً چلے جاؤ۔“

میں نے اُس کی ہانپہ پکڑنا چاہی مگر وہ میرا ارادہ بھانپ کر لہرائی ہوئی دمترس سے نکل گئی۔ محن کے وسط میں پہنچ کر پلٹی اور ہاتھ لہراتے ہوئے جانے کا اشارہ کرنے لگی۔ وہ میرے اور اپنی ماں کے بیچ میں حائل کھڑی تھی۔ ماں اپنی جانب بلا رہی تھی۔

ایسے میں ماں کی طرف منہ کر کے بولی۔ ”آ رہی ہوں اماں! سانس تو لے لیا کرو۔ میں چولہے سے راکھ نکال رہی ہوں۔“

پھر میری طرف منہ کر کے اونچی آواز میں بولی۔ ”کیا پتا تھا، راکھ میں انگارے دبے ہوں گے۔ ہاتھ کیا جٹے، یوں لگتا ہے جیسے پورے جسم میں آگ جل اٹھی ہو۔“

میرے لیوں پر زندگی ایک مسکراہٹ بن کر دم بھر کو ابھری، پھر دل تک چلی گئی۔ میں نے ہاتھ لہرا کر باہر کا قصد کیا۔ ابھی محل خان کے دروازے تک ہی پہنچ پایا تھا کہ اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سناٹی دی۔ مجھے گھر پہنچنے میں بہت دیر ہو گئی تھی اور چوروں کی طرح دیوار پھلانگنا ضروری ہو گیا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں شب کے پچھلے پہر میں گھر کی عقی کھڑکی سے نکل کر جیت شاہ کے مزار کی طرف جاؤں گا اور سن سن لینے کی کوشش کروں گا مگر سو یا تو پھر علی الصباح آنکھ کھلی۔ میں کمرے میں ہی نماز پڑھنے کا عادی تھا مگر اس دن میں سامیں جیت شاہ کے مزار کی طرف جا نکلا۔ ایسے ہی وقت میں مسجد کے اسپیکروں سے اذان کی صدا آئی۔ میں نے ٹینکی کے بیچ بستہ پانی سے وضو کیا، مزار کے بائیں پہلو میں محن کو ’صافے‘ کی مدد سے جھاڑ کر نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنائی اور خدا کے حضور سر بسجود ہو گیا۔

دعا مانگنے کے بعد مزار کے احاطے کا کھوجتی نظروں سے جائزہ لیا۔ یہاں کے باسیوں کی ابھی آنکھ نہیں کھلی تھی، صبح نہیں ہوئی تھی۔ سامیں دل جیت شاہ کی رہائش گاہ میں زندگی کی علامتیں غدار دھیں۔ میں ٹھیلے ہوئے مشرقی دیوار تک گیا، پارکنگ کا سرسری انداز میں جائزہ لینے کے بعد پلٹ کر مغربی دیوار تک چلا گیا۔ دیوار کے پار جنگل میں جھانکا۔ پردوں کو صبح کی خبر ہو گئی تھی۔ چکاروں نے ماحول میں موسیقی بکھیر دی تھی۔ کافی دیر تک دیوار کی منڈیر پر ٹھوڑی لگائے درختوں کے بیچ نظریں جمائے کھڑا رہا۔ کوئی حرکت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تھک

کر پٹنا، سامیں کی رہائش گاہ کو خوابیدہ پایا تو سوچ میں پڑ گیا۔ ڈاکٹر شاہ جی نے گزشتہ شام کو ہمیں محتاط کر کے کہا تھا کہ نشانیوں کو کھلی آنکھ سے دیکھنا اور ٹٹولنا پڑتا ہے۔ ہرے شیشوں والی بینک کے پار ہر طرف ہر اہر اسی دکھائی دیتا ہے۔ صبح کی روئیدگی نے اُس گھڑی میری آنکھوں کو تازہ دم رکھا تھا اور میری آنکھوں پر کوئی پٹی بندھی ہوئی نہیں تھی۔ یعنی میں منظر کے قلب میں بیوست سچائی تک پہنچنے کی اہلیت رکھتا تھا۔

میں سامیں کی رہائش گاہ کی بیرونی دیوار تک گیا۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ نور پور کے تمام گھروں سے اس وقت جھاڑو پھیرنے سے پیدا ہونے والی مخصوص آواز برآمد ہوتی تھی۔ عورتیں نماز سے فارغ ہوتے ہی محن کی صفائی سترائی میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ دل جیت شاہ کی دو بیویاں تھیں۔ اندازے کے مطابق ایک دونوں کرانیاں بھی ضرور موجود ہوں گی مگر بحال گھر سے جھاڑو کی مخصوص سرسراہٹ، برتنوں کی جھنکار، نکلے کا شور، بچوں کی چکاریں..... کچھ بھی تو سناٹی نہیں دیتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی ٹھیک کہتا تھا۔ نشانیاں دیکھنے سے دکھائی دیتی ہیں۔ لوگوں کو علی الصباح جاننے اور نماز پڑھنے کی تلقین کرنے والا خواب غفلت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ وہ راستہ دکھاتا تھا مگر خود اُس راستے کے برابر اپنا راستہ بنا کر چلتا تھا۔ میرے ہونٹ پہنچ گئے۔ نور پور کے بڑے کہتے تھے کہ سامیں جگ جیت شاہ دریاے سندھ کے پار سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ اُس نے اپنی نور پور کی زندگی نہایت عسرت اور مشقت میں گزاری تھی۔ ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا، محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتا تھا۔ جب نور پور کی مسجد ایسی نہیں تھی۔ چکنی مٹی کی چار دیواری میں گھرا ہوا بے چھت احاطہ مسجد کہلاتا تھا جس میں سب سے پہلی صف سامیں جگ جیت نے کہیں سے لا کر بچائی تھی۔ وہ اس محن کی صفائی کرنے کے بعد فجر کی اذان دیا کرتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اسپیکر کے بغیر ہی اُس کی جاندار اور دل کش آواز ساتھ کے دیہاتوں تک پہنچا کرتی تھی۔ وہ امامت کی سعادت بھی باقاعدگی سے حاصل کرتا تھا۔ اُس نے علم کی شمع روشن کر رکھی تھی۔ علی الصباح گاؤں کے تمام بچے اُس کے پاس قرآن پاک کا سبق لینے آیا کرتے تھے۔ سہ پہر میں وہ پھر سب کو بلوایا کرتا تھا۔ سامیں جگ جیت شاہ کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ اُس نے اپنی زندگی میں کسی سے نقد رقم کا تحفہ یا نذرانہ قبول نہیں کیا تھا۔ اُس کی بیوی کے پاس نور پور کی لڑکیاں اور عورتیں پڑھا کرتی تھیں۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ کڑھائی سلائی کا کام بھی کرتی تھی۔ اسی جگہ پر، جہاں جگ جیت شاہ کا مزار سر

9 کاکڑے میں لکڑی لکڑی

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز
پاکستان کے سب سے بڑے
مہینہ نامہ پیکر نامہ گزشتہ

ماہ حاصل کریں، اسے دروازے پر

ایک سال کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

روپے 600 کے لیے

امریکا کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

روپے 6,000 کے لیے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ ہم اسی حساب سے
ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

سب سے زیادہ کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا وائرمن
کے ذریعے بھی جاسکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر
میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: شرعباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیر 111 پکینیشن ڈینس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

لی تھی جبکہ وریام خان کا غصہ آیا کاروبار دھار گیا تھا۔ اس نے
مجھے بلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تاڑ چکا تھا کہ وریام
خان، حیات خان اور حیدر خان، تینوں وڈیرے ہی، بخت
خان سے بگاڑ پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

مجھے امیر نواز نے خوب ویل کی پختہ حوضی میں نہاتے
ہوئے سمجھایا تھا۔ ”شہرے خان! بابا برا آدمی نہیں ہے۔ چاچا
وریام کچھ مختلف سوچ رکھنے والا خان ہے۔ ہاں! چاچا بخت
خان تو فرشتہ ہے۔ ہمارا خاندان اس کی مخالفت محض اس کے
خیالات کی وجہ سے کرتا ہے۔ میں ایسا نہیں کرتا۔ تمہیں مشورہ
دیتا ہوں کہ بخت خان کا تھا ہوا ہاتھ بھی نہ جھٹکنا۔ وہ تمہیں
انسان بنائے گا، چاچا وریام اور چاچا حیدر خان تمہیں بد معاشی
کے راستے پر لے جائیں گے۔ بخت خان تم پر مہربان ہے،
بعید نہیں کہ وہ تمہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملتان، لاہور یا کسی بھی
بڑے شہر میں بھیج دے۔ دولت کے لحاظ سے وہ نور پور کے
دوسرے وڈیروں سے کم تر ہے مگر ہاتھ کا سختی ہے۔“

میں نے اس کی باتیں پہلے سے باندھ لی تھیں۔ امیر
نواز کی ایک خوبی مجھے پسند تھی۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔
شراب پیتا تھا مگر آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ شکل و صورت
میں بیکتا تھا، جوان جہان تھا مگر نور پور کی کڑیوں پر میلی نگاہ
نہیں ڈالتا تھا۔ جولائی کے تیز الاؤ والے شعلوں کے لیے اس
نے نور پور سے دور کئی سرومور پیچے بنا رکھے تھے۔ میں سمجھتا
تھا کہ وہ اپنی موج میں رہنے والا شخص ہے مگر بخت خان نے
مجھے اس کے بارے میں کہا تھا کہ امیر نواز کی جملہ خرابیوں
اور خامیوں پر اس کا انسان دوست رویہ پانی پھیر دیتا ہے۔

کھالے کی ہدایات سے سرفراز ہوتے ہوئے میں نے
چوک تریٹی پر بہ کثرت جانا شروع کر دیا تھا۔ عاشری کی گلی
میں، مین روڈ کی طرف منظور درزی کی دکان تھی۔ وہ اڈیٹر
مگر مگر جواں قلب انسان تھا۔ موسیقی اس کی کمزوری تھی۔ اس
نے مظفر گڑھ کے کسی کارنگر سے بڑا سا ڈیک (دسکی ساختہ
ٹیپ پلیئر) اور دو عدد جہازی ساز کے چوبی دھارے (ایئرکے
پاس) بنوا کر دکان میں سجائے ہوئے تھے۔ اس کے پاس
فوک گلوکار عطاء اللہ خان کے اب تک ریلیز ہونے والے
تمام البم موجود تھے جو اس نے اپنے دائیں ہاتھ پر رکھے
ہوئے مشغل چوبی ریک میں ترتیب وار رکھے ہوئے تھے۔
سراٹگی اور اردو گیتوں کا انتخاب اذخیرہ میں نے اور کہیں نہیں
دیکھا تھا۔ میں نے اسے ایک سوٹ سلائی کے لیے دیا اور راہ
ورسم پیدا کر لی۔

اس نے علاقائی رواج کے مطابق مجھ سے میرا شجرہ

مجبب لگ رہا تھا۔ جمہائیاں لیتے ہوئے، سلیپر کو کاہلانہ انداز
میں فرش پر رگیدتے ہوئے بیڑھیوں کی مخالف سمت میں
برآمدے کے آخر پر واقع غسل خانے کی طرف بڑھا۔ میں
سرک کر پیچھے ہٹا اور جنوبی منڈیر پر سے لٹک کر دیوار کے
ساتھ کھٹکا ہوا زمین پر جا گرا۔

میرا کام کھل ہو چکا تھا۔ کھلی آنکھوں دیکھ چکا تھا کہ
سائیں دل جیت دن چڑھے بیدار ہوا تھا اور اس نے یقینی
طور پر جگر کی نماز ادا نہیں کی تھی۔ یہ اچھے کی بات تھی۔ ڈاکٹر
شاہ جی کہتا تھا کہ جو شخص پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا
نہیں کرتا، وہ اللہ کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اللہ اس سے ناراض
ہوتا ہے، راضی نہیں ہوتا اور وہ جس سے راضی ہوتا ہے، وہ
تقویٰ اور عبادت شعار کی کو اپنا وتیرہ بنا لیتا ہے۔ اپنے گھر
میں بیدار ہونے والا پہلا شخص سائیں تھا جس کا واضح مطلب
یہی تھا کہ گھر میں علی الصبح بیدار ہونے کی روایت سرے
سے موجود ہی نہیں تھی۔

تاخیر کے سبب میں ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں نہیں جاسکا،
اس لیے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ زندگی کے معمولات کے
ساتھ ساتھ نور پور میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں بھی
میرے جلو میں چلی آ رہی تھیں۔ میں سردار حیات خان اور
وریام خان کے ڈیروں سے اٹھ کر بخت خان کی چھتری تلے
آن بیٹھا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میرا چلن دونوں وڈیروں پر
سخت کراں کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں اپنے
روپے پر بھی ہچکچتاوے کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ میں
وریام خان کی گالیاں اور سردار حیات خان کا طمانچا رخسار پر
وصول کرنے کے بعد دونوں کے پاس ایک بار بھی نہیں گیا
تھا۔ میں نے اپنے تئیں یہ طے کر لیا تھا کہ اب میں وہاں نہیں
جاؤں گا۔ بخت خان، جو میرے سمیت پورے نور پور کی
نظروں میں اکھڑ مزاج، بدتمیز اور دکھری ٹائپ کا وڈیرا تھا،
ایک نئے روپ میں مجھ پر آشکار ہوا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی اور
خان لوگوں کی نظروں میں اب بھی پہلے جیسے ہی تھے مگر میں
اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ وہ انسانیت کے سچے
ہمدرد اور بچی خواہ تھے۔

سردار حیات خان کو میرے غیاب کے سبب کچھ مشکلات
کا سامنا درپیش تھا۔ میں بغیر تحفہ کا ملازم تھا جو اس کے ”شعبہ
اکاؤنٹس“ کو سنبھالا کرتا تھا۔ اس کے منشیوں کا ایک طرح کا
سپر وائز تھا۔ اب اسے وہ سارا حساب کتاب خود کرنا پڑتا تھا
جس سے اس کی اب تک جان چھوٹی رہی تھی۔ اس نے ایک
دوسرے مجھے بلوایا تھا مگر میں نے بڑے آدب سے معذرت کر

اٹھائے کھڑا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک کچے کمرے میں سر
جھکائے کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک ہی پٹا تھا، دل جیت
جسے سائیں جگ جیت نے بڑی محنت سے پڑھایا۔ چوک
قریشی کے سرکاری اسکول میں اسے چھوڑنے جاتا اور خود سارا
دن وہاں پہلے داری کرتا۔ جب دل جیت کو چھٹی ہوتی، وہ
اسے سائیکل پر بٹھا کر نور پور لے آتا۔

سائیں جگ جیت شاہ کی آخر دم تک معاشی حالت
جوں کی توں رہی تھی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے سائیں دل
جیت نے اس کی مٹی قبر پر خانزادوں کی مالی معاونت کے
ساتھ عالی شان مقبرے کی تعمیر شروع کر دی۔ مقبرہ، پھر
رہائش گاہ، پھر مہمان خانے..... آج دل جیت کے پاس دنیا
کی ہر نعمت موجود تھی مگر مجھے اس کے ہاں وہ نشانی دکھائی نہیں
دی جو اس کے باپ کی زندگی کے لمحے لمحے سے عیاں تھی۔
جس نشانی کا تذکرہ نور پور کے بڑے بوڑھے کرتے تھے،
جن کی آنکھیں گھر سے کی ٹھٹھرتی راتوں میں بھی، جب وہ
کھیتوں کو پانی لگا کر گھروں کو لوٹ رہے ہوتے تھے، خستہ
حال حجرہ نما کمرے میں گھی کے چراغ کی روشنی میں سائیں
جگ جیت شاہ کو خدا کے دربار میں جھکا دیکھا کرتی تھیں۔

دل میں شک جاگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دل جیت شاہ بغیر
بٹی جلائے نماز پڑھ رہا ہو۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا
بارنگ ایریا میں آیا۔ دیوار بھانڈ کر رہائش گاہ کے
چھوڑے پینچا۔ برساتی پرنا لے گی دونوں انیوں پر چڑھ
لگائے اوپر اٹھتا گیا۔ چند ہی منٹوں کی مشقت نے مجھے چھت
پر پہنچا دیا۔ میں دو کمروں کی چھتوں کے بیچ کی تنگی سی منڈیر
پر چلتا ہوا آگے بڑھتا کہ میرے پیروں کی چاپ سے چھت
میں دھمک پیدا نہ ہو۔ محسن کی سمت والی منڈیر کے پاس سینے
کے بل لیٹ کر احتیاط سے محسن میں جھانکا۔ محسن سنان تھا
اور سبھی کمروں کے دروازے بند تھے۔ کمروں کی بٹیاں بھی
گل تھیں۔ اگر کوئی بٹی روشن ہوتی تو دروازے کے نچلے حصے
کا خلا روشن ہوتا۔

مجھے وہاں لینے ہوئے کافی دیر گزر گئی۔ سورج نے اپنا
آپ دکھانا شروع کر دیا۔ پورا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ لوگ
اپنے اپنے وعدوں میں رُجھ گئے تھے لیکن دل جیت شاہ کے
گھر کے بھی دروازے بند تھے۔ میں مایوس ہو کر چھت سے
اُترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شمالی گوشے کا آخری دروازہ
کھلا۔ میں محتاط ہو گیا۔ دیکھا، سائیں دل جیت شاہ
دروازے کے پچوں بیچ کھڑا کھڑا آیاں لے رہا تھا۔ چیک
دار دھوئی اور سفید رنگ کی بغیر بازوؤں والی بنیان پہنے وہ بڑا

نسب دریافت کیا۔ وہ میرے باپ کا واقف کار نکلا۔ نور پور کے اکثر بڑوں کو جانتا تھا۔ دکھ آمیز لہجے میں بولا۔ "ہائے! کیا جوانی تھی سوہنے خان کی..... پر بھوکہ زمین اُسے چاٹ گئی۔ بڑا گرم خون ہوا کرتا تھا اُس کا، ادھر کوئی بات ہوئی، ادھر اُس کا ہاتھ گھوم گیا۔ طاقت بھی تو سوہنے رب نے اُس کے وجود میں بہت بھر رکھی تھی ناں....."

پوچھا۔ "کیا وہ تم سے کپڑے سلوایا کرتا تھا؟" میں نے وہ کہنے لگا۔ "سوہنا تو ہر عید پر میرے پاس ہی آیا کرتا تھا۔ بڑا خیرہ تھا اُس کا اُس موئے دیوانے شاعر کے کام کیے سے پہلے نور پور کے سبھی لوگ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ اسی بہانے گاؤں کے حالات کا بھی پتا چلتا رہتا تھا۔ اب میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ بڑے عرصے کے بعد تمہاری شکل دیکھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی اُسی سے کپڑے سلوایا کرتا تھا۔ اب وہ خیرے دکھانے لگا ہے۔"

ماں کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اُس کی اولاد کی خوشامد کرنا پڑتی ہے۔ میں نے بھی منظور درزی کے ہنر کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اُس کے موسیقی کے شوق کو سراہا اور یوں دوسری ملاقات میں ہی ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا۔

عاشی کا گھر اُس کی دکان سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ چوک قریبی چونکہ بڑا شہر نہیں تھا، بلکہ ابھی پوری طرح قصبہ بھی نہیں بنا تھا اس لیے منظور درزی یہاں کے باسیوں کو فردا فردا جانتا تھا۔ کون کیا کرتا ہے؟ کیا ہے؟ اُسے کیسا ہونا چاہیے؟ وہ جانتا تھا اور کے ٹو فلٹر سگریٹ کے لیے بے کش لیتے ہوئے اظہار بھی کرتا جاتا تھا۔

میں آدھے دن کا بیشتر حصہ اُس کے پاس گزارنے لگا۔ اپنا سوٹ بدل جانے کے بعد بھی دکان پر آمد و رفت کا میں نے جواز یہ پیش کیا تھا کہ مجھے آدھا دن ویکین کے سلسلے میں چوک قریبی میں رہنا پڑتا تھا۔ میں ڈرائیوروں کی صحبت پسند نہیں کرتا تھا اور آوارہ گردی کرنے کے بجائے اُس کے ہاں آ بیٹھتا تھا۔ اُس نے میرے خیالات کی تعریف کی اور کھلے دل سے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت مرحمت کر دی۔

میں اُس سے عاشی کے خاندانی معاملات پر گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر جبکہ آڑے آ جاتی۔ میرا کام وحید نے آسان کر دیا۔ اُس نے گلی میں سے گزرتے ہوئے مجھے دیکھ کر پہچان لیا۔ "بھائی جان! کہہ کر مخاطب ہوا اور اپنے گھر لے

جانے پر یہ ضد ہوا مگر میں نے اُسے ٹال دیا۔ اُس کے جانے کے بعد منظور نے پوچھا۔ "تم سجاد کے بیٹے کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔ "ہاں! اس محلے میں امجد ڈرائیور کو بھی جانتا ہوں۔ کبھی کبھار اُس کے ہاں آیا کرتا تھا، گلی میں آتے جاتے وحید سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ وحید دوبارہ پہنچ گیا۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کا اعادہ کیا۔ میں بہ ظاہر طوعاً و کرہاً اُس کے ساتھ چل پڑا۔ دکان سے نکل کر اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں نے مجھے بلوایا تھا۔

عاشی کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کا دوسرا اتفاق تھا۔ حسب سابق اُس کی ماں چائے بنا لائی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "میرے بیٹے نے جب تمہارے بارے میں بتایا کہ تم بھائی منظور کی دکان پر بیٹھے ہو تو میرے دل میں تم سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ تمہارے گھر والے کیسے ہیں؟"

ہماری ثقافت کا ایک اہم جزو 'حال دینا' ہے۔ ملنے والے اپنے ہر متعلقہ شخص کا فرداً فرداً نام لے کر اُس کا احوال بیان کرتے ہیں۔ اختصار کو بے زنجیر قرار دیا جاتا ہے۔ وہ چونکہ پڑھی لکھی خاتون تھیں، اس لیے میں نے مختصر طور پر حال بیان کیا۔ اُس سے اُس کے شوہر اور بیٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ بولی۔ "عاشی کے ابو کو بلب کی روشنی میں الوداع کرتی ہوں، بلب کی روشنی میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ رہی عاشی، تو وہ آدھا دن کالج میں گزار کر آتی ہے تو پڑھنے بیٹھ جاتی ہے۔"

وحید بولا۔ "آپ بھی تو آدھا دن اسکول میں لگا آتی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "عاشی کو پڑھا کر استانی لکوانے کا ارادہ ہے؟"

وہ بولی۔ "ہاں پتر! ارادہ تو یہی ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بھی اپنے منہ سر جوگی ہو جائے گی۔"

ہمارا خاندان لڑکیوں کی پڑھائی کو بادل ناخواستہ قبول کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ نوکری کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا جاتا تھا۔ لڑکیوں کی کمائی کو برا بلکہ حرام خیال کیا جاتا تھا مگر اس طرف دھیان نہیں جاتا تھا کہ سبھی بالواسطہ طور پر لڑکیوں کی کمائی کما بھی رہے تھے چونکہ عورتیں اور بچیاں کھیتوں میں باقاعدگی سے جا یا کرتی تھیں اور کام کاج میں اپنے گھر کے مردوں کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں۔ اس طرح وہ گھر میں آنے والی آمدنی کی حصہ دار ہوتی تھیں۔ چارے کی من

ڈیڑھ من کی گھڑی سر پر لادنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا تھا، دو چار کتابوں اور ایک ہینڈ بیگ کا وزن بڑا سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ جی عموماً کہا کرتے تھے کہ ہمارے معاشرے میں منافقت اس حد تک رچی بسی ہے کہ اسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "ہم تو بیٹیوں کی نوکری کو اچھا نہیں سمجھتے خالہ جان!"

وہ ایک ذرا مسکرائی، نرم لہجے میں بولی۔ "تم ٹھیک کہتے ہو مگر جس چیز کو تم بہ آسانی جھیل سکتے ہو، میں نہیں جھیل سکتی۔ تم یہ گوارا کر لیتے ہو کہ تمہاری بہن یا بیٹی تمام عمر کسی کی غلامی کرتی رہے، دست سوال دراز کیے پالستی کی جانب ایک ٹانگ پر کھڑی رہے، اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے جھڑکیاں سنتی رہے..... جب، اور جس کا جی چاہے، مار پیٹ کر گھر سے نکال دے اور وہ بھائیوں کے در پر، بھابیوں کے رحم و کرم پر بیٹھ جائے، تا عمر آنسو بہاتی رہے، اُس کے فیصلے کیے جائیں اور اُس سے پوچھا تک نہ جائے۔ ہاں! تم لوگ یہ بھی گوارا کر لیتے ہو کہ اپنی اُجڑ کر آئی ہوئی بہن کو اُس کے چار پانچ بچوں سمیت تمام عمر پالتے رہو، اپنی قسمت کو کوسے رہو اور اسے جیتے جی درگور رکھو مگر میں یہ دکھ نہیں جھیل سکتی۔"

میں متعجب ہوا۔ "میں سمجھا نہیں خالہ جی!"

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ "سمجھنے کی کوشش کرو گے تو سمجھ میں آ جائے گا۔ میں ایک دوسرے انداز سے بتاتی ہوں۔ وحید کے ابو بہت جذباتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کئی سال پہلے، ایک مرتبہ مجھے معمولی جواز پر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اُن کا موقف تھا کہ میں اسکول میں پڑھانے جاتی ہوں۔ لوگ مجھے دیکھتے ہیں۔ عورت، جس کی جوانی کو لوگ آتے جاتے ہوئے دیکھیں، وہ گھر میں رکھے جانے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ وحید کے ابو کا قول تھا۔"

چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "اُس وقت عاشی میری گود میں تھی۔ میں اُسے لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ ایک سال وہاں رہی۔ چونکہ میری تنخواہ معقول تھی، میں کسی پر بوجھ نہیں مٹی بلکہ میرے والدین کو میرے وہاں رہنے سے مالی معاونت حاصل ہو گئی تھی، اس لیے مجھے آنکر کر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ وحید کے ابو کی ضد ایک سال میں ہی اپنی موت آپ مر گئی۔ برادری نے منت سماجت کی، بڑوں نے انہیں برا بھلا کہا اور میں بڑے ناز نعرے سے واپس اس گھر میں آئی۔ پھر انہیں جرات نہیں ہوئی کہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتے یا گالی دیتے۔"

مسافر

میں اٹھا ہوا تھا۔ اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "عاشی میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اسے اپنے خون سے پال کر جوان کیا ہے میں نے۔ اس کی پھوپھوں نے آج تک انگلی تانے رکھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بے حیا ہو جائے گی، پڑے شہر جا کر آوارہ اور بدچلن ہو جائے گی۔ میں نے ان کے ابو کو باور کرا دیا کہ جو کام بیوی کر سکتی ہے، وہ کام بیٹی بھی کر سکتی ہے۔ وہ مان گئی۔ اب جب وہ پڑھ لکھ گئی ہے اور اللہ نے چاہا تو عن قریب سی ٹی کر کے کسی سرکاری سکول میں استانی لگ جائے گی تو انہی پھوپھوں کی رال کھینچے گی ہے۔ بیٹیوں کے لیے رشتہ مانگنے لگی ہیں۔ اُن کا دل بھی بہنوں کے لیے پیچھا ہوا ہے مگر مجھے پروا نہیں....."

میری تمنا پوری ہو رہی تھی۔ جو میں پوچھنا چاہتا تھا اور پوچھنے سے جھجکتا تھا، وہ از خود مجھے بتا رہی تھی۔ "اُن کے بھانجے اور بیٹے اُن پڑھ ہیں یا بہت کم پڑھتے ہیں۔ اُن کے ردیے بھی میرے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ میں اپنی مرضی کروں گی، کسی باشعور اور سلجھے ہوئے بندے کو اپنی دھمی کی بانٹہ تھماؤں گی۔"

میں نے محاط انداز میں کہا۔ "ہونا تو پھر یہ چاہیے کہ آپ بھی اپنی مرضی نہ جتائیں بلکہ اپنی بیٹی کو انتخاب کا حق تفویض کریں۔"

وہ جھٹ سے بولی۔ "کیوں نہیں! میں یقیناً ایسا ہی کروں گی۔ وہ جسے چاہے گی، اگر وہ اُس کے لائق ہوگا میری نظر میں، تو میں اُس کے انتخاب کو قبول کروں گی۔"

"کوئی ایسا سامنے آیا؟"

"نہیں۔ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔"

دوسری ملاقات میں ہی وحید کا بھ سے بے تکلف ہونا مجھے بہت اچھا لگا۔ میں جب اُن کے ڈرائنگ روم سے نکل کر منظور درزی کے پاس آیا تو اُس نے چھوٹے ہی پوچھا۔ "بڑی دیر لگا دی جوان! خیر تو تھی؟"

میں نے اُسے مطمئن کیا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے امجد ڈرائیور کی نظر بھی مجھ پر پڑی۔ اُس نے گھر چلنے کا حکم صادر کیا۔ میں نے تھوڑی پس و پیش کے بعد حکم مان لیا اور اُس کے ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ ایک ہی دن میں مجھے عاشی کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل ہو گئیں مگر اُس لڑکے کے بارے میں پتا نہیں چلا جس کے ساتھ اُس کا 'معاشرت' چل رہا تھا۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا تھا کہ کیا دونوں کے بیچ استوار ہونے والے تعلق کو معاشرت کہا جاسکتا تھا یا نہیں۔

میں دوپہر کو ویکین پر کھالے کے ساتھ بیٹھ کر یا شیدو کے

”نہیں۔۔۔۔۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، ایک دوسرے سے شادی کا تعلق بھی نہیں تھا۔“

”پھر دونوں کی شادی کس طرح سرانجام پائی؟“ ڈاکٹر شاہ جی نے مجھ پر نظریں گاڑ دیں۔

میرا سر جھک گیا۔ سوچا جھوٹ بول دوں، پھر سوچا، جھوٹ بولوں گا تو پہلے کی طرح ہلکتا رہوں گا اور ڈاکٹر شاہ جی میری کوئی مدد نہیں کر پائے گا۔ میں نے کہا۔ ”میرا باپ بیل خریدنے کے لیے شاہ جیال گیا تھا۔ بیل پسند نہیں آیا، میری ماں نظر آ گئی جو پہلی نظر میں ہی اُسے پسند آ گئی۔ میرے تخیال والے امیر لوگ نہیں تھے، بلکہ ہم سے بھی گھٹے گزرے تھے مگر انہوں نے غیر برادری کی بنیاد پر رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ میرا دادا اور چاچا چرخ بھی اس رشتے پر رضامند نہیں تھے۔“

”تمہاری ماں کا نام کیا تھا؟“

”رضیہ۔۔۔۔۔ سبھی اُسے ’رجو‘ کہتے تھے۔“ میں نے بتایا۔ ”پھر دونوں کے بیچ میل ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا جس کے نتیجے میں ایک دن دونوں غائب ہو گئے۔ دونوں دیہاتوں میں بڑا ہنگامہ مچا ہوا۔ ایک ماہ کے بعد، جب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تو دونوں نور پور میں آئے۔ انہوں نے شادی کر لی تھی۔“

”کیا تمہارے تخیال والوں نے کوئی رابطہ کیا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ میرے بڑے ماموں نے یہ کہا تھا کہ رجو ہمارے لیے مر چکی ہے۔ اگر وہ یا سوہتا خان بھی شاہ جیال میں نظر آئے تو ان کا خون کر دیا جائے گا۔“

”بڑوں نے صلح کی کوشش کی؟“

”میرا خیال ہے کہ نہیں کی ہوگی۔ اگر کی بھی ہو تو اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ دونوں کو تمہارے کسی ماموں نے قتل کیا ہو؟“

میں نے پورے وثوق سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں شاہ جی! اُن کے بازوؤں میں اتنا دم نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو فوری طور پر حملہ کرتے۔ اتنا لبا اعتقاد نہ کرتے۔ ویسے بھی اتنے برسوں کی گردانجام کے شعلوں کو بجھا دیتی ہے۔“

اُس نے تمہیں انداز میں سر ہلایا، بولا۔ ”بالکل ٹھیک۔ اب ہم اس کہانی کو دوسرے رخ سے دیکھتے ہیں۔ کیا اس کہانی میں کوئی تیسرا کردار بھی تھا۔۔۔۔۔ ولن؟“

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ چہرہ ہل بھر کو متغیر ہوا۔ ڈاکٹر شاہ جی، جو یک تک مجھے گھور رہا تھا، فوراً بولا۔

چونکہ کہانی طویل تھی، اس لیے میں نے مناسب جانا کہ پہلے چائے تیار کر کے ڈاکٹر شاہ جی کو پیش کر دوں تاکہ بیچ میں اُٹھنا نہ پڑے۔ میں نے جب اپنے خاندانی پس منظر کو چھیڑا، ڈاکٹر شاہ جی تمام تر توجہ میرے الفاظ پر مرکوز ہو گئی۔ میں نے اپنے تئیں جزیات تک کو موضوع سخن بنایا تھا اور کوشش کی تھی کہ اُس پر سب کچھ عیاں ہو جائے۔ وہ سنا رہا، ہل ہل چہرہ متغیر ہوتا رہا اور میں اپنی ہی رو میں آ گئے، اور آگے بڑھتا رہا۔ کوئی گھٹنا بھر کے بعد میرے ذہن کا قصہ تمام ہوا تو اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ ہولے سے بولا۔ ”چائے۔۔۔۔۔“

مجھے اُس کے لبوں سے پھوٹنے والے اس واحد لفظ کی توقع تھی، اس لیے کوئی دیر کے بغیر میں اُٹھ کر بچن میں چلا گیا۔ اُس نے چائے کا ایک گھونٹ حلق میں اتارا، طویل سانس حلق سے خارج کی اور بولا۔ ”شہر یار! کیا تم چاہتے ہو کہ اس موضوع پر ہم گفتگو کریں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ”تو اب جو میں کہنے جا رہا ہوں، غور سے سنو۔ پھر فیصلہ کرنا کہ ہمیں اس راکھ کو کریدنا چاہیے یا نہیں۔ اوکے؟“

”میں سرا“

”تمہاری سناکی ہوئی داستان میں کئی جذباتی موڑ ہیں، کئی نفسیاتی خامیاں ہیں اور کئی تکنیک الجھنیں ہیں جنہیں سلجھاتے ہوئے، کہیں انگلیاں، کہیں زبان تو کہیں ہونٹ چل جائیں گے۔ تب کہیں جا کے چپے ہوئے کرداروں پر سے پردہ کشائی ہوگی۔ کہو! کیا اتنی ہمت رکھتے ہو؟“

میں اُس کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔ مگر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ”آپ بات کیجیے، مجھ میں حوصلہ ہے۔“

وہ چند لمحے تک مجھے ٹٹوتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا، اپنے تئیں کچھ طے کرتا رہا، پھر بولا۔ ”شہر یار! کیا تمہاری ماں بہت خوب صورت تھی؟“

میں نے کہا۔ ”لوگ یہی کہتے ہیں۔ شادی پر لیا گیا ایک بلیک اینڈ وائٹ فوٹو بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔“

”اور تمہارا باپ بھی؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں! وہ بہت خوبصورت اور کڑیل جوان تھا۔ اُس کا نام امام بخش تھا، مگر لوگ اُسے سوہتا خان کہتے تھے۔“

”کیا تمہارے تخیال سے تمہارے باپ کی رشتہ داری تھی؟“

جلدی سے کہا۔ ”دراصل مجھے اُس کی رونی صورت پر ترس آتا ہے۔“

”اُس پر ترس آتا ہے تو اُسے سمجھاؤ کہ اپنی محبت کی تاریخ کا رخ کسی اور جانب موڑ لے۔ مجھے معاف ہی رکھے۔“ اُس کے لہجے کی زہر خیزی میرے لیے تعجب کا باعث نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ”آپ تو کہتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں خدا بستا ہے، پھر دل توڑتے ہوئے آپ اپنے کہے ہوئے الفاظ سے انحراف کیوں کرتے ہیں؟“

اُس نے ایک نگاہ تاسف مجھے دیکھا، بولا۔ ”شہر یار! بچہ نا بچہ میں آگ کو چھوٹا چاہے، نہر میں کودنا چاہے یا بوڑھا کڑواہٹ محسوس کرتے ہوئے دوا کھانے سے انکار کر دے تو کیا اُس کی دل آزاری کے خوف سے اُس کی بات کو مان لینا دانشمندی کہلائے گا؟“

میں لا جواب ہو گیا۔ باتوں میں اُس سے جیتنا مشکل تھا۔ میں نے کہا۔ ”مگر وہ آگ کو چھوٹنے کی کوشش نہیں کر رہی، وہ اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کی خواہش دل میں رکھتی ہے۔ جانتی ہے کہ اُس کی بیماری کو اس انداز میں مشتہر کر دیا گیا ہے کہ کوئی اُسے لینے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ آپ جانتے ہیں، آپ اُسے قبول کر سکتے ہیں۔“

اُس کے لبوں پر پھر وہی موٹی زہریلی مسکراہٹ حیر کنی، بولا۔ ”نہیں! ابھی اُس کے مستقبل پر سوالیہ نشان معلق نہیں ہوا۔ ابھی وہ محض اپنی جسمانی ضرورت کے محاذ پر کھڑی مل کھا رہی ہے۔“

میں زینا کی حمایت میں اپنی تمام تر قابلیت اور علمیت کو بروئے کار لے آیا مگر وہ اُس سے مس نہ ہوا بلکہ ہر بار کی طرح مجھے ہی پسائی اختیار کرنا پڑی۔ اچانک ایک خیال کوندے کی طرح لپکا اور اُن کی آن میں میرے پورے وجود میں سرایت کر گیا۔ میں نے کھالے سے اپنے باپ کے قتل کے محرک پر ہونے والی گفتگو کے دوران یہ سوچا تھا کہ میں ڈاکٹر شاہ جی کو یہ خوں چکاں داستان سناؤں گا اور اُن سے قاتل کی تلاش میں مدد طلب کروں گا۔ چونکہ میری نظر میں وہ بہت ذہین اور معاملہ فہم انسان تھا، اس لیے ممکن تھا، کہ کوئی ایسا نکتہ سمجھا دیتا کہ میری مشکل حل ہو جاتی۔ میں نے اپنی اُسی سوچ کے تابع کہا۔ ”شاہ جی! میرا ذاتی نوعیت کا ایک پیچیدہ معما ہے، کیا اُسے حل کرنے میں آپ میری مدد کریں گے؟“

وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”وائے ناٹ! تمہارے کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔“

ساتھ پائیدان پر لٹک کر نور پور لوٹ آتا تھا۔ کھالے کو اپنی پیش رفت سے آگاہ کرتا اور راہنمائی حاصل کرتا۔ وہ بڑے کام کے مشورے عنایت کرتا تھا۔ مجھے بعض اوقات حیرانی ہوتی کہ اُس نے اتنی جالاکیاں اور نفسیاتی الجھنوں کے فوری سلجھاوے کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔ اُس کی ہر ترکیب کالیاں ہوتی اور ہر حیرت آنے پر جا لگتا تھا۔

منظور درزی کے ہاں آمدورفت کے مختصر دورانیے میں عاشی ایک مرتبہ مجھے دکھائی دی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کے دو جزدی برقعے میں لپیٹی ہوئی تھی۔ اس نوع کے برقعہ کو یہاں ’امیر بلا برقعہ‘ یا ’فیضی برقعہ‘ کہا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سفید رنگ کے شل کاک پر قلعے کو ’دیسکی‘ یا ’ٹوپی والا برقعہ‘ کہا جاتا تھا جو یہاں زیادہ رائج تھا۔

عاشی کو اُس کے چمک دار سیاہ برقعے نے پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ محض سفید اور نازک ہاتھ دکھائی دیتے تھے۔ میں اُسے پہچان نہ پاتا اگر اُسے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھتا۔

ان دنوں مجھے بیک وقت کاشکاری کے معمول کے کام کاج کرنا پڑتے تھے، ملکہ کو پڑھانے اور ڈاکٹر شاہ جی سے پڑھنے کے لیے جانا پڑتا تھا اور کھالے کے ساتھ ہر روز صبح چوک قریشی جانا پڑتا تھا۔ آدھا دن وہاں گزر جاتا تھا۔ بعض اوقات ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں سے اُٹھ کر کھالے اور مراد بخش کی محفل میں بیٹھنے کا اعزاز بھی حاصل کرنا پڑتا تھا۔ کھالے اور دیوانے کی آپس میں لوک جھوک کا سلسلہ ہر دم جاری رہتا تھا مگر طویل اور مختصر دورانیے کے ترکب تعلقات کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ زیناں جب بھی ملتی، کبھی زبان سے تو کبھی لوگوں کی موجودگی کے باعث آنکھوں سے ڈاکٹر شاہ جی کا جوابی خط طلب کرتی اور میں مایوسی سے اپنا سر نیچی میں ہلا دیتا۔

ایک دن اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے جواز دیے۔ چونکہ وہ مجھ سے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی، اس لیے اشارے کنائے سے ہی اپنا مدعا بیان کرنے پر مجبور تھی۔ میں اتفاق سے ڈاکٹر شاہ جی کے پاس جا رہا تھا۔

میں نے ہمت کر کے شاہ جی سے کہہ ہی دیا۔ ”زیناں ہر روز مجھ سے اپنے خط کا جواب ملتی ہے۔“

اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورا۔ ”کیا تم نے دلائی شروع کر دی ہے؟“

جملہ خاصا تضحیک انگیز تھا۔ ندامت ہوئی۔ میں نے

سمیٹ کر اٹھا اور رفع حاجت کے بہانے گھر دے سے نکل گیا۔ ماسٹر جی کے ہونٹ نفیس انداز میں سکڑے، ہنکارا بھرا اور کہا۔ ”شہرے! سوہنے کریم کا کرم ہے کہ یارن خان کا دل نور پور سے اچاٹ ہو گیا اور وہ لاہور چلا گیا ورنہ اب تک نور پور کی گلیاں ویران اور گھر مکھڑ ہو چکے ہوتے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ ایسا کیا کرتا تھا؟“
اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ لمبی آنکھیں اور اٹھ کر برتن سمیٹنے لگا۔ جاتے ہوئے دروازے میں رُک کر پلٹے بنا بولا۔ ”اُس چالوس شاعر سے کہنا کہ میرا سوٹ جلدی دے۔ میں نے کل نہیں جانا ہے۔“

مجھے اُس کا رویہ عجیب سا لگا۔ وہ کچھ کہتا جانتا تھا، کہنے سے ڈرتا بھی تھا حالانکہ یہ اُس کی فطرت کے منافی تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ یارن خان سے قلبی پر خاش رکھتا تھا ورنہ یارن خان ایسا شخص نہیں تھا جو اپنی حویلی، جہاں اسے سال کا شخص ایک مہینا گزارنا ہوتا تھا، اتنا بجائے سحرائے رکھتا تھا، وہ ظالم یا بڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ تنہائی پسند تھا۔ ایسا شخص بے ایمان اور فرعون صفت نہیں ہوتا۔ یہ بات مجھے بارہا ڈاکٹر شاہ جی نے کہی تھی کہ مطالعے اور کتاب بینی کا شائق شخص ہزار خامیاں رکھتا ہو، منافق اور ظالم نہیں ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ یارن خان نے کسی موقع پر ماسٹر ولی محمد کا دل دکھایا ہو، اُس کی کسی فرمائش کو سختی سے رد کیا ہو یا اُس پر کبھی ہاتھ اٹھایا ہو جس کا شکوہ ماسٹر جی کے لبوں پر چل اٹھتا ہو۔

میری ان سوچوں کی تائید دیوانے نے کی جب وہ کھیتوں سے لوٹ کر آیا۔ ماسٹر جی کی غیر موجودگی کو غنیمت قرار دیتے ہوئے بولا۔ ”بڑا ماسٹر ٹھیا (ساتھ برس کا) گیا ہے۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ بہتر یا (بہتر برس کی عمر کا) ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا چھوڑو یا اس قصبے کو، یہ بتاؤ تم نے دل جیت کے مہمانوں کو گھیرنے کا کیا منصوبہ تیار کیا ہے؟“
اُس کی گردن حسب توقع تن گئی، لہجے میں خیر سا گیا، بولا۔ ”شہرے خان! میں نے ایسا زبردست پلان بنایا ہے کہ آنے والے بھی چوہے کڑکی میں پھنس جائیں گے۔“

میرے کریدنے کے باوجود اُس نے محض دیکھ ہی لوگے کہنے پر اکتفا کیا۔ کچھ دیر تک اُس کی دکان میں بیٹھنے کے بعد میں اپنے ڈیرے پر آ گیا اور پوری تن دے سے اپنے کام میں بگڑ گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا، میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ سہ پہر کو میں نہادھو کر کھالے کے باپ کی دکان پر آ بیٹھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بجائے ڈاکٹر شاہ جی کے ہاں رات گزارنے کے، چوک

”ماسٹر جی!“ دیوانے نے صدائے احتجاج بلند کی۔
”وہ ان کی طرح ظالم اور سنجوس نہیں ہے۔“

”وہ ان سے بھی آگے کی شے ہے پترا“ ماسٹر جی کے جھریوں بھرے چہرے میں یک دم کئی داستانیں سمٹ آئیں، ہاتھ لہرا کر بولا۔ ”یہ نور پور کی قسمت چکی (اچھی) ہے کہ یہاں سے چلا گیا ورنہ تم لوگ دیکھتے کہ یہاں سانسیں بھی اُس کی اجازت سے لیتا پڑیں۔“

مجھے ماسٹر کی بات سن کر اچنبھا ہوا۔ میں یارن خان کو بہت پڑھا لکھا، سنجیدہ اور تارکب الدنیا قسم کا بندہ سمجھتا آیا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ماسٹر جی! وہ ایسا دکھائی تو نہیں دیتا۔“

”اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اُس کی حویلی میں کوئی قدم نہ رکھے، بتاؤ، کسی نے حویلی میں قدم رکھا؟“ اُس کے لہجے میں عجیب سی نفرت گھٹی ہوئی تھی۔ ”کسی میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ صرف اس لیے کہ نور پور کے خاندانوں اور قریشی جانتے ہیں کہ وہ ہتھے سے اُکھڑا تو کوئی بھی سنبھال نہیں پائے گا۔“

”وہ اب کہاں رہتا ہے؟“
”لاہور میں بہت بڑا بنگلا ہے اُس کا۔“ دیوانے نے جھٹ دیدے پھیلائے۔ ”دعاگے والی ٹیکسری بھی ہے اُس کی بھائی پھیرو میں۔ تم جاہل آدمی ہو، تم نے تو بھائی پھیرو کا نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہوگا۔ ہے ناں؟“

اُس کی ٹیکسری گردن اور ناچتی آنکھیں دیکھ کر مجھے تاؤ تو بہت آیا مگر حقیقت یہی تھی کہ میں نے یہ لفظ پہلی مرتبہ سنا تھا۔ پوچھا۔ ”کیا یہ کوئی شہر ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ لاہور کے نیڑے نیڑے (قریب) واقع ہے۔“ اُس نے فاتحانہ انداز میں اپنی علیت کا رعب بھریا۔ ”ماسٹر جی پتا نہیں کس زمانے کی بات کرتے ہیں۔ میں نے خان کو بڑا بیٹا (اچھا) اور غریب پرور پایا ہے۔ سچ کہتا ہوں شہرے!“

ماسٹر ولی محمد کی سوختہ نظریں دیوانے پر چپک گئیں۔ چند لمحے ایسے ہی گھورتا رہا، پھر لمبی سانس پھینچوڑوں میں اُتارتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”ایک لمبی بھرے نور پور میں غریب رہ گیا ہے۔ ہائی تو سب جاہلادوں والے بن گئے ہیں۔“

اُس کے لہجے میں غیر معمولی کاٹ پنہاں تھی جبکہ ہاتھ کا اشارہ دیوانے کی طرف تھا۔ دیوانے کی حالت متغیر ہوئی۔ طنز برداشت کرنا محال ہو گیا تو مٹھین اور حنّے پر پھیلی گئیں کو

میری عدم موجودگی میں سیری جھوٹی سچی وکالت کر کے اُسے ٹھنڈا کر دیتی تھیں۔ وہ بھی چپ ہو جاتا، کبھی دونوں کی خبر لینے لگتا۔ میں کوشش کرتا کہ میرا سامنا اُس سے کم سے کم ہو۔ اسی آنکھ پھولی میں بدھ کا دن آ گیا۔ طبیعت میں عجیب بیجان اور بے قراری کی ملی جلی کیفیت علی الصباح سے محسوس ہو رہی تھی۔ کھالا اپنی دیکھن پر تھا، بخت خان دکھائی نہیں دیا تو مجبوراً مجھے مراد بخش دیوانے کی صحبت اختیار کرنا پڑی۔ وہ ماسٹر ولی محمد کا کتہ سینے میں جتا ہوا تھا۔ ابھی ہم روایتی تبادلہ احوال کر رہے تھے کہ ماسٹر ولی محمد چائے کی چپک اور پیالہ اٹھائے آن وارد ہوا۔ مجھے دیکھ کر قدرے خوش دلی سے بولا۔ ”شہرے پترا! یہ پکڑو، میں دوسرا پیالہ اٹھاتا ہوں۔“

وہ میرے روکنے کے باوجود پلٹا اور گھر سے پیالہ اٹھا لایا۔ ہمیں چائے کے لبالب پیالے تھمانے کے بعد آدھ سلے کرتے کا جائزہ لینے لگا۔ اپنی ہی رو میں گویا ہوا۔ ”میں نے کہا کہ یارن خان کے آنے سے پہلے سوٹ سلوا لوں۔ بعد میں تو دیوانہ اُس کی حویلی کا ہو کر رہ جائے گا۔“

دیوانے نے جھٹ پوچھا۔ ”خان کب آ رہا ہے ماسٹر جی؟“

وہ بولا۔ ”ٹھیک سے تو علم نہیں ہے مگر اُس کا لوکر بتا رہا تھا کہ چند دنوں میں ہی آنکھ لگے گا۔“

دیوانے کی آنکھیں جھلکا اٹھیں۔ یارن خان کی آمد کی موہوم سی اطلاع بھی اُس کے لیے بڑی جاں افزا تھی۔ ماسٹر جی کی بات درست تھی۔ یارن خان جتنا عرصہ بھی یہاں رہتا تھا، دیوانے کا گھر وندہ منتقل رہتا تھا۔ رات دن خان کی حویلی میں گھسار ہوتا تھا۔ چونکہ خان شعر و شاعری کا دلدادہ تھا، اس لیے دیوانے کی چاندی ہو جایا کرتی تھی۔ مہینا بھر دم چھلا بنے رہنے کا ٹکڑا انعام وصول کیا کرتا اور صبح تا شام اُس کی سقاوتوں، اچھی عادتوں اور ادب پروریوں کے قصیدے سنایا کرتا تھا۔

دیوانے کی حد سے متجاوز دلچسپی کے سبب یارن خان کا قصہ چمڑ گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگا۔ میرا چائے کا پیالہ خالی ہو گیا تو ماسٹر ولی محمد نے اپنے لیے چائے انڈیل لی۔ ایک لمبا گھونٹ حلق سے اُتارتے ہوئے بولا۔ ”اوئے چالوس شاعر! اب اُس کی اتنی تعریفیں بھی مت کر کہ سیری زبان کل جائے۔ وہ نور پور کا بڑا خان زادہ ہے۔ ایک وقت تھا، جب اُس کی حکم چلتا تھا۔ میں نے وہ زمانہ دیکھ رکھا ہے جب یہ حیات خان اور وریم خان دونوں اُس کے دارے پر کھڑے (چار پائیاں) سیدھے کرتے تھے۔“

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس راگ کو کریدنے کے مراحل میں بہت سے جذباتی موڑ آئیں گے۔“
میں سنبھل گیا، بولا۔ ”جی! مجھے احساس ہے۔ میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا۔“

”غیرت کے بعد رقابت ہی ایسا جذبہ رہ جاتا ہے جو انسان کو خون خرابے پر مجبور کرتا ہے۔“ شاہ جی نے قدرے سرد لہجے میں کہا۔ ”غیرت والے ڈبک گئے مگر ضروری تو نہیں کہ ناکام عاشق نے بھی مفاہمت کر لی ہو۔“

میرے لبوں سے یہ وقت نکلا۔ ”جی۔۔۔۔۔“ پھر چند ساعتیں موج کر کہا۔ ”ممکن تو ہے مگر۔۔۔۔۔“
”مگر تمہیں معلوم نہیں ہے۔“ شاہ جی نے ہنکارا بھرا۔ ”تھوڑا ذہن پر زور دو۔۔۔۔۔ سوچو، کسی ایسے شخص کے بارے میں جو اُس رات کے بعد ہمیشہ کے لیے یا کچھ عرصہ کے لیے غائب ہو گیا ہو؟“

اُس رات سے اُس کی مراد وہ بھیانک رات تھی جس نے میری زندگی میں سرخ اندھیرے بھر دیے تھے۔

میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ کھالے، چاچے چراغ اور امیر نواز سے ہونے والی گفتگو کو ذہن میں کھنگالا، کوئی ایسا فرد بھائی نہیں دیا۔ میں نے انکار کیا تو وہ بولا۔ ”تم نے جو کچھ اُس رات میں مٹی کے بھڑولے میں سے جھانک کر دیکھا، تفصیل سے بتاؤ۔ کسی بھی بات کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا۔“

میری زبان ٹیپ پلیٹر کی طرح چل پڑی۔ میں نے اُس خوں چکاں واقعے کو برہنہ برس کے دروازے میں بھی مخ نہیں ہونے دیا تھا۔ کبھی زبان سے، کبھی دل ہی دل میں، دہراتے ہوئے زندہ رکھتا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتا رہا، توجہ سے سنتا رہا اور کبھی انداز میں سر ہلاتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو قاتل تک پہنچا جاسکتا ہے۔“

وہ شاید تھک گیا تھا۔ جماہیاں لینے لگا۔ مجھے اب جانا چاہیے تھا۔ اجازت چاہی تو اُس نے کہا۔ ”تم صرف اتنا گھونج لگاؤ کہ نور پور کا کون سا شخص اس واقعے کے بعد سے اب تک غیر موجود ہے یا کوئی ایسا فرد جو چند ماہ کے غیاب کے بعد لوٹ آیا ہو۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے مگر کس طرح ممکن ہے، یہ تم بہتر جانتے ہو۔“

میں نے کبھی انداز میں سر ہلایا اور گھر کی راہ لی۔ گزشتہ چند دنوں سے کام کاج میں سیری عدم دلچسپی چاچا چراغ کا بار بار چڑھنے کا سبب بن رہی تھی۔ فرزانہ اور پروین، دونوں مل کر

کھڑا تھا جیسے اُس کے بدن میں حرکت کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ یہ اُس کا غیر فطری فعل تھا۔
میں نے اپنی ہمت جمع کی۔ ”بلو! چھوڑ دے مجھے، وہ دیکھ، تیرا بھائی دروازے میں کھڑا دیکھ رہا ہے۔“
مجھے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے علیحدہ ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا۔ جہاں کی تھاں رہ گئی۔ میں نے قدم اٹھانا چاہا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پہلو کے بل زمین پر ڈھم سے آن گرا۔ کھالے کو دیکھ کر میں دہشت سے بھول گیا تھا کہ میرا جسم بے حس و حرکت ہو گیا ہے۔

میں نے اٹھنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی تو بے اختیار میرے منہ سے چیخ برآمد ہوئی۔ میری بانہیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ چار پائیوں کے نیچے سے کھالے اور بلو کے پیر دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر ساکت کھڑے تھے۔ میں کھالے کی سرشت سے آگاہ تھا۔ غیرت کے معاملے میں وہ کسی مفاہمت کا قائل نہیں تھا۔ پوری سختی کے ساتھ اپنے دانت بھینچ کر میں انتظار کرنے لگا کہ کب وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا ہے اور اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھے ہوئے چمکدار خنجر سے میری گردن کاٹتا ہے۔ ایسا ہی ایک خنجر اُس نے مجھے بھی تحفے میں دے رکھا تھا جو اس وقت میرے ٹریک میں پڑا تھا۔ اگر وہ اس وقت میرے پاس ہوتا بھی تو میرے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔

میں مسلسل اپنے جسمانی اعضا کو حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر سوائے گردن کے، کسی عضو میں حرکت نہیں دے سکا تھا۔ خالدہ دونوں چار پائیوں کے بیچ، جہاں سے وہ مجھے دھکیل کر پٹی کے پاس لائی تھی، کھڑی تھی جبکہ کھالے کے گھٹنوں تک دونوں پیر مجھے دروازے میں دکھائی دے رہے تھے۔

تمن چار..... یا زیادہ منٹ گزر گئے تھے۔ میری آنکھوں میں بے بسی سے آنسو تیرنے لگے۔ ایسے ہی وقت میں خالدہ روتی ہوئی کھالے کی ٹانگوں سے چٹ گئی۔ خدا کے واسطے دیتے ہوئے معافیاں مانگنے لگی۔ کھالاب بستہ، بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ شاید میرے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر اُس نے پوری قوت سے خالدہ کو ٹھٹھا مارا اور چمکاڑا۔ ”اے خان کے بچے! چوہوں کی طرح بل میں کیوں پڑتے ہو؟ اٹھو اور میرا سامنا کرو۔“

اُس کی دھاڑ سن کر میرا دل کانپ اٹھا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی بے گناہی کا واسطہ دیتے ہوئے خدا سے مدد مانگی۔ خالدہ اٹھ کر پھر اپنے بھائی سے چٹی۔ اُس نے زور

رہا تھا۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا مگر پورا بدن عُن ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ دقت تمام میرے منہ سے نکلا۔ ”چھوڑو مجھے، بلو! پڑے ہو۔“

اُس نے میرے کہے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں پھر چلایا۔ ”میں کہہ رہا ہوں، مجھے چھوڑو۔ مجھے چوٹ لگ گئی ہے۔“
”مجھے بھی چوٹ لگی ہوئی ہے۔ پہلے اس زخم پر پھپھا (مرہم) رکھو۔“

”خدا کے لیے بلو! پڑے ہو، میں کہیں نہیں جاؤں گا مگر مجھے چھوڑ دو سہی..... مجھے جہاد کی یہ حرکتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ میرا گلا خشک ہو گیا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ میری آواز پورے نور پور میں گونج رہی ہوگی اور آدمی دنیا سن رہی ہوگی مگر اُس نے جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ وہ اپنی پیش قدمی میں حدیں پھلانگتے پر کر پستہ تھی۔ ایڑیوں کے بل اوپر اٹھی اور میرے بھانپنے سے قبل میرے سینے سے آگئی۔ اُس نے میری بظلوں میں سے ہاتھ نکال کر پٹی پر رکھ لیے تھے یا پٹی کی باہر کو نکلی ہوئی آئی کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا کہ میں بڑی طرح اُس کی بانہوں کے شکنجے میں جکڑا گیا۔ میں پوری قوت اور تمام تر خشکی کو بردے کا رلا کر اُسے پڑے ہٹنے کا کہہ رہا تھا مگر وہ جیسے بہری ہو کر رہ گئی تھی۔

ایسے میں اچانک کمرے میں روشنی کچھ کم ہو گئی۔ ایک سایہ سالہرا گیا۔ میں نے بے ساختگی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ میرا دل جیسے اچانک نیچے آ نک گیا اور بدن کو یکبارگی سے اوپر بھینچ لیا گیا تھا۔

بلو میری جسمانی کیفیت اور ذہنی اذیت سے بے نیاز جوانی کے شجر تشہ کام کو سیراب کرنے کے لیے میری گردن کو چوم رہی تھی اور میں دہشت زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دروازے کے پتوں بیچ کھالا شعلہ بار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دونوں بانہیں پھیلا کر دروازے کی چوبی چوکھٹیں تمام رکھی تھیں۔ میں خالدہ کو کھالے کے ہارے میں بتانا چاہتا تھا مگر میری زبان نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ بلو تو میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور نہ ہی اپنے عقب میں کھالے کو دیکھ رہی تھی۔

میرے نیم مغفوج ذہن نے اچانک کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک خیال بڑی تیز رفتاری سے میرے دماغ میں اتر آیا کہ کھالا دروازے میں رکھا ہوا کیوں ہے؟ اُسے تو فی الفور ہم پر شکرے کی طرح جھپٹ پڑنا چاہیے تھا مگر وہ یوں

میں نے اٹھنا چاہا مگر وہ اپنے پورے بوجھ سمیت میرے گھٹنوں پر لنگ گئی۔ اپنا چہرہ بھی لٹکا دیا۔ بولی۔ ”صاحب جی! مجھ سے بھاگتے کیوں ہو؟ مجھے تم اچھے لگتے ہو، دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے، کچھ مانگتی بھی تو نہیں ہوں..... پھر مجھے دھکے کیوں دیتے ہو؟“

اُس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ اُس گھڑی اُس کا چہرہ ہمتایا ہوا تھا۔ آنکھوں کی تیز چمک پریشان کن تھی۔ میں نے اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پیچھے دھکیلا۔ اُس کے لیے میری یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ پیچھے کی جانب گری مگر دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر سنبھل گئی۔ میں اس دوران میں کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ کوئی جواب دیے بغیر دروازے کی طرف بڑھا مگر پٹی نہیں پایا۔ اُس نے عقب میں آ کر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

میں نے غصے سے کہا۔ ”چھوڑو مجھے، جانے دو۔ یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

اُس کی گرفت میں مزید سختی آ گئی، بولی۔ ”میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ کچھ دیر زکوہ پھر ملے گا۔“

میں نے گردن جھکا کر اپنے پیٹ کے بالائی حصے پر اُس کے ہاتھ دیکھے۔ اُس نے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا رکھی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا اور علیحدہ کر دیے۔ وہ بجلی کی مستعدی سے میرے پہلو سے نکل کر سامنے آ گئی۔ میں گھبرا گیا۔ بھاگ نکلنے کی راہ مسدود دکھائی دی تو اُسے باہر کی طرف دھکیلتا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹنے کے بجائے مجھ سے چمک گئی اور مجھے دھکیلنے لگی۔

کچھ دن پہلے وہ نیم تاریکی میں گمراہی تھی۔ آج پوری کی پوری حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ مجھے چار پائی پر گرانا چاہتی تھی مگر کامیاب نہ ہو پائی۔ یہ ضرور ہوا کہ میری پشت سامان والی جستی پٹی سے جا ٹکرائی۔ پٹی کا آہنی کنڈار بڑھ کی ہڈی میں لگا۔ یوں لگا جیسے طاقتور برقی رو بدن میں اتر گئی ہو اور آہن واحد میں پورا بدن مغفوج ہو گیا ہو۔ میں بہ دقت تمام اپنے پیروں پر کھڑا رہ پایا۔ وہ میری حالت سے بے خبر اپنی یورش پر تمام تر قوتیں مرکوز کیے مجھے بانہوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ میں نے اُسے ٹھپڑ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا مگر دل دھک سے رہ گیا۔ میری شدید تر خواہش کے باوجود ہاتھ میں حرکت نہیں ہوئی۔ میں نے جلدی سے باری باری دونوں پیروں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر ناکامی پر بڑی طرح گھبرا گیا۔

میں پھٹی پھٹی نظروں سے اُس کی وارفتہ یلغاروں کو دیکھ

قریبی چلا جاؤں گا۔ عشرت کالج سے لوٹ آئی ہوگی۔ ممکن تھا کہ وہ کہیں دکھائی دے جاتی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس کا بھائی مجھے اپنے کمرے لے جاتا اور اُس کی ماں کے ساتھ ساتھ میری عاشی سے ملاقات بھی ہو جاتی۔ ابھی تک اُس کی محض ایک جھلک دیکھی تھی، اُسے سنا نہیں تھا، سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

کھالے کا باپ دکان پر موجود نہیں تھا۔ کوئی گاہک بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ایسے میں دکان کا اندرونی دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ خالدہ دروازے میں کھڑی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

”اماں بلا رہی ہے صاحب جی!“ وہ مصومیت سے بولی۔

میں بادل ناخواستہ اٹھا اور گھر میں چلا آیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتی ہوئی بڑے کمرے کے دروازے تک آئی۔ میں نے پوچھا۔ ”ماسی مغوک کیا کام ہے مجھ سے؟“
وہ بولی۔ ”اندھ لکھنی ہے، خود ہی آ کر پوچھ لو۔“

میں اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ ماسی مغو کسی بھی چار پائی پر لٹکی دکھائی نہیں دی۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کہاں ہے ماسی؟ مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔“
وہ پٹی، میری طرف بڑھی اور عین مقابل منہ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اُس کے مصوم چہرے پر شرارت کے عکس لرزاں تھے۔ میں آہن واحد میں اُس کا ارادہ بھانپ گیا مگر ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ اُس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور خاموش مگر متوجہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے بلو! جھوٹ کیوں بولا تم نے؟“
”یہاں بیٹھ جاؤ، بیچ سننے کی ہمت ہے تو بیچ بولنے لگتی ہوں۔“ اُس نے مجھے آہستگی سے پیچھے دھکیلا اور چار پائی پر بٹھا دیا۔

”ماسی اور غموراں کہاں ہیں؟“
”انہیں بڑی بی بی نے حویلی میں بلایا تھا۔ ابھی گئی ہیں، گھنٹا بھر وہیں رہیں گی۔“ وہ میرے گھٹنوں پر دونوں ہاتھ ٹکا کر پیروں میں بیٹھ گئی۔ ”اباحیات خان کے فارم پر گیا ہے۔ کمریوں کے کنڈے اور مویشیوں کے سنگل (آہنی زنجیریں) ٹھیک کر رہا ہے۔ شام سے پہلے کسی صورت نہیں لوٹے گا۔“

یکبارگی مجھے معاملے کی سچائی کا احساس ہوا۔ کھالے کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ خالی کمرے کے کمرے کی تنہائی میں خالدہ اور میں کسی بھی دیکھنے والی نگاہ میں مجرم بن سکتے تھے۔

بڑی سی عمارت کے وسیع و عریض احاطے میں آکر ٹھہر گیا۔ یہ سب جمہوریت کے حامی تھے، مگر مختلف سیاسی پارٹیوں سے ان کا تعلق تھا جو جمہوریت کی علمبردار اور حامی تھیں۔ ان میں ”الف“ پارٹی کے لوگ بھی شامل تھے۔ ”ب“ بھی موجود تھی، ”پ“ سیاسی پارٹی سے تعلق رکھنے والے بھی اس میں موجود تھے۔ ”ت“ نامی سیاسی پارٹی بھی شامل تھی۔ اس وقت یہ سب ایک اور ہم آواز ہو کے آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔

ان کے دائیں جانب ایک اور گروہ کے لوگ بھی موجود تھے، ان کی تعداد آٹھ میں نمک کے برابر تھی۔ یہ مختصر یا تھوڑی تعداد رکھنے والا گروہ آمریت کا حامی تھا مگر یہ خاموش تھے۔

لوگوں کا جھوم اس قسم کے پر جوش نعرے لگاتا ہوا ایک

اتار کی اور بے چارگی کا سنگین خطرہ

سیاست سے کھلواڑ... اب تو عہد حاضر کا خاصہ بنتا جا رہا ہے اور اس ہنسی ٹھنھول کا براہ راست نشانہ عوام کو بنتا پڑتا ہے... مگر کیا کیجیے کہ حالات ”نہ اگلے چین نہ ننگلے چین“ کے مانند حلق میں پھنس کر رہ گئے ہیں... ایسے میں اگر کسی کا دم گھٹتا ہے تو گھٹ جائے، جب حالات اتنے سفاک ہو جائیں تو کہیں سنگساری اور کہیں سنگباری کے واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔

”آمریت!“

”مردہ باد!“

”جمہوریت!“

”زندہ باد!“

”ہاتھوں میں ہاتھ دو۔“

”آمریت کو مات دو۔“

”جمہوریت۔“

”زندہ باد!“

”آمریت۔“

”مردہ باد!“

مقابلہ

ڈاکٹر عبد الباقی

اُس نے خنجر پوری قوت سے میرے بازو میں گھونپ دیا۔ مجھے اُس کا خنجر والا ہاتھ نیچے آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں لگا جیسے خنجر راہ میں ہی رُک گیا ہو۔ تکلیف نہیں ہوئی۔ اُس کا ہاتھ پھر ہوا میں بلند ہوا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں کہ خنجر کا پھل خون سے تر تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر اپنے بازو کو دیکھا۔ خون سے تھیں سرخ ہو رہی تھی۔ ایسے میں اُس نے دوسرا وار بھی کر دیا۔ پہلے زخم کے اوپر یا کچھ فاصلے پر خنجر بازو کی پچھلی میں بیوست ہو گیا۔ اب کے تھوڑی سی جھن محسوس ہوئی تھی۔ میں چلایا۔ ”کھالے! میرا قصور نہیں ہے۔“

”اے چپ رہ گدھے کی اولاد۔“

اُس کے نچنے پھڑک رہے تھے اور آنکھوں سے موت کا قرض ہو رہا تھا۔ مجھے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا، پھر اُس نے میرے بازو کی طرف نگاہ کی۔ ایسے میں چونک گیا۔ ایک انچ چوڑا پھل دوسرے بازو کے پار ہو چکا تھا مگر میرے بازو میں حرکت نہیں ہوئی تھی۔ اتنے ضبط کی توقع کسی ذی حس انسان سے نہیں کی جاسکتی۔ وہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تجھے درد نہیں ہوتا۔ ہیں؟ اچھا۔۔۔“

اپنی برداشت دکھا رہا ہے کھالے کو۔ ہیں؟“

اُس کے لبوں سے پھر قہقہہ ابل پڑا۔ میں نے بد وقت تمام کہا۔ ”کھالے! میرا جسم من ہو گیا ہے۔ مجھے چوٹ لگی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو، میری مدد کرو، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔ خدا کے لیے کھالے۔۔۔ پہلے میری بات تو سن لو، پھر بے شک مارو دیتا۔“

اُس نے پہلو بدلا۔ اُس کا چہرہ فرط غیظ سے بالکل سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں شعلہ بار تھیں۔ دانت کچکا کر بولا۔ ”پہلے میری بات سن لو۔۔۔ ہائیں۔۔۔ تاکہ تم مجھے اپنی لچھے دار باتوں میں الجھا لو۔ اور تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔۔۔ ہاں۔۔۔ کارے (کمین) کی عزت پر ہاتھ ڈالنا کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے۔ ہم نے اپنی بیٹنیں خانوادوں کے لیے ہی تو پال رکھی ہیں۔ شہرے! تم معافی کے قابل نہیں ہو۔ تم یا مار ہو، تم نمک حرام ہو۔۔۔ بس!“

اُس کا ہاتھ برق رفتاری سے ہوا میں بلند ہوا اور آنکھیں میرے سینے پر جم گئیں۔

معاشرتی ناہمواریوں سے مزین دلوں کی دھڑکن، لبو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری اس سفر کے اگلے بڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

دارمنا اُس کے منہ پر جڑا اور بالوں سے پکڑ کر پرے گھما پھینکا۔ کمرے کی مغربی دیوار کے ساتھ چار پائیاں ایک دوسرے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ وہ اُن سے ٹکرائی۔ اوپر والی چار پائیاں گرنے کی آواز سنائی دی۔

کھالے قدم بہ قدم چلتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ دونوں چار پائیوں کے بیچ ایک ذرا رُکا، جھکا اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اُس کے عزائم دیکھ کر میری رہی سہی جان بھی ہوا ہو گئی۔

چند لمحوں بعد وہ میری پنڈلی پر پاؤں رکھ کر ہاتھ ہاتھ۔ ”بے غیرت انسان! اٹھ کھڑا ہو، دیکھ۔۔۔ اپنا حشر ہوتا تو دیکھ ناں۔۔۔ یار کے گھر میں ڈاکا مارنے کا انجام تو اپنی آنکھوں سے دیکھتا جا۔۔۔ اٹھ اٹھ اٹھ۔۔۔“

وہ غراتی ہوئی آواز میں گالیاں دیتے ہوئے میرے پہلو سے جڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اگر کلیجا سا تھ نہیں دیتا تھا تو اس گھر میں داخل نہ ہوتے۔ سوچ لیتے کہ یہ کھالے کا گھر ہے۔ کھالے ہر گناہ معاف کر سکتا ہے مگر کسی یار مار کو معاف نہیں کر سکتا۔“

میں گھکیا یا۔ ”یار کھالے۔۔۔“

اُس نے اُلٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ ”گندی زبان سے میرا نام نہ لے، مجھے یار نہ کہہ بے غیرت۔۔۔“

اُس نے اوپر تلے تین چار گالیاں دیں۔ مجھے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا۔ میرا گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ کھالے کا چہرہ فرط غیظ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ اُس نے خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ میں اُسے روکنا چاہتا تھا مگر خوف اور دہشت سے میرے منہ سے موائے گھر گھراہٹ کے کچھ برآمد نہیں ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کا خنجر والا ہاتھ نیچے آنے سے پہلے ہی میرا دل دھڑکتا بند کر دے گا۔ خالدہ بھاگتی ہوئی آئی۔ کھالے سے چٹ گئی اور خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ کھالے نے اُسے جھٹک کر چار پائیوں کے بیچ پھینک دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔

جان بچانے کے لیے میں نے اپنی آخری کوشش کی۔ ”کھالے! ام۔۔۔ میں اٹھ نہیں سکتا۔۔۔ میں مر رہا ہوں کھالے۔۔۔“

اُس کا وحشیانہ قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا۔ جتنے جتنے پھر میرے پاس بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”ہاں شہرے خان! تو مر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں مگر تو یہ نہیں جانتا کہ میں تجھے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ یہ دیکھ۔۔۔“

جس عمارت کے سامنے یہ دونوں مخالف گروہ کھڑے تھے، اس کے اندر کا منظر سادہ تھا۔ ایک ہال کمرے کے وسط میں ایک مستطیل میز تھی اور اس کے دونوں سروں پر صرف دو مگر قدرے اونچی پشت گاہ والی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں جو خالی تھیں، دونوں کرسیوں کے عقب میں دو دروازے تھے جو اس وقت بند نظر آ رہے تھے، ہال کمرے میں خاموشی تھی، کمر خالی تھا۔

عمارت کے باہر احاطے میں دونوں مذکورہ گروہ کے لوگ اب خاموش کھڑے تھے کیونکہ ان کے سامنے بنے ایک چوڑے پر چھریرے جسم کا حامل ایک شخص ڈانس پر کھڑا مانگ پران سے مخاطب تھا۔

”آپ لوگوں کے ہم شکر گزار ہیں کہ آپ نے کمال ”نظم و ضبط“ کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے سبھی خاموشی اختیار کی اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا۔ زندہ اور باشعور قوموں کا یہی دتیرا ہونا چاہیے کہ وہ ہر مسئلے کا حل، خواہ وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا سماجی، Table talk کے ذریعے نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جسے عام فہم میں ”مکالمہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ جذباتیت کسی مسئلے کا حل ہرگز نہیں، عموماً دیکھا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں جذباتیت کی رو میں بہہ جانا ایک روایت بن گیا ہے، اس سے نا انصافی، بے رحمی اور تحریب کاری جنم لیتی ہے، تنگ نظری اور تعصب بھی اس کا باعث بن سکتا ہے، یاد رکھیے..... جذباتیت میں جو بھی چھپا ہوتا ہے، جی ہاں..... چور..... جذباتیت کا مظاہرہ وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس اپنے کسی موقف کے دفاع کے لیے کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہوتی یا وہ لا جواب ہونے لگتے ہیں پھر نام نہاد جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہڑ بولنگ بچانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ بات آئی گئی ہو جائے، خیر.....!“ وہ آدمی سانس لینے کو رکھا۔ پھر مزید کہنا شروع ہوا۔

”میرا بذات خود کسی گروہ سے تعلق نہیں ہے، میں نیوٹرل ہوں، ہاں! سچ اور حق بات کا داعی ضرور ہوں، جمہوریت بہتر ہے یا آمریت..... ابھی ذرا دیر بعد ہی اس عمارت کے اندر ایک بڑے ڈیموکریٹ اور ڈکٹیٹر کے درمیان Table talking کا آغاز ہونے والا ہے، یہ دونوں مذکورہ اشخاص مدلل بحث کے ذریعے اپنے اپنے موقف یا نظریے کو درست ثابت کرتے ہوئے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہر مکالمے کا کوئی نتیجہ برآمد ہونا چاہیے۔

چونکہ کسی بھی تعمیری بحث یعنی بحث برائے اصلاح کو منطقی انجام تک پہنچنا چاہیے۔ اس لیے اس مکالمے کی خوبی یہ ہے کہ جیسے ہی یہ بحث اپنے منطقی انجام کو پہنچے گی اس کی تمثیل ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے، اس کے بعد یا جمہوریت

رہے گی یا پھر آمریت.....“

اتنا کہہ کر آدمی نے خاموشی اختیار کر لی۔

آمریت پسند گروہ پر مکمل خاموشی طاری تھی جبکہ جمہوریت پسند گروہ چہ میگوئیوں کا شکار تھا۔ وہ ایک دوسرے سے سینہ پھلا کر کہہ رہے تھے۔

”دیکھنا آمریت کا منہ کالا ہوگا اور جمہوریت کا بول بالا۔“

”الف“ پارٹی سے تعلق رکھنے والے نے کہا تو ”ب“ پارٹی کے ایک مہم دے دار نے اس کی حمایت میں کہا۔

”ہاں بابا کیوں نہیں..... کیوں نہیں..... جمہوریت آخر جمہوریت ہے۔ ریت تھوڑی ہے جو ڈھلے جائے، یہ کئی اینٹوں کی دیوار کھٹی ہے بابا۔“ وہ اپنی اجڑک درست کرتے ہوئے بولا تو ”پ“ سے تعلق رکھنے والے نے بھی جمہوریت کے حق میں لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

”خوچہ امارا بھی یقین اسی پر ہے مملکت خداداد کو جمہوریت ہی اس آئے گا۔“

”ت“ کی سیاسی پارٹی کے کارکن نے بھی جمہوریت کے حق میں گرہ لگانا اپنا فرض اولین سمجھا، بولا۔ ”شادابجے شاداب..... جمہوریت دی گئی اے، بھلا کوئی جمہوریت دے پچھے دی بے سکہ ہے“ (بھلا کوئی جمہوریت سے انکار کر سکتا ہے) ”ٹ“ سے تعلق رکھنے والے نے اپنی ریش دراز پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”الحمد للہ..... سراج کو آج نہیں۔“

معاملات مدلل رخ اختیار کرتے جا رہے تھے۔

ہال کی خاموشی اور ساکت فضا کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وقت کو موت آگئی ہو۔ مستطیل میز کے دونوں سروں پر دھری کرسیاں ہنوز خالی تھیں۔ دفعتاً ہال میں سرسراہٹ ابھری۔ کرسیوں کے عقب کے دونوں دروازے بیک وقت کھلے تو ایک دروازے سے لبا چوڑا شخص برآمد ہوا، اس کے کندھوں پر اجڑک دھری تھی سر پہ اونچے شملے والا پگڑ باندھ رکھا تھا، پیروں میں پشاور کی جوتے تھے، گویا اس کی وضع قطع ایسی تھی کہ وہ ملک کی چند بڑی جمہوریت پسند سیاسی پارٹیوں کی نمائندگی کر رہا ہو، اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی وہ بڑے کدھر سے چلتا ہوا اپنی کرسی پر آکر براجمان ہو گیا، یہ ڈیموکریٹ تھا، اس کی آنکھوں میں اس وقت غضب کی نخت تھی، چہرے کے تاثرات میں سمجھنڈا میز تباہ تھا اور وہ بڑی کھا جانے والی نظروں سے اپنے سامنے والی خالی کرسی کے عقب میں کھلے دروازے کی طرف گھورے جا رہا تھا، جدھر ایک ڈکٹیٹر کھڑا تھا، وہ درمیانے قد کا آدمی تھا، خوب گھٹا ہوا جسم تھا اس کا، اس نے قیمتی سوٹ زیب تن کر

رکھا تھا، چہرہ سپاٹ اور آنکھیں کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھیں۔ اس نے صرف ایک نظر سامنے کرسی پر بیٹھے ڈیموکریٹ پر ڈالی اور خاموشی سے اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ ڈیموکریٹ نے اپنی دسی گھڑی پر وقت دیکھا اور سامنے بیٹھے ڈکٹیٹر سے بڑی مغرور اور نخوت زدہ آواز میں بولا۔

”میرے پاس وقت کم ہے، جلدی بات کرو۔“

”میرے پاس وقت ہے، ابھی بات شروع کرتے ہیں۔“

ڈکٹیٹر نے جواباً بروہاری سے کہا۔ پھر ہولے سے کھنکھار کر کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ ڈیموکریٹ بول پڑا۔ ”ویسے تم نے بلا وجہ اپنا اور میرا وقت ہی ضائع کیا، اول آخر شکست تمہاری ہے۔“

”شاید تمہاری بات درست ہو۔“ ڈکٹیٹر نے سپاٹ لہجے میں اور کھلے دل سے اعتراف کیا اور تب کچھ کہنے سے قبل اس کے ہونٹوں پر پگھلی بار اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی، بولا۔

”پہلے اپنی اقادیت گنواؤ۔“

”بے شمار۔“ ڈیموکریٹ نے گردن اکڑا کر کہا۔ ”پہلا فائدہ بیرونی امداد کے دروازے ہم پر کھلے رہتے ہیں، ہماری وجہ سے ملک میں دولت کی ریل پٹیل ہو جاتی ہے اور.....“

”اور..... پھر بندر بانٹ شروع ہو جاتی ہے۔“ ڈکٹیٹر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کے لہجے میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔

”یہ سارا روپیہ عام عوام کو ملنے کے بجائے صرف حکومت وقت کی پارٹی کے لوگوں کو ملتا ہے، عوام کو وعدوں پر رٹا دیا جاتا ہے۔“

”یہ محض پردہ پیٹل ہے۔“ اس کی بات پر ڈیموکریٹ آٹا کانی کرنے لگا۔ ڈکٹیٹر نے اگلا سوال داغاً۔

”گزشتہ سال ملک میں سیلاب آیا، تیرہ سے زائد ممالک نے سروے کرنے کے بعد امداد جاری کی تو ”وطن کارڈ“ کی صورت میں یہ روپے زیادہ تر تمہاری پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو ملے، جبکہ عوام کے لیے ”وطن کارڈ“ کا حصول ایک فضول اور نہ ختم ہونے والے ”لائنگ پروس“ کے نام پر ”جام“ کر دیا گیا، کیوں؟ جبکہ یونیسف کے ایک ادارے کے اعداد و شمار کے مطابق سیلاب زدگان کے لیے تیرہ سے زائد ممالک کی طرف سے اربوں ڈالر کی شکل میں ملی ہوئی امدادی رقم آئی تھی کہ اس سے دس مملکت خداداد بن سکتی تھیں، مگر یہاں تو بے چارہ ایک اجڑا بچہ ملک ہی پورا تعمیر نہ ہو سکا۔“

”دیکھ دو، یا ثبوت پیش کرو۔“ ڈیموکریٹ کا خون اگلنے لگا تھا۔

”اتنی امداد آنے کے باوجود پھر کیوں اب تک سیلاب سے متاثر بستیاں آباد نہیں ہوئی ہیں، لوگ ابھی تک بے گھر ہیں، کمپوں میں زندگیاں گزار رہے ہیں، ایک سال گزرنے کے

باوجود ابھی تک وطن کارڈ ز پوری طرح تقسیم کیوں نہیں ہوئے؟“

”تم اب گڑھے مردے مت اکھاڑو، کسی نئے ایٹھ پر بات کرو۔“ ڈیموکریٹ آئیں بائیں شاکیں کرنے لگا۔ جواباً ڈکٹیٹر کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ ابھری، بولا۔

”تمہاری وجہ سے ملک اندھیریوں میں ڈوبا ہوا ہے، توانائی کا ایسا بحران آیا کہ بڑی بڑی صنعتیں بند ہو گئیں، لوگ بیروزگار ہو گئے۔“

”یہ پرانا ایٹھ ہے، اسے چھوڑو۔“

”اس ضمن میں صرف ایک سوال کا جواب جاننا چاہوں گا۔“ ڈکٹیٹر نے ڈیموکریٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”ہاں! پوچھو۔“ وہ ہیزانہ نظر آنے لگا۔

”آج سے کئی سال پہلے تمہارے جیسی ہی ایک جمہوریت کی علبردار پارٹی برسر اقتدار تھی تو، اس وقت کے بجلی اور پانی کے ایک وفاقی وزیر نے مذکورہ پارٹی لیڈر کی توجہ اس خدشے کی طرف دلاتے ہوئے کہا تھا کہ آئندہ آٹھ دس سالوں میں مملکت خداداد میں بہت شدید بجلی اور توانائی کا بحران آنے والا ہے لہذا اس معصیت سے بچنے کے لیے اگر ابھی سے قدم اٹھالیے جائیں تو اس سے بچا جاسکتا ہے، مگر اس کی بات نہیں مانی گئی کیوں.....؟ کیا یہ بات جمہوریت کے اصولوں کی منافی نہیں؟“

”اڑے بابا! ابھی کی، آج کی بات کرونا..... وہ اس وقت کی حکومت یا پارٹی جانے.....“ ڈیموکریٹ نے ہاتھ جھٹک کر کہا تو ڈکٹیٹر نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

”ہم یہاں صرف کسی ایک سیاسی پارٹی کی کارکردگی پر بات کرنے کے لیے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں، بات جمہوریت اور آمریت کی ہو رہی ہے کہ کون مملکت خداداد کے لیے سودمند ثابت ہو سکتی ہے، تم دو، دوبار ”بھاری“ عوامی مینڈیٹ کے ساتھ برسر اقتدار آتے رہے..... مگر ایک دوسرے کے ساتھ رسائی اور کرسی کھینچنے اور بچانے کے سوائے تم نے عوام کے لیے کیا کیا؟“

”ہمارا دو دوبار برسر اقتدار آتے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام جمہوریت پسند ہے اور اول آخر ہمیں ہی پسند کرتی ہے۔“ ڈیموکریٹ کے لہجے میں غرور تھا۔

”غلط، تمہاری جمہوریت، جاگیر دارانہ نظام کے تحت پھلتی پھولتی ہے، لیڈر شپ کے تحت نہیں۔“ ڈکٹیٹر نے بڑے مستحکم لہجے میں یہ بات بتائی۔

”تم اپنے بارے میں بتاؤ، تم نے بھی تو اب تین چار بار مملکت خداداد کی باگ ڈور سنبھالی، تم نے کون سے تیر چلا دیے۔“ ڈیموکریٹ نے خارزار لہجے میں ڈکٹیٹر کو گھور کر کہا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا وہاں قیام کرنا انہیں کے مفاد میں تھا لیکن اس کے درباریوں کے تیور کچھ اور تھے۔ وہ بادشاہ پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنی ملازمت میں نہ رکھے۔
”کیا یہ وہی شخص نہیں جس نے جالوت کو قتل کر کے ہمیں شکست سے دو چار کر دیا تھا اور ہمارا قتل عام ہوا تھا۔ ہم وہ دن بھی نہیں بھول سکتے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام کی بڑے پیمانے پر مخالفت ہو رہی تھی۔ انہیں تو اب یہ شک ہو رہا تھا کہ موت یہاں بھی ان کے

مخالفت حالات اور جالوت سے مقابلہ کرنے والے نبی کا حال

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ کی اپنے بندوں سے محبت دنیاوی معنا سے ستر گنا زیادہ ہے تب ہی وہ ان کی رہنمائی کے لیے گاہے بگاہے نبیوں کو مبعوث کرتا رہا ہے۔ جب جب انسان نے اندھیروں کی طرف سفر شروع کیا تب تب اپنا نور اس نے دنیا میں بھیجا۔ بنی اسرائیل... ایک ایسی قوم جس پر اللہ نے اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی

حضرت داؤد علیہ السلام

رضوانہ ساجد

بارش کر دی مگر... افسوس کہ یہ قوم لالچ، طمع اور گمراہی سے خود کو نہ بچا سکی۔ ایسے میں ہی حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا اور یہ وہ نبی ہیں جنہیں اللہ نے بادشاہت اور نبوت ایک ساتھ عطا کی... نہ صرف یہ بلکہ ان پر پرندوں کی زبان کو بھی آسان کر دیا اور آپ ﷺ کے سامنے پتھروں کو بھی زبان عطا کر دی۔ سبحان اللہ... تو کون ہے جو سبق حاصل کرے۔



تھا۔ جس سے یہ ایک بات تو ظاہر ہو ہی گئی کہ عوام کی خاصی تعداد جمہوریت یا جمہوری پارٹیوں سے نالاں ہے، خیر... میں آپ کو رزلٹ بتائے دیتا ہوں... کہ... موجودہ حالات کے تناظر میں جمہوریت کے بجائے... آمریت ہی... ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ڈیوکریٹ اپنی کرسی سے اچھل کے اس آدمی پر چھٹ پڑا اور پرچہ لے کر اس کے پرزے پرزے کر ڈالے اور باہر آ کر اپنے خاص گروہ سے چلا چلا کے کہنے لگا۔ ”جمہوریت جیت گئی، آمریت ہار گئی۔“

لوگ خوش ہو کر نعرے لگانے لگے۔ دوسرا گروہ منہ لٹکا کے خاموش کھڑا تھا۔

اعمر ڈکٹیٹر بہت مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس پریشان حال آدمی کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔

”مکالمے“ کے نام پر چلنے والی یہ بحث اپنے نتیجے کی جانب تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

ڈکٹیٹر کی بات سن کر وہ آدمی باہر نکلا اور ڈکٹیٹر کے خاص گروہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں اس نے نہایت دھمے دھمے اور رازدارانہ لہجے میں انہیں ڈکٹیٹر کا پیغام سنایا اور پھر واپس عمارت کی طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈکٹیٹر گروپ سے ایک شخص نہایت خاموشی کے ساتھ جمہوریت پسندوں کے خوشی سے مچلتے ہوئے گروپ میں شامل ہو گیا اور کسی ایک جمہوریت پسند پارٹی کے کارکن کے کان میں کچھ کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہاتھوں میں ہاتھ دیے کھڑے خوشی اور فتح و کامرانی کے نعرے لگانے والے جمہوریت پسند گروہ میں کھلبلی مچ گئی، دیکھتے ہی دیکھتے ”الف“، ”ب“، ”پ“ وغیرہ پارٹیوں کے لوگ ایک دوسرے سے دست درگربان ہو گئے، کہاں تو تھوڑی دیر پہلے آمریت کے خلاف متحد تھے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بھائی چارے کا سہل بنے ہوئے تھے اور اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آنے لگے۔

ڈکٹیٹر نے صرف یہ پیغام دیا تھا کہ کسی طرح کسی ایک جمہوریت پسند پارٹی تک یہ بات پہنچا دو کہ فلاں جمہوریت پسند پارٹی نے اس ”مکالمے“ کی کامیابی کا سارا کریڈٹ اپنی سیاسی جماعت کے نام کر کے عوام میں عام مقبولیت حاصل کرنا چاہی ہے تاکہ آنے والے عام انتخابات میں اس کی جماعت ٹھوڑی لولی جمہوری حکومت قائم کرنے کے بجائے بھاری اور اکثریت سے دوٹو مینڈیٹ لے کر... ایوان میں مضبوط حکومت بنالے۔



”ہمارے دور اقتدار میں عام آدمی ہم سے خوش تھا، وہ سکون اور چین کی نیند سوتا تھا، بد معاشی اور بھتا خوری بند ہو گئی تھی، سیاسی مارگٹ کلنگ بالکل بند ہو کے رہ گئی تھی، جبکہ مذہبی مارگٹ کلنگ میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی تھی، دن دھاڑے گھروں میں گھس کر گن پوائنٹ پر بھی لوٹ مار نہیں ہوئی، بسوں اور عام مسافروں پر فائرنگ بھی نہیں ہوئی، شہنشاہی کا رڈ چیک کر کے دوسری زبان کے لوگوں کو قتل نہیں کیا گیا۔ لسانیت کو ہوا نہیں ملی، بیرون ملک سے لوگ یہاں سرمایہ بھیجتے لگے، زرمبادلہ میں خاطر خواہ نہیں تو مقابلتا اضافہ ضرور ہوا۔ جنگل میں ایک شیر کی حکمرانی سب کے لیے ساجھی تھی، جبکہ تم جمہوریت کے علمبردار جب بھی اقتدار میں آتے ہو، تو تمہاری آپس کی لڑائیاں، قتل، مارگٹ کلنگ اور بد معاشیاں عروج پر ہوتی ہیں، بھتا خوری کے لیے علاقے بانٹ لیے جاتے ہیں اور جہاں بھتا خوری کے سلسلے میں ذرا بھی ”اور لپٹنگ“ ہوئی وہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ تم جمہوری پارٹیوں نے اس ملک کو اس عوام کو دیایا کیا ہے، آج تک سوائے غریب کاری اور اتار کی کے، میں جمہوریت کے خلاف نہیں، مگر آج مملکت خداداد کے جو حالات دگرگوں ہیں انہیں دیکھتے ہوئے مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آتا ہے اور وہ ہے آمریت۔“

”بکواس بند کرو اپنی...“ ڈکٹیٹر کی تیز و تند باتیں سن کر ڈیوکریٹ غصے سے پھٹ پڑا۔ قتل اس کے کہ وہ دونوں دست و گریبان ہو جاتے، وہی آدمی جانے کہاں سے نمودار ہوا، اس کے ہمراہ تین اور بھی آدمی تھے، جو ہمیں پس منظر میں ان کی گفتگو ٹوٹ کر رہے تھے اور نمبر لگا رہے تھے، انہوں نے آکر انہیں سنبھالا۔ نہ صرف یہ بلکہ نتیجے کے طور پر اس شخص نے جو تھوڑی دیر پہلے باہر لوگوں سے مخاطب تھا، ان دونوں سے بولا۔

”ہم نے آپ دونوں کی گفتگو سے نتیجہ نکال لیا ہے کہ اب مملکت خداداد میں کس کی حکومت ہونی چاہیے۔“ وہ بکا پھر بولا۔ ”مگر آپ دونوں پہلے آرام سے بیٹھ جائیں اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کر کے رزلٹ سنیں۔“ وہ دونوں بیٹھ گئے۔

اسی آدمی نے ایک کانڈ ہاتھ میں لیا اور پڑھنے لگا۔ ”جیسا کہ ملکی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے، گزشتہ روز عام عوامی رائے لی گئی تھی کہ کیا وہ اس سلسلے میں جمہوریت اور آمریت کے مابین ”مکالمہ“ یا ”ڈائیلاگ“ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ دونوں میں سے کون سی ”ترکیب“ مملکت خداداد کے حال اور مستقبل کے لیے بہتر رہے گی، تو اس سلسلے میں متفقہ طور پر تقریباً اسی فیصد لوگوں نے اثبات میں جواب دیا

دوسرے دن وہ اپنے ساتھیوں سمیت بحر مہلج کی طرف چل پڑے۔ ابھی مہلج دور تھا کہ بربادی کے آثار نظر آنے لگے۔ بستی کی طرف سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔ قریب گئے تو حقیقت آشکارا ہو گئی۔ وہ اپنی آنکھوں سے شہر کو دیکھ رہے تھے جو بل کر خاکستر کر دیا گیا تھا۔ مکانات اور کینوں کی جگہ راکھ کے ڈھیر تھے۔ ان کے تمام ساتھی اپنے بیوی بچوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے مگر اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس شہر کو جس نے بھی آگ لگا لی تھی وہ یا تو انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے یا وہ جل کر راکھ ہو گئے تھے۔

یہ حادثہ ایسا تھا کہ تمام لوگ مشتعل ہو کر حضرت داؤد علیہ السلام کے خلاف ہو گئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ اس بربادی کا باعث داؤد ہے۔ اگر وہ ہمیں اس ملک میں نہ لاتا تو ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ اس کے خدا نے اسے اس قابل نہیں سمجھا کہ اسے بچاتا تو ہم بھی اسے کیوں بچائیں۔ ان مشتعل لوگوں نے یہ تک طے کر لیا تھا کہ وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو سنگسار کر دیں گے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ جو مصیبت آئی ہے اس کے تم ہی نہیں میں بھی شکار ہوا ہوں۔ میری دو بیویاں بھی اسیر ہوئی ہیں لیکن مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ میں خدا کے خلاف ایک لفظ بھی کہوں۔ تم ٹھہرو میں خدا سے پوچھتا ہوں، اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ حضرت داؤد علیہ السلام سب کو چھوڑ کر ایک اکیلے گوشے میں عبادت کرنے لگے انہوں نے خدا سے دریافت کیا۔ ”اگر میں ان لٹیروں کو پیچھا کروں تو کیا میں ان کو جالوں گا؟“

جواب آیا۔ ”تو یقیناً ان کو جالے گا اور ضرور سب کو چھڑا لے گا۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے لوگوں کو خوش خبری سنائی۔ ”خدا اب بھی ہمارے ساتھ ہے، خداوند اسرائیل کے خدا نے کہا ہے یہ عملی لٹیروں سے تھے۔ تو اگر ان کا پیچھا کرے تو ان کو ضرور پالے گا اور ضرور سب کو چھڑا لے گا۔“ ان کے پرستاروں نے ایک مرتبہ پھر کمر ہمت باندھی اور ان کے ساتھ ہو لیے۔ راستے میں ایک عری آتی تھی اسے پار کیا۔ ٹھکن سے چور تھے مگر چلے جاتے تھے۔ ایک جگہ انہیں ایک آدمی ملا جو ٹھکن سے مصری معلوم ہوتا تھا۔ وہ شخص زمین پر پڑا ہوا تھا اور بری حالت میں تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے روٹی اور شہد دیا۔ پانی پینے کے بعد اس کے کچھ حواس درست ہوئے تو اس نے بتایا۔

”میں مصری ہوں اور ایک عملی شخص کا غلام۔ میں بیمار تھا اس لیے میرا مالک مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم بہت سی ٹھکنوں پر حملے کرتے رہے ہیں اور مہلج کو بھی ہم نے ہی جلا یا تھا۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟“ حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا۔

”اگر آپ قسم کھائیں کہ مجھے قتل نہیں کریں گے تو میں آپ کو اس طرف لے چلتا ہوں جہاں وہ ہو سکتے ہیں۔“

وہ شخص انہیں ایک طرف کو لے کر چلا۔ عملی اس وقت ایک جگہ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ ان کے ناچ گانے کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ عملی پہلے تو اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے لیکن پھر سنبھل کر مقابلے پر آ گئے۔ یہ ایسے سخت جان لوگ تھے کہ اس اچانک حملے کے باوجود مقابلے پر ایسے ڈٹے کہ دوسرے دن شام تک معرکہ گرم رہا۔ سیکڑوں عملی قتل ہو گئے۔ اس کے باوجود سیکڑوں عملی قتل ہونے پر جینہ کر نکل بھاگے۔ وہ ان تمام لوگوں کو وہیں چھوڑ گئے جنہیں اسیر بنا کر مہلج سے لائے تھے لہذا بڑی کامیابی یہی تھی کہ سب کو ان کے بیوی بچے مل گئے ان میں حضرت داؤد علیہ السلام کی دو بیویاں بھی تھیں۔ گھر بار مل گئے تھے لیکن پھڑے ہوئے عزیز انہیں دوبارہ مل گئے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام مہلج میں واپس آ گئے۔ اپنی پریشانی سے نجات ملی تو طاوت اور بنی اسرائیل کا خیال آیا جن سے جنگ کرنے کے لیے فلسطین گئے ہوئے تھے۔

وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔ ”مجھے اپنی قوم کا خیال آ رہا ہے۔ نہ جانے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ طاوت نے اپنی امانی سے مجھے خود سے دور کر لیا ہے۔ اگر میں وہاں ہوتا تو اپنی قوم کے کچھ کام آسکتا۔ کوئی خبر آئے تو معلوم ہو وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہوگا برا ہوگا۔“

انہیں مہلج آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک شخص کو دیکھا جس کے سر پر خاک تھی اور پیرا ہن چاک تھا وہ بے تحاشا ہمارا رہا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر حضرت داؤد علیہ السلام پر پڑی وہ سجدے میں گر گیا۔

”تو کون ہے اور کیوں روتا ہے؟“ حضرت داؤد علیہ السلام نے پوچھا۔

تغاب میں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے قتل کر دے گا۔ اکیس بادشاہ بھی ان کے دباؤ میں آ کر مجھے نکال دے گا۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جس حال میں رکھے میں خوش رہوں گا۔ انہوں نے بادشاہ سے بات کی۔

”تیرے درباری مجھے برداشت کرنے کو تیار نہیں۔“ حضرت داؤد علیہ السلام نے اکیس سے کہا۔ ”تو ایسا کر مجھے دار السلطنت سے دور کوئی علاقہ رہنے کو دے دے۔ میں اپنے آدمیوں کو لے کر وہاں چلا جاؤں۔ تو جب کہے گا میں اپنے لشکر سے تیری مدد کروں گا۔“

یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مہلج کا علاقہ انہیں رہنے کو دے دیا۔ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں تھا۔ یہی اسرائیلیوں کے پاس تھا پھر اس پر فلسطینیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور اب حضرت داؤد علیہ السلام کو مل رہا تھا۔

یہ شہر سرحد پر واقع تھا اور یہاں پہلے ہی سے کچھ اسرائیلی خاندان آباد تھے لہذا حضرت داؤد علیہ السلام کو اس شہر میں اپنا بیت محسوس ہوئی۔ ان کے ساتھی بھی بھاگتے بھاگتے آچکے تھے۔ بہت دن بعد انہیں رہنے کے لیے فیصلہ دار شہر ملا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو مہلج میں رہتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ یہاں کے رہنے والے ان کے شکر گزار تھے کہ ان کی موجودگی کی وجہ سے عملی لوٹ مار کے لیے اس طرف نہیں آئے تھے ورنہ یہ خانہ بدوش لٹیروں کے آئے دن لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ مہلج کے لوگ ان کے احسان مند تھے۔

ایک دن اکیس بادشاہ کا قاصد مہلج آیا اور پیغام دیا کہ وہ اپنے سپاہیوں سمیت جات میں حاضر ہو جائیں۔ فلسطینی دیکھ رہے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، اپنی قوم سے الگ ہو گئے ہیں۔ ان کی قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔

ایک گروہ طاوت کے ساتھ ہے دوسرا حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ۔ اب اسرائیلیوں میں اتحاد باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کمزور ہو چکے ہیں لہذا ان پر حملہ کر دیا جائے۔ اسی حملے میں ساتھ چلنے کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کو پیغام بھیجا گیا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ سخت رنجیدہ ہوئے۔ کیا مجھے اپنی قوم پر کوار اٹھانی پڑے گی؟ میں قسم کھا چکا ہوں کہ طاوت کو تہ توئل کروں گا اور نہ اس سے جنگ کروں گا۔ اے خدا! میری قسم کو قائم رکھ۔ مجھے اس امتحان سے بچالے۔

انہوں نے اکیس بادشاہ سے وفاداری کی شان دکھائی۔ قاصد سے کہہ بھی دیا کہ بادشاہ کا حکم سر آنکھوں پر۔ اپنے ساتھیوں کو لے کر چل بھی دیے لیکن دل میں یہی تھا کہ یہ معرکہ ٹل جائے۔

وہ ”رفیق“ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں فلسطینی فوجیں اٹھیں ہو رہی تھیں۔ راستے بھران کے سپاہی بھی چہ میگوئیاں کرتے رہے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، طاوت سے لڑنے پر کیونکر آمادہ ہو گئے ہیں جبکہ وہ یہ کہتے رہے تھے کہ طاوت خدا کا مسوح ہے وہ اس کے خلاف کوار نہیں اٹھائیں گے۔

یہی سوچے سوچے وہ اٹھتے ہی اٹھ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی فوج کے عہدے داروں کے ماتھے ٹھکنوں سے بھر گئے۔ وہ اس برہمی کی حالت میں اکیس بادشاہ کے سامنے پہنچے۔

”مختصر آپ نے داؤد کو کیوں بلا لیا۔ اس کا ہمارے درمیان کیا کام۔“

”کیا تم نہیں جانتے کہ یہ طاوت کا دشمن ہے اور بہادر بھی ہے۔ یہ ہماری جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر لڑے گا۔“

”یہ شخص ہمارے ساتھ صرف اس لیے جا رہا ہے کہ طاوت پر دباؤ ڈال کر اپنے لیے معافی حاصل کر لے اور عین جنگ کے دوران ہم سے الگ ہو کر اپنی قوم کے ساتھ مل جائے۔“

”داؤد ہمیشہ ہمارا قدار رہا ہے۔“

”مگر ہم اس پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ اسے فوراً واپس بھیج دیں۔ یہ ہمارے ساتھ نہ جانے پائے۔“

اکیس بادشاہ عجیب شکمش میں تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اس کی فوج مخالفت کر رہی تھی بالآخر اس نے حضرت داؤد علیہ السلام سے معذرت کر لی۔

”میری فوج تمہاری مخالف ہے لہذا میں مجبور ہوں۔ میرے افسران کو اشتعال مت دلاؤ بلکہ چپ چاپ مہلج روانہ ہو جاؤ۔“

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے خدا کا شکر ادا کیا جو قدم قدم پر ان کی مدد کر رہا تھا۔ خدا نے ان کی قسم کی لاج رکھ لی تھی۔ طاوت کے خلاف کوار اٹھانے سے بچ گئے تھے۔

اے اسرائیل کی بیٹیوں ساؤل پرورد
اس نے تم پر نفیس نفیس ارغوانی لباس پہنائے
سونے کے زیوروں سے تمہاری پوشاک کو آراستہ کیا
ہائے لڑائی میں زبردست کیسے کھیت آئے۔

+++

اب اسرائیلی قوم کا کوئی بادشاہ نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا جو انہیں دشمنوں سے بچاتا۔ اسرائیلی بھاگ بھاگ کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آ رہے تھے اور انہیں مجبور کر رہے تھے کہ وہ بادشاہت کا اعلان کر دیں۔ خود ان کے ساتھی ان پر زور دے رہے تھے لیکن خدا سے پوچھے بغیر وہ کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ پہلے تو وہ انتظار کرتے کہ خدا ان سے مخاطب ہو اور ان کی رہنمائی کرے۔ پھر وہ اس کی رضا جوئی کے لیے اس کے حضور جھکے۔ خدا نے انہیں مخاطب کیا۔

”یہوداہ کے شہر جبرون چلا جا۔“

ہجرت کے دن ختم ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے خاندان اور اپنے ساتھیوں کے خاندانوں سمیت جبرون چلے گئے۔ جبرون کے لوگوں نے شاندار استقبال کیا۔ لڑکیاں دف بجا بجا کر پھر دی گیت گات رہی تھیں۔

”ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا مگر داؤد نے لاکھوں کو مارا۔“

یہوداہ کے قبیلے کے بزرگوں نے بڑی دھوم دھام سے تاجپوشی کی رسم ادا کی اور ان کو طالوت کے تخت پر بٹھایا۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر تیس برس تھی۔

جبرون میں یہوداہ کے قبیلے نے حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا بادشاہ بنایا اور ملک کے باقی حصوں میں طالوت کے سپہ سالار انبیر نے طالوت کے ایک بیٹے اشبوست کی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ انبیر نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ یہوداہ کے خلاف الفکر کشی کر دی۔ اب بنی اسرائیل واضح طور پر دو حصوں میں بٹ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نہیں چاہتے تھے کہ یہ خانہ جنگی ہو لیکن یہ جنگ ان پر مسلط کر دی گئی تھی۔

اس خانہ جنگی کے دوران یہوداہ قبیلہ اور اسرائیل کے دوسرے قبیلوں کے سیکڑوں جوان خواجواہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس خانہ جنگی کو دو برس ہو چکے تھے کہ انبیر اور اشبوست کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ انبیر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس جبرون آیا اور ان سے پورے اسرائیل کی بادشاہت کے لیے شرائط طے کرنے لگا۔ ان شرطوں کو مان کر وہ جبرون سے واپس جا رہا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بھانجے یوآب نے اپنے بھائی عسائیل کے قتل کے بدلے میں انبیر کو قتل کر دیا۔ چند دنوں بعد اشبوست بھی اپنے بستر پر اپنے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

یہ قتل اتنی جلدی جلدی ہوئے کہ اسرائیلیوں نے جان لیا کہ خداوند حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ پھر ہم اس کا ساتھ کیوں چھوڑیں۔

اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اب تک صرف ایک قبیلے کے بادشاہ تھے لیکن اب باقی کیا رہے قبیلوں کے نمائندے بھی جبرون آئے اور حضرت داؤد علیہ السلام سے ملے اور ان سے کہا، ہم تیری ہڈی اور تیرا گوشت ہیں۔

ان لوگوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پورے ملک کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر 37 سال تھی۔ انہیں یہوداہ پر حکومت کرتے ہوئے سات سال ہوئے تھے اور اب وہ پورے ملک اسرائیل کے بادشاہ تھے۔

خانہ جنگی سے فرصت مل چکی تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اب پورے ملک کے بادشاہ تھے۔ صرف ایک شہر ”یہوس“ ایسا تھا جو ان کے قبضے میں نہیں تھا بلکہ کسی کے لیے بھی یہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے تسخیر کرنے کا ارادہ کیا۔

”ہم خدائے قادر کی مدد سے یہوس کے ناقابل تسخیر شہر کو فتح کریں گے تاکہ اسے اسرائیل کی سلطنت کا پایہ تخت بنائیں۔“

اس شہر میں لعانیوں کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ اس کے لوگ یہوسی کہلاتے تھے اور شہر کا نام یہوس پڑ گیا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے سرداروں نے سنا تو انگشت بدنداں رہ گئے۔ آج تک کسی اسرائیلی نے اس شہر میں ایک رات کے لیے قیام بھی نہیں کیا تھا، فتح کرنا تو بڑی بات۔ بلند بالا برجوں اور فصیلوں والا شہر ابھی تک اسرائیلیوں کی عزت کو لالچا رہا تھا۔

”میں اسرائیلی فوج سے آیا ہوں۔“

”کیا خبر لایا ہے؟“

”خبر بہت بری ہے۔ تمام اسرائیلی فوج پراگندہ ہو کر بھاگ گئی اور ہزاروں سپاہی جنگ میں کام آ گئے۔“ یہاں تک کہنے کے بعد وہ پھر رونے لگا۔ جب ذرا دل ہلکا ہوا تو اس نے وہ بات کہہ دی جو حضرت داؤد علیہ السلام سننا نہیں چاہتے تھے۔

”طالوت اور اس کا بیٹا بھی مارے گئے ہیں۔“

”کہیں تو غلط تو نہیں کہہ رہا ہے۔ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ مر گئے ہیں۔“

اس عمالیتی نے یہ تو دیکھ لیا تھا کہ طالوت اس جنگ میں قتل ہوا ہے اور اس طرح قتل ہوا ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ اس کے تین بیٹے قتل ہو چکے اور وہ خود بھی تیر اندازوں کے زرخے میں ہے۔ بھانسنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس نے اپنی کھوار زمین پر کھڑکی کی اور پیٹ کے بل اس پر گر پڑا۔

اب جو اس عمالیتی سے پوچھا کیا تو اس نے اسے اپنے نام سے منسوب کر دیا تاکہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے دشمن (طالوت) کے مارنے والے سے خوش ہو کر اسے انعام دیں۔

”میں خود کوہ جلعوہ پر تھا۔ میں نے طالوت بادشاہ کو دیکھا کہ اپنے پیٹ کے ساتھ بھالے کی ٹیک لگائے ایسا وہ طالوت بادشاہ مجھے دیکھ کر چلا اٹھے کہ میرے پاس آؤ۔ میں قریب گیا تو انہوں نے کہا، مجھے اس اذیت سے نجات دلاؤ۔ میں سخت تکلیف میں ہوں مگر میری جان نہیں نکلتی۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں نے کھوار نکالی اور ایک ہی وار میں انہیں تکلیف سے نجات دلا دی۔ آپ کے دشمن کا قاتل میں ہوں۔ مجھے انعام ملنا چاہیے۔“

انعام کے بجائے حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز گونجی۔ ”تو خداوند کے مسح کو ہلاک کرنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھانے سے کیوں نہ ڈرا۔“ پھر انہوں نے ایک جوان کو نزدیک بلا کر کہا۔ ”تو ایک جا اور اس پر حملہ کر۔“

اس جوان نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ یہ اس کے جھوٹ کی اسے سزا تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کی لاش کو مخاطب کیا۔ ”تیرا خون تیرے ہی سر پر کیونکہ تو نے ہی اپنے منہ سے آپ اپنے اوپر گواہی دی اور کہا کہ میں نے خداوند کے مسح کو قتل کیا۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے اس سرے کے ساتھ طالوت اور جونا تھن کا غم منایا۔

اے اسرائیل تیرے ہی اونچے مقاموں پر

تیرا خرم مارا گیا

ہائے زبردست کیسے کھیت آئے

یہ بات میں نہ بتانا

اسقلوں کے کوچوں میں اس کی خبر نہ کرنا

نہ ہو کہ فلسطینیوں کی بیٹیاں خوش ہوں

اے جلعوہ کے پہاڑ

تم پر نہ اوس پڑے اور نہ بارش ہو

کیونکہ وہاں زبردستوں کی سپر بری طرح

چھینک دی گئی

یعنی ساؤل (طالوت) کی سپر

+++

طالوت اور جونا تھن

وہ عقابوں سے تیز

اور شیر بدروں سے زور آور تھے

جہالت کس تاریکی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چند لوگ ہندوستان سے ایک ہاتھی کسی ایسے ملک میں لے گئے جہاں پہلے کسی نے ہاتھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ہاتھی کو ایک تار یک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کو اس بات کا علم ہوا تو اس کمرے کے باہر ہجوم جمع ہو گیا۔ کمراتار یک اور ہاتھی سیاہ، کسی کو کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لوگوں نے ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر یہ اندازہ لگانا چاہا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ جس شخص کا ہاتھی کے جسم کے کسی حصے پر ہاتھ لگتا وہ اسی سے ہاتھی کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنالیتا۔ جس کا ہاتھ کان پر پڑا اس نے کہا ”یہ بہت بڑے قنگے جیسا ہے۔“ جس نے ہاتھی کی پیٹھ کو چھوا، اس نے کہا ”یہ تخت کی طرح ہے۔“ جس نے ہاتھی کے پاؤں اور ٹانگوں کو چھوا تھا، اس نے اعلان کیا ”یہ تو ستون جیسا ہے۔“ ہر شخص نے ہاتھی کو جیسا ٹٹول کر دیکھا، ویسا بتایا۔ کسی نے کہا ”الف“ ہے، کسی نے اسے ”ب“ کہا مگر ہاتھی کی اچھڑ سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ البتہ ان کے ہاتھوں میں روشنی کے لیے شمع ہوتی تو سب کی ایک رائے ہوتی، یہ اختلاف نہ ہوتے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہاتھی کی شکل و صورت کیسی ہے۔

اقتباس: حکایات روی و سجدی از ڈاکٹر تصدق حسین

اب حضرت داؤد علیہ السلام سوچ رہے تھے کہ یرد شلم میں ایک عبادت گاہ بنائیں اور تابوت سکینہ کو وہاں منتقل کر دیں۔ انہیں خدا کے جواب کا انتظار تھا۔ ایک دن یہ جواب مل گیا۔

خدا فرما رہا تھا۔ ”کیا تو میرے لیے ایک گھر بنائے گا؟ کیونکہ جب سے میں بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لایا آج کے دن تک گھر میں نہیں رہا بلکہ خیمہ اور مسکن میں بھرتا رہا ہوں۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے تابوت سکینہ کو یرد شلم لانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ تیس ہزار چیدہ چیدہ سپاہیوں کی فوج ہمار کی گئی تاکہ یہ قربت تحریم جائے اور ابتداء کے گھر سے وہ صندوق لے کر آئے جو وہاں رکھا ہوا تھا۔ اس صندوق کے لیے ایک خاص خیمہ تیار کر لیا گیا تھا کیونکہ اس وقت تک یہ مکمل تعمیر نہیں ہوا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے تیاریوں کی ساری تفصیلات پر ذاتی طور پر نگاہ رکھی اور موسیقی کے سازوں، سازندوں اور گانے والی جماعت کا خاص انتظام کیا۔

ایک بہت بڑا جلوس خوشی خوشی قربت تحریم کی طرف روانہ ہو گیا۔

گانے والیاں گارہی تھیں۔

خداوند کے پہاڑ پر کون چڑھے گا۔

اور اس کے مقدس مقام پر کون کھڑا ہوگا۔

وہی جس کے ہاتھ صاف ہیں اور جس کا دل پاک ہے۔

اس صندوق کو قربت تحریم سے لایا گیا۔ جب یہ مجمع یرد شلم کے قدیم پھاٹکوں پر پہنچا جو صدیوں تک ان پر بند رہے تھے تو جلوس کے قدم رک گئے۔ سب کو شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ کتنی بڑی مہربانی ہے۔ اب اس شہر میں اس کی پاک حضوری ہوگی۔

گانے والیوں نے پھر گایا۔

اے پھاٹکواپنے سر بلند کرو

اے ابدی دروازہ واوٹے ہو جاؤ

اور جلال کا بادشاہ داخل ہوگا۔

یہ جلال کا بادشاہ کون ہے

خداوند جو قوی اور قادر ہے

+++

حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا کی طرف سے اشارہ مل چکا تھا اسی لیے وہ نہایت اعتماد کے ساتھ اس شہر کے پھاٹک کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

فصیل سے کسی نے پکار کر کہا۔ ”بزدل یہودی! تمہیں یہ کمان بھی کیسے ہو گیا کہ تم ٹٹلی بھرفوج کے ساتھ اس شہر کو فتح کر لو گے۔ ہمارے تو لنگڑے لو لے بھی تمہیں بھگا دیں گے۔“

حضرت داؤد علیہ السلام نے ساتویں بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس شہر کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں سوائے ایک زمین دوزنہر کے۔ انہوں نے اپنے لشکر میں اعلان کیا جو شخص اس زمین دوزنہر کے ذریعے سب سے پہلے شہر میں داخل ہو کر کسی بیوی کو قتل کرے گا اسے میں اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دوں گا۔ اس اعلان کو سنتے ہی چند لوگ نہر میں اتر پڑے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا بھانجا یوآب نہایت جوشیلا نوجوان تھا۔ اس وقت بھی وہ سب سے آگے تھا۔

یہ لوگ اسے کوئی عام نہر سمجھ رہے تھے لیکن یہ اندر سے بہت گہری تھی۔ تاریکی میں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا سر کو اوپر رکھتا بھی مشکل تھا۔ کئی تو راستے ہی میں غرق ہو گئے۔ یوآب برابر ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ بالآخر یہ سفر مکمل ہوا۔ روشنی کی ہلکی سی کرن نمودار ہوئی۔ وہ نہر کے دوسرے سرے پر تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا۔ یوآب سب سے پہلے باہر آیا۔ بیوی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شہر میں داخل ہوگا۔ انہوں نے پھاٹک بند کر دیے تھے لیکن کوئی پہرے پر نہیں تھا۔ سب کے سب فصیلیوں پر چڑھ کر یہودیوں کی بے بسی پر ٹٹنے لگا رہے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ نہر کے ذریعے کچھ لوگ اندر آ چکے ہیں۔ انہیں تو اس وقت معلوم ہوا جب شہر کا دروازہ کھل گیا اور انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کی فوج کو شہر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت تک اپنے دفاع کا وقت گزر چکا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی فوج نے سخت خوں ریزی کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔

یہ شہر صدیوں بعد یہودیوں کے ہاتھ لگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کا نام یرد شلم رکھا۔ جس کا عام مطلب ”سلامتی کا شہر“ ہے۔

یہ شہر نہ صرف اسرائیل کی سلطنت کی حیثیت سے سیاسی مرکز بنا بلکہ دینی مرکز بھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسی شہر میں قیام اختیار کیا۔

ان کے بڑھتے ہوئے قدم دیکھ کر فلسطینیوں نے ایک مرتبہ اسرائیل پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے اپنے ایک شہر میں جہاں ان کے بت رکھے ہوئے تھے، جمع ہونا شروع کر دیا تاکہ وہاں جمع ہو کر یرد شلم کی طرف بڑھیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام صرف بادشاہ نہیں تھے نبی بھی تھے۔ کوئی کام خدا کی مرضی کے بغیر کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے خدا کی مرضی پوچھی۔

”کیا میں فلسطینیوں سے مقابلے کے لیے جاؤں؟“

”ضرور جا کیونکہ میں انہیں تیرے ہاتھ میں کر دوں گا۔“

انہوں نے اپنے سپہ سالار یوآب کو حکم دیا کہ لشکر تیار کر کے اچانک دھاوا بول دو۔ فلسطینیوں کا لشکر جرار و فائیم کی وادی میں پڑا ہوا تھا۔ اس مرتبہ یہ لشکر عجیب شان سے آیا تھا۔ یہ لوگ اپنے بت اپنے ساتھ لائے تھے اور انہیں وادی میں جا بجا نصب کر دیا تھا۔ گویا حضرت داؤد علیہ السلام اپنا خدا اپنے ساتھ رکھتے تھے تو وہ بھی اپنے بتوں کو اپنے ہمراہ لے آئے تھے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر بے خبری میں حملہ کیا۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ جان بچا کر بیٹھروں کی طرح بھاگے اور ایسے بھاگے کہ اپنے دیوتاؤں کو بھی وہیں چھوڑ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان بتوں کو اکٹھا کر کے آگے لگا دی۔ فلسطینیوں نے اپنے دیوتاؤں کی موت کا انتقام لینے کے لیے ایک مرتبہ پھر حملہ کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی فوجوں نے انہیں پھر شکست دی۔ اس مرتبہ فلسطینیوں کو ایسا سبق ملا کہ آئندہ ان کے دلاوروں کی ہمت نہیں ہوئی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے مقابل آئے۔

اس جنگ و جدل کے ماحول سے فرصت ملی اور حضرت داؤد علیہ السلام یرد شلم میں اپنے تعمیر کردہ محل میں بیٹھے تو بے چین ہو گئے۔ وہ سوچا کرتے کہ میں تو یہاں دیودار کی لکڑیوں کے گھر میں رہتا ہوں اور خدا کا مقدس صندوق سات پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ ایک گھر میں مقید ہے جہاں چند لوگ ہی اس کا دیدار کرتے ہیں۔

کاہنوں کے شہر تو یہ میں خیرہ اجتماع تھا جو ایسی عبادت گاہ تھی جس میں خدا کی خاص حضوری تھی اور جن میں خاص خاص دینی رسومات ادا کی جاتی تھیں لیکن جب سے طاوت نے وہاں کاہنوں کو قتل کیا تھا اس صندوق کو ججون میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

اس طرح پورا کیا کہ آپ کے ہاتھ میں لوہے اور فولاد کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ جب وہ زور دیتے تو سخت مشقت اور آلات کے بغیر فولاد کو جس طرح چاہتے کام میں لاتے اور ان کے ہاتھ میں موم کی طرح یہ آسانی ہر قسم کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔
قرآن مجید نے اس واقعے کو سورہٴ یاس میں اس طرح بیان کیا ہے۔
”اور ہم نے اس (داؤد) کے لیے کوہانرم کر دیا تھا کہ نیاز رہیں کشادہ اور انداز سے سے جوڑ کڑیاں۔“

سورہٴ انبیاء میں اس طرح بیان ہوا ہے۔
”اور ہم نے اس (داؤد) کو سکھایا ایک قسم کا لباس بنانا تاکہ تم کو لڑائی کے موقع پر اس سے بچاؤ حاصل ہو۔“
تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ داؤد علیہ السلام سے پہلے لوہے کی صنعت نے اس حد تک ترقی کر لی تھی کہ فولاد کو پھلکا کر اس سے سائٹ نکڑے بنائے جاتے اور ان کو جوڑ کر زریں بنائی جاتی تھیں۔ یہ زریں بہت بھاری ہوتی تھیں۔ انہیں صرف قوی جنگی لوگ ہی پہن سکتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہیں خدا تعالیٰ نے یہ فضیلت بخشی کہ انہوں نے تعلیم وحی کے ذریعے ایسی زریں تیار کیں جو باریک اور نازک زنجیروں کے حلقے سے بنائی جاتی تھیں اور ہلکی اور نرم ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا سپاہی اس کو پہن کر بہ آسانی نقل و حرکت بھی کر سکتا تھا اور دشمن سے محفوظ بھی رہتا تھا۔

آپ کو کتاب زبور عطا کی گئی تھی۔ آپ کو یہ معجزہ بھی عطا ہوا تھا کہ آپ جب گھوڑے پر زین کنا شروع کرتے تو اس سے لاریغ ہونے تک مکمل زبور کی تلاوت کر لیا کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ معجزہ حرکت زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا خدائے تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے زمانے کو اس مدت میں ایسا سمیٹ دیتا تھا کہ عام حالت میں وہ گھنٹوں کی مقدار بن سکتا ہے یا حضرت داؤد علیہ السلام کو سرعت اور الفاظ کی اس درجہ قوت عطا کر دی گئی تھی کہ دوسرا شخص جس کلام کو گھنٹوں میں ادا کرے۔ حضرت داؤد علیہ السلام بخاری کی نقل کر وہ روایت کے مطابق مختصر وقت میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔
یہ اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کی تلاوت پسند تھی۔ ابن ابی حاتم جعفر بن سلیمان سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام قیامت کے روز عرش کی بجلی کے پاس کھڑے ہوں گے تو اللہ عزوجل ارشاد فرمائیں گے کہ اے داؤد آج اسی حسین اور عمدہ آواز کے ساتھ میری بزرگی بیان کرو جس کے ساتھ دنیا میں تم میری بزرگی بیان فرماتے تھے۔
حضرت داؤد علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”الہی اب کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے مجھ سے وہ آواز لے لی ہے۔“
فرمان باری ہوگا۔ ”آج میں دوبارہ تم کو عطا کر دیتا ہوں۔“
اس فرمان کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام جنت کی آسودہ حالی کے ساتھ اپنی پوری قوت عمدہ آواز میں صرف کر دیں گے۔

+++

حضرت داؤد علیہ السلام اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے استون اور ابی سلوم ان کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔ ایک وقت تو وہ آیا تھا جب حضرت داؤد علیہ السلام کو یروشلم سے نکلنا پڑ گیا تھا لیکن پھر ان بغاوتوں پر قابو پالیا گیا۔ استون اور ابی سلوم یکے بعد دیگرے مارے گئے اور حضرت داؤد علیہ السلام کو دوبارہ یروشلم آنا نصیب ہوا لیکن اب کہن سالی کی بدولت امر پر لینے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انتقامی معاملات میں خلل پڑنے لگا۔ حضرت داؤد علیہ السلام دو بغاوتیں فرد کر چکے تھے اس لیے انہوں نے سوچا اپنے جانشین کا اعلان فرمادیں۔ انہیں خدا کا پیمانہ یاد تھا کہ تیرے بیٹا سلیمان بادشاہ بنایا جائے گا اور وہ مکمل تعمیر کرے گا۔

ایک عام اجتماع میں حضرت داؤد علیہ السلام نے حاکموں، امرا اور کاتبوں کو تاکید کی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ان کا ہاتھیں اور بادشاہ تسلیم کریں۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے مشیروں کو طلب کیا اور ان سے کہا۔ ”ہمارے بیٹے سلیمان کو شاہی فخر پر سوار کر کے میرے ماموں کے ہمراہ جیون لے جاؤ۔ وہاں تاتن نبی اور صندوق کاہن سے اسے مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنائیں۔ اسے شاہی تخت پر بٹھایا جائے کیونکہ ہم نے اسے اسرائیل کا بادشاہ بنایا ہے۔“

جب حضرت سلیمان علیہ السلام تخت پر بیٹھ چکے اور نعتا نعروں سے گونج چکی تو حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا کے یہ الفاظ یاد آئے۔ ”ہم تیری بادشاہت کو بھی ختم نہیں کریں گے۔“
حضرت سلیمان علیہ السلام کو نصیحت کی۔
”اے میرے بیٹے سلیمان اپنے باپ کے خدا کو پہچان اور پورے دل اور روح کی مستعدی سے اس کی عبادت کر کیونکہ خدا

انہوں نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو متحد کر دیا تھا۔ ارد گرد کے دشمنوں سے انہیں نجات دلا دی تھی۔ یروشلم کو ساری قوم کا مذہبی مرکز بنا دیا تھا۔ عہد کا صندوق، یروشلم میں لا کر رکھا۔ اب انہیں یہ آرزو ہوئی کہ عبادت کے لیے ایک مستطیل عمارت (میکل) تعمیر کریں لیکن خدا کی طرف سے ملنے والا جواب خاصا حوصلہ شکن تھا۔
”میکل کی تعمیر اس وقت تک ملتوی رکھی جائے جب تک اس کا بیٹا سلیمان تخت نشین ہو۔“

اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ چونکہ تیرے ہاتھوں نے بہت خون بہایا ہے اس لیے میں تجھے میکل کی تعمیر کی اجازت نہیں دے سکتا۔

خدا کی طرف سے اس انکار پر بھی ان کے دل میں رنجش کے بجائے جذبہ تشکری موجزن تھا کیونکہ اس پیغام میں یہ خوش خبری بھی تھی کہ ان کی بادشاہت ان کی نسل میں منتقل ہوگی اور حضرت سلیمان کا زمانہ ان سے زیادہ پرسکون اور پرامن ہوگا۔
وہ اگر میکل کی تعمیر نہیں کر سکتے تھے تو اس مبارک منصوبے کی تیاری تو کر سکتے تھے۔ پس وہ بڑی سرگرمی سے تعمیر کے لیے سامان اکٹھا کرنے میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت سا سونا چاندی، میکل، لوہا اور عمارتی لکڑی جمع کی تھی اور اسے اس کا ذخیرہ کے لیے علیحدہ رکھ دیا تھا۔

+++

قرآن مجید، توریت اور اسرائیلی تاریخ اس کی شاہد ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام شجاعت، قوت فکر و تدبیر جیسے اوصاف میں کامل تھے۔ فتح و نصرت ان کے قدم چومتی تھی اور خدا کا فضل و کرم اس قدر شامل حال تھا کہ دشمن کے مقابلے میں ان کی جماعت کتنی ہی مختصر ہوتی کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ اس لیے بہت گھوڑے عربیہ میں شام و عراق، فلسطین اور مشرقی اردن کے تمام علاقوں پر ان کا حکم نافذ ہو گیا۔ ایلہ سے لے کر فرات کے تمام علاقوں اور دمشق تک تمام ملک ان کے زیر نگیں تھا اور اگر حجاز کے بھی ان حصوں کو شامل کر لیا جائے جو ان کی قلمرو حکومت کا حصہ بن چکے تھے تو یہ کہنا کسی طرح بے جا نہ ہوگا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی مملکت و حکومت واحد سلطنت تھی جو جدید قلفہ تاریخ اقوام کے مطابق وحدت عرب یا اس سے بھی زیادہ وسیع وحدت اقوام ساری کی حکومت بھی جاسکتی ہے۔ وحی الہی کے مشرف نے ان کی عظمت و شوکت کو اور بھی زیادہ بلند کر دیا تھا۔ رعایا کو یہ یقین حاصل تھا کہ اگر حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے کوئی ایسا معاملہ رکھ دیا جائے جو انتہائی بے چیدہ ہو۔ کذب و اقتراف سے اسے کتنا ہی ڈھانپ دیا گیا ہو تب بھی وحی الہی کے ذریعے ان پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ جن دافس کی کو بھی یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کریں۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ دو شخص ایک گائے کا جھگڑا حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس لے گئے ایک نے دوسرے پر دعویٰ دائر کیا کہ یہ میری گائے ہے اور اس نے غصب کر لی ہے لیکن مدعا علیہ انکار کرتا رہا اور جھگڑے کی بات چیت رات گئے تک چلتی رہی پھر اللہ نے آپ پر وحی فرمائی کہ مدعی کو قتل کر دو۔ صبح ہوئی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعی کو کہا کہ مجھے حکم باری ہے کہ تجھے قتل کر دوں لہذا بچ بچا کر بھاگ جا۔ اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے پیچھے نبی میں اس پر اپنے دعوے میں بالکل سچا ہوں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس واقعے سے قبل میں نے دھوکا دے کر اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کو قصاص میں قتل کر دیا۔

اس قسم کے واقعات ہوتے تھے جن کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کے حکم اور ان کی عظمت و شوکت کے سامنے سب پست اور فرماں بردار تھے۔

قرآن شاہد ہے۔

”اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کیا اور اس کو حکمت (نبوت) عطا کی اور صحیح فیصلہ کرنے کی طاقت بخشی۔“

شاہی اور بادشاہی کے باوجود حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے مال سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ اہل و عیال کی معاش کا ہا، بیت المال پر نہیں ڈالتے تھے بلکہ اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے حلال روزی حاصل کرتے اور اسے ذریعہ معاش بناتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ”کسی انسان کا بہترین رزق اس کے اپنے ہاتھ کی محنت سے کمایا ہوا رزق ہے اور بے شبہ اللہ کے پیغمبر داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت کر کے روزی کماتے تھے۔“

صحیح بدرالدین یعنی فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام دعائیں نکالتے تھے کہ خدایا ایسی صورت پیدا کر دے کہ میرے ہاتھ کی کمائی آسان ہو جائے کیونکہ میں بیت المال پر اپنی معاش کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ چنانچہ آپ کی اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے

بے خبر نظر آتے والے پھر ان کے لیے انسانوں کا فریب

نشیرویں عینک زہر



قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ خون کی ایک بوند سے پیدا ہونے والے انسان کو نرالی عقل دے کر کل کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا اور پھر اس کی مسلسل عرق ریزی اور تحقیق کبھی ایسا رنگ بھی لانے گی اس کا تو اسے خود بھی گمان نہ تھا۔ زندگی کی بساط پر مہروں نے ثابت کر دیا کہ دانش سے بازی کیسے ہلٹی جاتی ہے... وہ جو کبھی پھولوں کو زندگی کہتے تھے، جانے کیسے اچانک قاتل روپ میں ڈھل گئے۔

گریموں کی راتوں میں، جب میں بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر سونے کے لیے بیٹھی تو چار موچھائے سٹائے میں چھتوں سے چٹنی ہزاروں، لاکھوں شہد کی مکھوں کی بھینٹا ہٹ مجھے صاف سٹاکی دیتی تھی جو بعض اوقات کانوں کے پردے سے یوں ٹکرائی کہ لینا دو بھر ہو جاتا مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ اُس وقت یہ آوازیں مجھے احساس دلاتی تھیں تم بہت بوڑھی ہو چکی ہو، اتنی بوڑھی کہ چت لینے لینے تمہاری کراکڑ

شہد کی فارمگ کے لیے بنائے گئے ٹریوی فارم کے گلوئی کے بڑے بڑے درجنوں صندوق نما ڈبے افقی رخ پر ایک دوسرے پر دھرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان اہوں کا کوئی چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ ہو۔ میرے گھر اور ان کے درمیان خالی میدان تھا لیکن کچن کی کھڑکی سے وہ مجھے صاف نظر آرہے تھے حالانکہ میرے گھر اور ان کے بیچ لگ بھگ آدھے میل کا فاصلہ تھا۔

سب دلوں کو جانتا ہے۔ اگر تو اسے ڈھونڈے تو وہ تجھ کو مل جائے گا اور اگر تو اس کو چھوڑے تو وہ ہمیشہ کے لیے تجھے رد کر دے گا سو ہوشیار ہو کیونکہ خدا نے تجھ کو مقدس کے لیے ایک گھر بنانے کو چنا ہے سو ہمت باندھ کر کام کر۔“
انہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے یہ سب بیان کر کے پیش کرے ہوئے فرمایا۔ ”اس نقشے کا ہر حصہ خدا کی عین ہدایت کے مطابق ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے لیکن ہمیشہ ہمت سے کام لیتا۔“
خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے فرمایا۔
”میرے بیٹے سلیمان کو ایسا کامل دل عطا کر کہ وہ تیرے حکموں اور شہادتوں اور آئین کو ماننے اور ان سب باتوں پر عمل کرے۔“
حضرت داؤد علیہ السلام اب محسوس کر رہے تھے کہ وہ جلد ہی اس رحیم خالق کے پاس پہنچ جائیں گے جس کا دستِ بزرگ ہمیشہ انہیں سنبھالتا رہا۔

+++

مشہور محدث حاکم نے اپنی کتاب مستدرک میں ایک روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے۔
”حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا عالم بالا میں جب حضرت آدم علیہ السلام کی صلب سے ان کی ذریت نکالی اور ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے ایک خوبصورت چمکتی پیشانی والے شخص کو دیکھ کر دریافت کیا۔ پروردگار یہ کون شخص ہے، جواب ملا تمہاری ذریت میں سے بہت بعد میں آنے والی ہستی داؤد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عمر کیا مقرر کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ساٹھ سال۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ الہی! میں اپنی عمر کے چالیس سال اس کو بخشا ہوں۔

اس روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتقال کے وقت حضرت داؤد علیہ السلام کی عمر مبارک سو سال تھی۔ توریت وغیرہ میں صرف اتنا بتایا گیا کہ آپؑ نے کہیں سالی میں انتقال فرمایا۔

مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔
”حضرت داؤد علیہ السلام میں بہت سخت غیرت و حیاء تھی۔ آپؑ جب باہر جاتے تو باہر سے دروازے بند کر جاتے اور کوئی آپ کے آنے تک داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مرتبہ آپؑ کی بیوی نے اچانک کھن کے بیچ میں کسی کو کھڑے پایا تو اس کو کہنے لگیں، اللہ کی قسم ہم کو داؤدؑ سو اکر دیں گے۔

اتنے میں حضرت داؤد علیہ السلام واپس آ گئے۔ پوچھا تو کون ہے؟ اس شخص نے کہا میں وہ ہوں جو بادشاہوں سے نہیں ڈرتا اور رکاوٹیں مجھے آنے سے نہیں روک سکتیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام فوراً بولے پھر تو اللہ کی قسم آپؑ ملک الموت ہیں۔ اللہ کے فرمان کو مہربان ہو۔ پھر کچھ ٹھہرے اور روح قبض ہو گئی۔

جب غسل و کفن اور سارے معاملات سے فارغ ہوئے تو سورج اپنی تپش ڈالنے لگا۔
حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کو فرمایا۔ داؤدؑ پر سایہ فگن ہو جاؤ۔ پرندوں نے آپؑ (داؤدؑ) کی فحش مبارک پر سایہ کر لیا حتیٰ کہ رات نے ظلمت طاری کر دی اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کو فرمایا پر سمیٹ لو۔
حضرت ابو ہریرہؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ہمیں ساتھ ساتھ اشاروں سے سمجھا رہے تھے کہ کیسے پرندوں نے پر پھیلائے اور کیسے سمیٹے اور وہ پرندے بڑے بڑے پروں والے باز تھے اور یہ کئی تھے اور سایہ فگن تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ”داؤدؑ شنبہ (ہفتہ) کے دن اچانک وفات پا گئے تھے اور پرندے آپؑ پر سایہ فگن تھے۔“

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات سو سال کی عمر میں ہوئی اور (ہفتہ) کا دن تھا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک الموت آپؑ کے پاس تشریف لائے تو آپؑ سیزھویوں سے اتر رہے تھے۔ فرشتے نے عرض کیا مجھے بھی اجازت دیجیے کہ میں بھی آپؑ کے ساتھ اتروں۔ پھر کہا اے اللہ کے نبی! سال، مہینے، روزی سب کچھ ختم ہو گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام وہیں سیزھویوں پر سجدے میں گر گئے اور فرشتے نے سجدے کی حالت میں روح قبض کر لی۔

ماخذات: قصص القرآن - قصص الانبیاء - توریت

جاتی ہے۔ میں بھی اسے جرم معافی ہی سزا سمجھ کر تسلیم کر لیتی اور سونے کی کوشش کرنے لگتی مگر اس کے باوجود نہ تو مجھے ٹریوی اور نہ ہی شہد کی مکھیوں سے کوئی شکایت تھی۔

بات یہ ہے کہ میں بچپن سے یہ آوازیں سنتی آئی ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن کے دنوں میں شہد کی مکھیوں کی جھنجھناہٹ سے مجھے ہوا میں زندگی کا تاثر ملتا تھا۔ ان مکھیوں کا ایک ساتھ بڑے سے چھتے کو بنانا اور پھر اس میں شہد پیدا کرنا مجھے بہت انوکھا اور دلچسپ عمل لگتا تھا۔ چھتے کو دیکھ کر مجھے دوستی کا درس ملتا تھا۔

میرے والدین نیوزی لینڈ کے ایک بہت خوبصورت دیہات میں رہتے تھے۔ قدرتی نظاروں اور خالق کے پیدا کردہ جانوروں اور حشرات الارض کی مختلف اقسام سے متعلق میری معلومات شہروں میں بسنے والے ہم عمر بچوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھیں مگر شہد کی مکھیوں سے مجھے خصوصی لگاؤ تھا۔ جب میں ذرا بڑی ہوئی تو ان سے میری محبت اور بڑھ گئی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ جب میں خود کام کرنے کے قابل ہو جاؤں گی تو شہد کا فارم بناؤں گی۔ میں بڑی ہو گئی مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

میں پڑھ لکھ گئی تو کاؤنٹی سیکریٹریٹ میں کلرک بھرتی ہو گئی اور پھر چالیس برس تک وہیں نوکری کرتی رہی۔ وقت گزرتا چلا گیا اور پھر چالیس برس کی ملازمت کے بعد میں ریٹائر کر دی گئی۔ ریٹائرمنٹ کی پہلی شب مجھے احساس ہوا کہ میری زندگی کے سنہری دن کاؤنٹی کے دفتر اور فائلوں میں کھو گئے۔ اب انہیں واپس لانا بھی چاہوں تو وہ ماہ و سال مجھے کبھی نہیں مل پائیں گے۔ پل کے نیچے سے ایک بار بہہ جانے والا۔ پانی کب لوٹ کر آتا ہے۔

بڑھاپا ہو تو جسم کو توانائی کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ شہد سے زیادہ توانائی فراہم کرنے والی شاید ہی کوئی اور قدرتی شے ہو۔ مجھے روزانہ شہد استعمال کرنے کی عادت تھی مگر بہت ہی مناسب انداز میں۔ ٹریوی میرے لیے اکثر اپنے فارم سے خالص شہد لے کر آتا تھا۔

ٹریوی ہمیشہ مجھے سبز آرتھر کے نام سے پکارتا تھا۔ آرتھر میرے شوہر کا نام تھا جنہیں اس جہاں سے گزرے بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اب میں بالکل تنہا اور عمر کے اس حصے میں تھی جہاں میرے اندر یہ خواہش شدت سے سراٹھانے لگی تھی کہ لوگ اب تو مجھے میرے اصلی نام سے پکاریں، وہ نام جو میرے والدین نے رکھا تھا نہ کہ اس شخص کے نام سے جس سے میں نے صرف شادی کی تھی اور وہ بھی

کب کا اپنا نام قبر کے کتبے پر لکھوا کر مٹی میں سوچکا ہے۔ ان سب باتوں اور خواہشوں کے باوجود جب ٹریوی مجھے سبز آرتھر کہہ کر پکارتا تو مجھے کچھ خاص برا نہیں لگتا تھا۔

میرے نزدیک ٹریوی بہت اچھا لڑکا تھا۔ وہ بوائے اسکاؤٹ تھا۔ جب بھی مجھ سے ملتا ہمیشہ احترام سے پیش آتا تھا۔ اس نے بھی میرے سامنے کوئی بد تمیزی نہیں کی تھی، البتہ میرے آس پڑوس کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ پورے قبے میں مجھے باؤلی بڑھیا کہتا پھرتا ہے۔ ممکن ہے وہ لوگ سچ کہتے ہوں، البتہ میں نے اس کے منہ سے ایسا کبھی نہیں سنا تھا۔

ممکن ہے کہ وہ مجھے باؤلی سمجھتا ہو اور ممکن ہے وہ اپنے طور پر درست سمجھتا ہو۔ ایک مرتبہ میں نے بھی کچھ ایسا ہی محسوس کیا تھا۔ وہ مجھے راستے میں مل گیا تھا، چرچ کے پاس۔ میرے لیے شہد لے کر آ رہا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے مادام سبز آرتھر کہہ کر پکارا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے شہد لیا اور وقت گزاری کے لیے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اس کے ہاتھ میں چاک تھا۔ وہ میری باتوں کا ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا اور اس دوران برابر کی دیوار پر دائرے بناتا رہا۔ ممکن ہے کہ وہ اس وقت ان دائروں سے مجھے بھی باور کرانا چاہ رہا ہو کہ بڑھیا کا دماغ گھوما ہوا ہے۔

ٹریوی فارم پر کھڑے ہو کر عین شمال کی جانب دیکھا جائے تو وہاں ایک سبز قطار دکھائی دے گی۔ یہ سبز قطار دراصل میرے باغ کے اونچے اونچے کھنے درخت ہیں۔ ان درختوں کی سبز قطار کے ساتھ ہی مرینا کا گھر ہے۔ وہ میری بہت پرانی ہمسائی ہے۔ اس کے گھر کے سامنے بڑا سالان ہے جسے اس نے نہایت سلیقے سے سنوارا ہوا ہے۔ وہ بھی میری طرح بیوہ اور بوڑھی ہے مگر اسے اپنے لان سے بہت محبت ہے۔ کبھی وہ میری دوست تھی مگر پھر اس نے مجھ سے ایک ایسی زیادتی کی کہ ہماری دوستی اور پڑوسی کے رشتے کا تعلق ہی ختم ہو گیا۔

وہ بہت لالچی تھی مگر مجھے اس کی اس عادت سے کبھی کوئی سروکار نہ رہا مگر ایک دن اس نے میری زمین ہتھیالی، غیر قانونی طور پر لیکن قانون کی مدد سے۔ بات یہ ہے کہ میرا گھر جس زمین پر تھا، وہ کوئی ڈیڑھ ایکڑ کا پلاٹ تھا۔ یہ ہماری خاندانی جائیداد تھی۔ ایک دن یہ ہوا کہ اس نے نہ جانے کن کن لوگوں سے ساز باز کر کے کاغذات میں رد و بدل کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زمین اس کے نام ہو گئی۔ میں بوڑھی عمارت کی عورت کیا کر سکتی تھی، چپ کر کے گھر بیٹھ گئی۔

میری زمین اور اس پر لگا باغ ہتھیار کردہ بہت خوش تھی۔ بڑی شان سے اپنے لان اور باغ کے سامنے اکثر صبح و شام

ہاتھ میں چھڑی تمام کر چہل قدمی کرتی تھی۔ اس ظلم کے بعد تو میرے دل سے یہی بدعا نکلتی تھی کہ خدا کرے وہ مجھ سے پہلے اس دنیا سے اٹھ جائے۔

☆☆☆

مرینا بہ ظاہر خوبصورت، محنت مند اور چاق و چوبند نظر آتی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیمار نہ تھی۔ کئی برس پہلے اسے دماغ کا دورہ پڑا تھا جس کی وجہ سے اسے کافی عرصے اسپتال میں رہنا پڑا۔ وہ اُس دورے میں بچ تو گئی مگر بے چاری کا کافی کمزور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اُس کے دماغ میں کچھ ایسی کیمیائی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، جن کی وجہ سے اسے دورہ پڑا جو خطرناک تھا۔ یہ میری زمین ہتھیلے سے پہلے کی بات ہے۔ اس کی زندگی بہ دستور فطرے میں تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر اسے وہ دورہ پھر پڑ گیا تو شاید بچنا محال ہو جائے گا۔ مجھے امید تھی کہ ایسا ہوا تو وہ میرے لیے خوشی کا باعث بنے گا۔

اُس نے جو جرم کیا تھا، شاید ہی وہ کبھی کاؤنٹی کے لوگوں میں گفتگو کا موضوع بنا ہو۔ ہوا یہ تھا کہ دو پرائیویٹ پراپرٹی کے درمیان میرا ڈیڑھ ایکڑ کا پلاٹ تھا۔ اس پلاٹ کے ایک طرف مرینا کا گھر اور دوسری طرف ٹریوی کا شہد فارم تھا۔ ان دونوں کے بیچ واضح اس پلاٹ پر میرا باغ تھا جہاں سیب، ناشپاتی، چیری اور خوبانی سمیت کئی پھل دار درخت تھے۔ میرے لیے وہ باغ آمدنی کا نہیں خوشی کا بڑا ذریعہ تھا۔ میں اکثر ٹریوی اور مرینا سمیت کئی لوگوں کو تازہ پھل بہ طور تحفہ اسے دیا کرتی تھی۔

مرینا کو تازہ پھلوں اور شہد کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑی ادنیٰ سے میرے تحفے لے کر شکر یہ ادا کرتی تھی۔ ویسے وہ پھلوں سے زیادہ شہد کی زینا تھی۔ وہ ہر چیز کے ساتھ شہد استعمال کرے کی عادی تھی۔ مجھے بھی شہد پسند ہے مگر میں اُس کی طرح دیوانی نہیں تھی۔ میرے باغ میں پھلوں کی اچھی ماسی مقدار پیدا ہوتی تھی مگر میں انہیں بیچی نہیں تھی۔ سارا پھل احباب کو بہ طور تحفہ دے دیتی تھی۔

جب خزاں کے ستارے درختوں پر بہار میں نئی کوئلیں ہوتیں، ان پر نور لگتے اور جب وہ پھل میں بدلتے تو جج مجھے دلی مسرت ہوتی تھی۔ میں پھلوں کو ہر روز دیکھا کرتی تھی۔ انہیں بڑھتا دیکھ کر مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ننھے سے ہانک بڑا ہوتا دیکھ رہی ہوں۔

میرا پھلوں کا باغ بچوں کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ طر قبے کے بچے کھیلنے کودتے وہاں آ جاتے، درختوں پر

چڑھتے، پھل توڑتے اور وہیں بیٹھ کر جی بھر کر کھاتے تھے۔ مجھے یہ اچھا لگتا تھا اور کئی دفعہ تو میں خود بھی ان بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی تھی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک مرتبہ مرینا کو اپنی زمین کے سروے کا خیال آیا۔ یہ سروے کاؤنٹی انتظامیہ کرتی ہے، جس کے لیے وہ فیس لیتی ہے۔ جب مرینا نے اپنی جائیداد کے سروے کی درخواست دی تو انہوں نے بھی فیس مانگی، جس پر وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ میں فیس کی رقم میں حصہ ڈالوں۔ ”مگر کس لیے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تم اپنی جائیداد کا سروے کروا رہی ہو، میرا اس سے کیا تعلق جو میں فیس ادا کرنے کے لیے حصہ ڈالوں؟“ مجھے سخت حیرت تھی کہ وہ یہ بات مجھ سے کہنے کیوں آئی ہے۔

”اس لیے کہ مجھے شبہ ہے کہ ہماری زمین کی تقسیم درست نہیں کی گئی تھی۔“ مرینا نے وضاحت پیش کرنا شروع کی۔ ”تمہاری اور میری زمین ساتھ ساتھ ہے اور یہ ہم دونوں کے قائمے میں ہے کہ اپنی اپنی زمین کی حد جان لیں۔“

”مگر مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ یہ سن کر مجھے غصہ آنے لگا۔ ”میں جانتی ہوں کہ جو میری زمین ہے وہ میرے پاس ہے۔ مجھے اس کی از سر نو پیمائش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”ضرورت ہے۔“ اس نے یہ سن کر ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ پیمائش غلط کی گئی تھی جس کی وجہ سے میری کچھ زمین تمہارے اس باغ میں شامل ہو چکی ہے۔“ اس نے کھلی کھڑکی سے باغ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ دوبارہ پیمائش ہوئی تو مجھے وہ زمین مل جائے گی جو اس وقت تمہارے قبضے میں ہے۔“ اس نے جیسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”وہ زمین میری ہے۔ مجھے مل جائے تو میں اپنے لان کو زیادہ بڑا کر سکوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک صاف نظر آرہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔“ اس کی بات سن کر میں طیش میں آ گئی تھی لیکن میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے اگر تم سمجھتی ہو کہ ایسا کچھ ہے تو خود فیس ادا کرو اور پیمائش کروالو۔“ یہ کہہ کر میں نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تمہارا مسئلہ ہے، صرف تمہارا۔“ میں نے نظمیں لہجے میں کہا۔

مجھے یقین ہے کہ جھگڑا تب شروع ہوا جب اس نے یہ حساب کتاب لگانا شروع کیا کہ میرے باغ میں لگے پھل دار درخت کتنے ہیں اور ہر سال موسم میں اُن سے کتنے پھل اترتے ہیں اور ان سے وہ سالانہ کتنی آمدنی حاصل کر سکتی ہے۔

خیر، مرینا کی خواہش کے مطابق سروے ہوا۔ نارنجی جیکٹ اور پیل ہیلٹ میں ملبوس کاؤنٹی کے لینڈ ڈیپارٹمنٹ کے تین چار سرویئر صبح سویرے اپنے آلات کے ساتھ پہنچ چکے تھے۔ وہ پینکٹس اور اپنے نقشے کے مطابق کام میں مصروف تھے۔ اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ کاش ٹریوی فارم کی ساری شہد کی مکھیاں نارنجی جیکٹ والوں پر ٹوٹ پڑیں اور انہیں ڈنک مار مار کر موت کی نیند سلا دیں مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ دوپہر تک اپنا کام نمٹا کر واپس چلے گئے۔

ایک ماہ بعد لینڈ ڈیپارٹمنٹ نے سروے رپورٹ اس کے حوالے کر دی۔ جیسے ہی یہ اسے موصول ہوئی، وہ سیدھی میرے پاس پہنچی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ وہ بہت پرجوش نظر آ رہی تھی۔

”یہ دیکھو“ جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا، اس نے ایک لفافہ میری آنکھوں کے سامنے نکالتے ہوئے کہا۔ ”میرا اندیشہ درست نکلا۔“ یہ کہہ کر اس نے فخریہ انداز سے میری طرف دیکھا۔

”ہوا کیا ہے؟“ میں سمجھ تو گئی تھی مگر پھر بھی استفسار یہ نکالوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری بات غلط تھی، میری زمین کے ایک حصے پر تم قابض ہو۔“ اس کا لہجہ بہت گستاخانہ ہو رہا تھا۔ ”یہ پڑھ لو۔“

ڈیپارٹمنٹ نے تصدیق کر دی ہے۔ اس میں رپورٹ اور نقشہ بھی ہے۔ اچھی طرح اپنی تسلی کر لو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے لفافے سے وہ دونوں چیزیں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔

مرینا کیا کچھ کہہ رہی تھی، مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا مگر جب میں نے رپورٹ پڑھی اور نقشہ نکال کر دیکھا تو میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ نقشے میں ہم دونوں کے پاس موجود زمینوں کی درست اور از سر نو حد بندی کی گئی تھی۔ نقشے کے تحت میری زمین کا وہ حصہ جس پر پھل دار درخت تھے، اس کے حصے میں چلا گیا تھا۔

سروے رپورٹ میں وضاحت کی گئی تھی کہ یہ زمین سو برس قبل میرے پردادا نے خریدی تھی مگر اس وقت سروے محکمہ اتنی ایڈوانس نہیں تھی جس کی وجہ سے یہ غلطی ہوئی۔ ڈیپارٹمنٹ نے وضاحت کی تھی کہ جدید محکمہ کی مدد سے اب سروے کی اس پرانی غلطی کو درست کر لیا گیا ہے۔ میں یہ بات سمجھتی تھی مگر پھر جس طرح وہ لاپرواہی انداز سے سروے سے پہلے ہی میرے باغ کی آمدنی کا اندازہ لگاتی پھر رہی تھی، اس سے شک تھا کہ کچھ نہ کچھ ساز باز ہوئی ہے۔

سروے رپورٹ اور نقشہ اس کے ہاتھ لگنے کی دیر تھی کہ اس نے پورے قہبے میں اس بات کو مشہور کرنا شروع کر دیا۔ وہ لوگوں پر زور دے رہی تھی کہ جلد از مجھ سے باغ کا قبضہ اسے دلوائیں۔

میں عجیب و غریب صورت حال سے دوچار تھی۔ انہی دنوں ایک روز وہ شام کے وقت مجھے سر راہ مل گئی۔ بڑے تپاک سے سلام دعا کے بعد کہنے لگی ”میں بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے میری زمین پر لگے درختوں کی بہت اچھی طرح نگہبانی کی۔ اب جب ان پر پھل لگیں گے تو ان میں سے کچھ تمہیں بھی ضرور دوں گی۔“ میں اس کی بات سن کر دانت پیس کر رہ گئی۔ وہ درخت میرے دادا نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے۔ میرے باپ نے عمر بھر ان کی دیکھ بھال کی اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کتنی آڑی ترچھی لکیروں کی بنیاد پر اب وہ اس کی مالک بن بیٹھی ہے اور کتنی ڈھٹائی سے مجھے میرے ہی درختوں کا پھل کھلانے کا وعدہ کر رہی تھی۔

میرے درخت، میرا باغ لینڈ ڈیپارٹمنٹ کے نئے نقشے کے بعد بہت زیادہ دنوں تک میرا نہیں رہا۔ اس نے کاؤنٹی پولیس میں درخواست دی اور مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس پر قبضہ جمالیا۔ اس نے باغ کے گرد بہت اونچی باڑھ بنوا دی تاکہ کوئی بچہ یا بڑا اندر آ کر پھل نہ توڑ سکے۔ بہت جلد پھلوں کا موسم آ گیا۔ اس نے سارے پھل اتروائے اور دریا پار والے آڑھتی کوچ کر نوٹ کھرے کر لیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب سے باغ اس کے قبضے میں گیا تھا، اس نے ایک بار بھی مجھے پھل نہیں دیے تھے۔

☆☆☆

میرے باغ کو ہتھیائے گئے کئی موسم بیت گئے مگر اب بھی باغ کے ان پھل دار درختوں سے میری انسیت برقرار تھی۔ جب تک وہ میرے تھے، بالکل آزاد تھے۔ ان کے گرد کوئی باڑھ نہ تھی۔ بچے آزادانہ طور پر وہاں آ کر کھلے کودتے تھے مگر اب تو اس بات کو بہت عرصہ ہو گیا۔ صبح ۱۱ شام کا زیادہ تر وقت میں بچن میں گزارتی تھی۔ جس کی کھڑکی سے میرا باغ صاف نظر آتا تھا۔ میں اسے حسرت سے جھٹی رہا کرتی تھی۔ یہ میرا اور درختوں کا وہ جذباتی رشتہ تھا۔ مرینا چاہے کچھ بھی کر لے، اس رشتے کو ختم نہیں کر سکتی تھی۔

اس صبح بھی گھر کا داخلی دروازہ عام دنوں کی طرح کھلا تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر ڈائنگ ٹیبل پر کھینیاں لگا کر کافی پی رہی تھی۔ بچن کی کھڑکی کھلی تھی۔ میری نگاہیں درختوں پر جمیں کہ اسی دوران ٹریوی آ گیا۔ وہ میرے لیے اپنے قاتل

تارہ شہد لے کر آیا تھا۔ مجھے اس کا آنا برا نہیں لگا مگر اس وقت میرا دل اس سے باتیں کرنے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

”ہائے سزا آ رہی ہے۔“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے احترام سے کہا۔ ”کیا حال ہیں اور مرینا کے باغ کا کیا حال ہے؟ ویسے کیا کر رہی ہے وہ؟“ اس نے میز پر شہد کے دو ٹھونڈے مرتبان رکھتے ہوئے شرارت سے کہا۔

”شاید اب وہ تمہارے فارم سے شہد چرانے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مذاق کر رہی تھی۔“ میں نے اس کی حیرانی دور کرنے کے لیے وضاحت کی۔ ”ویسے اس بار میرے لیے تم کیا لے کر آئے ہو؟“ میں نے انجان بنے ہوئے پوچھا، حالانکہ جانتی تھی کہ وہ ہر بار صرف شہد ہی لے کر آتا ہے۔

”شہد۔“ اس نے پوری جتنی نکال کر بڑے جوش سے جواب دیا۔ ”آج ہی چھتے سے نکالا ہے۔“

”اے ستوا!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ سر جھکائے صاف کر رہا تھا۔

”جی سزا آ رہی ہے۔“

”کیا تم اب بھی مرینا کے لیے شہد لے کر جاتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے کچھ پتا نہیں ہے۔“ اس نے استفسار یہ نکالوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے فارم کا شہد بہت اچھا ہوتا ہے۔“

”میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا ورنہ مجھے کیا۔“

”اسے تو ہمارا شہد بہت پسند ہے۔ سزا آ رہی ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ وہ شہد کی کتنی دیوانی ہے۔ ہر چیز میں شہد ملا کر لہاتی ہے۔“

”اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسے بھی اور تمہارے شہد کو بھی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”بس... بہت کر لی تم نے اپنے لہلی تعریف۔ اب چپ ہو جاؤ۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد رہا ہے۔“ میں نے ویسے ہی پیشانی کو دباتے ہوئے کہا۔

”اگر یہ ہے کہ اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کا سن نہیں رہا تھا۔“

”پتا ہے سزا آ رہی ہے، مرینا باغ کے قریب اور اونچی لگوا رہی ہے؟“

”کیا۔“ یہ سن کر میں چونک گئی۔ ”مگر کیوں؟ باڑھ تو سے ہی لگی ہوئی ہے۔“

”پایا بتا رہا ہے۔“ اسے کہہ دو روز پہلے کوئی آدمی اس کے باغ سے خوبانی توڑ رہا تھا کہ مرینا نے اسے پکڑ لیا۔“ اس نے سادگی سے وجہ بتائی۔ ”ہو سکتا ہے اسی لیے مزید اونچی باڑھ لگوا رہی ہو۔“

”کرنے دو اسے جو کر رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اب تم بھی چلو، مجھے آرام کرنا ہے۔“

ٹریوی نے درست کہا تھا۔ چند روز کے اندر اندر اس نے نہایت بھدے انداز کی بہت اونچی باڑھ لگوا دی تھی، درختوں کے اطراف وہ باڑھ اتنی بے ڈھب اور پرانے انداز کی تھی کہ میں نے بچن کی کھڑکی ہی بند رکھنا شروع کر دی مگر کب تک میں بچن کی کھڑکی بند رکھتی۔ آخر میں نے اس کا حل نکال لیا۔ باڑھ کے دوسرے طرف میری زمین تھی۔ میں نے اپنے حصے پر باڑھ کے ساتھ ساتھ ایک قطار کی صورت پودے لگانا شروع کر دیے، تاکہ بد صورت باڑھ میری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ ان میں کچھ پھل دار درخت بھی تھے مگر وہ بہت سست رو تھے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں کبھی ان کا پھل چکھ پاؤں گی۔ البتہ یہ یقین تھا کہ میرے مرنے کے بعد ہی کسی، یہاں کسی کو پھل توڑتے ہوئے کوئی چور کہہ کر پکڑے گا نہیں۔

مجھے باغبانی کا بہت شوق ہے۔ میری اسٹڈی میں اس موضوع پر کئی کتابیں ہیں۔ انہی دنوں جب میں بد صورت باڑھ کو چھپانے کے لیے پودے لگا رہی تھی، ایک دن ایک کتاب میرے ہاتھ لگی۔ وہ نیوزی لینڈ کے مقامی پودوں، ان کے کیمیائی خواص اور اثرات کے بارے میں تھی۔ میں یہ کتاب بھول ہی چکی تھی، فوراً اسے دوسری کتابوں سے الگ کر کے پڑھنے والی میز پر رکھ دیا۔

رات کو ڈنر سے فارغ ہو کر میں بیڈ پر بیٹھی وہ کتاب پڑھ رہی تھی۔ رنگین تصویروں والی کتاب مجھے بہت اچھی لگی۔ اچانک یہ کتاب مجھے اور بھی زیادہ اچھی لگنے لگی۔ اس میں ایک پودے کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا گیا تھا۔ یہ پودا ٹوٹو تھا اور صرف نیوزی لینڈ میں ہی پایا جاتا تھا۔ اس کے کیمیائی خواص پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ پودے باڑھ کے ساتھ لگاؤں۔ ان کے اثرات میرے موڈ کو خوشگوار بنا سکتے تھے۔ اس کی ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ یہ پودا خاصا موٹا ہوتا ہے اور بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔ اس میں بہت خوبصورت بڑے بڑے پھول لگتے ہیں، جن کے بیج میں اس پودے کے ننھے ننھے بے شمار بیج ہوتے ہیں، بالکل سورج مکھی کے پھول میں رہنے والے بیجوں کی طرح۔ مجھے یقین تھا کہ یہ

روز میں وہ پودے پھولوں سے لہ گئے۔ میری محنت رنگ
لا رہی تھی۔

”سنوٹریوی...“ اُس روز وہ میرے ساتھ پودوں کی
دیکھ بھال میں مصروف تھا۔

”جی مسز آر تھر۔“ اس نے کھربلی چلاتے ہوئے کہا۔
”میں چاہتی ہوں کہ یہاں پر ایک چھوٹا سا کٹڑی کا ڈبا
رکھ لوں اور شہد کی مکھیاں پالوں۔“ میں نے بڑے اشتیاق
سے کہا۔ ”تم مجھے شہد کی مکھیاں اور ڈبا لا دو، دیکھو نا یہاں کتنی
بڑی جگہ خالی ہے اور اب تو یہ پھول پودے بھی ہیں۔“

”واہ... یہ تو بہت اچھا خیال ہے۔“ وہ خوشی سے چپکا۔
”مجھے شہد نہیں چاہیے بلکہ کچھ روٹی ہو جائے گی۔“

”میرے پاپا نے مختلف سائز کے ڈبے بنا رکھے ہیں،
آج ہی ان سے پوچھ کر ایک ڈبا اور اس کے حساب سے شہد
کی مکھیاں لے آؤں گا۔“ وہ پوری طرح میری خوشی میں
شریک ہونے کو تیار تھا۔ ”ابھی جا کر لے آؤں؟“ اس نے
سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

”ذرا گوڈی مکمل کر لو، پھر جا کر لے آنا۔“
”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کام میں لگ گیا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب ٹریوی ڈبا اور مکھیاں لے آیا۔ شہد
فارمنگ کے بارے میں میری معلومات اتنی تھیں کہ چاہتی تو
اپنا فارم کھول سکتی تھی۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ اب میں اپنی
پسند کا خالص اور خاص شہد جلد ہی حاصل کر لوں گی۔

شہد فارمنگ کے لیے چھوٹا سا ڈبا کیا لگا کہ میری
معروفیت بھی بڑھ گئی۔ میں دن بھر شہد کی مکھیوں کو ٹوٹو پودوں
کے ریلے پھولوں کا رس پختہ دیکھتی تھی۔ ویسے بھی ٹوٹو پر
اتنے پھول کھلے تھے کہ مکھیوں کو رس پختہ کے لیے ادھر
اُدھر جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ دیکھ کر میں بہت
خوش ہوتی تھی مگر جب بھی باڑھ میں قید میرے پیارے
درختوں پر نظر پڑتی تو کلیجہ کھٹکتا تھا۔

جب سے بہار کا موسم آیا تھا تب سے میں روزانہ
دیکھتی تھی کہ مرینا دن کے مختلف اوقات میں پھل دار درختوں
کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ وہ اکثر سر اٹھا اٹھا کر درختوں کو
دیکھتی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ ابھی سے یہ منصوبہ بنا رہی ہے کہ
کتنا پھل اترے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے موسم گرما میں
تیار ہونے والے پھلوں کی آمدنی کا ابھی سے پکا حساب
کتاب لکھ کر رکھا ہوگا۔ خیر، مجھے سے تو اس نے میری ساری
خوشیاں ہی لوٹ لی تھیں۔ وہ جانتی تھی تاکہ میں بوڑھی عورت
ہوں، اس کا کیا بازو لوں گی۔ وہ ایسا سوچتی تھی تو بہ ظاہر ٹھیک

پھول اچھا شہد بنانے میں بہت مدد دیں گے۔

پودے کے خواص کو تفصیل سے پڑھنے کے بعد مجھے
یقین تھا کہ انہیں باڑھ کے ساتھ لگاؤں تو وہ بہت جلد بڑے
ہو کر نہ صرف کٹڑی کی بد نما ادنیٰ باڑھ کی بد صورتی کو میری
نظروں سے ادھم کر سکتے ہیں بلکہ ان پر شہد کی مکھیاں بھی آکر
بیٹھیں گی۔ ویسے بھی مجھے بچپن سے ہی شہد کی مکھیوں کی
بھینھناہٹ بہت اچھی لگتی تھی۔ دوسرے ہی دن میں نے کافی
بڑی تعداد میں ٹوٹو پودے کی فراہمی کا آرڈر دے دیا۔ بہت
جلد وہ پودے آ گئے۔ میں نے ٹریوی سے مدد لی۔ اُس نے
گڑھے کھودے اور میں نے باڑھ کے ساتھ ساتھ پودے
لگا دیے۔ وہ موسم بہار کے دن تھے۔ پودوں کے لیے فضا بھی
سازگار تھی۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی ان پر بڑے بڑے دلکش
پھول کھل اٹھیں گے۔ اب مجھے بے چینی سے ان کے بڑے
ہونے اور پھولوں کے کھلنے کا انتظار تھا۔

پودے بڑے ہونے لگے تھے۔ اب میں کچن میں بیٹھ
کر کٹڑی سے انہیں دیکھا کرتی تھی۔ یہ منظر آنکھوں کو بھی بھلا
لگتا تھا۔ اب مجھے وقت گزاری اور اپنے درختوں کے چھن
جانے کا غم بھلانے کا ایک ذریعہ مل گیا تھا۔ میں انہیں
باقاعدگی سے پانی اور کھاد دیتی تھی۔ دیکھ بھال کرتی اور شام کو
ان پودوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی بھی کرتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ بہار میں لگے پودے موسم گرما میں
خامیے بڑے ہو گئے تھے۔ اب یہ موسم بھی تقریباً اپنے
اعتماد پر تھا۔ کھلی فضا میں صبح اور شام کو فتنی محسوس ہونے لگی
تھی۔ خزاں آرہی تھی۔ اُس روز میں اپنے درختوں کو قریب
سے دیکھنے اور محسوس کرنے کی چاہ میں مرینا کے گھر کے
سامنے چہل قدمی کر رہی تھی۔ میری نظر درختوں پر تھی۔ پتے
جھڑ چکے تھے اور وہ ٹنڈ ٹنڈ کھڑے تھے۔ ان کے پھل تو وہ
بہت پہلے ہی اتار کر بیچ چکی تھی۔

اُس بار موسم سرما بہت شدید تھا۔ دسمبر کے آخر سے
جنوری کے وسط تک، ہر روز ہی برف پڑتی تھی۔ کہیں کہیں تو
دس دس فٹ برف کی تہ جم چکی تھی۔ میں اپنے پودوں پر سے
روزانہ برف صاف کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے ٹوٹو کے پودے
بڑے سخت جان اور سدا بہار تھے۔ اس برف باری میں انہیں
کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش تھی۔ پودے جوان
ہو چکے تھے اور اب موسم بہار میں ان پر بڑے بڑے سفید
پھول کھلنے لگے۔

موسم بہار کا پہلا ہفتہ تھا جب ٹوٹو کا پہلا پھول کھلا۔ سب
پودے مکھیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند

سوچتی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ یہ رائے قائم کرتے ہوئے اس سے کہیں پر کچھ بھول ضرور ہوئی ہوگی، جسے وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی تو بھی یاد نہ کر پاتی۔ لالچ کی مٹی آنکھوں پر بندھی ہو تو عقل پر خود بخود پردے پڑ جاتے ہیں۔

وہ موسم بہار کے آخری دن تھے۔ ٹوٹو کے سدا بہار پودوں پر بڑے بڑے سفید پھول اتنی بڑی تعداد میں لگے تھے کہ کم و بیش انہوں نے ان پودوں کا اوپری حصہ مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔ دن بھر ان پھولوں پر شہد کی کھیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ ڈبے میں شہد کے کئی چھتے بننا شروع ہو گئے تھے اور ہر روز وہ بڑے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس دن مجھے گھر کا کچھ سامان خریدنے اور بینک سے پیسے نکلوانے کے لیے جانا تھا۔ بازار گئی تو مجھے کئی جگہوں پر بیچے ملے۔ وہ سب مجھے جانتے تھے۔

”گڈ مارننگ سزا آ رہی۔“ ننھے پوائے اسکاؤٹ ہیری نے بڑے احترام سے میرے سامنے آ کر کہا۔

”سنو...“ میں نے پیار سے کہا۔ ”میں نے سزا مرینا کو اپنے باغ کا انچارج بنا دیا ہے۔ پھل لگنے لگے ہیں۔ اب جب تمہیں پھل چاہیے ہوں تو اس سے جا کر کہنا۔“

”شکر یہ سزا آ رہی۔“ اس نے خوش دلی سے کہا اور چلا گیا۔ میں مسکراتے ہوئے بینک کی طرف بڑھ گئی۔

اُس روز مجھے راتے میں جتنے جاننے والے ملے، میں نے سب سے یہی بات کی۔ ویسے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

وہ پھل دار درخت جب تک میرے تھے، تب تک میں ہر موسم بہار میں اپنی جان پہچان والوں کو یہی دعوت دیتی تھی۔

دیے تھے میں کتنی کے ہی چند لوگ تھے جو جانتے تھے کہ اب وہ باغ میری ملکیت نہیں رہا ہے۔ اس لیے سب نے میری بات پر یقین کر لیا۔

مجھے موسم گرما پہلے نہیں مگر اب اچھا لگنے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سردیوں میں میری بوڑھی ہڈیاں بہت تکلیف دیتی تھیں مگر گرمیوں میں بالکل صحت مند رہتی تھیں۔ ویسے بھی وہ موسم گرما بہت خوش گوار تھا۔

وہ اگست کا مہینا تھا۔ درختوں پر پھل پک چکے تھے۔

ادھر میں بھی شہد کے ڈبے سے کئی چھتے اتار کر تین درمیانے درجے کے مرتبان بھر چکی تھی۔ وہ سب میرے بچن کی الماری میں تھے۔ اب بھی ٹریوی میرے اور مرینا کے لیے

شہد لے کر آتا تھا۔ وہ ہم دونوں کے لیے ایک ساتھ ہی شہد کی بوتلیں لاتا تھا۔ پہلے مجھے دیتا، اس کے بعد مرینا کی طرف جاتا تھا۔ اب جب بھی وہ شہد لے کر آتا، میں اسے کسی نہ کسی کام

میں لگا دیتی تھی۔ اکثر اس کے ذمے پودوں کی صفائی، کھاد اور پانی دینے کا کام ہوتا تھا۔ اسے بھی باغبانی کا بہت شوق تھا۔ وہ بڑے مزے سے کام کرتا رہتا اور میں بچن میں بیٹھ کر اسے دیکھا کرتی تھی۔ اس دوران مرینا کے لیے اس کی لالچی ہوئی شہد کی بوتلیں میری نگاہوں کے سامنے ہوتی تھیں۔

ایک دن ٹریوی آیا اور پودوں کی صفائی ستمی کرنے کے بعد شہد دینے مرینا کے گھر چلا گیا۔ میں بچن میں بیٹھی تھی۔

باغ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ کچھ لوگ درختوں پر چڑھ کر پھل اتار رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ دریا پار سے آئے

پھلوں کے بیوپاری کے کارندے ہی ہوں گے جو اس علاقے کے تازہ پھلوں کو خرید کر، بہترین پیکنگ میں پیک کر کے نیوزی لینڈ کے مختلف شہروں کی منڈیوں میں بیچتے

تھے۔ اسی دوران ڈورنیل بھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا، سامنے مرینا کھڑی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

”خیریت؟“ میں نے اسے دیکھتے ہی سپاٹ لہجے میں کہا۔

”یہ تم نے لوگوں سے کیا بکواس کی ہے؟“ اس نے بڑی رکھائی سے بولنا شروع کیا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ تم نے مجھے اپنے باغ کا انچارج بنا دیا ہے۔“

اس نے برہمی سے کہنا شروع کیا۔ ”اب جس بھی مفت خورے کو مفت میں پھل چاہئیں، وہاں جا کر مجھ سے مانت لے یا خود توڑ لے۔“

”میرے خیال میں، اس میں تو کوئی بڑی بات نہیں کہ تم کسی کو دو چار پھل دے دو۔“ وہ کینہ توڑنگا ہوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

”یہ تو میں نے اس لیے کہا تھا کہ تم بھی لوگوں کو پھل کا تحفہ دے کر خوش ہوگی میری طرح، اسی لیے...“

”مجھے مفت میں مال اڑا کر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔“ اس نے میری بات پوری نہ ہونے دی اور بھنائے ہوئے لہجے میں چلاتے ہوئے کہا۔

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ میں نے سکون سے جواب دیا۔

”یہ بڑی پرانی روایت ہے۔ میں نے کبھی ان درختوں کے پھل نہیں بیچے مگر تم نے پچھلے سال پہلی بار انہیں فروخت کیا اور کسی کو بھی انہیں چکھنے نہیں دیا۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔“

”ہوگی مگر تمہارے لیے، میرے لیے نہیں۔“ وہ چلا اٹھی۔ ”تم جو کرتی تھیں، ضروری نہیں کہ میں بھی وہی کروں۔“

اب وہ درخت میری ملکیت ہیں، ان کا پھل میرا ہے اور وہ میں بیچوں گی۔ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں ایک غریب

بیوہ عورت ہوں۔“ اس نے معصوم بن کر غربت کے پردے میں اپنی لالچ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پلیز مرینا...“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”لوگوں میں پھل بانٹنے سے تم مزید غریب نہیں ہو جاؤ گی۔“

”اپنی بکواس بند کرو۔“ وہ ایسے چلائی جیسے ابھی مجھ پر حملہ کر دے گی۔

”لوگوں کو مفت میں میرے باغ سے پھل لینے کی دعوت دینا بند کر دو ورنہ میں پولیس میں تمہارے خلاف شکایت درج کروا دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے شعلے اور منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

”اوکے۔“ میں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

اسے سخت غصے میں دیکھ کر مجھے روحانی تسکین مل رہی تھی۔

”ویسے یہ کام تم بھی کر سکتی ہو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں میں یہ کر سکتی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر چلائی۔

اس کی باتیں سن کر میں دل میں بہت خوش تھی۔ اسے شدید غصہ آ رہا تھا مگر میں اس کی سنی ان سنی کر کے اپنے ٹوٹو کے سفید پھولوں کو دیکھتی اور مسکراتی رہی۔ سفید سفید پھولوں پر گہری اور زرد آڑی دھاریوں والی شہد کی کھیاں ٹڈی ڈل

کی طرح چھائی ہوئی، ان کا رس پھونسنے میں مصروف تھیں۔

”میرا خاص شہد...“ میں نے خود کھای کی اور باغ کی طرف دیکھنے لگی۔

مجھے یقین تھا کہ میری یہ حرکت اسے اور طیش دلا دے گی۔

”کیا بکواس ہے۔“ وہ تیزی سے مڑی اور غصے میں بڑبڑاتے ہوئے واپس چل دی۔ یہ مرینا سے میری آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد میں نے پھر بھی اسے زندہ نہیں دیکھا۔ ویسے بھی مجھے اس سے ملنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

مجھے تو لالچی لوگوں سے دیے ہی بچپن سے سخت نفرت تھی۔

مرینا کے میرے ہاں آنے کے دو دن بعد کا ذکر ہے۔

صبح کا وقت تھا۔ میں اپنے پودوں کے پاس ٹہل رہی تھیں۔ فضا میں خاموشی تھی۔ صرف شہد کی کھیاں کی جھنجھٹ سنائی دے رہی تھی جو کسی عمدہ موسیقی سے بھی زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

میں اپنی ہی دھن میں مگن تھی کہ ٹریوی آ گیا۔ وہ ہاتھ میں شہد کی دو بوتلیں پکڑے ہوئے تھا۔

”گڈ مارننگ سزا آ رہی۔“

”گڈ مارننگ۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”یہ دونوں میرے لیے ہیں؟“ میں نے اس کے ہاتھ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یقیناً...“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ”لیکن صرف ایک، دوسری آپ کے باغ کی انچارج کے لیے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ مجھے دو۔ میں بچن میں جا کر اپنے لیے کافی اور تمہارے لیے ڈونٹ بناتی ہوں، تب تک تم انہیں کھاؤ اور پانی دے دو۔“

”ابھی کرو دیتا ہوں یہ کام۔“ اس نے مستعدی سے کہا اور شہد کی دونوں بوتلیں مجھے تھما دیں۔

مجھے یقین تھا کہ اب وہ گھٹنا بھر کے لیے مصروف ہو گیا۔

”لگتا ہے تمہیں کو یہ پھول بہت پسند ہے۔“ اس نے پانی کا ڈول اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں... مجھے بھی پسند ہے۔“

”دیکھو نا، سارے پھولوں کو انہوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔ ”بہت سارا شہد بنارہی ہوں گی۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بوتلیں لیے ہوئے بچن میں چلی آئی۔ ٹریوی کے آنے سے ایک ساتھ کئی کام نکل آئے تھے۔

جب تک وہ یہاں تھا، مجھے نہایت سکون سے کافی اور ڈونٹ بنانے کے علاوہ ایک اور کام بھی کرنا تھا۔

”سنا ہے مرینا تم سے لڑ کر گئی ہے؟“ اس نے کام نمٹالیا تھا اور اب بچن میں میرے سامنے بیٹھا ڈونٹ کھا رہا تھا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ مجھ سے کیوں لڑ کر گئی ہوگی؟“ میں نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا اس سے سوال کر دیا۔

”کچھ اندازہ نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگا۔

”ہو سکتا ہے کہ وہی درختوں والا...“

”سچ بٹاؤ، تمہیں کیسے پتا چلا اس لڑائی کے بارے میں؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”وہ میں...“ وہ کچھ کہتے ہوئے اٹکا۔

”بتاؤ، شاباش... اچھے بچے جھوٹ نہیں بولتے۔“

”وہ دو تین دن پہلے جب لڑنے آئی تھی، تب میں سائیکل پر یہاں سے گزر رہا تھا۔ اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر میں آگیا اور اُدھر چپ کر ساری باتیں سن لی تھیں۔“ اس نے نظریں نیچی کر کے شرمندہ لہجے میں کہا۔

”اوہ شرارتی بچہ!“ میں نے پیار سے اس کے کان مروڑے۔

ویسے اگر... کوئی اور بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ لوگوں کو تو دو لوگوں کی لڑائی میں مزہ آتا ہے اور پھر لڑنے والی دونوں بڑھیا ہوں تو لوگوں کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے۔

”پتا ہے ٹریوی، وہ ذرا سی پاگل ہے۔ اس کے دماغ کے کچھ اسکرڈ ڈھیلے ہیں۔“ میں نے پیشی پر انگلی رکھ کر چیخ کس کی طرح گھماتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

”سچ...“ اس نے حیرت سے کہا۔

”وہ دماغی مریض ہے۔ اس کا میڈیکل پرابلم ہے۔“

”اچھا...“ اس کا لہجہ اور چہرہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

”مجھے نہیں پتا تھی یہ بات۔“ اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

”یہ بات سب کو بتا دو کہ اس سے دور رہا کریں ورنہ پتا

نہیں وہ کب کس سے لڑنے لگے۔“

”میں سب دوستوں کو بتا دوں گا۔“ یہ سنتے ہی اس نے

تیزی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے

ایسے لوگوں سے۔“

”تم مت ڈرو اس سے۔“ میں نے فوراً اس کی ہمت

بندھا لی۔ ”وہ صرف ان لوگوں سے لڑتی ہے جو مفت میں اس

سے کچھ لینا چاہیں مگر تم تو اسے مفت میں اتنا سارا شہد دیتے

ہو۔ اس کے گھٹنے ہی کام کر دیتے ہو۔ وہ تم سے تو ہرگز نہیں

لڑے گی، تم سے تو وہ خوش ہوتی ہوگی۔“

”اچھا...“ وہ بہ دستور حیرت زدہ تھا۔

”اور نہیں تو کیا۔ جایا کرو اس کے پاس شہد لے کر۔“

میں نے سامنے رکھی مریٹا کے حصے کی شہد کی بوتل کو دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”تھیں پتا ہے نا کہ اس بے چاری کو شہد کتنا پسند

ہے۔ اب تم اسے شہد نہیں دو گے تو کون دے گا۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ڈونٹ ختم

کر کے اس نے بوتل اٹھائی۔

”بائے سزا آر تھر، میں جا رہا ہوں آپ کی پاگل پڑوس

کے ہاں۔“ اس نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا اور چلا گیا۔

مجھے ڈر تھا کہ مریٹا کے پاگل پن کے بارے میں سن کر

کہیں وہ بہت زیادہ نہ ڈر گیا ہو اور شہد اس کے ہاں لے

جانے کے بجائے کہیں باہر زمین پر آڈیل کر نہ چل دے

یا اُسے دیے بنا اپنے گھر نہ لوٹ جائے۔ اسی لیے میں بھی اس

کے پیچھے پیچھے اٹھی اور باہر چل دی۔ وہ مریٹا کی طرف ہی

جار ہا تھا۔ جب وہ اس کے کیاؤنڈ میں داخل ہو گیا تو میں

مسکراتے ہوئے واپس پن میں آ گئی۔

ادو مریٹا... تم اور تمہارا شہد۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے

ہوئے کہا۔

گئے دنوں میں جب ہم اچھے مسائے تھے، تب وہ کبھی

کبھار سہ پہر کی چائے پر مجھے بلا لیتی تھی اور بڑے چاؤ سے

قبوے میں شہد ملائی اور پھر کیک پر شہد لگا کر مجھے پیش کرتی

تھی۔ بہت ہو کا تھا اسے شہد کی مناس کا۔ اس کا بس چلتا تو

کھانے کی ہر چیز پر شہد لگا کر کھاتی مگر افسوس کہ نمک مرچ

لگے گوشت پر شہد لگا کر کھانے سے بالکل مزہ نہیں آتا ہوگا۔

ایسا میں نے تو کبھی نہیں کیا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ اُس نے یہ

تجربہ اپنی زندگی میں کبھی ایک بار تو ضرور کیا ہوگا۔

وہ چاہتی تو لمبی عمر اور صحت مند زندگی جیتی مگر شاید وہ

خوشی کے لفظ سے نا آشنا تھی۔ شہد اور دولت دیکھ کر اس کی

آنکھیں ایک جیسے حریصانہ انداز میں چمک اٹھتی تھیں۔ یہی

وجہ ہوگی کہ اسے دماغی مرض لاحق ہوا اور اس کے بعد اس

نے اپنی ہوس کی بھوک مٹانے کے لیے میرے باغ پر

غاصبانہ قبضہ کر لیا۔

درخت پوری طرح پھلوں سے خالی ہو گئے تھے۔ خزاں

کی آمد میں چند روز باقی تھے۔ انہی دنوں ہیلوین کا تہوار

آ گیا۔ میری بچوں سے بڑی دوستی تھی۔ میں جانتی تھی کہ رات

کے اندھیرے میں بچے ڈراؤنا بہرہ روپ بنا کر مجھے ڈرانے کے

لیے ضرور آئیں گے۔ وہ ہر سال ایسا کرتے تھے۔

وہ رات ہیلوین کی رات تھی۔ ڈورنٹیل بھی، میں جانتی

تھی کہ بچے ہوں گے مگر پھر بھی میں نے بند دروازے کے

پیچھے سے پوچھا کون ہے، مگر جواب نہیں ملا۔ میں نے کنڈی

کھولی۔ جیسے ہی دروازے کا پٹ کھلا پانچ چھ بچے بھوتوں کا

روپ دھارے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔ میں نے

ڈرنے کی اداکاری کی اور ایک زوردار چیخ ماری۔ میرے

چینٹنے ہی انہوں نے ماسک اتار دیے اور ہنسنے لگے۔

میں نے سب بچوں کو ایک ایک چاکلیٹ اور کچھ میسے

دیے۔ یہ چاکلیٹ میں کچھ روز پہلے اسی مقصد کے لیے خرید کر

لائی تھی۔ بچے خوشی خوشی مڑے اور کہنے لگے۔ ”ہم مسز مریٹا

کے گھر جا رہے ہیں۔“

”ارے نہیں، مت جاؤ وہ سو رہی ہوگی۔“

”یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔“ ٹریوی نے کہا۔ وہ بھی

ان کے ساتھ تھا۔

”اگر وہ تم لوگوں کو اس روپ میں دیکھ کر ڈر گئی تو...“

”اسی لیے تو جا رہے ہیں۔“ وہ باہر نکلتے ہوئے ایک

زباں ہو کر بولے۔

میں نے بچوں کو دہاں جانے سے روکنے کی سنجیدہ کوشش

کی تھی۔ وہ دماغی مریض ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بے دھیانی

میں دروازہ کھولنے پر وہ اس طرح کے بھوت دیکھتی تو دماغ

کو جھٹکا لگ سکتا تھا۔

ہیلوین کی اُس رات کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں

نے پردہ اٹھا کر کھڑکی سے جھانکا، اس کے پن کی لائٹ غیر

معمولی طور پر روشن تھی۔ میں انہی اور اس کے ہاں چل دی۔

میں نے ڈورنٹیل بجائی مگر کافی دیر تک جواب نہ ملا تو میں نے

دروازے کو اندر کی طرف ہلکا سا دھکیلا، وہ کھل گیا۔ میں پن

میں داخل ہوئی اور جو کچھ دیکھا، میرے لیے وہ غیر متوقع نہیں

تھا۔ ایسا کبھی نہ بھی ہوتا ہی تھا۔ آخر کو اسے پہلے بھی دماغ کا

دورہ پڑ چکا تھا۔ میرے لیوں پر ہلکی سے مسکراہٹ دوڑ گئی

البتہ دل میں دکھ کا احساس بھی تھا۔ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا

مگر جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں وہ خود ہی تھی۔

مریٹا پن کے فرش پر آڑی ترچھی بے شدہ پڑی تھی۔

میز پر شہد کا بڑا سا مرتبان اونگھا ہوا تھا جس سے نکلنے والا

شہد فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ شہد کی دعوت اڑانے کے لیے چیونٹیاں

پینچ چکی تھیں۔ جتنی چیونٹیاں وہاں تھیں، انہیں دیکھ کر مجھے یہ

سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ اس حالت میں اسے کم از کم گھٹنا

دو گھنٹے گزر چکے ہوں گے۔ میں جھک کر گھٹنوں کے بل فرش پر

بیٹھ گئی۔ اس کی شہد رگ اور ہاتھ کی نبض دیکھی۔ وہ زندہ تھی مگر

نبض بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں نے اس کے دل پر

ہاتھ رکھا۔ دھڑکنیں بھی کم اور خامسے وقفے کے ساتھ گئیں۔

میں اٹھی اور فون اٹھا کر اسپتال کا نمبر ملائے گی۔ چاہتی

تو پلٹ کر واپس گھر جا سکتی تھی مگر اسے اب طبی امداد کی اشد

ضرورت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی جو حالت ہے، اب

اسے یونہی بے شدہ اسپتال میں پڑے رہنا ہوگا۔ پہلے بھی تو

اسے دماغ کا دورہ پڑا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر بار انسان اتنا

خوش نصیب ہو کہ صحت یاب ہو کر گھر لوٹ آئے۔

ایسوی لینس تھوڑی ہی دیر میں پہنچ گئی۔ جیسے ہی وہ اسے

لے کر چلے، میں نے بھی پن کی لائٹ بند کی اور اپنے گھر

لوٹ آئی۔ وہ خنک رات تھی، میں آرام دہ بستر میں لیٹی ہوئی

تھی لیکن وہ کہ میرے دماغ میں مریٹا اور اپنے باغ کا

خیال آ رہا تھا۔ آخری بار جب وہ مجھ سے لڑنے کے لیے آئی

تھی تو کہہ رہی تھی کہ یہ باغ میرے بڑے بڑے کا سہارا ہے مگر

افسوس کہ وہ مجھ سے میرا باغ بھتیا کر صرف دو موسم کے پھل

ہی اتار کر چند میسے کھا سکی تھی۔

صبح میں خاصی دیر سے انہی اور ناشتے سے فارغ ہو کر

اسپتال پہنچی۔ اسے آئی سی یو میں رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا

تھا کہ اسے اچانک کسی خوف کے باعث دماغی دورہ پڑا اور وہ

کوما میں چلی گئی۔ اس کی حالت شدید خطرے میں تھی۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اگر بروقت اسپتال پہنچا دیا جاتا تو شاید

اس کی جان بچ سکتی تھی مگر وہ دورہ پڑنے کے بعد کئی گھنٹے بغیر

کسی طبی امداد کے پڑی رہی جس کی وجہ سے اب اس کی جان

بچنے کا امکان بہت کم ہو گیا تھا۔ میں نے شیشے کی کھڑکی سے

اندر جھانکا۔ اس کے منہ سے اسکیجن کی تالی لگی ہوئی تھی۔ اس

کی دماغی حالت معلوم کرنے کے لیے کئی تاروں کے سرے

اس کے سر سے جڑے ہوئے تھے۔ وہ نیم مردہ نظر آرہی تھی۔

میں نے کچھ دیر اسے دیکھا اور پھر افسردگی سے پلٹ آئی۔

وہ کئی روز تک اسپتال میں رہی۔ میں دو تین بار اسے

دیکھنے کے لیے گئی مگر وہ بہ دستور کوما میں تھی۔ ڈاکٹر اس کی

زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے، بس موہوم امید کے

سہارے علاج کر رہے تھے۔۔۔۔۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا

مگر دماغ رفتہ رفتہ موت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

میں پاشا کر رہی تھی کہ ٹریوی آ گیا۔ اس کی سانسیں

پھولی ہوئی تھی۔ ”مسز آر تھر، مسز آر تھر۔“ وہ باہر سے ہی

چلاتا ہوا آ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، میں نے پوچھا۔

مجھے حیرت تھی کہ وہ یوں چلاتا ہوا کیوں آیا ہے۔

”مسز مریٹا، مسز مریٹا...“ اس کی سانسیں پھول رہی

تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”ان کا انتقال ہو گیا آج صبح۔“ اس نے اکتاتے ہوئے

بتایا۔

”ادو میرے خدا۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں نے سینے پر کر اس کا نشان بنا کر آنکھیں موند لیں۔ ”ایسا

تو ہونا ہی تھا۔“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور جب آنکھیں

کھولیں تو ٹریوی جا چکا تھا۔

میں کل رات ہی یہ سوچ کر سوئی تھی کہ آج صبح گھر کی

پرانی دستاویز میں اپنی زمین کی الاٹمنٹ کی وہ دستاویز تلاش

کروں گی جو میرے پردادا کے زمانے کی ہے۔ مجھے سو فیصد

امید تھی کہ اس الاٹمنٹ کا ریکارڈ کاؤنٹی کے لینڈ ڈیپارٹمنٹ

میں ضرور موجود ہوگا۔ میں خود کاؤنٹی سیکریٹریٹ میں طویل

عرصے تک کام کر چکی تھی، جانتی تھی کہ آر کاؤنٹی شیشے میں تمام

ریکارڈ موجود ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی مگر ہمت

نہیں ہو رہی تھی مگر آج ہمت کر ہی لی۔ مریٹا کی موت کی خبر

افسوسناک تھی مگر اب اس کی وجہ سے میں دن بھر ہاتھ پہ ہاتھ

دھر کر تو بیٹھنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

چڑے کا وہ بڑا سا تھیلا میرے پردادا کی نشانی تھا۔

براؤن رنگ کے اس بیگ میں کئی پرانی دستاویز، تصاویر،

خطوط، ڈائریاں اور اسی طرح کی چیزیں موجود تھیں۔ میں

نے تھملا کیا کھولا کہ ذہن کے دریچے ماضی کی طرف کھل گئے۔ میں ایک، ایک کاغذ کو اچھی طرح پڑھتی رہی۔ یہ بھول ہی گئی کہ کس لیے تھملا کھولا تھا۔ آخر اچانک زرد رنگ کا ایک کاغذ مجھے مل گیا۔ یہ کاغذ کافی موٹا اور بوسیدہ تھا مگر اس کے باوجود اس پر لکھی تحریر بالکل صاف اور واضح تھی۔ یہ زمین کی الاٹمنٹ کی دستاویز تھی اور اس پر کاؤنٹی کی بڑی سی مہر بھی ثبت تھی۔ اس پر زمین کی الاٹمنٹ کی تاریخ پندرہ اکتوبر، 1891ء درج تھی۔

میں نے وہ دستاویز علیحدہ کر کے احتیاط سے فائل میں لگا لی اور باقی ساری چیزیں تھیلے میں رکھ کر اسے بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ میں یہ دستاویز بھی تلاش نہیں کرتی اگر مرینا میرے درختوں کے پھلوں کو بیچنے کے بجائے علاقے کے لوگوں اور بچوں میں مفت بانٹ دیا کرتی۔ مجھے اپنے درختوں کو قید سے آزاد کرانا تھا۔

شام کو ڈنر کے بعد میں نے تفصیلی طور پر ایک درخواست تائب کی۔ دستاویز کی کاپی اس کے ساتھ منسلک کی اور یہ بھی لکھا کہ میرا باغ ناجائز طور پر مرینا کی جائداد میں شامل کیا گیا ہے۔ اس لیے اس قیدم اور اصلی دستاویز کی روشنی میں از سر نو پیتاؤش کر کے میری ملکیتی زمین کی حدود متعین کی جائیں۔

دوسرے دن میں نے درخواست لینڈ ڈیپارٹمنٹ میں جمع کرادی۔ چونکہ میری درخواست ان کے ایک فیصلے کے خلاف تھی، اس لیے مجھے سے فیس بھی نہ لی گئی اور کارروائی بھی فوراً ہوئی۔ دوسرے ہی دن نارنجی جیکٹیں اور پیلے ہیلٹ پہنے کاؤنٹی کے لینڈ ڈیپارٹمنٹ کا عملہ پیتاؤش کے آلات لے کر پہنچ گیا۔ انہوں نے کئی گھنٹے تک کام کیا اور واپس چلے گئے۔

اس کے صرف دو روز بعد ہی مجھے کاؤنٹی سے ایک خط ملا، جس میں انہوں نے معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ نہ صرف میرا باغ بلکہ مرینا کے گھر کے داخلی دروازے سے صرف تین میٹر دور تک کی زمین میری ملکیت ہے۔ انہوں نے پولیس کو بھی مطلع کر دیا تھا تا کہ وہ اس غلطی کے ازالے کے لیے مجھے میری زمین کا فوری قبضہ دلوائیں۔ اس سے اگلے ہی روز شریف پہنچ گیا اور مجھے میرا باغ اور کافی ساری زمین واپس مل گئی۔

جن دنوں کی یہ بات ہے، اس وقت خزاں آچکی تھی۔ درخت ٹنڈ ٹنڈ ہو رہے تھے۔ میرے درختوں کے پتے بھی جھڑ گئے تھے۔ موسم بہت افسردہ تھا۔ اسی دوران کاؤنٹی چارج نے اعلامیہ شائع کروایا جس کے مطابق مرینا کی تدفین

اتوار کو ہونی تھی۔ تدفین میں تاخیر کا سبب یہ بتایا گیا تھا کہ مرحومہ کے کچھ رشتے دار دروازے سے آرہے تھے۔ اسی لیے ان کی درخواست پر تاخیر کی گئی۔ مرینا کی تدفین میں، میں نے بھی ایک اچھے ہمسائے کی طرح بھرپور شرکت کی اور تمام دعائیہ رسوم میں شریک ہوئی۔

مرینا کی تدفین کے بعد میری طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ کئی روز تک بستر سے اٹھ نہ سکی۔ اس دوران ٹریوی باقاعدگی سے میری خیریت پوچھنے کے لیے آتا تھا۔ اس کی زبانی ہی یہ پتا چلا تھا کہ تدفین کے تیسرے روز ہی مرینا کا گھر فروخت ہو گیا تھا۔ جس دن اس نے یہ بات بتائی، اُسی شام نئے ہمسائے مجھ سے ملنے چلے آئے۔

وہ میاں بیوی تھے۔ ٹریوی کا ہم عمر لڑکا ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ مجھے اچھی عادات کے مالک لگے۔ میں نے انہیں تفصیل سے سارا قصہ سنایا کہ کس طرح میرا باغ ان کے گھر کی مرحومہ مالکین نے ہتھیا یا اور کس طرح وہ مجھے واپس ملا۔ مجھے ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ اس زمین کو جو تنازعے سے پہلے مرینا کے پاس تھی، اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے اپنا باغ چاہیے تھا، وہ مجھے واپس مل چکا تھا۔ میں اُس زمین پر بھی اپنا حق نہیں جمانا چاہتی تھی جو بھی مرینا کے پاس تھی۔ میری اس اجازت پر وہ لوگ بہت خوش ہوئے۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد برف باری کا موسم آجائے گا۔ دوسرے دن سو کر اٹھی تو طبیعت ہشاش بشاش تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں باہر چلی آئی۔ سردیاں شروع ہوتے ہی ٹوٹو کے پھول اور شہد کی مکھیاں، دونوں غائب ہو چکے تھے۔ ویسے بھی مجھے اب ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کمری سنبھالی اور ایک ایک کر کے سارے پودے اکھاڑنے لگی۔ گھٹنا بھر میں آدھے پودے صاف ہو چکے تھے۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہیں مسز آر تھر۔“ اسی دوران ٹریوی پہنچ گیا اور زمین پر پڑے ٹوٹو کے اکھاڑے گئے پودے دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”اب ان کی ضرورت نہیں۔“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میرے ہمسائے بہت اچھے ہیں۔“ یہ ظاہر میری نظر درختوں کی طرف تھی۔

”یہ...“ اس نے باغ کی طرف اشارہ کیا۔ ”ہاں... یہی سمجھ لو۔“ اسے تو کہہ دیا مگر میرا اشارہ

ہرگز ان کی طرف نہیں تھا۔ اشارہ تو مرینا کے گھر میں بسنے والے نئے ہمسائیوں کی طرف تھا مگر وہ بچہ کیا سمجھتا میری ذوق معنی بات۔

”مگر پھر بھی۔“ اس نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ”انہیں نہیں اکھاڑنا چاہیے تھا۔“ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ مجھ سے ناراض ہے۔

”ضروری تھا۔“

”مگر کیوں؟“

”کل مزدور آئیں گے اور یہ باڑہ ختم کر دیں گے۔“ میں نے اسے ٹوٹو اکھاڑنے کی وجہ سمجھانا شروع کی۔ ”جب باڑہ اکھاڑیں گے تو یہ پودے بھی اکھاڑنا پڑیں گے۔ ان کی جڑیں تو باڑہ کے نیچے ہیں۔“

”یہ پودے میں گھر لے جاؤں؟“ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔

”ہرگز نہیں...“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ان سے بنا شہد بالکل بے ذائقہ، پھیکا بلکہ کڑوا ہے۔ تمہارا اچھے ذائقہ والا شہد بھی خراب ہو جائے گا۔ میں نے خود اس کا ساٹھا شہد پیچک دیا ہے اور ہاں، جاتے ہوئے یہ ڈبا بھی لے جانا۔“ یہ کہہ کر میں رکی۔ ”بھئی یہ شہد کی فارمنگ بہت مشکل کام ہے، میرے بس کاروگ نہیں۔“

”آپ کو فارمنگ کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“ اب وہ بھی پودے اکھاڑنے کے لیے میرے ساتھ کھرپ لی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ ”میں جو آپ کے لیے مزید ارشید لے کر آتا ہوں۔“

”واقعی...“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ہوتے ہوئے مجھے شہد کی کیا کمی ہے۔“

ٹوٹو کے سارے پودے اکھاڑ لیے گئے تھے۔ اب وہ ڈھیر کی صورت میں سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ٹریوی کے جانے کے بعد میں نے ایک گڑھا کھودا اور بچن میں رکھے شہد کے دوسرے تان اٹھائے اور سارا شہد گڑھے میں ڈال کر دوبارہ مٹی ڈال دی۔

دوسرے دن مزدور آگئے۔ انہوں نے لکڑی کی باڑہ نہ صرف ہٹا دی بلکہ اسے کھانڈی سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر لکڑی کے اسٹور میں بھر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ باڑہ کے یہ کٹے ہوئے ٹکڑے پوری سردی میرے آتش دان کو روشن اور مجھے گرم رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔

☆☆☆

موسم بہار آ گیا تھا۔ ٹنڈ ٹنڈ درختوں پر سبز کوٹلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے خوشی تھی کہ اس بہار میں میرے درخت

آزاد ہیں اور موسم گرما میں میرے باغ کے پھل لوگوں کو اپنی جانب پھر متوجہ کریں گے۔ ایک بار پھر میرے باغ کے پھلوں پر سب کا حق ہوگا۔

بہار کے موسم میں ایک بار پھر دل میں خیال آیا کہ کچھ پھول والے پودے لگاؤں۔ میں اپنی اسٹڈی میں رکھی کتابوں میں پھولوں کے پودوں کی کتاب تلاش کر رہی تھی کہ وہی کتاب ایک بار پھر ہاتھ میں آگئی، جس میں ٹوٹو کے بارے میں پڑھنے کے بعد میں نے وہ پودا لگایا تھا۔ کتاب بہت اچھی تھی۔ ورق گردانی کرتے ہوئے ٹوٹو کے خواص والا صفحہ سامنے آ گیا اور میں ایک بار پھر وہی پڑھنے لگی:

”ٹوٹو پودے میں ایک ہی بہت بڑی برائی ہے اور وہ یہ کہ اس کا وہ حصہ جسے شہد کی مکھیاں چوستی ہیں، ایک بہت ہی زہریلا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر اس مادے کو بچھنے والی مکھیوں کا تیار کردہ شہد استعمال کیا جائے تو وہ دوسرے شہد کے مقابلے میں بہت میٹھا اور خوش ذائقہ محسوس ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس شہد کو ستوا تر کئی مہینوں تک استعمال کر لے تو کسی بھی اچانک پیش آنے والی خوف کی صورت حال میں وہ کو مایاں جاسکتا ہے اور اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اسی زہریلے خواص کی بدولت لوگوں میں یہ پودا مقبول نہیں رہا، حالانکہ ان کے بڑے بڑے سفید پھول آنکھوں کو بہت بھلے لگتے ہیں۔“

یہ پڑھ کر میں مسکرا دی۔ ”اسی لیے تو ٹوٹو لگایا تھا۔ اگر مرینا کو حد سے زیادہ شہد پسند نہ ہوتا تو شاید وہ اب بھی میرے باغ پر قابض ہوتی۔“ اس خیال پر میں مسکرا دی اور سوچنے لگی کہ دیکھو بے چارے ٹریوی کو کبھی پتا ہی نہیں کہ چلا کہ وہ مرینا کے لیے جو شہد لے کر آتا تھا، میں بچن میں آ کر کتنی صفائی سے وہ شہد نکال کر ٹوٹو والا شہد اس میں بھر دیتی تھی۔ بھلا ہو ہیلو دین تہوار کا۔ نہ وہ رات آتی، نہ وہ بچے اُس کے گھر جاتے اور نہ ہی وہ اچانک اتنی خوف زدہ ہوتی کہ ٹوٹو کے شہد کا مغیر دماغ مادہ اسے کو مایاں لے جاتا۔ مجھے کتاب میں لکھی تحریر کا کامیاب تجربہ ہو چکا تھا۔

مرینا کی موت کا خیال آتے ہی افسوس کی ایک ہلکی سی لہر من میں اٹھی۔ میں نے کھلی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ میرے سرسبز آزاد کھڑے درخت ہوا میں جموم رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں مسکرا دی اور کتاب میں سے وہ صفحہ آہستہ سے پھاڑ کر پڑے پڑے کرویا۔

”الوداع ٹوٹو۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے کاغذ کے پرزے سنک میں بہا دیے۔





کسی کے دل میں جاہت کی ندیا دھیرے دھیرے بہتی ہے تو کہیں طوفانی لہریں اسے اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی تسخیر کائنات کا خواب تھا مگر کسی کو عشق میں سربازار رسوائی منظور نہ تھی۔ جبکہ وہ ایسی محبت کی آرزو مند تھی جو ندیا کے دونوں کناروں کے مابین پانی کے مانند بہتی ہو اور چاہتی تھی کہ یہ دونوں کنارے ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جو پانی آگے بڑھ جاتا ہے کنارے اس کا ساتھ نہیں دیتے... پیچھے سے آنے والا پانی ان کی ہریالی کا سبب بنتا ہے۔ زندگی کے اس فلسفے کو وہ آخری سانس تک نہ سمجھ سکی، کیونکہ وہ ایک ایسی عجیب میکانیکی محبت کے حصار میں تھی جس میں جذبات کے گرداب نے اس کی آنکھوں میں دھول اور دامن میں خاک بھر دی تھی... وہ جو غفلت میں عجلت کا شکار تھی... محبت میں رقابت کو ہوا دے رہی تھی... خواہشوں کے دھوکے میں سازشوں میں پناہ تلاش کر رہی تھی... معلوم نہیں اس کی جنوں خیزی میں کس کا ہاتھ تھا، معاشرتی نظام کا، جدید سہولتوں یا خیالات کی بے سماعت اڑان کا... جو کچھ بھی تھا اس کے ستارے گردش میں آچکے تھے... اسیری خواہشوں کی ہو یا سلاخوں کی... ذہنی تباہی کا سبب ضرور بنتی ہے... اور بالآخر بن گئی۔

انقلاب اچھوٹنی محبت

محبت اور اس کے لیے ہر شے کی قربانی

”ایسی باتیں کر کے میرا دل نہ دکھاؤ احسن...! میری شادی کہیں بھی ہو، محبت تو مجھے تم ہی سے ہے اور رہے گی۔“

”شاید یہ دنیا کی پہلی اور آخری انوکھی محبت ہوگی۔“

احسن نے افسردگی میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اگر تم تنہائی میں مجھ سے ملتے رہتے تو میں یہ شادی نہیں کرتی۔ جب تک تمہیں ملازمت نہیں مل جاتی، میں انتظار کر لیتی لیکن تم اس کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے!“

”مجھے حیرت ہے کہ تم اس قسم کی باتیں اتنی بے جاابی سے کرتی کیسے ہو۔“ احسن کے لہجے میں غمی آگئی۔

”مگر میں یہ باتیں تمہارے علاوہ کسی سے نہیں کرتی۔“

ساحرہ نے سنجیدگی سے برجستہ کہا۔ ”میں تم سے جسمانی طور پر نہ کسی لیکن ذہنی طور پر تو بہت قریب ہوں۔ چار سال کے قریب گزر چکے ہیں، ہمیں ایک دوسرے سے ملنے ہوئے اور اس سارے وقت میں ہم ایک دوسرے کی محبت سے سرشار رہے ہیں۔ میں تم سے ہی یہ باتیں کر سکتی ہوں۔“

”ہوں۔“ احسن نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔

”احسن! جو باتیں میں نے پرچے شروع ہونے سے

سب جاننے تھے کہ ساحرہ احسن کی دیوانی ہے مگر... جانے کیوں ان دنوں بے گلی کا شکار رہنے لگی تھی۔ اسی کیفیت میں کچھ دن گزر گئے۔ اپنے آخری پرچے سے ایک دن نکل ساحرہ نے احسن کو بتایا۔ ”تین دن بعد میری شادی ہونے والی ہے۔“

اس کے چہرے پر بہت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ احسن اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا احسن!“ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے ساحرہ سنجیدہ ہوئی۔ ”یہ خبر تمہارے لیے غیر متوقع تو نہیں ہونا چاہیے تھی۔ میں نے امتحانات شروع ہونے سے پہلے تم سے جو باتیں کی تھیں، کیا وہ تمہیں یاد نہیں؟“

”یاد... ہیں...“ احسن کی آواز بھرا گئی۔

”تو پھر اب کیا ہوا؟“

احسن جذباتی ہو گیا۔ ”ہر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن اسے موت آئے گی۔ اس کے باوجود وہ ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے لیکن جب موت اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔“

ہوں۔ اس کے ساتھ اسٹڈی کرنا تو محض ایک بہانہ ہے۔ اس طرح مجھے تم سے ملنے کا موقع آسانی سے مل جاتا ہے۔

”یہ سب میں جانتا ہوں۔“

”ہاں۔“ ساحرہ نے کہا۔ ”میں یونہی رو میں بولتی چلی گئی۔ میں تمہیں شیا کی بات بتانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال بھی یہ ہے کہ میری شادی جلد از جلد نہ ہوئی تو میری صحت برباد ہو جائے گی۔ کل تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ صحت کی وہ بربادی کسی مرض کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

”غلط کہا ہے شیا نے۔“ احسن پھر تیزی سے بولا۔ ”یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا ہے کہ تم اس معاملے میں ایٹارل ہو، لیکن زیادہ وقت گزر جانے سے یہ ایٹارلٹی کسی بیماری کا سبب نہیں بن سکتی۔“

ساحرہ اس بات کا جواب نہیں دے سکی۔ شیا نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ساحرہ نے اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جو راستے اپنا لیے تھے، وہ اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ ساحرہ اب اس معاملے میں بے بس بھی ہو چکی تھی۔ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر اس راستے پر دھیرے دھیرے آگے بڑھی تھی اور اب اتنا آگے جا چکی تھی کہ واپسی کا امکان نہیں رہا تھا۔ کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی لیکن احسن کو وہ یہ سب کچھ نہیں بتا سکی۔

”میں اس معاملے میں بحث نہیں کرنا چاہتی احسن!“

ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن یہ ایک بار پھر کہوں گی کہ تم سے میری محبت بھی ختم نہیں ہوگی۔ شادی اور محبت کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں، ان سے بھی تم واقف ہو چکے ہو۔ میں اپنے شوہر کی ملکیت نہیں بنوں گی۔ اگر آج کا مرد پوری طرح آزاد ہے تو عورت کیوں نہیں!“

”عورت کی یہ آزادی اس معاشرے کو.....“

”پلیز احسن!“ ساحرہ نے چڑ کر کہا۔ ”مجھے اس جھوٹے معاشرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”تو پھر شادی کے بغیر ہی آزاد ہو جاؤ۔“ احسن نے تلخی سے کہا۔

یہ ساحرہ کے لیے ایک معاشرتی مجبوری تھی لیکن وہ ضدی یہ لفظ ”معاشرہ“ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ وہ بولی۔ ”شادی اس لیے ضروری ہے کہ بات لیگلا کر ہو جائے۔“

”تو کیا یہ معاشرے کا خوف نہیں؟“ احسن نے چیخے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ ساحرہ نے کہا۔ ”میں اپنے والدین کی وجہ سے مجبور ہوں۔“

”لیکن مجھ سے تنہائی میں ملنے کے لیے تیار ہو۔“

”تمہاری بات اور ہے۔ معاملہ اگر کھل بھی گیا تو تم سے میری شادی ہو جائے گی۔ بات کھلنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن تمہاری جگہ کوئی اور ہوا اور بات کھل گئی اور وہ مجھ سے شادی کے لیے بھی تیار نہیں ہوا تو میرے والدین کو اس بدنامی سے شدید صدمہ پہنچے گا۔ رہی میری بات، تو میں اسے برا ہی نہیں سمجھتی اور نہ یہ بدنامی کا سبب بننا چاہیے لیکن بد بخت..... بد بخت.....“ وہ دانت چرس کر رہ گئی۔

وہ ”معاشرے“ کا لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔

”بد بخت۔“ احسن نے تلخی سے کہا۔ ”چپ کیوں ہو گئیں؟ بات پوری کرو۔ معاشرہ ہی کہنا چاہتی تھیں نا!“

”ہاں۔“ ساحرہ نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”یہ بد بخت، جھوٹا معاشرہ!“

”جس کی بنیاد.....“

”بس آگئی۔“ ساحرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

وہ دونوں بس اسٹاپ پر پہنچ گئے تھے اور اتفاق سے اسی وقت بس آ کر رک گئی۔

”میں تم سے فون پر رابطہ کروں گی۔“ ساحرہ نے کہا اور بس میں سوار ہونے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئی۔

احسن گم سم کھڑا ساحرہ کو بس میں سوار ہوتے دیکھتا رہ گیا۔

بس میں بیٹھی ہوئی ساحرہ کچھ دیر افسردہ رہی۔ اسے قدرے دکھ یہ تھا کہ اس کی شادی کی خبر احسن سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔ ساحرہ سوچ رہی تھی کہ بعض مردوں کی سوچ ایسی کیوں ہوتی ہے؟ وہ محبت کے نتیجے میں اسی لڑکی سے شادی کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟

اور یہ احسن؟..... ساحرہ نے بیٹھے بیٹھے منہ بناتے ہوئے سوچا، وہ تو بس ”معاشرہ، معاشرہ“ رٹا رہتا ہے، پاگل!

خیر! اس نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ وہ احسن کے لیے کوئی بہت خوب صورت لڑکی تلاش کرے گی۔ ان دونوں کی شادی کرادے گی۔ احسن بھول جائے گا کہ محبت کے نتیجے میں شادی ضروری ہے۔

اسی قسم کی سوچ بچار کے ساتھ وہ بس سے اتر کر شیا کے بچکے کی طرف روانہ ہوئی۔

شیا حسب معمول اپنے کمرے میں کتابیں لیے کالین پر بیٹھی تھی۔

ہی دیے۔

”اچھا سنو!“ ساحرہ نے کہا اور کچھ سوچنے لگی۔

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم بھی تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ یہ وہی پارک کی فٹ پاتھ تھی جہاں وہ بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے باتیں کرتے تھے۔

”میں اب بھی اس شادی سے انکار کر سکتی ہوں۔“

ساحرہ خامے توقف کے بعد بولی۔

احسن چلتے چلتے ایک جھکے سے رک گیا۔ ”تو کرو انکار!“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”مگر اس کی ایک شرط ہے۔“ ساحرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن رکومت، چلتے رہو! لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے ہیں۔“

یہ بات احسن نے بھی محسوس کر لی تھی۔ وہ پھر چلنے لگا۔

اس مرتبہ اس کی رفتار درست تھی۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

”کیا شرط ہے؟“

”میری شدید خواہش ہے کہ میری زندگی میں آنے والے پہلے مرد تم ہو۔“ ساحرہ نے کہا۔ ”اگر ہماری ملاقاتیں تنہائی میں ہونے لگیں تو میں انتظار کر لوں گی۔ جب تمہیں ملازمت مل جائے گی تو ہم شادی کر لیں گے۔“

”نہیں۔“ احسن نے تیزی سے کہا۔ ”شادی سے پہلے یہ ممکن نہیں۔“

”خود کو اس جھوٹے معاشرے سے باندھے رکھو گے!“ اس مرتبہ ساحرہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

”میں تمہاری بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے بس اتنا کہوں گا کہ اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں تو یہ معاشرہ ٹکٹ ہو کر رہ جائے۔ جنگل بن جائے گی یہ دنیا جہاں صرف جانور رہتے ہوں گے۔“

ساحرہ یہ کہتے کہتے رک گئی کہ جانور تو انسان بھی ہے۔ وہ رکی اس لیے کہ اس نے احسن کا مقصد سمجھ لیا تھا۔ اس نے ”جانور“ کا لفظ لغوی معنوں میں استعمال نہیں کیا تھا۔

”جانوروں کی سی وحشت۔“ احسن پھر بولا۔ ”میں اپنے اندر نہیں سمو سکتا۔“

”میں بھی تو مجبور ہوں احسن!“ ساحرہ نے سنجیدگی سے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میرے اندر کی آگ مجھے اندر سے جلاتی چلی جا رہی ہے۔ اگر اس پر پانی نہیں پڑا تو میں جل جل کر خاک ہو جاؤں گی۔ میری دوست شیا کو تو تم جانتے ہی ہو۔ میں اس وقت اسی کے گھر جا کے اس کے ساتھ اسٹڈی کرتی

پہلے تم سے بہت کھل کر کی تھیں، اس کے بعد تو تمہیں میرا مزاج سمجھ لینا چاہیے تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو بہت کشادہ دلی سے تسلیم کرنا چاہیے احسن!“

”آج تو تم کچھ زیادہ ہی بالغ ہونے کا ثبوت دے رہی ہو۔“ احسن کے لہجے میں پہلے سے زیادہ تلخی تھی۔ ”زندگی کی حقیقتوں کو خوب سمجھنے لگی ہو۔“

”کیا آج طنزی کرتے رہو گے؟“

”جب دل پر قیامت گزر جائے تو آدمی کی زبان سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔“

”کیوں قیامت گزر رہی ہے تمہارے دل پر! کیا تم نے میری ان باتوں کو مذاق سمجھا تھا کہ شادی اور محبت، وہ مختلف باتیں ہیں؟“ ساحرہ اپنے سوال کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ محبت تو مجھے تم سے ہی رہے گی۔“

”لو کھی محبت! احسن نے دہرایا۔

”تم اسے کوئی بھی نام دے لو۔ میں نے جو کہا ہے، وہ حقیقت ہے۔“

”مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم میری زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کر چکی ہو۔“

”ہرگز نہیں۔“ ساحرہ مسکرائی۔ ”جب تمہیں ملازمت مل جائے گی تو میں خود تمہاری شادی کراؤں گی۔ خود ڈھونڈوں گی تمہارے لیے کوئی بہت خوب صورت سی لڑکی.....! میں تو خوب صورت بھی نہیں ہوں احسن!..... یہ بات شاید دنیا کی کوئی لڑکی اپنی زبان پر نہیں لاسکتی لیکن میں ہر حقیقت کو کشادہ دلی سے قبول کرتی ہوں۔“

احسن کچھ نہیں بولا۔ اس کے دل و دماغ کی کشاکش خوف ناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

ساحرہ پھر بولی۔ ”میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ میں شادی کے بعد بھی تم سے ملتی رہوں گی۔ خواہ تم مجھ سے تنہائی میں ملو یا نہ ملو۔ ہاں اگر تنہائی میں ملو گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں تم سے یہ بھی کہہ چکی ہوں کہ میں اپنے شوہر کی ملکیت نہیں بنوں گی۔“

احسن اب بھی خاموش رہا۔

”کیا اب تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے؟“ ساحرہ نے کچھ افسردگی سے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔“

احسن کے دماغ نے کچھ الفاظ اس کی زبان کی طرف دھکیل دیے۔

ساحرہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ یہ سمجھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ احسن کی طرف داری کرتے ہوئے شیا جھنجلائی کیوں تھی اور اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی۔ شیا خاموش ہونے کے بعد بھی ہلکتی رہی۔

”جانی!“ ساحرہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”یہ تو بہت ممکن ہے کہ تمہیں میری باتوں سے اتفاق نہ ہو لیکن تمہیں اتنا براہم تو نہیں ہونا چاہیے۔“

”بہتر ہوگا کہ ہم اس موضوع پر اب گفتگو نہ کریں۔“ شیا کے لہجے میں سردہری تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ ساحرہ اپنی کتابیں سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ معمول کے مطابق شیا اسے چھوڑنے کے لیے برآمدے تک آئی مگر اس کے انداز میں پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی۔

”جانی!“ ساحرہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”کیا بہت ناراض ہو گئی ہو مجھ سے؟ کیا تمہیں میرے خیالات برے لگے ہیں یا میرا احسن سے شادی نہ ہونا؟“

”سبھی کچھ.....“ شیا نے کہا۔ ”لیکن..... میں نے ابھی کہا تھا نا.....! اب یہ باتیں نہ کرو۔“

”اتنا تو بتا دو! کیا اب تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو؟“

”ایسا بہر حال نہیں ہے کہ اب میں تم سے ملنا ہی نہ چاہوں۔“ شیا نے پھمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”شکر ہے۔“ ساحرہ نے طویل سانس لی۔ ”میرے سینے سے بوجھ اتر گیا۔ اچھا، خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

ساحرہ اس کے بیگلے سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ یہ اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ شیا اسے رخصت کرنے کے بعد تقریباً دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی تھی اور

بستر پر گر سی پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے تھے۔ اس وقت ساحرہ اس کی یہ حالت دیکھتی تو سکتے میں رہ جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ شیا پر یہ رد عمل کیوں ہوا تھا۔

ساحرہ تو کیا، کوئی بھی شیا کی اس حالت کا سبب نہیں سمجھ سکتا تھا۔ شیا نے اپنے دل کی یہ بات بھی کسی کو بتائی ہی نہیں تھی کہ

احسن اس کا محبوب تھا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ کالج ہی کے زمانے میں وہ اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ احسن اسے بے تحاشا بھاگیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ احسن کے قریب

ہونے کی کوشش میں کامیاب ہونے کے بعد اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتی، اسے یکا یک محسوس ہوا کہ احسن تو ساحرہ کی طرف متوجہ تھا اور ساحرہ بھی اس کی متوالی نظر آئی تھی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت اور شادی دو الگ الگ باتیں ہیں۔“ شیا اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

ساحرہ پھر بولی۔ ”جس سے محبت ہو، اس سے شادی ہو جائے تو اچھا ہے لیکن اگر نہ ہو..... میرا مطلب ہے کہ

شادی کسی اور سے ہو جائے تو اس میں کوئی بہت زیادہ حرج تو نہیں۔ شادی کے بعد بیوی شوہر کی، یا شوہر بیوی کی ملکیت نہیں بن جاتا۔“

”تم نے اپنے ان خیالات کا اظہار پہلے کبھی نہیں کیا۔“ شیا دھیمی آواز میں بولی۔ اس کے چہرے سے تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

”کوئی ایسی بات ہی نہیں چھڑی۔“

”احسن تمہارے ان خیالات سے متفق ہے؟“

”متفق ہی تو نہیں۔“ ساحرہ نے منہ بنایا۔ ”جب میں یہاں آئی تھی تو اسی کی باتوں کی وجہ سے ابھی ہوئی تھی۔ وہ

ایسا نظر آنے لگا تھا جیسے اس کی جان پر بن گئی ہو..... لیکن..... ٹھیک کر لوں گی میں اسے۔“

شیا نے اس کی باتوں پر شاید دھیان نہیں دیا اور پوچھا۔ ”جہاں تمہاری شادی طے کی گئی ہے، کیا اس کے لیے

تمہارے والدین نے تمہیں مجبور کیا تھا؟“

”نہیں تو.....“

”یعنی تم اس شادی سے انکار بھی کر سکتی تھیں؟“

”ہاں، کر سکتی تھی۔“

”اور تم نے نہیں کیا؟“ شیا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کیوں کرتی؟ آخر تم بھی تو یہ کہہ چکی ہو کہ میری شادی جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔“ ساحرہ نے شیا کی بات پھر

دہرائی۔

”لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم احسن کے بجائے کسی اور سے شادی کر لو۔ اب مجھے اس پر یقین نہیں آ سکتا کہ

تم بھی اس سے محبت کرتی تھیں۔“

”کرتی تھی نہیں، اب بھی کرتی ہوں۔“

”جھوٹ بول رہی ہو تم!“ شیا جھنجلائے ہوئے سے انداز میں کھڑی ہو گئی اور ٹپکتے ہوئے بولی۔ ”قیامت ڈھادی ہے تم نے احسن کے دل پر.....! میں کالج کا زمانہ بھولی نہیں

ہوں۔ جب ہم دونوں فرسٹ ایئر میں تھے۔ احسن تھوڑا ایئر میں تھا۔ ہم کلاس فیلو نہیں تھے لیکن جب بھی کسی وقت لڑکے لڑکیاں لان میں بیٹھی ہوتی تھیں یا کینٹین میں یکجا ہوتیں تو احسن کی نظریں تمہارے چہرے کے علاوہ کسی

چہرے پر نہیں جمتی تھیں۔“

”اب اتنی جلدی ہو گئی احسن کو!“ شیا نے ہنس کر کہا۔

”کہاں ملازمت مل گئی اسے؟“

”ملازمت تو اسے ابھی نہیں ملی..... اور بات بھی تم شاید غلط سمجھ رہی ہو۔ میری شادی احسن سے نہیں ہو رہی ہے۔“

”کیا!“ شیا چونکی۔

”ہاں۔“ ساحرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری شادی کہیں اور ہو رہی ہے۔ اسی اطلاع پر تو احسن نے ایسی

باتیں کی تھیں کہ وقتی طور پر میرا ذہن الجھ گیا تھا۔“

”وقتی طور پر؟“ شیا اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”ہاں۔“ ساحرہ نے کہا۔ ”احسن کو جھٹکا سا لگا تھا یہ سن کر، لیکن مجھے امید ہے کہ وہ کچھ دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

شیا کی حیرت کم نہیں ہوئی۔ ”اور تم بالکل مطمئن نظر آ رہی ہو۔“

”کیا مجھے مطمئن نہیں ہونا چاہیے؟ کیا تم ہی نے یہ نہیں

کہا تھا کہ میری شادی جلد از جلد ہونا چاہیے؟“

”لیکن میرا خیال تھا کہ تم احسن کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرو گی۔“

”اب میں بھی کیا کرتی! وہ ملازمت ملنے سے پہلے

شادی کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔“

”کیا تمہیں اس سے محبت نہیں؟“

”وہ تو ہے۔“

”تو تم نے اسے سمجھایا کیوں نہیں کہ وہ ملازمت کی شرط ختم کر دے؟“

”سمجھایا تھا۔ وہ ماننا ہی نہیں۔“

”شادی تمہارے والدین نے طے کی ہے؟“

”ہاں۔“

”احسن کو بہت مددہ ہوا ہوگا لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم

پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمہیں بہت چاہتا تھا،

بلکہ اب بھی چاہتا ہوگا۔“

”میں بھی اسے چاہتی ہوں جانی!“

”پھر بھی خوشی خوشی دوسری جگہ شادی کر رہی ہو؟“

ساحرہ نے طویل سانس لی۔ ”تم بھی احسن کی طرح

باتیں کرنے لگیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے جانی کہ میری شادی

دوسری جگہ ہو رہی ہے؟“

”کچھ نہیں ہوتا اس سے؟“

”کچھ بھی نہیں! میں شادی کے بعد بھی احسن سے ملتی

رہوں گی۔“

”شادی تو اب اس سے نہیں کر سکو گی۔“

ابتدائی رسمی گفتگو کے ساتھ ساحرہ نے شیا کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنی ایک کتاب کھولی اور اگلے دن کے پرچے کے حوالے سے شیا سے ایک سوال کیا۔

شیا جواب دینے کے بجائے تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا جانی؟“ ساحرہ ہنسی۔ ”اس طرح کیوں دیکھنے لگیں.....؟“

”معمول کے خلاف ہوا ہے آج۔“ شیا بولی۔ ”تم تو

کتابیں رکھ کر سیدھی کمپیوٹر کی طرف جایا کرتی تھیں۔“

”آج ذہن تھوڑا سا الجھا ہوا ہے۔“

”کیوں؟ اور ذہن الجھا ہوا ہے تو اسٹڈی کیا خاک

کرو گی۔“

”اسٹڈی شروع کروں گی تو وہ خیالات ذہن سے نکل

جائیں گے۔“

”خیالات کیا ہیں؟“

”سب بتاؤں گی تمہیں! پہلے اسٹڈی کر لی جائے۔“

”اچھا!“ شیا نے طویل سانس لی۔ ”جیسی تمہاری

مرضی۔“

اس دن تک ساحرہ نے شیا کو اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

شیا نے اسٹڈی ختم کرنے سے چند منٹ پہلے کتابیں بند کر دیں اور ساحرہ سے بولی۔ ”کیا اب بھی تمہارا ذہن الجھا

ہوا ہے؟“

”نہیں۔“ ساحرہ مسکرائی۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ

اسٹڈی کروں گی تو وہ خیالات ذہن سے نکل جائیں گے۔“

”وہی خیالات تو جانا چاہتی ہوں۔“

”خوش ہو جاؤ گی سن کر!“

”اگر ایسی بات ہے تو اس میں تمہارا ذہن کیوں الجھا

ہوا تھا؟“

”الجھا ہوا تو احسن کی باتوں کی وجہ سے تھا۔ میں تمہیں

یہ خوش خبری دینا چاہتی ہوں کہ پرسوں میری شادی ہو رہی

ہے۔“

”پرسوں؟“ شیا چونکی۔ ”اور تم مجھے آج بتا رہی

ہو؟..... بات اچانک تو طے نہیں ہوئی ہوگی۔“

”ہاں بات تو چند روز سے چل رہی تھی۔ میں نے سوچا

تھا کہ معاملات جب طے پا جائیں گے، تبھی تمہیں بتاؤں گی۔

سب کچھ آج صبح فائنل ہوا ہے۔ پرسوں کی تاریخ بھی طے

پا گئی ہے۔“

رہا تھا کہ گھر سے نکلے۔

ناشتے کے بعد زبیری اپنے دفتر چلے گئے۔ وہ اکہم ٹیکس پریکٹیشنر تھے۔ دفتر ان کا ذاتی تھا۔

عابدہ، ملازمہ سے گھر کی صفائی کرانے میں مصروف ہو گئیں۔ احسن اپنے کمرے میں جا لیٹا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے اسپرین کی ایک گولی کھالی تھی۔ اس کے دماغ میں پھر باضی کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ زندگی کے نہایت خوش گوار لمحوں کی پرچھائیاں۔ لیکن اب صورت حال ایسی بن گئی تھی کہ ان پرچھائیوں کو کم ہو جانا چاہیے تھا۔ زندگی ایک اذیت ناک موڑ پر آ گئی تھی۔ اب مستقبل ان پرچھائیوں کی رفاقت میں نہیں گزارا جاسکتا تھا لیکن احسن محسوس کر رہا تھا کہ وہ زندگی بھر ان پرچھائیوں سے بچتا نہیں چھڑا سکے گا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اس لیے ان سب خیالات کے باوجود اسے نیند آگئی۔ جب وہ جاگا تو تین بج رہے تھے۔ اس کی ماں عابدہ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھی تھوٹیش سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”ارے!“ احسن نے اٹھنا چاہا۔

”لیٹے رہو۔“ عابدہ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بخار ہے تمہیں! میں تم سے کھانے کے لیے پوچھنے آئی تھی تو تم سو رہے تھے۔ میں نے تمہاری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تھا۔ بخار ہی کی وجہ سے میں نے تمہیں اس خیال سے نہیں جگا دیا کہ شاید سونے سے آرام کرنے سے ہی تمہارا بخار اتر جائے۔“

”معمولی حرارت ہے ای جان!“

”نمبر بچو۔“

عابدہ نے خود قہر مائٹرن کال کر اس کا نمبر بچ لیا۔ ”سو ہے۔“ وہ بولیں۔ ”اب بہتر یہی ہے کہ تم کھانا نہ کھاؤ۔ میں تمہارے لیے جو شانہ بنا کر لاتی ہوں۔“

عابدہ حکمت کی بہت قائل تھیں۔ اس کے برخلاف زبیری ایلو پیٹھ پر بھروسہ کرتے تھے۔

ماں کے جانے کے بعد احسن کی نظر اپنے موبائل فون پر پڑی۔ اس نے تعجب سے دیکھا کہ موبائل آف تھا۔ اس نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی کہ بستر پر لیٹنے کے بعد کیا اس نے موبائل آف کر دیا تھا؟ اسے یاد نہیں آیا تو اس نے سوچا، شاید بے خیالی میں بند ہی کر دیا ہو۔ اس نے موبائل آن کر کے رکھ دیا اور لیٹا رہا۔ دماغ پر بھی خیالات کی یلغار شروع ہو گئی۔

عابدہ اس کے لیے جو شانہ بنا لائیں۔ احسن کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ لیکن ماں کی خاطر اسے جو شانہ پینا ہی پڑا۔

احسن اپنے بستر پر نڈھال پڑا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے موبائل کی طرف دیکھتا رہا جس پر کال آئی تھی اور جواب میں کچھ بولے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ نہ جانے کون یہ حرکت کرتا ہے، اس نے سوچتے ہوئے موبائل بستر پر ایک طرف ڈال دیا، پھر اس کا دھیان اس کی طرف سے ہٹ گیا۔ وہ کم نام کال آنے سے پہلے بھی وہ ساحرہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب اس کا ذہن پھر اسی طرف لگ گیا۔ چند گھنٹوں میں اس کے چہرے پر ایسی زردی کھنڈ گئی تھی جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ رات بھر اسے نیند نہیں آسکی۔ وہ بستر پر ساکت پڑا تھا لیکن اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔

صبح جب اس کی ماں عابدہ اسے جگانے آئیں تو وہ جاگ ہی رہا تھا۔ ”کیا سوئے نہیں بیٹا!“ ماں نے تشویش سے پوچھا۔

”سو گیا تھا ای جان! ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے۔“ احسن جھوٹ بولتے ہوئے بستر سے اٹھا۔

”چلو جلدی سے نہا دھو لو! میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔“

احسن سر ہلاتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ اس حالت میں اس نے نہانا مناسب نہیں سمجھا، منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کیے، بالوں میں کنگھا پھیرا۔ پھر قہر مائٹرن کال کر اپنا نمبر بچ دیکھا۔ معمولی سی حرارت تھی لیکن قلبی واردات کے بوجھ کے باعث وہ زیادہ بخار محسوس کر رہا تھا۔

ناشتے کے دوران میں اس کے باپ زبیری نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کل رات سے تم الجھے الجھے سے نظر آ رہے ہو بیٹا۔۔۔۔۔ رات کو کھانا بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھا یا تھا، خیریت تو ہے؟“

”کوئی خاص بات نہیں ابو جان!“ احسن نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”یوں ہی ذرا تھکن سی محسوس کر رہا ہوں۔“

”تھکن تو ہوگی ہی۔“ عابدہ بول پڑیں۔ ”ملازمت کے لیے جانے کہاں کہاں دھکے کھاتے پھرتے ہو۔“

”جی ہاں۔“ احسن نے کہا۔ خود اس کا دل بھی نہیں چاہ

خود شیا جس طرح یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب کبھی شادی نہیں کرے گی، اسی طرح احسن کا فیصلہ بھی یہی ہو سکتا تھا۔ ساحرہ سے اس کی چاہت بہت شدید تھی۔ اسے بہت گہرا صدمہ ہوا ہوگا۔ خود شیا اس صدمے کو محسوس کر رہی تھی اور وہی صدمہ اس کی آنکھوں میں آنسو لے آیا تھا۔

ساحرہ اور احسن کی محبت کا علم ہو جانے کے بعد شیا نے احسن کا سامنا کرنے سے گریز کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی بہت کچھ سمجھایا تھا لیکن وہ احسن کی محبت کو اپنے دل سے مکمل طور پر تو کیا، ذرا بھی نہیں نکال سکی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ احسن اسے بھی نہیں مل سکے گا لیکن اس نے اپنی تسکین کا ایک ذریعہ نکال لیا تھا کہ بھی بھی احسن کی آواز سن لیا کرتی تھی۔ اسے نہ جانے کب اور کس سے احسن کا موبائل فون نمبر معلوم ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی احسن کو فون کر لیا کرتی تھی اور فون کرنے کے لیے اس نے ایک نیا نمبر استعمال کیا تھا۔ احسن دوسری طرف سے ”ہیلو، ہیلو“ کرتا رہتا اور وہ خاموشی سے اس کی آواز سنتی رہتی۔

دو تین مرتبہ کے بعد جب احسن نے اس نمبر کی کال ریسیو کرنا چھوڑ دی تو شیا نے ایک اور نمبر استعمال کیا۔ اس کے بعد اس نے معمول ہی بنا لیا تھا کہ ایک نمبر سے بس ایک ہی مرتبہ فون کیا کرتی۔ اس طرح اس کے پاس بے شمار ”سم“ جمع ہو گئی تھیں۔

اس وقت اسے خود کو سنبھالنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر اس نے اپنے آنسو خشک کر کے بیڈ کی دراز سے ایک نئی ”سم“ نکالی اور اپنا موبائل فون کھول کر اس کی پرانی ”سم“ نکالی۔ نئی ”سم“ لگا کر اس نے موبائل بند کیا اور احسن کے نمبر ملانے لگی۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ احسن اس وقت کس حال میں تھا، وہ آواز سے ہی احسن کی کیفیت کا اندازہ لگا لیتی اور ایسا ہی ہوا۔

احسن نے کئی گھنٹوں کے بعد کال ریسیو کی تھی اور ”ہیلو“ کہا تھا۔

شیا نے اس کے لہجے میں ایسی شدید مردنی پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی۔ اس کے دل پر شدید چوٹ لگی اور آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبائیں۔ اس نے جلدی سے موبائل آف کر دیا۔ جب اس نے تکیے پر سر رکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”ساحرہ!“ اس کے دل میں ایک چیخ کوئی۔ ”بہت برا کیا تو نے احسن کے ساتھ!“

♥ ♥ ♥

شیا نے یہ احساس ہونے سے پہلے اپنے اور احسن کے بارے میں بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے اس لیے ساحرہ اور احسن کی محبت کا علم اس کے لیے ایک صدمے سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ دو تین روز تک اتنی نڈھال رہی تھی کہ کالج بھی نہیں جاسکتی تھی۔

ساحرہ اور احسن کے بارے میں کالج کے دوسرے لڑکے لڑکیوں نے بھی محسوس کر لیا تھا جس کا سبب خود احسن کا رویہ تھا۔ ساحرہ کے سامنے آنے پر احسن کو اپنی آنکھوں پر جیسے اختیار ہی نہیں رہتا تھا۔ اس کی نگاہیں ساحرہ کے چہرے پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ اس کے برخلاف ساحرہ میں ایسا جنون نہیں تھا لیکن محبت وہ احسن ہی سے کرنے لگی تھی۔ اسی لیے شیا نے فیصلہ کیا تھا کہ ساحرہ اور احسن کے بیچ سے ہٹ جائے۔ اس نے دیرے دیرے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی اور اپنے دل کو سمجھایا تھا کہ انسان کو اپنی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ضد نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے دماغ میں اکثر یہ خیال بھی آیا کہ اب وہ کبھی کسی سے شادی نہیں کرے گی۔ کالج میں وہ کوشش کرنے لگی کہ احسن سے اس کا آتنا سا سامنا ہی نہ ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ سے اس کا قرب دیرے دیرے بڑھتا رہا۔ اس بڑھتے ہوئے قرب میں شیا کی ہی کوششوں کا دخل تھا۔ وہ کوششیں لاشعوری بھی تھیں۔ اسی لیے ایک بار چونک گئی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہی بھی؟ کیا اس لیے کہ ساحرہ کے قرب سے اسے تسکین ملتی تھی کیونکہ اس کا محبوب ساحرہ کو چاہتا تھا۔

گویا لیلیٰ اور سنگ لیلیٰ کا سامنا تھا۔

یہ احساس ہونے کے بعد شیا پڑمردگی سے مسکرا دی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شیا نے ساحرہ کو اپنے بہت قریب کر لیا تھا۔ ان کی ملاقاتیں کالج کے باہر بھی ہوا کرتیں۔ کالج میں بھی نے سمجھ لیا تھا کہ ساحرہ اور شیا بہت گہری دوست بن گئی تھیں۔

ساحرہ جب شیا سے اپنی اور احسن کی باتیں کرتی تو اس کا انداز بڑا دلہانہ ہوا کرتا تھا۔ شیا سوچا کرتی تھی کہ شادی کے بعد ساحرہ اور احسن کا جوڑا دنیا کی نظر میں ایک مثالی جوڑا ہوگا۔ مگر اب اچانک جیسے ساری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اس کو یہ جان کر شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا کہ ساحرہ کسی اور سے شادی کر رہی تھی۔ اسے یہ خیال قطعی نہیں آیا کہ اب اس کے لیے میدان صاف ہو گیا تھا اور وہ احسن تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ احسن اس کی پذیرائی ہرگز نہیں کرے گا۔ اس کا دل چور چور ہو چکا ہوگا۔

”موبائل آن کر لیا تم نے؟“ عابدہ بولیں۔

”زندہ درگور تو کر دیا ہے تم نے مجھے!“ وہ بولا۔

”ارے واہ! بس شادی ہو رہی ہے میری! میں مری تو نہیں جا رہی ہوں، زندہ رہوں گی اور تم سے ملتی بھی رہوں گی اور.....“ وہ ہنسی۔

”کسی نہ کسی دن تم سے اپنی بات منواتولوں گی۔“

”انہی باتوں کے لیے فون کیا تھا؟“

”ارے نہیں! وہ تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ آج کا پرچہ بھی اچھا ہو گیا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاید کچھ گزربڑ ہو جائے۔ تمہاری کل کی باتوں سے میرا دل تھوڑا سا بوجھل سا ہو گیا تھا۔“

”تم جس معاملے میں اپنا دل ہو، اس معاملے میں آدی کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔ تمہارا پرچہ خراب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔

”میں نے پڑھا ہی پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی لیکن ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہوں۔ خیر چھوڑو، مجھے یہ بھی کہنا تھا کہ آج میں کسی طرح تم سے ملنا چاہتی تھی لیکن گھر میں آج ہی سے اتنا ہنگامہ شروع ہو گیا ہے کہ گھر سے میرا نکلتا ممکن ہی نہیں، اور کل شادی ہے۔ اب میں تمہیں پرسوں فون کر سکوں گی۔ ملیں گے کسی جگہ۔“

”اب اس کی کیا ضرورت ہے!“ احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ارے واہ! اس کی ضرورت تو ساری زندگی رہے گی۔“

احسن خاموش رہا۔

”اچھا، اب میں بند کرتی ہوں۔“ ساحرہ بولی۔

”ٹھیک۔“ احسن کی آواز بہت دھیمی ہو گئی۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے ریسور جو اگیا ہو اور پھر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی لڑکی بھی ہو سکتی ہے؟ احسن نے سوچتے ہوئے اپنا موبائل بند کیا۔

ایک گھنٹے بعد عابدہ نے اس کے کمرے کا چکر لگایا۔ احسن نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہا ہو۔ عابدہ بیگم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور ہٹا لیا۔ چند لمحوں کھڑی رہیں، پھر کسی سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئیں۔

احسن محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بخار میں کچھ تیزی آگئی تھی۔

آدھا گھنٹا اور گزرا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی

”موبائل آن کر لیا تم نے؟“ عابدہ بولیں۔

”ارے واہ! بس شادی ہو رہی ہے میری! میں مری تو نہیں جا رہی ہوں، زندہ رہوں گی اور تم سے ملتی بھی رہوں گی اور.....“ وہ ہنسی۔

”انہی باتوں کے لیے فون کیا تھا؟“

”ارے نہیں! وہ تو میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ آج کا پرچہ بھی اچھا ہو گیا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ شاید کچھ گزربڑ ہو جائے۔ تمہاری کل کی باتوں سے میرا دل تھوڑا سا بوجھل سا ہو گیا تھا۔“

”تم جس معاملے میں اپنا دل ہو، اس معاملے میں آدی کا دماغ بہت تیز ہوتا ہے۔ تمہارا پرچہ خراب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔

”میں نے پڑھا ہی پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی لیکن ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہوں۔ خیر چھوڑو، مجھے یہ بھی کہنا تھا کہ آج میں کسی طرح تم سے ملنا چاہتی تھی لیکن گھر میں آج ہی سے اتنا ہنگامہ شروع ہو گیا ہے کہ گھر سے میرا نکلتا ممکن ہی نہیں، اور کل شادی ہے۔ اب میں تمہیں پرسوں فون کر سکوں گی۔ ملیں گے کسی جگہ۔“

”اب اس کی کیا ضرورت ہے!“ احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔

”ارے واہ! اس کی ضرورت تو ساری زندگی رہے گی۔“

احسن خاموش رہا۔

”اچھا، اب میں بند کرتی ہوں۔“ ساحرہ بولی۔

”ٹھیک۔“ احسن کی آواز بہت دھیمی ہو گئی۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے ریسور جو اگیا ہو اور پھر رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی لڑکی بھی ہو سکتی ہے؟ احسن نے سوچتے ہوئے اپنا موبائل بند کیا۔

ایک گھنٹے بعد عابدہ نے اس کے کمرے کا چکر لگایا۔ احسن نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے سو رہا ہو۔ عابدہ بیگم نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور ہٹا لیا۔ چند لمحوں کھڑی رہیں، پھر کسی سوچ میں ڈوبی آہستہ آہستہ چلتی کمرے سے نکل گئیں۔

احسن محسوس کر رہا تھا کہ اس کے بخار میں کچھ تیزی آگئی تھی۔

آدھا گھنٹا اور گزرا تھا کہ اس کے موبائل فون کی گھنٹی

اجھوتی محبت

کب آسکیں گے؟

”آپ کب ملنا چاہتی ہیں؟“

”میں تو فوراً ملنا چاہتی ہوں۔“

”تو میں آدھے گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

بخار کے باوجود احسن بستر سے اٹھ گیا۔

”مگر میرے گھر سے اس ریسٹورنٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے سے زیادہ کا ہے۔“

”میں انتظار کر لوں گا۔“

”شکریہ احسن صاحب!“ اس جواب کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

احسن نے الماری کھول کر وہ بنگر نکالا جس میں اس کے کپڑے لٹکے تھے۔ اسی وقت عابدہ کمرے میں آئیں اور چونکیں۔

”کیا کہیں جا رہے ہو؟“ انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

”جی امی جان!“ احسن نے بہانہ سوچ لیا۔ ”میری طبیعت زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے، میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔“

عابدہ نے قریب آ کر احسن کا ہاتھ چھوا۔

”ہاں۔“ وہ تشویش سے بولیں۔ ”بخار تیز تو ہوا ہے۔ ایک سو ایک سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بار جو شامہ اور پنی لو۔ دو گھنٹے اور دیکھ لو۔ اگر اس کے بعد بھی.....“

”نہیں امی جان! میں اب جو شامہ نہیں پہوں گا۔“

”تم باپ بیٹے بس!..... ایلو پیٹھ، ایلو پیٹھ!..... اچھا خیر!..... تم ٹیکسی میں جانا۔ اس حالت میں موٹر سائیکل چلانا مناسب نہیں ہوگا۔ تم کپڑے بدلو، میں پڑوس کے کسی بچے سے ٹیکسی منگواتی ہوں۔“

ٹیکسی اسٹینڈ قریب ہی تھا، احسن پیدل وہاں تک جاسکتا تھا لیکن وہ ماں سے اس بحث میں پڑ کر ایک منٹ بھی متاع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کچھ نہیں بولا۔ جب وہ باہر نکلا تو ٹیکسی گھر کے دروازے پر موجود تھی۔

عابدہ نے ایک اسپتال کا نام لیتے ہوئے اس کی تعریف کی اور کہا۔ ”وہیں جانا۔ ابھی میں نے تمہارے ابو جان کو بھی فون پر بتا دیا تھا۔ وہ بھی یہی کہہ رہے تھے۔“

”جی اچھا۔“

”وہاں پہنچ کر مجھے فون بھی کر دینا۔“

”جی..... جی.....“

احسن بے تابانہ گھر سے نکلا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

بچی۔ اس نے جلدی سے اٹھایا لیکن اسکرین پر ایک نیا اور اجنبی نمبر دیکھ کر اس پر جھنجھلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ اس نے یہی سمجھا تھا کہ وہی کم نام فون ہوگا۔ اس نے سوچا کہ آج اس نامعلوم شخص کو کھری کھری سنائی دے گا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

”کون ہو تم!“ احسن نے ترختی ہوئی سی آواز میں کہا۔

”کیا چاہتے ہو؟ فون کرتے ہو تو پوچھ لیتے کیوں نہیں ہو؟ کیا تمہیں کوئی بیماری ہے؟..... کیا میں تمہیں کسی اچھے اسپتال کا پتا بتاؤں؟“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!“ دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

احسن چونک پڑا۔ ”کو..... کون!“ وہ ہکلا سا گیا۔

”میں بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی جہاں آپ نے پڑھا ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”میں آپ سے آج ہی ملنا چاہتی ہوں۔“

”کیوں؟“ احسن نے دھیمی آواز میں پوچھا اور پھر کہا۔

”میں آج کسی سے نہیں مل سکتا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”آپ شاید نہ ملنے کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ ہاں اتنا یقین مجھے ضرور ہے کہ آپ بہت ڈسٹرب ہوں گے۔ آپ سے آج ملاقات بہت ضروری ہے احسن!“

”مجھے ساحرہ کے بارے میں بات کرنا ہے۔“ دوسری طرف سے بات کاٹ دی گئی۔

”جی؟“ احسن چونک پڑا۔

”جی ہاں، ساحرہ کے بارے میں ضروری بات کرنا ہے آپ سے!“

”کون ہیں آپ؟“ احسن کے تنفس کی رفتار کچھ تیز ہو گئی۔

”جب آپ مجھے دیکھیں گے تو پہچان لیں گے۔“

اگر احسن کی طبیعت خراب نہ بھی ہوتی تو وہ اپنی ذہنی کیفیت کے باعث کسی لڑکی سے ملنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن ساحرہ کا نام آ جانے کی وجہ سے وہ بے تاب ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی اس سے ساحرہ کے بارے میں جاننے کی بات کرنا چاہتی تھی؟

”کہاں ملنا چاہتی ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”کسی ریسٹورنٹ میں! جہاں آپ مناسب سمجھیں۔“

احسن نے ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام لیا جو اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”آپ

ملنے تک انتظار کر لیتی؟“ احسن اب بھی چپ رہا۔
”بتاؤ احسن!“ شیا کے انداز میں بے تابی تھی۔ ”وہ
شرط پوری ہونے سے اس کی شادی تم سے ہو سکتی ہے؟“
”تم نے شاید۔“ احسن تذبذب سے بولا۔ ”بات سمجھ
لی ہے۔“

”میں اس کی فطرت سے، اس کے مزاج سے، اس
کے انداز فکر سے اچھی طرح واقف ہوں اس لیے صرف ایک
لفظ نے ہی مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔“

”تو پھر اب مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟“
”احسن!“ شیا کی آواز کانپ گئی۔ ”میں ابھی جا کر
اسے سمجھا سکتی ہوں اگر تم اس کی شرط مان لو۔“
احسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا کہہ
رہی ہو تم۔“

”پلیز احسن!“ شیا کی آواز بھرا گئی۔ ”اس کی بات
مان لو۔“

”شیا!“ احسن نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔ ”جب میں
نے ساحرہ کا اصرار نظر انداز کر دیا تو تمہاری بات کیسے مان سکتا
ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ساحرہ کے بغیر شاید میں زندہ درگور
ہو جاؤں لیکن میں خود کو اپنی ہی نظروں میں نہیں گرانے چاہتا۔ تم
کیوں چاہتی ہو کہ میں خود کو اپنی نظروں سے گرا دوں۔“
”شاید میں پاگل ہو گئی ہوں۔“ شیا کی آواز رعد
گئی۔

احسن نے محسوس کیا کہ شیا کی آنکھوں میں آنسو بھی
آگئے تھے۔ احسن نے جھپک کر شیا کا چہرہ دیکھا۔ اس کی
آنکھیں واقعی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

”تم رو رہی ہو؟“ احسن حیرت سے بولا۔
”نہ! نہ!..... شیا کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک
رہے۔“

”شیا!“ احسن پھر حیرت سے بولا۔
شیا کچھ نہیں بولی۔ اچانک ایسا لگا تھا جیسے اس پر
ہیجان طاری ہو گیا ہو۔ ایسیلرینٹر پر اس کے پیر کا دباؤ بڑھ
گیا۔ کار کی رفتار خاصی تیز ہو گئی لیکن اس ویران سڑک پر وہ
رفتار کسی حادثے کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں شیا؟“ احسن پریشان ہو گیا تھا۔
”احسن!“ شیا لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے
سوچا تھا، میں کسی طرح بھی اپنی زندگی بے کسی گزار دوں گی۔“
”تو ساحرہ کی شادی سے اس میں کیا رکاوٹ آ سکتی
ہے؟“

”مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا حل نہیں نکل سکتا، لیکن یہ میری
سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ تم اس کے لیے کیوں بے چین ہو کہ
اس کی شادی بھی سے ہو۔“

”اس لیے کہ تم اسے بے تحاشا چاہتے ہو۔ میں جانتی
ہوں کہ تم اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکو گے۔“ شیا جذباتی
ہو گئی۔ ”میرا مطلب ہے، تم اس طرح نہیں جی سکو گے جس
طرح زندہ رہنا چاہیے۔“

”ہاں۔“ احسن کے لہجے میں درد تھا۔ ”لیکن.....
لوگ کہتے ہیں، وقت گزرتا رہتا ہے تو یادوں پر دھول جمتی
ہلی جاتی ہے۔“

”تمہاری یادوں کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اس پر دھول
جننے میں برسوں لگ جائیں گے اور اس طویل عرصے میں تم
شاید جینے کے معنی بھی نبھول جاؤ۔ میں صرف سانس لینے کو
زندگی نہیں سمجھتی۔“

”تمہاری دوست تو خوش ہے نا!“
”ہاں۔ اس کے خیالات غیر معمولی طور پر عجیب ہیں۔
میں نے بتایا نا کہ ایک معاملے میں غیر معمولی طور پر اہتار مل
ہونے کی وجہ سے وہ ہر معاملے میں اہتار مل ہو گئی ہے۔ اس
کے خیال میں شادی اور محبت، دو الگ الگ باتیں ہیں۔“

”میں اس کے خیالات سے، اس کی اہتار ملی سے اچھی
طرح واقف ہوں لیکن میں اس کی خواہش پوری نہیں
کر سکتا۔“ احسن ایک دم چپ ہو گیا۔ آخری جملہ بے
اختیاری میں اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ مناسب نہیں سمجھتا
تھا کہ ساحرہ کی اس خواہش کے بارے میں کسی کو کچھ بتائے۔

”خواہش۔“ شیا زیر لب بڑبڑائی۔ اس کے چہرے
پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں
ڈوب گئی ہو۔ احسن کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
”خواہش۔“ وہ پھر بڑبڑائی۔

احسن چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شیا کو
یہ سب باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

شیا کچھ توقف سے بولی۔ ”کیا اس کی خواہش کا تعلق
اس کی اہتار ملی سے ہے؟“

احسن پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے خود پر جنون لگتا ہوئی
تھی۔ وہ ایک ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی۔
شیا کو ساحرہ کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ وہ صرف
ایک لفظ ”خواہش!“ سے شاید حقیقت کی تک پہنچ گئی تھی۔

”احسن!“ شیا کچھ توقف سے بولی۔ ”اگر تم اس کی
شرط مان لیتے تو کیا وہ تم سے شادی کے لیے، تمہیں ملازمت

منیٹیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اسے آپ سے میری ملاقات کا علم
ہو۔ اوہ، سوری! میں پھر آپ کہہ بیٹھی۔“
”تم نے مجھے بلایا کیوں ہے؟“ احسن نے بے تابی
سے پوچھا۔ ”ساحرہ کے بارے میں تم مجھ سے کیا بات کرنا
چاہتی ہو؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”مجھے اندازہ ہے کہ تم اس بارے میں بات کرنے
کے لیے بے چین ہو گے۔“ شیا بولی۔ ”میں نے بھی اسی کے
بارے میں بات کرنے کے لیے تم سے ملنا ضروری سمجھا تھا۔
تم دونوں کے معاملات مجھ سے کبھی پوشیدہ نہیں رہے۔ مجھے یہ
بھی معلوم ہے کہ وہ تمہیں اپنی شادی کے بارے میں بتا چکی
ہے جو کل ہی ہو رہی ہے۔ آخر تم یہ ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے
کہ ملازمت ملنے سے پہلے شادی نہیں کرو گے۔“

”یہ ضد کی نہیں، میرے اصول کی بات تھی۔“ احسن
نے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ”لیکن اس کی
دوسری جگہ شادی کی وجہ میرا یہ اصول نہیں ہے۔“

”میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ تمہارا اصول ہی تھا۔“
”نہیں۔“ احسن نے جواب دیا۔ ”وجہ کچھ اور ہے۔“
”وہ کیا ہے؟“

”تم نے کہا تھا کہ تمہیں ساحرہ کے بارے میں بات
کرنا ہے۔ اس سے میں سمجھا تھا کہ تم مجھے ساحرہ کے بارے
میں یا اس کی شادی کے بارے میں کوئی خاص بات بتانا
چاہتی ہو لیکن تم نے تو مجھ سے ہی سوالات شروع کر دیے۔“
”میں وجہ اس لیے جانتا چاہتی ہوں کہ اگر اس کا کوئی
حل نکل سکے تو..... تو..... شاید.....“

شیا کی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ اس
سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ شیا نے غالباً جان بوجھ کر
گاڑی اس سڑک پر موڑی تھی۔ ٹریفک کی حد درجہ کمی کے
باعث کہا جاسکتا تھا کہ وہ سڑک ویران تھی۔

احسن سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا، پھر
بولا۔ ”تم نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔“

”حل نکلنے کی صورت میں۔“ شیا کا لہجہ دھیمہ تھا۔
”ممکن ہے کہ ساحرہ اب بھی اس شادی سے انکار کر دے جو کل
ہی ہے۔ میں اس سے بات کر لوں گی۔ اس معاملے میں وہ اتنی
اہتار مل ہے کہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ وہ اس
شادی سے انکار کر دے اور اس کی شادی تمہی سے ہو۔“

”تمہارے لہجے میں اعتنا نہیں ہے۔“
”تم ٹھیک سمجھے ہو احسن!“ شیا نے ٹھنڈی سانس
لی۔ ”لیکن میں کوشش تو کر سکتی ہوں اگر وجہ معلوم ہو جائے۔“

ڈرائیور کو اس نے ریٹورنٹ کا نام بتایا۔
ٹیکسی چل پڑی۔ احسن کا دماغ اس وقت بہت زیادہ
الجھا ہوا تھا۔ نہ جانے کون لڑکی ہے اور ساحرہ کے بارے میں
اس سے کیا بات کرے گی؟ وہ سوچتا رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں
لگا سکا۔

ٹیکسی ریٹورنٹ کے سامنے رکی تو احسن نے جلدی
سے اتر کر اپنا پرس نکالا۔ وہ کرایہ ادا کر رہا تھا کہ ایک قیمتی کار
قریب آ کر رکی۔

”سینے احسن!“ نسوانی آواز تھی۔ ”میں نے ہی بلایا
ہے آپ کو۔“

احسن نے چونک کر دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی
ہوئی لڑکی شیا تھی۔ کالج میں احسن کی اس سے بھی بات چیت
نہیں رہی تھی اور کالج چھوڑے ہوئے اسے ایک سال گزر
چکا تھا۔ شیا کا چہرہ شاید اسے یاد نہ رہتا لیکن ساحرہ کیونکہ شیا
کا تذکرہ کرتی ہی رہتی تھی اس لیے وہ شیا کو فوراً پہچان گیا۔

ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے احسن کار کے قریب گیا۔
”چلیں۔“ وہ ریٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے شیا سے بولا۔

”اب یہیں مل گئے ہیں تو ضرورت نہیں ہے
ریٹورنٹ میں بیٹھنے کی۔ آپ گاڑی ہی میں آ جائیں۔“ شیا
نے کہا۔

احسن قدرے متذبذب رہا لیکن پھر کار میں بیٹھ گیا
جس کا دروازہ خود شیا ہی نے کھول دیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی
شیا کا حرکت میں لے آئی۔ اس وقت احسن کے ذہن میں
یہ خیال چکر رہا تھا کہ شیا یقیناً ساحرہ کے بارے میں اہم
باتیں کر سکتی ہے۔ وہ جانتا ہی تھا کہ ساحرہ اسٹیڈی کرنے کے
لیے اس کے گھر جایا کرتی تھی۔

”آپ یقیناً بہت الجھ رہے ہوں گے احسن!“ شیا
بولی۔

”پلیز!“ احسن نے کہا۔ ”ایک کالج میں پڑھتے
ہوئے اگر ایک دوسرے کے ساتھ آپ جناب کے ساتھ
بات کریں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کو تم کہہ کر
بھی مخاطب کر سکتے ہیں۔“

”دراصل میرا خیال تھا احسن کہ آپ..... میرا مطلب
ہے..... تم شاید اتنی بے تکلفی پسند نہ کرو۔“

”تم نے فون پر اپنا نام کیوں نہیں بتایا تھا؟“ احسن
نے پوچھا۔
”مجھے ڈر تھا کہ میرا نام جان کر آپ ساحرہ کو فون نہ کر

ابن بھی آیا تھا گھر سے! میں جواب بھی دے چکی ہوں کہ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی۔

”ہاں شیا!“ احسن دھیمی آواز میں بولا۔ ”آدمی رات تو ہو گئی۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔“

احسن کی پلکیں پونچھل ہونے لگی تھیں۔ یہ اسی دیر جانے والے کپسول کا اثر تھا۔ ڈاکٹر نے چاہا ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آرام کر لے۔ اس نے شیا کو رخصت ہوتے دیکھا اور پھر نیند کی آغوش میں جا کر۔

جب وہ جاگا تو صبح ہو چکی تھی۔ عابدہ اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے اور آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ رات بھر جاگتی تھیں۔ ”اب تمہیں بالکل بخار نہیں ہے۔“ وہ شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”ہاں نقاہت ضرور ہوگی۔ چلو میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔ ہاتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر کھلی کر لو۔ پھر میں تمہارے لیے ناشا تیار کر کے لاتی ہوں۔ تمہارے ابو جان کو کوئی ضروری کام تھا۔ تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر چلے گئے ہیں۔“

احسن نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ نو بجنے والے تھے۔ احسن کو اشتباہ محسوس نہیں ہو رہی تھی اس لیے اس نے صرف کارن فلیکس لے لیا۔

”چلو اب تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ کچھ سلائس وغیرہ لے لینا یا جیسا تم چاہو۔ ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کا پریز نہیں بتایا ہے۔“

احسن نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ جاگنے کے چند لمحوں بعد سے ہی اس کے دماغ میں ساحرہ کی شادی کا خیال اور شیا کی باتیں چکرانے لگی تھیں۔ شیا کی یہ بات اس کے لیے معما بنی ہوئی تھی کہ اس کی خوشی اسی میں ہے کہ احسن خوش رہے۔

”احسن!“ عابدہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”تمہاری دوست ہے تو بہت خوب صورت!..... شادی تو شاید نہیں ہوگی ابھی اس کی!“

”جی۔“ احسن نے ماں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”شادی تو ابھی نہیں ہوئی۔“

”تمہیں کیسی لگتی ہے؟ کیا اپنی بہو بنالوں اسے؟“

احسن نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ”اس طرح نہ سوچئے ای جان! وہ بہت بڑے گھرانے کی بیٹی ہے۔ زنجانی شوگر ملز اس کے والدین کی ہیں۔“

”اس کے مزاج میں تکبر تو نہیں ہے۔“

”یہ الگ بات ہے۔“ احسن نے کہا، پھر جلدی سے بولا۔ ”چائے پلا دیں ای جان! عادت ہے نا اس کی اس میں

کہا۔ اس وقت ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

زیریں محبت سے احسن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو بیٹا؟“

”ٹھیک..... شاید..... ٹھیک تو ہوں۔“ احسن کی آواز میں کمزوری تھی۔ ”کیا میں بے ہوش ہو گیا تھا۔“

”پہلے انہیں یہ کپسول کھلا دیجیے!“ شیا نے ایک کپسول اور پانی کا گلاس بڑھاتے ہوئے زیریں سے کہا۔

احسن نے خود اٹھنا چاہا لیکن زیریں اور عابدہ نے یہ ایک وقت اسے سہارا بھی دیا۔ کپسول کھانے کے بعد وہ لیٹا تو اس کی نظر ایک طرف ڈیکورٹ کلاک پر پڑی۔ بارہ بجتے والے تھے۔

”رات ہو گئی۔“ وہ چونک کر بولا۔

”چار گھنٹے تو اسپتال میں رہے ہو تم۔“ عابدہ نے بتایا۔

پھر احسن کو تفصیل معلوم ہوئی۔ اس پر غشی طاری ہو گئی تھی اس لیے اسے فوری طور پر اسٹریچر پر ڈال کر ایک کمرے میں لے جایا گیا تھا جہاں اسے ایک کپسول کھلانے کے بعد اسے ابلیشن لگایا گیا تھا جس کے بعد اس پر گہری غنودگی طاری ہو گئی تھی۔

شیا نے عابدہ کو فون کر کے صورت حال بتا دی تھی۔ ان کا فون نمبر اسے احسن کے موبائل میں مل گیا تھا۔ عابدہ اور زیریں گھبرائے ہوئے وہاں پہنچے تھے لیکن اتنا وقت گزر جانے کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب تشویش کی کوئی بات نہیں کیونکہ بخار کم ہونے لگا تھا۔

شیا نے احسن کے والدین کو بتایا تھا کہ وہ احسن کی کالج کے زمانے کی دوست ہے۔ اس نے احسن کو ٹیکسی میں دیکھا تھا تو اسے ٹیکسی سے اتر کر اپنی کار میں اسپتال لے گئی تھی۔

چار گھنٹے بعد انہیں اس بات کی اجازت ملی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو احسن کو گھر لے جائیں۔ اسے ایبوسلینس میں گھر لاکے بستر پر لٹایا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اسے جگایا نہ جائے اور جب وہ خود جاگے تو اسے کپسول کھلا دیا جائے۔ کپسول کے علاوہ صرف ٹیبلٹس نہیں جو اسے چار چار گھنٹے سے کھلانے کی ہدایات کی گئی تھیں۔

”اب تو تم جاؤ بیٹی!“ عابدہ نے کہا۔ ”تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔“

”نہیں ہوں گے۔“ شیا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں نے پہلے ہی فون کر دیا تھا کہ کسی دوست کی بیماری کے باعث اسپتال میں رک گئی ہوں۔ ابھی ایس ایم

دراز ہو جاؤ۔“

”میں ہی ٹھیک ہے شیا!“ احسن نے اپنا سر پشت گاہ سے لٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ شیا کی ساحرہ کے بارے میں باتوں کے باعث اسے اپنی حالت کا احساس ہی نہیں رہا تھا لیکن اب اس نے محسوس کیا کہ اسے چکر سا آ رہا تھا۔

”بڑی غلطی ہوئی مجھ سے کہ میں نے تمہیں اس وقت بلایا۔“ شیا کی آواز احسن کو کچھ دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”شیا!“ احسن آنکھیں بند کیے بڑبڑایا۔ ”تمہاری خوشی..... میری خوشی..... تعلق.....“ بے ربط الفاظ کے باوجود احسن کی بات واضح تھی۔

”خاموشی سے آرام کرو احسن!“ شیا نے جھرجھراتی سی آواز میں کہا۔ ”تمہیں بہت تیز بخار ہے۔ آرام کرو۔ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔“

”جب..... جب گھر سے..... چلا تھا تو.....“

”ہاں اس وقت بخار اتنا تیز نہیں ہوگا۔“ شیا اس کی بات سمجھ کر تیزی سے بولی۔ ”لیکن اب بہت تیز ہے۔ شاید ایک سو تین سے بھی زیادہ!“



شیا کا اندازہ غلط تھا یا اسپتال پہنچتے پہنچتے بخار میں مزید تیزی آئی تھی۔ ڈاکٹر پیر پیر لپٹے کے بعد حیرت سے احسن کی طرف دیکھنے لگا۔

”یقین نہیں آتا کہ آپ اپنے پیروں پر چل کر آئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہاسپٹلائز ہو جائیں، فوری طور پر۔“

اب خود احسن کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اس کی حالت خاصی غیر ہو گئی گی۔ سر گھومتا ہوا سالگ رہا تھا۔

”نمبر پچر کیا ہے ڈاکٹر؟“ احسن نے شیا کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنی اور پھر وہ اس طرح ڈمگایا جیسے کرسی سمیت گر پڑے گا۔ ڈاکٹر کے اسسٹنٹ نے اسے فوراً سنبھالا۔ پھر احسن کے ساتھ جو کچھ ہوا یا جو کچھ اس نے دیکھا، وہ کسی بکھرے ہوئے خواب کے مانند تھا۔ کوئی کرا..... ڈاکٹر..... زیریں..... شیا..... پھر بازو میں ہلکی سی جھن جس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

غشی تھی، غنودگی تھی یا نیند؟

یہ احسن کے لیے ایک سوال تھا جب اسے ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس وقت اپنے گھر میں ہی بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ شیا کے علاوہ اس کے والدین بھی اس کے بستر کے قریب تھے۔

”شکر ہے تیرا، مولا!“ عابدہ نے اوپر دیکھتے ہوئے

”تم خوش نہیں رہ سکو گے۔“

”تو اس سے تمہاری خوشی کا کیا تعلق؟“ احسن کے لہجے میں پھر حیرت آ گئی۔

”بے تعلق! بہت گہرا تعلق ہے۔“ شیا نے کہا۔ اب اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔

اس سے پہلے کہ احسن پھر کچھ کہتا، اس کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا۔ اسے یقین تھا کہ کال اس کی ماں کی ہوگی۔

شیا سے باتوں میں وہ اپنی ماں کو کال کرنا بھول ہی گیا تھا۔

”جی ای جان!“ اس نے موبائل کان سے لگایا۔

”پریشان کر دیا تم نے!“ عابدہ کی آواز آئی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ اسپتال سے فون کر دینا لیکن اب تو اتنی دیر ہو چکی ہے کہ تمہیں اسپتال سے واپس بھی آ جانا چاہیے تھا۔“

”مسئلہ ہو گیا ہے ای! میں اسپتال آ گیا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب دوسرے مریضوں میں بہت مصروف ہیں۔ آپ فکر نہ کیجیے! میری طبیعت زیادہ خراب نہیں ہے۔“

یہ ایک شیا نے بڑی تیزی سے بریک لگائے۔

چرچاہٹ کی آواز خاصی تیز تھی۔

”ہیں؟“ عابدہ حیرت سے بولیں۔ ”یہ آواز کیسی تھی؟“

”ایک احمق وارڈ بوائے۔“ احسن کو پھر جھوٹ بولنا پڑا۔ ”بڑی تیزی سے اسٹریچر کھینچ کر لے گیا ہے۔“

شیا نے کار سڑک کے کنارے روک دی اور اپنی آنکھیں خشک کر کے احسن کی طرف دیکھنے لگی۔

”اچھا خیر!“ عابدہ بولیں۔ ”ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد مجھے ایک فون ضرور کر دینا۔“

”اچھا ای جان!“ احسن نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

”احسن!“ شیا تیزی سے بولی۔ ”تمہاری طبیعت خراب ہے؟“

”معمولی سا بخار ہے۔“

”اب میں نے غور سے دیکھا ہے تمہیں.....! تمہارا چہرہ تپ رہا ہے احسن!“ شیا نے کہتے ہوئے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ احسن کی کلائی پر رکھ دیا۔ ”اوہ گاڈ!“ اس کے منہ سے نکلا۔ ”تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ تمہیں پہلے ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے تھا احسن! مجھ سے بعد میں مل لیتے۔“ شیا پھر گاڑی حرکت میں لائی اور اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میں تمہیں اسپتال لے چلتی ہوں۔ تم سیٹ پیچھے کر لو۔ آرام سے

لگا لگا سا درد ہونے لگا ہے۔

”ابھی لاتی ہوں بیٹا!“ عابدہ جلدی سے اٹھ گئیں۔

دراصل احسن یہ چاہتا تھا کہ اس موضوع پر زیادہ بات نہ ہو جو اس کی ماں نے چھیڑ دیا تھا۔ تنہائی ملتے ہی اس کی دماغی رو پھر چل پڑی۔ اسے اندازہ ہی نہیں، بڑی حد تک یقین تھا کہ ساحرہ کی شادی کا صدمہ ہی اس کے بخار کا سبب بنا تھا۔

ساحرہ کی شادی اسی دن ہونے والی تھی۔ احسن کے لیے اس کا خیال اذیت ناک تو تھا لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس کے دماغ میں یہی بات آئی کہ ساحرہ سے اس کی شادی نہ ہونا ہی اس کے حق میں بہتر رہا ہے۔ ساحرہ کے انداز فکر سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ اگر وہ اس کی بیوی بنتی تو بھی خود کو اس کی ملکیت نہیں سمجھتی۔ گویا وہ ایسے معاملات میں بھی آزاد ہوتی جو احسن کے لیے ناقابل برواشت ہوتے۔ ساحرہ سے اس کی شادی اس کے لیے سوہان روح بن کر رہ جاتی۔

ساحرہ کے بارے میں سوچ کے ساتھ شیا کا خیال بھی اس کے دماغ میں گڈبڈ ہو رہا تھا۔ شیا اس سے باتیں کرتے کرتے رونے بھی لگی تھی۔ اس پر کچھ بیجان بھی طاری ہو گیا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ احسن کی شادی ساحرہ سے ہو ورنہ وہ زندگی بھر خوش نہیں رہ سکے گا جس کی وجہ سے وہ بھی خوش نہیں رہ سکے گی۔

یہ آخری بات احسن کے لیے کسی معنی سے کم نہیں تھی۔ عابدہ چائے بنانا لگیں۔ احسن نے پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔

”کون آگیا!“ عابدہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولتی ہوئی اٹھیں۔ ”تمہارے خیال سے تمہارے ابو جان تو جلدی نہیں آگئے۔“

احسن نے چائے کا دوسرا گھونٹ لیا۔ عابدہ کمرے سے جا چکی تھیں۔ احسن نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے اپنا موبائل نظر نہیں آیا۔

ای جان نے ہی کہیں رکھ دیا ہوگا، اس نے سوچا اور شاید بند بھی کر دیا ہو۔

پھر اس وقت وہ چونک پڑا جب عابدہ کے ساتھ ہی اس نے شیا کو بھی کمرے میں آتے دیکھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پھلوں کی باسکٹ اور دوسرے ہاتھ میں گل دست تھا۔

”ہیلو احسن! ہاؤ آر یو!“ وہ مسکراتی ہوئی آگے آئی، پھر فوراً ہی ہنس کر بولی۔ ”یہ بھی میں نے رسا پوچھ لیا۔ تم بالکل ٹھیک نظر آ رہے ہو۔“

احسن مسکرا دیا۔ شیا نے پھلوں کی باسکٹ احسن کے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھی اور گل دست اس کی طرف بڑھایا۔ ”تھینک یو شیا!“ احسن نے گل دست لے لیا۔

”میں تمہارے لیے بھی چائے بنا کر لاتی ہوں بیٹی!“ عابدہ نے کہا۔ شیا نے تکلفاً بھی انکار نہیں کیا۔ عابدہ کے جاتے ہی اس نے جلدی سے اپنا پرس کھولا اور ایک لفافہ نکال کر احسن کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ جلدی سے اپنے بچے کے نیچے رکھ لو۔ جب میں چلی جاؤں، جب دیکھنا۔“

”کیا ہے؟“ احسن نے لفافہ لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”میری ممکنہ شادی کا دعوت نامہ۔“ شیا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

احسن دھیرے سے ہنس دیا۔ ”ممکنہ شادی؟“ ”ہاں۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ ”جب تک کوئی کام ہونہ جائے، یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہو گیا۔ اسے ممکنہ ہی سمجھنا چاہیے۔“

”اچھا!“ احسن نے کچھ تعجب سے کہا۔ ”بہر حال!..... ٹھیک مبارک باد۔“

”ٹھیک مبارک باد مجھے قبول نہیں! وقت پر ہی دینا۔ اچھا لفافہ تو رکھ لو نیچے کے نیچے!“

”ابھی دیکھ لوں تو کیا حرج ہے؟“ ”میں چاہتی ہوں، میرے ممکنہ شوہر کا نام تم کو میرے سامنے نہ معلوم ہو۔“

”عجب.....“ احسن اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے لفافہ نیچے کے نیچے رکھ لیا۔

عابدہ چائے لیے ہوئے اندر آئیں۔ ”ارے!“ شیا نے جلدی سے اٹھ کر پیالی ان کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ ”اتنی جلدی بتالی چائے۔“

”کسی کام کے لیے پانی گرم کرنا تھا۔ مائیکرو ویو پر رکھ کر ہی آئی تھی احسن کو چائے دینے۔ اتنے میں تم آ گئیں۔ جا کر دیکھا تو پانی کھولا ہی تھا۔ اسی سے ایک پیالی بتالی۔“ عابدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”شکریہ ای!“

”لو! پھر کوئی آگیا۔“ عابدہ بولیں۔

کال بیل کی آواز سنائی دی تھی۔ عابدہ دیکھنے چلی گئیں۔

اچھوتی محبت

”تمہیں اب بالکل بخار نہیں ہے۔“ شیا نے احسن کی کلائی چھو کر کہا، پھر بولی۔ ”تمہیں اتنی جلدی ٹھیک ہونا ہی تھا۔ بس ساحرہ کی شادی کا صدمہ دھیرے دھیرے اثر انداز ہوتا رہا تھا۔ یہ بات میں نے ڈاکٹر کو بھی بتادی تھی۔“

احسن چونکا۔ ”ساحرہ کے بارے میں؟“ ”اتنی بے وقوف تو نہیں ہوں احسن!“ شیا نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے بس اتنا بتایا تھا کہ تمہیں ایک شدید صدمہ پہنچا ہے۔ بعد میں ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا خیال بالکل درست نکلا۔ تمہارے جسم میں کسی وائرس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ ایک گھنٹے میں تمہارے کئی بلڈ ٹیسٹ کر لیے گئے تھے۔“

”ہوں!“ احسن نے ٹھنڈی سانس لی۔ شاید اس نے شیا کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا، اسے ساحرہ یاد آ گئی تھی۔

شیا نے اس کی ٹھنڈی سانس سے شاید کچھ سمجھ لیا اور اسی لیے احسن کا دھیان ہٹانا چاہا۔ ”ابھی دوا کی ایک خوراک تو ہاتی ہوگی جو بارہ بجے کے لیے تھی۔“

”ہاں۔“ ”نہیں۔ اب وہ مت کھانا۔ امی نے نہیں بتایا؟ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بخار بالکل اتر جائے تو پھر کوئی خوراک لینے کی ضرورت نہیں۔“

”بس کچھ یاد رکھا ہے تم نے!“ احسن پیمکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”کاش کوئی اور خیال رکھتا میرا۔“

”بس اب غذا پر دھیان دینا ہے تمہیں۔“ شیا نے جلدی سے بات بدلی۔

قدموں کی آہٹیں قریب آنے لگی تھیں۔ احسن نے اپنے والد کی آواز پہچان لی۔ وہ عابدہ کو کچھ بتاتے ہوئے آرہے تھے۔

”چلیں اچھا ہے۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عابدہ نے زبیری سے کہا۔ ”ایک دن کے بخار نے بہت کمزور کر دیا ہے احسن کو.....! وہ بھی آب و ہوا بدل لے گا تو اچھا رہے گا۔“

”کیا معاملہ ہے ابو جان؟“ احسن نے پوچھا۔ زبیری نے بستر کے قریب آتے ہوئے، احسن کو جواب دینے سے پہلے شیا کے سلام کا جواب دیا، پھر کہا۔ ”بیٹا تم جانتے ہی ہو کہ مجھے اپنے ایک کلائنٹ کے معاملات میں کسی سے بات کرنے کے لیے سال میں ایک آدھ بار اسلام آباد جانا پڑتا ہے۔ آج اچانک کچھ ایسی صورت بنی ہے کہ اب کل ہی مجھے اسلام آباد جانا پڑے گا اور تم جانتے ہی ہو کہ

”میرا معاملہ ہے ابو جان؟“ احسن نے پوچھا۔ ”کیونکہ احسن نے زبیری کو ابو جان کہہ کر مخاطب کیا تھا اس لیے شیا نے بھی ایسا ہی کیا۔“

زبیری اپنے کلائنٹ سے فوراً کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ فون کرنے کے لیے دہاں سے چلے گئے۔ عابدہ بیٹھی رہیں۔

”میرا فون کہاں ہے امی جان؟“ احسن نے پوچھا۔

اچھوتی محبت

تمہاری امی جان میرے ساتھ ضرور جاتی ہیں۔ اب اس مرتبہ تم بھی چلے چلو۔ صحت پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”نہیں ابو جان!“ احسن نے کہا۔ ”آپ دونوں ہی چلے جائیے.....! میں پہلے بھی کبھی آپ کے ساتھ نہیں گیا۔“

”اس مرتبہ چلے چلو۔“ زبیری نے کہا۔ ”تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری امی جان کا دل بیٹیں لگا رہے گا۔“

”میری صحت کو کیا ہوا۔ اب میں ٹھیک ہوں، شام تک آپ مجھے اور بہتر پائیں گے۔ کل صبح تک میں بالکل ٹھیک نظر آؤں گا۔“

”اگر کل صبح تک بالکل ٹھیک نظر نہیں آئے تو چلنا پڑے گا۔“ عابدہ بولیں۔

”ٹھیک ہے۔“ احسن نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

عابدہ بیگم اور زبیری میں اتنی ہی محبت تھی کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لیے بھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوئے تھے۔ احسن نے سنا تھا کہ شادی کے بعد عابدہ ایک رات کے لیے بھی اپنے والدین کے گھر نہیں رکی تھیں۔ زبیری شہر سے جب بھی کسی کام سے کہیں جاتے تھے، عابدہ ضرور ان کے ساتھ جاتی تھیں۔

”میں تو تین گھنٹے بنواتا ہوا لایا ہوں۔“ زبیری بولے۔

احسن نے کہا۔ ”اگر کل صبح میں بالکل ٹھیک نظر آؤں تو ایک گھنٹہ کینسل کرواد بیچے گا۔ آپ کی واپسی کب ہوگی؟“

”بس ایک دن بعد! کل صبح گیارہ بجے کی فلائٹ ہے۔ پرسوں صبح کی فلائٹ سے واپسی ہوگی۔ اگر تم بھی ساتھ ہوئے تو ایک آدھ دن کے لیے مری ہو آئیں گے۔“

اس دوران میں شیا بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی۔ بیٹے سے بات کرنے کے بعد زبیری اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس سے چند باتیں کیں اور اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ان کے بیٹے کا اتنا خیال رکھا۔

”شرمندہ نہ کیجیے ابو جان!“

”کیونکہ احسن نے زبیری کو ابو جان کہہ کر مخاطب کیا تھا اس لیے شیا نے بھی ایسا ہی کیا۔“

”وہ میں نے بند کر کے دراز میں ڈال دیا تھا، شیا بیٹی! وہ نکال کر دے دو احسن کو۔“

شیا جس کرسی پر بیٹھی تھی، وہ احسن کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل کے قریب تھی۔ شیا نے سائڈ ٹیبل کی دراز سے موبائل فون نکال کر احسن کو دے دیا۔

”رات دس بجے ساحرہ کی کال آئی تھی۔“ شیا آہستہ سے بولی۔ ”تجھی اسی جان نے فون بند کر دیا تھا اور گھر آ کے دراز میں ڈال دیا تھا۔“

”یہ ساحرہ کون ہے بیٹا!“ عابدہ نے پوچھا۔ ”پہلے بھی ایک بار اس کی کال آئی تھی تو میں نے تمہارا موبائل بند کر دیا تھا۔“

احسن سے پہلے شیا بول پڑی۔ ”وہ بھی ہماری کالج کی دوست ہے ای جان!“ پھر شیا کھڑی ہو گئی۔ ”اب میں چلوں گی۔“ پھر اس نے فون کر احسن سے کہا۔ ”اب خوب پھل وغیرہ کھاؤ۔ سوپ پیو، کھانا کھاؤ، صبح تک تمہیں بالکل ٹھیک ہونا ہے ورنہ تو پھر جانا ہی پڑے گا تمہیں ای جان اور ابو جان کے ساتھ۔“

احسن خفیف سا مسکرا دیا۔

♥ ♥ ♥

ساحرہ کی شادی کی تیاریاں گزشتہ روز سے ہی شروع ہو گئی تھیں۔ جو تیاری ساحرہ کے گھر کی طرف سے ہونا چاہیے تھی، وہ بھی آغا نصیر ہی کروا رہا تھا۔ ساحرہ کے والدین کی مالی حالت ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ اتنا پسپا خرچ کر سکتے۔

وہ تیاریاں آغا نصیر کی پرسنل سیکریٹری عشرت اعوان کر رہی تھی جس کی عمر لگ بھگ پچاس پچپن سال ہو سکتی تھی لیکن اس نے خود کو بہت زیادہ مین مین کیا تھا۔ اس عمر میں بھی وہ دلکش نظر آتی تھی لیکن بہت سنجیدہ تھی۔ سارا دن اور دوسری صبح بھی ساحرہ کا اور اس کا ساتھ رہا تھا لیکن وہ ایک بار بھی مسکراتی نظر نہیں آئی تھی۔

گزشتہ روز ساحرہ صبح سے شام تک مسلسل عشرت اعوان کے ساتھ رہی تھی اور خریداری کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ بوتیک، جیولری شاپز، واپچ ہاؤسز اور جانے کہاں کہاں!

ساحرہ کی ماں بوجان اور باپ سرکار احمد کے لیے بھی کپڑے وغیرہ خریدے گئے تھے اور خاصے زیادہ پیسے دے کر اتنے ارجنٹ سلوائے گئے تھے کہ رات کو آٹھ بجے سے پہلے ل بھی گئے تھے۔ زیورات کی خریداری بوجان کے لیے بھی کی گئی تھی اور وہ بہت خوش تھی۔ اس کے برخلاف سرکار احمد کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا رہا تھا کہ وہ طوعاً و کرہاً

اور شاید بیوی کے دباؤ میں یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ ساحرہ کو عشرت اعوان سے معلوم ہوا تھا کہ آغا نصیر نے اس شادی سے پہلے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے اس کی ایک نو جوان بیٹی اور اس سے دو سال بڑا بیٹا تھا۔ ان دونوں کی ماں کا انتقال آٹھ سال پہلے ہوا تھا۔ انتقال کے ایک سال بعد ہی اس نے دوسری اور پھر تین سال بعد تیسری شادی کی تھی۔ ان دونوں بیویوں کی اموات پر اسرار انداز میں ہوئی تھیں۔

ساحرہ ”پراسرار موت“ کے ذکر پر زیادہ نہیں الجھی تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنی شادی پر لگا رہا تھا۔ وہ خوش تھی کہ اگلے دن سے اس کے بدن کا دوزخ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو جائے گا۔ اس دوران میں اسے خیال آتا رہا تھا تو صرف احسن کا۔ اس سے پہلی مرتبہ ایک بار فون بند ہونے کے بعد تو احسن نے اسے خود کال کر لیا تھا لیکن رات کو فون کرنے کے بعد احسن نے اپنا فون بند کرنے کے بعد مسلسل بند رکھا تھا۔

منالوں کی اسے بعد میں، ساحرہ نے سوچا تھا۔ رات ہی کو عشرت اعوان نے اس کے مہندی بھی لگوائی۔ مہندی لگوانے سے پہلے بھی ساحرہ نے احسن سے بات کرنا چاہی تھی مگر اس کا موبائل فون بند ملا تھا۔ بہت ناراض ہے لیکن مجھ سے بچ کر تھوڑی رہ سکے گا، ساحرہ نے مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں کہا تھا۔

رات ساحرہ نے بڑی بے چینی میں اور نہ جانے کیا کیا خواب دیکھتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح نو بجے عشرت اعوان اسے لینے آ گئی۔

آس پاس رہنے والے اس کار کی آمد و رفت کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے حالانکہ بوجان نے کئی پڑوسیوں کو بتا دیا تھا کہ اس کی بیٹی بیاہ کر ایک بہت بڑے گھر میں جا رہی ہے۔

عشرت جہاں ساحرہ کو ایک شاندار بیوٹی پارلر میں لے گئی وہیں ساحرہ نے وہ لباس بھی پہنا جو آغا نصیر نے خود خرید کر بھجوا دیا تھا۔

اینا میک اپ مکمل ہونے کے بعد ساحرہ نے آئینہ دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ خود کو ایک اجنبی روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بالوں کا اسٹائل بھی دیدنی تھا۔

بیوٹی پارلر سے ساحرہ کو ایک مسجد میں لے جایا گیا۔ نکاح وہیں ہونا تھا، ابتدا میں آغا نصیر نے سول میرج کی تجویز رکھی تھی جو سرکار احمد نے سختی سے رد کر دی تھی۔

مسجد میں سرکار احمد اور بوجان پہلے سے موجود تھے۔

اچھوتی محبت

انہیں لینے کے لیے آغا نصیر نے کار بھجوائی تھی۔ وہی کار انہیں واپس بھی لے جاتی۔

سرکار احمد کی خواہش پر پڑوس کے دو بزرگ بھی آ گئے تھے۔

نکاح کے بعد سرکار احمد اور بوجان نے بیٹی کو مسجد ہی سے رخصت کیا۔ ساحرہ اس شاندار کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کی سیٹ پر بیٹھی۔ ڈرائیونگ سیٹ خود آغا نصیر نے سنبھالی تھی۔ کار میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ عشرت اعوان مسجد سے کسی اور کار میں رخصت ہوئی ہوگی۔

آغا نصیر کی تصویر ساحرہ کو پہلے ہی دکھا دی گئی تھی لیکن اب وہ جیتی جاگتی حالت میں سامنے آیا تو وہ ساحرہ کو زیادہ متاثر کن محسوس ہوا۔ وہ لمبے قد کا ٹھہ اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی چمک بتا رہی تھی کہ خطاب لگانا اس کے لیے اب تک ضروری نہیں ہوا تھا۔

کار چل پڑی۔ ساحرہ نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ”تم خوش تو ہونا ساحرہ!“ آغا نصیر بولا۔

ساحرہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آغا نصیر ہنسا۔ ”میں نے بس بات کرنے کے لیے یہ وال کر دیا۔ مجھے عشرت اعوان سے معلوم ہو چکا ہے کہ تم خوش ہو۔ مجھے شہرت سے یہی خواہش تھی۔ دراصل بعض لڑکیاں زیادہ عمر کے شخص سے شادی کرنا پسند نہیں کرتیں۔“

ساحرہ خاموش رہی۔

”تم مجھے اتنا عمر دراز نہیں پاؤ گی جتنا میں ہوں۔“ آغا نصیر نے معنی خیز جملہ کہا۔

یہی تو میں بھی چاہتی ہوں، ساحرہ نے اپنے دل میں کہا۔

آغا نصیر پھر بولا۔ ”میں نے تمہارے والدین کے بارے میں بھی ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس پر عمل درآمد پہلے بھی کیا جاسکتا تھا لیکن میرا دھیان صرف تم سے شادی کرنے پر لگا رہا۔ کل مجھے خیال آیا تھا لیکن عشرت تمہارے معاملات میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ اس منصوبے کے سلسلے میں کچھ کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اچھا نہیں ہے تاکہ میری بیوی کے والدین ایک چھوٹے سے مکان میں پسماندگی کی زندگی گزاریں۔ اب عشرت نے اس منصوبے پر کام شروع کر دیا ہوگا۔ آج ہی تمہارے والدین کے لیے ایک خوب صورت فلیٹ خرید لیا جائے گا۔ آج ہی ایک انٹیریئر ڈیکورٹر کو وہ فلیٹ دکھا دیا جائے گا۔ کل فلیٹ کے لیے فرنیچر خریداجائے گا اور فلیٹ کو ڈیکوریت بھی کیا جائے گا۔“

پردے بھی کل ہی سل جائیں گے۔ فلیٹ میں شاید آدمی رات تک کام ہوتا رہے۔ پرسوں صبح تمہارے والدین اس فلیٹ میں منتقل ہو جائیں گے۔ ایک کار بھی انہیں شو فر کے ساتھ مل جائے گی۔ کچھ دن میں ایک اسکول بھی بنوادوں گا جو تمہارے والد چلائیں گے۔ اگر کوئی اچھا اسکول خریدا جاسکا تو وہ خرید لیا جائے گا۔“

ساحرہ خوشی سے پھولے نہیں سار ہی تھی۔ اس نے کبھی کبھی ایسی زندگی کے خواب تو دیکھے تھے لیکن اس معاملے میں سنجیدہ یا جذباتی نہیں ہوئی تھی۔ احسن اسے ایسی زندگی نہیں دے سکتا تھا جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہ تو اس کے جسم کی پکار تھی جس نے اسے آغا نصیر سے شادی کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ شاید وہ اس کے لیے آمادہ نہ ہوتی اگر احسن اس کی بات مان جاتا، اس کے جسم کی پکار سن لیتا۔

آغا نصیر جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا اور ساحرہ اپنے خیالوں میں کھوئی رہی۔ بس کبھی کبھی لاشعوری طور پر اثبات میں سر ہلا دیتی تھی۔ جب کار ایک پتکے کے پھاٹک سے اندر داخل ہوئی، اس وقت ساحرہ ایسی تدبیروں میں الجھی ہوئی تھی جن میں سے کسی ایک پر عمل کر کے وہ احسن کو مان سکتی۔

کار بہت ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رکی اور ساحرہ کے خیالات کی کڑیاں بکھر گئیں۔ ان کڑیوں کے بکھرنے کا سبب صرف کار کا ہلکا سا دھچکا نہیں تھا۔ اس کی نظر برآمدے میں کھڑی ہوئی شیا پر پڑی تھی۔

”یہ میری بیٹی شیا ہے۔“ آغا نصیر کی آواز ساحرہ کے صرف کانوں میں نہیں، کسی گونج کی طرح اس کے سارے وجود میں پھلتی چلی گئی۔ ”یہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑی ہے، اپنی نئی می کے استقبال کے لیے!“ یہ دوسری گونج تھی جو ساحرہ کے وجود میں پھیلی۔ ”تمہاری تو دوست ہے نا یہ!“ تیسری گونج!

ساحرہ کار سے اتری تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ کار کا دروازہ اس کے لیے ایک باوردی ملازم نے کھولا تھا۔ وہاں کچھ اور ملازم بھی اپنی نئی مالک کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

”کار کا دروازہ تمہیں کھولنا چاہیے تھا شیا!“ آغا نصیر کی آواز تھی۔

لیکن شیا دروازہ کیسے کھولتی! اسے تو جیسے ہو گیا تھا۔ وہ ساحرہ کو یوں نکلے جا رہی تھی جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو دیکھ رہی ہو۔

یہ ایک ساحرہ اتنی تیزی سے آگے بڑھی جیسے کسی نے

اسے خواب سے نکال کر اچانک حقیقت کی دنیا میں دکھیل دیا۔ وہ شیا سے لپٹ گئی۔
 ”جانی! جانی!“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”یہ تم ہو.....؟“
 ارے!..... جانی! میری جان!“ ساحرہ کا انداز بیجانی تھا۔ ”تم ہی ہو!“ میری پیاری شیا! میری جان! میری دوست!“
 ”اب صرف دوست نہیں۔“ آغا نصیر ہنس کر بولا۔
 ”اب یہ تمہاری بیٹی بھی ہے۔“
 ”نہیں۔“ ساحرہ کے منہ سے نکلا۔ ”یہ صرف میری دوست ہے۔“ پھر اس نے شیا کو جھوڑ ڈالا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟..... مجھے اس روپ میں دیکھ کر خوش نہیں ہوئی ہو؟“
 شیا نے آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر ساحرہ کے شالوں پر رکھ دیے اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اب وہ کتے کی حالت سے باہر آگئی تھی۔
 ”میری جان!“ ساحرہ نے کہتے ہوئے شیا کو چوم لیا۔

”اب اندر چلو بھی!“ آغا نصیر پھر ہنسا۔
 ”چلو!“ ساحرہ نے شیا کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔
 وہ تینوں ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ صوفے پر بیٹھنے کے بعد بھی ساحرہ، شیا سے لپٹی جا رہی تھی، اسے پیار کر رہی تھی۔
 ”کچھ ہماری بھی خبر لیں بیگم صاحبہ!“ آغا نصیر مسکراتا ہوا بولا۔ ”کیا صرف اپنی دوست سے ہی باتیں کرتی رہیں گی؟“
 اب ساحرہ چوکی۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھول ہی گئی تھی کہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس کا نکاح ہوا تھا۔ وہ دلہن تھی اور اس گھر میں اپنی دوست سے ملنے نہیں، اس گھر میں رہنے کے لیے آئی تھی۔ اس نے چونک کر خود کو شیا سے الگ کیا اور نظریں جھکا لیں۔ اس کی سانسیں بہت تیزی سے چلنے لگی تھیں۔
 ”کسی سے کھانا لگوانے کے لیے کہو شیا!“ آغا نصیر بولا۔

”عشرت! احوان کہاں ہیں؟“ شیا نے پوچھا۔
 ”وہ بہت معروف ہے، کل تک معروف رہے گی۔ کسی وقت آئے گی بھی تو ذرا دیر کے لیے.....! کسی ملازم سے کہہ دو کھانے کے لیے۔“
 شیا نے ایک ملازم کو بلا کر اس سے کھانے کی میز لگانے کے لیے کہا۔
 آغا نصیر نے ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شیا سے تو تم مل لیں۔ اس کے بڑے بھائی سے کچھ ہی عرصے بعد

مل سکو گی۔ میں نے اسے تعلیم کے لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ آکسفورڈ سے پڑھ کر آئے گا۔“
 اس بات سے ساحرہ کی ایک الجھن دور ہو گئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ لڑکی کے علاوہ آغا نصیر کا ایک بیٹا بھی ہے۔ ساحرہ کو ایک اور الجھن بہر حال لاحق ہو گئی تھی۔ شیا کو دیکھ کر وہ خود تو بہت خوش ہوئی تھی لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شیا اگرچہ اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ساحرہ نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ کچھ فکر مند تھی۔
 ”کھانا کتنے تک میں ذرا داش روم ہواؤں۔“ آغا نصیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 ساحرہ کو اس کی عدم موجودگی میں شیا سے کچھ باتیں کرنے کا موقع ملا۔
 ”کیا تم خوش نہیں ہو شیا!“ ساحرہ نے پوچھا۔
 ”یہ تم نے کیوں سمجھ لیا؟“
 ”میرا خیال ہے کہ تم کچھ فکر مند ہو!“
 ”فکر مند ہونا دوسری بات ہے۔“ شیا نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
 ”فکر مندی کی وجہ؟“
 ”بس کچھ ہے۔ ابھی اسے رہنے دو۔ کچھ دن بعد جنہیں شاید خود ہی معلوم ہو جائے۔ مجھے امید ہے کہ تم اصرار نہیں کرو گی۔“

”اچھا!“ ساحرہ نے طویل سانس لی۔ ”چھوڑ دیتی ہوں یہ ذکر! ایک اور بات بتاؤ۔ میں تو اپنی شادی کی تیاریوں میں اور شادی کے خیالوں میں الجھی ہوئی تھی اس لیے ایک بار سے میں ان سے تفصیل پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا۔ اب مجھے ان کی وہ بات یاد آرہی ہے۔ تمہاری والدہ کے بعد آغا صاحب نے مجھ سے پہلے دو شادیاں اور کی تھیں۔ عشرت! احوان نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی اموات پر اسرار انداز میں ہوئی تھیں۔ پر اسرار کیوں شیا؟“
 ”پہلی تو دم گھٹ جانے کی وجہ سے دنیا چھوڑ گئی۔“ شیا نے بتایا۔ ”حالانکہ کراچی میں گیس ہیٹر کا رواج نہیں ہے لیکن اسے سردیوں میں الیکٹرک ہیٹر کی گرمی پسند نہیں تھی۔ دراصل وہ رہنے والی پنڈی کی تھی۔ وہیں کی عادت پڑی ہوئی تھی اسے۔ ڈیڈی نے گیس ہیٹر لگوا دیا تھا۔ ڈیڈی ایک دن پہلے کسی کام سے عشرت! احوان کے ساتھ بیرون شہر گئے ہوئے تھے۔ وہ کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ رات کو کسی وقت گیس بند ہو جانے سے ہیٹر بجھ گیا لیکن گیس کی بندش وقتی طور پر بند

ہوئی تھی وہ دوبارہ جاری ہوئی۔ ہیٹر بجھا ہوا تھا، گیس کمرے میں بھرتی چلی گئی۔ اسی سے اس کا دم گھٹ گیا۔“
 ”یہ تو اتفاقی بات تھی۔ اسے پر اسرار کیوں سمجھا گیا؟“
 ”اس لیے کہ گیس کیوں بند ہوئی! کیا کسی نے وقتی طور پر دالو بند کیا تھا؟ اس سوال کا جواب پولیس کو نہیں مل سکا۔“
 ”پولیس تک بات چلی گئی تھی؟“
 ”ہاں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ پولیس کیسے آگئی تھی۔ کئی سال پرانی بات ہے۔ پولیس نے کچھ دن تحقیق کی، پھر فائل بند کر دی گئی۔“ شیا نے جواب دینے کے بعد کچھ کئی سے کہا۔
 ”ہماری پولیس کو فائل بند کرنے میں تو مہارت ہے نا!“
 ”ضروری بھی تو نہیں ہے کہ کسی نے دالو بند کیا ہو۔ مجھے ٹیکنیکل باتوں کا خود تو کوئی علم نہیں لیکن سنا ہے میں نے! کسی وقت گیس کی لائن میں از خود بھی کچھ گڑبڑ ہو جاتی ہے اور پھر از خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہے۔“
 ”بہر حال! عشرت! احوان نے ہی اسے پر اسرار قرار دیا تھا۔“
 ”اور دوسری کی موت؟“

”وہ کرنٹ کی وجہ سے ہوئی۔“ شیا نے بتایا۔ ”شاید اس نے قحط پکار کی ہو مگر اتفاق سے اس وقت بھی گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد ڈیڈی آئے تھے اور ہاتھ روم میں گئے تھے تو انہیں پتا چلا تھا، وہ بالکل جل بھن گئی تھی۔ دراصل ڈیڈی الگ سے پانی گرم کرنے کے لیے ہاتھ روم میں ایک الیکٹرک راڈ بھی رکھتے ہیں۔ جب ہاتھ ب میں اس کی لاش ملی تو راڈ اس میں گری ہوئی تھی۔ پانی بری طرح کھول رہا تھا۔ ہاتھ روم میں بھاپ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیڈی نے راڈ کا سوچ آن دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے سوچ آف کرنے کے بعد پولیس کو اطلاع دی۔ کھولتے ہوئے پانی سے لاش نکالنا ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔“

”یہ کیسے ہو گیا؟“ ساحرہ حیرت سے بولی۔ ”میرے گھر میں تو ہاتھ ب تھا نہیں لیکن میں نے پڑھا تو ہے۔ اس میں پانی بھرنے کے لیے گرم پانی کی لائن الگ ہوتی ہے۔“
 ”قیاس یہ کیا کیا تھا کہ الیکٹرک راڈ غالباً ہاتھ ب کے سرپائے کی طرف رگھی ہوئی ہوگی۔ دراصل وہ شراب بہت پینے لگی تھی۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے معلوم ہوا تھا کہ وہ اس وقت بھی بہت زیادہ شراب پیے ہوئے تھی۔ شاید وہ ڈگمگائی ہو اور اس کا ہاتھ نکلنے سے راڈ کا سوچ آن ہو گیا ہو۔ وہ اس سے بے خبر ہاتھ ب میں اتر گئی۔ پھر جب وہ نہا رہی

اچھوتی محبت

تھی تو شاید اس نے ہاتھ اوپر کیے ہوں۔ راڈ اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر ہاتھ ب میں گر گئی پانی کے جھینٹے اوپر جانے سے وہ خود ہی پھسل کر ہاتھ ب میں گر پڑی ہو۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا، بہر حال وہ موت اس طرح ہوئی تھی۔“ شیا جواب دینے کے بعد ایک بار پھر کئی سے بولی۔ ”ممکن ہے کہ دونوں ہی اموات اتفاقیہ ہوں لیکن عشرت! احوان نے اس موت کو بھی پر اسرار قرار دیا تھا۔“

”کیوں؟“ ساحرہ حیرت سے بولی۔ ”عشرت! احوان نے اسے کیوں پر اسرار قرار دیا؟“
 ”دراصل.....“ شیا کے لہجے میں اب بھی تلخی تھی لیکن اسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ آغا نصیر داش روم سے آگیا تھا۔

کھانے کی میز لگائی جا چکی تھی۔
 کھانا کھانے کے بعد آغا نصیر نے مسکرا کر ساحرہ سے کہا۔ ”اچھا بیگم صاحبہ! تم اپنی دوست یا بیٹی سے باتیں کرو۔ ہم چلے دفتر! اب شام کو ملاقات ہوگی۔“
 ”صبح سے اب تک دفتر نہیں گئے!“ ساحرہ نظریں جھکائے دھیمی آواز میں بولی۔ ”اب کیا کام یاد آ گیا؟“
 ”تمہاری خاطر وقت نکالا تھا۔“ آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب جا کے تھوڑا سا کام دیکھ لوں کیونکہ کل تو..... اچھا خیر، چھوڑو! رات کو بتاؤں گا۔“
 ساحرہ کو اس خیال سے بڑی کوفت ہوئی کہ اب رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔

آغا نصیر کے جانے کے بعد وہ بولی۔ ”ہاں شیا! تم عشرت! احوان کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔“
 ”ہاں.....! تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں، مجھے ہی نہیں بلکہ بھائی جان کو بھی شبہ ہوا تھا کہ وہ ان اموات کو قتل ظاہر کر کے ہم بھائی بہن کو پھنسانا چاہتی ہے۔“

”کیا اس وقت تمہارے بھائی جان نہیں تھے۔“
 ”پہلی موت کے وقت وہ باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور دوسری موت جب ہوئی، ان دنوں وہ چند دن کی چھٹی لے کر آگئے تھے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔“
 ”لیکن وہ تم دونوں کی دشمن کیوں ہو گی؟“
 ”یہ تو میں نہیں کہہ سکتی۔ بس ایک شبہ ہے جو ممکن ہے کہ غلط ہو۔“

”تم اور تمہارے بھائی جان تو دوسری موت کے وقت گھر میں ہوں گے بھی نہیں..... ابھی تم بتا چکی ہو نا کہ گھر

میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔“

”ہاں گھر میں تو کوئی نہیں تھا۔ میں اور بھائی جان لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔“

”پولیس نے تم سے پوچھ چکے تھے۔“

”پوچھ چکے تو سبھی سے کی تھی۔ ملازمین سے بھی لیکن انہیں کسی قسم کے شواہد نہیں مل سکے تھے اور ہمارے منہ سے بھی ان کے کسی سوال کے جواب میں ایسا کوئی لفظ نہیں نکلا تھا کہ وہ اسی کو پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ بہر حال اس کیس کی فائل بھی بند ہو چکی ہے۔ ڈیڑی کی بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اتفاقیہ اموات تھیں ورنہ وہ کیس کی فائل بند نہیں ہونے دیتے۔“

ساحرہ نے سوچتے ہوئے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔ اس کے تصور میں عشرت اعوان کی شخصیت ابھر آئی تھی۔ پھر اسے کچھ اور خیال آیا۔ وہ پوچھ بیٹھی۔ ”لیکن اگر وہ قتل ہوئے تھے تو ان میں تم دونوں کا ہاتھ آخر کیوں ہوگا۔“

”وہ کیا؟“

”یہی کہ میں اپنی سوتیلی ماؤں سے حسد ہوگا۔“

”ہوں۔“ ساحرہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔

شیبا کچھ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”اس شادی سے تم اتنی خوش ہو کر اپنی ذہن میں ایک بار بھی تمہاری زبان پر احسن کا نام نہیں آیا۔“

ساحرہ ہنس دی۔ ”وہ بہت ناراض ہے مجھ سے۔ فون بھی ریسیو کرنا چھوڑ دیا ہے اس نے لیکن..... مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، منالوں کی میں اسے!“

”اب بھی ملتی رہو گی اس سے؟“

ساحرہ کچھ سنجیدہ ہوئی، پھر اس نے کہا۔ ”اب اگرچہ حالات بدل چکے ہیں لیکن میں اب بھی..... اور آغا صاحب کی بیٹی، یعنی تمہارے سامنے بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھے احسن سے محبت ہے اور رہے گی۔“

”کیا تم یہ بات ڈیڑی کو بھی بتا سکو گی۔“

ساحرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اگر ضروری ہو تو کسی مناسب موقع پر بتا دوں گی لیکن مجھے امید ہے کہ تم ان سے کچھ نہیں کہو گی۔“

شیبا اس کا منہ بھکتی رہ گئی۔

”نکل سے اب تک بہت تھک گئی ہوں۔“ ساحرہ پھر

بولی۔ ”اب آرام کرنا چاہتی ہوں لیکن..... وہ مسکرائی۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ اس گھر میں اب میرا کرا کہاں ہے۔“

”اب ظاہر ہے کہ ڈیڑی ہی کا کرا تمہارا کرا ہوگا۔“

شیبا کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ ”چلو، دکھا دوں تمہیں!“

ساحرہ اپنے نئے شاندار گھر کا ایک ایک گوشہ دیکھنا چاہتی تھی مگر تمکین کی وجہ سے اس نے پہلے آرام ہی کر لینا چاہا۔ شیبا اسے کمرے میں پہنچا کر چلی گئی۔ وہ کہیں گھوٹی کھوٹی سی تھی اور ساحرہ نے یہ بات محسوس کر لی تھی لیکن اس نے شیبا سے کچھ کہا نہیں۔

مہکتے ہوئے کمرے کی فضا نے ساحرہ کو بخور سا کر دیا۔ اتنا شاندار کرا اس نے بھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ نرم و گداز بستر پر لیٹی تو خود کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس نے تکیہ اٹھا کر اپنے سینے سے بچھ لیا اور خود کو مزید بیڑ حال ہوتا محسوس کیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہ نیند کی آغوش میں تھی۔

اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب اسے جگا یا گیا۔ جگانے والا آغا نصیر تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ”بہت تھک گئی تھیں شاید انہی گھنٹے سو لیں۔ ساڑھے سات بج رہے ہیں۔“

ساحرہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

”تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لیے چائے منگواتا ہوں۔“ آغا نصیر نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ دروازہ ہاتھ روم کا تھا۔ ساحرہ اس میں داخل ہوئی۔ اتنے شاندار ہاتھ روم کا بھی اس نے بھی تصور نہیں کیا تھا لیکن اس کی نظریں ہاتھ روم کی دل کشی کا جائزہ نہیں لے سکیں۔ وہ ذرا دیر کے لیے ہاتھ نب کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی اور اسے آغا نصیر کی دوسری بیوی کی موت کا خیال آیا تھا۔

ہاتھ روم میں ساحرہ نے صرف کھلی کی۔ وہ فوری طور پر اپنا میک اپ ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میک اپ ہی کی وجہ سے معمولی نقش و نگار کے باوجود وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے آغا نصیر کے سامنے بوتل کھلی ہوئی تھی اور گلاس سے وہ شاید ایک آدھ گھونٹ لے بھی چکا تھا۔ وہ ساحرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لو گی تم؟“ اشارہ شراب کی طرف تھا۔

ساحرہ نے نفی میں سر ہلادیا۔

”میرے قریب آ کر تو بیٹھو!“ آغا نصیر بولا۔

”تمہارے لیے چائے آتی ہی ہو گی۔“

”یہ۔“ اس نے شراب کی طرف اشارہ کیا۔ ”میری

ایک بیوی تو یہ بہت پتی تھی، تم کو بھی اس کا عادی بنا دوں گا۔“

اچھوٹی محبت

سوات کی ٹھنڈک میں تو ویسے بھی یہ آگ..... یہ پھیلی ہوئی آگ..... اس کی ضرورت ہو گی تمہیں!“

”سوات!“ ساحرہ چونک پڑی۔

”ہاں۔“ آغا نصیر نے کہا۔ ”میں ٹکٹ بنواتا لایا ہوں۔“

کل ہم پشاور روانہ ہو جائیں گے۔ ہنی مون سوات میں منائیں گے۔ دس دن بعد واپسی ہو گی۔ ہماری واپسی کے آٹھ دن بعد میرا بیٹا بھی باہر سے آجائے گا۔ فون آیا تھا اس کا!“

ساحرہ اس کے آخری دو جملے ٹھیک سے سن بھی نہیں سکی۔ اسے فوری طور پر خیال آیا تھا کہ وہ دس دن تک احسن سے مل بھی نہیں سکے گی۔ اس نے شدید بے چینی محسوس کی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ آغا نصیر کی بات رد کر دیتی۔

ملازم چائے لے آیا۔ شراب کی بوتل اور گلاس دیکھ کر اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ وہ منظر اس کے لیے نیا نہیں ہو گا۔

ساحرہ چائے بنا رہی تھی جب آغا نصیر نے پوچھا۔ ”جانتی ہو، میں نے تم سے شادی کیوں کی؟“

ساحرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

آغا نصیر نے ہنس کر کہا۔ ”تم شیبا کے ساتھ اسٹڈی کرنے آتی تھیں نا اتفاق ہے کہ ہمارا آتنا سا منا بھی نہیں ہوا لیکن میں نے بیڑ روم کی اس کھڑکی سے تمہیں پھانک سے اندر آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد چپ کر بھی نہیں گئی ہار دیکھا۔ تمہارے چہرے کے دانوں نے مجھے پاگل بنا دیا تھا تمہارا۔ چہروں پر دانوں کی گئی وجہ ہوئی ہیں لیکن تمہارے دانوں نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ تم بہت ہی پر جوش لڑکی ہو گی۔“

ساحرہ کا جسم سنستا گیا۔ وہ آغا نصیر کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

آغا نصیر اس کے چہرے کے دانوں پر اس طرح ہونٹا رہا جیسے اس نے کوئی ریسرچ ورک کیا ہو جس میں انٹرنیٹ بھی اس کے کام آیا ہو۔

اس دوران میں ساحرہ نے چائے پی لی۔ اس وقت تک آغا نصیر دوسرا گلاس بھی آدھا کر چکا تھا۔

”ابھی۔“ وہ ساحرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہوا بولا۔

”گھٹنا بھر میں ثابت ہو جائے گا کہ میرا خیال درست ہے یا نہیں.....! ہاں اگر تم شراب کا ایک گلاس بھی پی لیتیں، تب تو غضب ہی ہو جاتا۔“

ساحرہ نے شراب نہیں پی لی لیکن وہ ایک گھٹنا کسی غضب ناک سمندر کی تمثیل بن گیا۔ ساحرہ کے تنفس کی

بلا خیر موجیں ایسی تھیں کہ شاید کشادہ خواب گاہ کی ساری فضا میں بھر گئی ہوں۔

♥♥♥

دوسری صبح احسن کے والدین اسلام آباد چلے گئے۔ احسن کی طبیعت اب تک مکمل طور پر بحال نہیں ہوئی تھی لیکن خود کو بالکل ٹھیک ظاہر کرنے کے لیے وہ انہیں چھوڑنے اور پورٹ بھی گیا تھا۔

گھر واپس آ کر اس نے بستر پر لیٹتے ہی عین کے نیچے سے وہ لفافہ نکالا جو گزشتہ روز شیبا سے دے گئی تھی۔ اس لفافے میں شیبا کے بقول ”مکملہ دعوت نامہ“ دراصل ایک خط تھا جو شیبا نے اس کے نام لکھا تھا۔ اس تحریر میں ایک سے زائد مقامات ایسے تھے کہ احسن چونک گیا تھا۔ اب اس خط کے الفاظ پھر اس کے سامنے تھے۔ شیبا نے لکھا تھا۔

”احسن! ساحرہ کے بارے میں میرا خیال اب یہ ہے کہ وہ شاید خوف ناک حد تک ابنا رہا ہے۔ مجھے اس کی ابناہٹ کا علم بہت پہلے ہو گیا تھا لیکن اب جو اس نے میرے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں کانپ گئی۔ وہ معاشرے کی باغی ہے اور وہ اس بغاوت کو فطرت کے عین مطابق سمجھتی ہے۔ اسی لیے تم سے محبت کے باوجود کسی اور سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے لیکن وہ سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد بھی فریقین ایک دوسرے کی ملکیت نہیں ہو جاتے۔ غالباً اس نے یہ بات تم سے بھی کہی ہو گی اور اس کا مطلب کیا ہے، یہ تم نے بھی یہ خوبی سمجھ لیا ہو گا۔“

میری شدید خواہش تھی کہ تمہاری شادی ساحرہ سے ہو جائے۔ اسی لیے میں تم سے ملی بھی تھی۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا، یعنی تمہیں جس بات پر آمادہ کرنا چاہا تھا، وہ یقیناً میرا پاگل پن ہی تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ ساحرہ کے بغیر تمہاری زندگی بہت دیران ہو جائے گی۔ میں نے کالج ہی میں اندازہ لگایا تھا کہ تم اس سے کتنی شدید محبت کرتے ہو۔ پھر تم سے ملنے کے بعد جب میں نے کوشش کر کے غیر جذباتی انداز میں سوچا تو مجھے احساس ہوا کہ ساحرہ سے شادی کر کے تم بھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ اس کا رویہ تمہیں شدید اذیت میں مبتلا رکھے گا۔ عین ممکن ہے کہ صورت حال تمہاری برداشت سے باہر ہو جائے اور تم ساحرہ سے علیحدگی اختیار کر لو..... اس سے بہتر تو یہی ہو گا کہ اس کی شادی تم سے نہ ہو۔ یقیناً ساحرہ کی شادی تمہارے لیے اتنا بڑا صدمہ ہے کہ تم تشویش ناک حد تک بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ صدمہ شکر کہ تمہاری جسمانی حالت بہت جلد سنبھل گئی لیکن

کے تحت باہر نہ جانا پڑے۔ میں ابھی بنا کے لاتی ہوں۔" وہ کمرے سے جانے کے لیے مڑی۔

"ارے رہنے دو شیا!" احسن نے جلدی سے کہا۔

"بیٹھو، باتیں کرو۔ ابھی مجھے کچھ خواہش بھی نہیں ہے۔"

"سوپ پینے کے لیے خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی۔" شیا نے جاتے جاتے سرسوز کرہلی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جب تک ابو جان اور ای جان نہیں آ جاتے، مجھے ہی تمہارا خیال رکھنا ہوگا۔"

وہ کمرے سے چلی گئی اور احسن بستر پر بیٹھا پھر شیا اور ساحرہ کا موازنہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شیا لوٹی تو سوپ کے ساتھ وہ اپنے لیے چائے بھی بتلائی۔ سوپ کا پیالہ احسن کو دے کر وہ خود کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ساحرہ کا فون تو آیا ہوگا؟" وہ آہستہ سے بولی۔

"ہاں۔ کل دوپہر تک اس نے کئی مرتبہ کال کیا لیکن میں نے ریسپونڈ نہیں کیا۔"

شیا نے نظریں جھکا لیں۔

"مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس قسم کی بات کرے گی اور میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ اس کی باتوں کا کیا جواب دوں گا۔"

شیا کچھ نہیں بولی، کچھ سوچتے ہوئے چائے کے کھونٹ لیتی رہی۔ پھر احسن بھی خاموشی سے سوپ پیتا رہا۔ جب وہ سوپ پی چکا تو شیا نے پیالہ اس سے لے کر ایک طرف رکھنے کے ساتھ پیانی بھی وہیں رکھ دی۔ چائے وہ بھی پی چکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔ "تمہاری طبیعت اب ٹھیک ہے لیکن اگر غذا ایت کا خیال دو ایک دن اور رکھ لو گے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔" پھر اس نے پوچھا۔ "کھانے کا کیا ہے گا؟"

"ای جان خاصا کچھ پکا کر ڈیپ فریزر میں رکھ گئی ہیں۔ بس گرم کرنا ہوگا۔"

"روٹی تو نہیں ہوگی؟"

"میں ڈبل روٹی سے کام چلا لوں گا۔ وہ تو ہے۔"

"نہیں نہیں۔ میں روٹی پکا دوں گی۔ یہ مت سمجھنا کہ میں بڑے گھرانے کی لڑکی ہوں اس لیے مجھے یہ سب کچھ نہیں آتا ہوگا۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا کیا....." احسن رک کر بولا۔ "بس یہی باتیں کرتی رہو گی؟"

شیا اس کا مطلب تو سمجھ گئی لیکن نظریں جھکا کر بولی۔

"اور کیا بات کروں؟"

"تمہارا ایک خط ہے میرے پاس..... اس کی بات

کی کال ریسپونڈ کرنے سے اجتناب برتا تھا اور اب کال بتل بچتے پر اسے خیال آیا تھا کہ ساحرہ خود ہی نہ آگئی ہو۔

دوسری مرتبہ کال بتل کچھ توقف سے بھی تودہ بستر سے اٹھا لیکن بستر ہی پر بیٹھا رہ گیا۔ وہ اس وقت تھا اور ساحرہ ہمیشہ یہی کوشش کرتی رہی تھی کہ ان دونوں کی ملاقات تنہائی میں ہو۔

تیسری مرتبہ کھٹکی بھی لیکن اس مرتبہ وہ موبائل فون کی تھی۔ احسن نے دیکھا کہ اسکرین پر شیا کا نام چمک رہا تھا۔

احسن نے فوراً کال ریسپونڈ کی۔ "ہیلو!"

"کیسے ہو احسن؟" شیا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں شیا!"

"ابو جان اور ای جان تو چلے گئے ہوں گے۔"

"ہاں وہ تو جا چکے ہیں۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ ٹھیک ہو تو میں یقین کیسے لیتی ہوں ورنہ تو میں ڈر گئی تھی کہ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے کال بتل کی آواز سن کر تم دروازہ کھولنے بھی نہیں آ سکے۔"

"اوہ!" احسن چونکا۔ "دروازے پر تم ہو؟"

"تم کیا سمجھ رہے تھے؟"

"میں آرہا ہوں۔" احسن نے بستر سے اٹھتے ہوئے موبائل بند کر دیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

شیا اندر آتے ہوئے بولی۔ "کال بتل سن کر تم کیا سمجھتے تھے؟"

"ساحرہ کا خیال آ گیا تھا۔" احسن جواب دیتے ہوئے واپسی کے لیے مڑتا ہوا بولا۔ "اپنی تنہائی کی وجہ سے میں ڈر گیا تھا۔"

شیا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ "مجھے تمہاری تنہائی میں یہاں آنے سے اس لیے ڈر نہیں لگا کہ میں تمہارے مضبوط کردار سے واقف ہوں۔"

احسن نے کچھ نہیں کہا۔

شیا اس کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "ناشناکب کیا تھا؟"

"مجھ ہی کر لیا تھا۔"

"اس کے بعد کچھ کھایا؟"

"نہیں۔"

"کمال کرتے ہو۔ ابھی تمہیں اپنی غذا کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابھی تمہارے لیے چکن سوپ بنا کے لاتی ہوں۔ ای نے کل ہی مجھے بتا دیا تھا کہ فریج اور ڈیپ فریزر میں ہر چیز موجود ہے تاکہ تمہیں کسی بھی ضرورت

سے قریب کرتی چلی گئی۔ اس کی قربت میرے لیے باعث تسکین تھی کیونکہ وہ تمہاری محبوبہ تھی۔ ان باتوں کے بعد تم سمجھ گئے ہو گے کہ تمہیں خوش دیکھ کر ہی میں خوش رہ سکتی تھی، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دوں لیکن یہ سب کچھ خود کہنے کی ہمت مجھے نہیں ہو رہی تھی اس لیے میں نے قلم کا سہارا لیا ہے۔ میرے احسن، یقین کرو کہ میں تمہارے سب زخم مندمل کر دوں گی۔ میری چاہت کی دیواری تمہیں ہر غم بھلا دے گی۔ میرے اس اظہار محبت کو تمہاری پذیرائی ملے گی یا نہیں، میں نہیں جانتی۔ اسی لیے میں نے اسے اپنی شادی کا ممکنہ دعوت نامہ کہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی ہی نہیں، تمہاری محافظ بھی بننا چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری حفاظت ساحرہ سے کرنا ہوگی کیونکہ ساحرہ کسی اور سے شادی کر لینے کے باوجود..... میں اب اور کیا کھوں تم نے میرا مطلب سمجھ ہی لیا ہوگا۔ بس اب میں قلم رکھتی ہوں۔ میں پہلے تو نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اب..... صرف تمہاری، شیا۔"

احسن نے یہ خط متعدد مرتبہ پڑھا تھا اور تمام حالات پر مسلسل غور کرتا رہا تھا۔ ساحرہ اس کی محبت تو یقیناً سمجھ لیکن اس کی شادی کے بعد اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے ملتا۔ ایک دوست کی حیثیت سے ملنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ ساحرہ اس سے صرف دوست کی حیثیت سے نہیں ملے گی۔ اس کا مطالبہ اب بھی قائم رہے گا۔ اس بات پر یقین اس لیے کیا جاسکتا تھا کہ ساحرہ نے اس سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔ اس کے نظریات ایسے تھے جو احسن کے خیال میں تو دنیا کی کسی اور لڑکی کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ کسی بہت ہی الزما ڈرن گھرانے کی لڑکی ہوتی تو اس کے ان نظریات کا سبب تلاش کرنے کی کوشش کی جاسکتی تھی لیکن اس نے تو ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔

اس کا اندازہ کیا ہو جانا نہایت عجیب خیر تھا۔

اس کے برخلاف شیا ایک نہایت ماڈرن اور آزاد خیال گھرانے کی بیٹی تھی۔ یہ خیال اسے یوں تھا کہ اس کے باپ کی تین شوگر ملز تھیں۔ اس کے خیال کے مطابق اتنے مال دار لوگ عموماً نہایت ماڈرن اور آزاد خیال ہوتے ہیں لیکن شیا.....؟

اس پر شاید مادر پدر آزادی کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔ احسن بڑی سنجیدگی سے اس کا اور ساحرہ کا موازنہ کرتا رہا۔ کال بتل کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ فوراً بستر سے اٹھا۔ وہ متذبذب ہو گیا تھا۔ گزشتہ روز سے اس نے ساحرہ

تمہارا دل تو اب بھی زخم زخم ہوگا۔"

یہاں تک شیا نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے احسن کو مکمل اتفاق تھا۔ یہ سب کچھ وہ خود بھی سوچ چکا تھا لیکن شیا کا اس حد تک سوچ لینا اس کے لیے قدرے تعجب کی بات تھی۔ پھر اس سے آگے کی تحریر نے تو اسے خاصا چونکا دیا۔

شیا نے لکھا تھا۔

"یہ زخم زخم ہونا تمہارے حق میں بہتر ہے احسن!..... ممکن ہے کوئی تمہارے ان زخموں پر مرہم رکھ دے، اگر تم چاہو۔ اس کے بعد میں خاصے متذبذب کے بعد لکھ رہی ہوں کہ تم اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی ذمہ داری مجھے بھی سونپ سکتے ہو۔"

انہی سطوروں نے احسن کو چونکا دیا تھا اور پھر باقی خط اس نے بڑی تیزی سے پڑھ ڈالا تھا۔

"تم چونک گئے ہو گے احسن! یقیناً چونک گئے ہو گے۔ میرے جملے کا جو مطلب ہے وہ تم نے سمجھ لیا ہوگا۔ تم اسے میری پیشکش نہ سمجھنا جو میں تمہاری حالت کی وجہ سے کر رہی ہوں۔ نہیں احسن! حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔"

یہ پڑھتے ہوئے احسن کا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"میں پہلی نظر کی محبت کو ایک افسانوی بات سمجھا کرتی تھی لیکن یہ محض افسانوی نہیں ہے۔ یہ میں نے اس وقت جانا جب میں نے تمہیں کالج میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اپنے اس وقت کے جذبات کا اظہار بہت اچھے انداز میں کروں لیکن ایسے الفاظ میرے دماغ کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں، اس لیے میں ایک عام سی بات لکھ رہی ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھا اور دل پارٹیشی لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہارے قریب ہونے کی کوشش کرتی، میں نے ساحرہ سے تمہاری محبت محسوس کرنی۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ تم اس سے شدید محبت کرتے ہو۔ تمہاری نظریں ساحرہ کے علاوہ کسی چہرے پر محبت ہی نہیں تھیں۔ تم ہی نہیں، ساحرہ بھی تمہیں چاہتی تھی اور اس کے دعوے کے مطابق وہ اب بھی تمہیں چاہتی ہے لیکن اب اس کی چاہت کی تشریح کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں..... بہر حال جب میں نے محسوس کیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ میں آپ دونوں کے درمیان میں آنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ انہی کوئی کوشش میری محبت کی توہین ہوتی۔ محبت اگر خود غرض ہو تو کیا اسے محبت کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! سو میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور ساحرہ کو خود

نہیں کر رہی ہو۔ ادھر ادھر کی باتوں میں پڑی ہوئی ہو۔“
 ”میں اس کی کیا بات کروں۔“ شیدا نظریں جھکائے
 ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکی۔“
 ”کو یا اب مجھے کہنا ہے۔“ احسن کی مسکراہٹ خزاں
 رسیدہ سی تھی۔

شیدا خاموش بیٹھی رہی۔
 احسن یکا یک اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ وہ کچھ مضطرب نظر آ رہا
 تھا۔

”شیدا! احسن کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔“ میں مرد
 ہوں، اس لیے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن حقیقت یہی ہے کہ
 اب میں ساحرہ سے بہت خوف زدہ ہوں۔ کل اس کی شادی
 ہو چکی ہوگی۔ اب تو وہ بہت زیادہ بے باک ہو جائے گی۔“
 شیدا اب بھی خاموش رہی۔

”تم اس سے بالکل مختلف ہو!“ احسن کچھ توقف سے
 بولا۔ ”زمین اور آسمان کا فرق ہے تم دونوں میں! تمہاری
 سوچ..... میں سلام کرتا ہوں اسے!..... یہ آسان نہیں ہے کہ
 کوئی اس طرح سوچ کر اپنی محبت کا گلا گھونٹ دے۔“
 ”میں نے اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹا احسن!“ شیدا
 تیزی سے بولی۔ ”میری محبت آج بھی زندہ ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ تم نے کل سے پہلے اپنے
 جذبات ظاہر نہیں ہونے دیے۔ جو زمانہ کالج میں گزرا، اس
 میں بھی مجھے شبہ تک نہیں ہو سکا کہ ساحرہ کے علاوہ بھی کوئی مجھے
 چاہتا ہے، اور چاہت بھی ایسی کہ محبوب کی خوشی کے لیے خود کو
 اذیت میں دھکیل دے۔“
 ”ہرگز نہیں۔“ شیدا پھر تیزی سے بول پڑی۔ ”تم
 خوش رہتے تو میں بھی خوش رہتی۔“

”ایسی باتیں بس کہنے کی باتیں ہوتی ہیں شیدا! انسانی
 فطرت کے خلاف کچھ نہیں ہوتا۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ
 تمہارے دل پر کیا گزرتی رہتی۔“
 ”میرے دل پر اگر کچھ گزرتی بھی تو کبھی کسی کے
 سامنے نہیں آتی۔“

”یہ دوسری بات ہے۔“

شیدا اب پھر خاموش رہی۔

احسن ٹہلنے ٹہلنے بستر کے قریب رکا اور پھر بیٹھ کر شیدا کی
 طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا خط ملنے سے بھی پہلے، ساحرہ
 سے آخری ملاقات کے بعد میں خود یہ سوچتا رہا تھا کہ ساحرہ کی
 شادی کے بعد مجھے بھی کسی لڑکی سے شادی کر لینا چاہیے۔ اس
 طرح مجھے کچھ تو آڑ مل جائے گی۔ میں کسی ایسے معاملے

میں ملوث نہیں ہو سکتا کہ خود ہی اپنی نظروں سے گرجاؤں اس
 لیے مجھے یقیناً کچھ تحفظ کی ضرورت ہے۔ میں اپنے تحفظ کی
 ذمہ داری تمہیں سونپنے کے لیے تیار ہوں شیدا!“
 ”احسن!“ شیدا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور
 آب دیدہ ہو گئی۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا
 یقین کر لوں کہ میں نے جو سنا ہے وہی تم نے کہا ہے؟“
 ”ہاں شیدا!“ احسن بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔
 اب اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی فک پڑے۔
 ”یہ کیا شیدا!“ احسن جلدی سے بولا۔

”یہ خوشی کے آنسو ہیں احسن!“ شیدا پہلے سے زیادہ
 لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ساحرہ کی شادی کا معاملہ سامنے
 آنے سے پہلے تک۔ بلکہ تم سے اپنی پہلی ملاقات تک
 میرے دماغ میں یہ بات پتھر کی لکیر بنی ہوئی تھی کہ تم میرا
 مقدر نہیں ہو لیکن اس وقت تمہارے جواب نے اس پتھر کو ہی
 پگھلا دیا ہے جس پر وہ لکیر تھی۔“

”ہمیں جلد از جلد شادی کر لینی چاہیے۔“ احسن نے
 سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن میرا تعلق ٹل کلاس سے ہے۔ کیا
 تمہارے والد مان جائیں گے؟“

”میں ہر قیمت پر ان سے منوالوں گی۔“ شیدا پر جوش
 ہو گئی، پھر اس نے پوچھا۔ ”اور تمہارے والدین؟ انہیں خیال
 آ سکتا ہے کہ میں ایک بہت ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہوں۔“
 احسن مسکرایا۔ ”تم نے اپنے خط میں پہلی نظر کی بات کی
 تھی۔ اس میں تم نے اپنی ہی طرف اشارہ کیا تھا لیکن ایسا ہی
 امی جان کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ انہیں بھی تم پہلی ہی نظر میں بھا
 گئی ہو۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں، تمہیں اپنی بہو بنالوں۔“
 ”سچ احسن!“ شیدا کے ہونٹ لرز گئے۔

احسن نے اثبات میں سر ہلایا۔

شیدا نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا جس پر آنسوؤں
 کی لکیریں بن گئی تھیں، پھر وہ بولی۔ ”تو اب ہمیں اس
 معاملے میں جلدی کرنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، ابو جان اور امی جان کل آجائیں گے۔
 تم اپنے ڈیڑی سے بات کر لو۔“

”ڈیڑی تو آج سوات چلے گئے ہیں، دس دن بعد
 لوٹیں گے۔“

”اتنے بڑے کاروباری لوگوں کو تفریح کی اتنی فرصت
 مل جاتی ہے؟“ احسن کے انداز میں تھوڑا سا تعجب تھا۔

”مال دار لوگوں سے زیادہ تفریح کون کر سکتا ہے۔“
 شیدا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ اپنی چوٹی بیوی کو گھمانے لے

گئے ہیں۔“
”چوتھی بیوی؟“

”ہاں، جنہیں بعد میں معلوم ہوئی جائے گا اور تم سوچو کے کہ میں نے تم سے یہ بات چھپائی لہذا میں تمہیں ابھی بتا دیتی ہوں۔“ شیبہ نے اپنے باپ کی چاروں شادیوں کے بارے میں بتایا لیکن پراسرار اموات کا ذکر اس لیے نہیں چھیڑا کہ بات طویل ہو جاتی۔ اس کے علاوہ اس نے فی الحال یہ بھی ظاہر نہیں کیا کہ اس کے باپ کی چوتھی بیوی ساحرہ تھی۔
”اتنی بیویاں مر گئیں ان کی؟“ احسن نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ”ساحرہ تمہارے بارے میں بہت باتیں کرتی تھی مگر اس نے یہ نہیں بتایا۔“
”ڈیڈی کی شادیاں!“ شیبہ کچھ تلخی سے بولی۔
”ساحرہ کو یہ سب کچھ بتانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔“

احسن نے سر ہلایا۔ ”ساحرہ نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ تمہارے والد کئی شوگر ملز کے مالک ہیں اور ہاں، یہ بھی بتایا تھا کہ تمہارے ایک بڑے بھائی بھی ہیں جو پڑھنے کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں۔“

”وہ کچھ دن میں آنے والے ہیں، خیر یہ ذکر چھوڑو! میں نے ابھی کہا تھا کہ ہمیں اپنی شادی کے معاملے میں جلدی کرنا چاہیے۔“
”میں بھی اب جلدی چاہوں گا لیکن تم اپنے ڈیڈی کو تو آجانے دو۔“

”میں انہیں بعد میں منالوں گی اور تمہاری امی جان تیار ہیں تو ابو جان بھی تیار ہو ہی جائیں گے۔ میں چاہتی ہوں احسن..... کہ.....“ وہ جھجک گئی۔

”کہ.....؟“ احسن اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کہ..... ہم..... آج ہی.....“ شیبہ نے نظریں جھکا لیں۔

”آج ہی؟“ احسن حیرت سے بولا۔

”ہاں۔“ شیبہ کی نظریں بہ دستور جھکی رہیں۔ ”ہم آج ہی سول میرج کر لیں۔“

احسن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ شیبہ کا منہ نہکتا رہ گیا تھا۔

”ہاں احسن! آج ہی.....! لیکن میری اس عجلت کی وجہ وہ خواہش ہرگز نہیں ہے جو ساحرہ کی تھی۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ تم پر میرا ایک حق ہو جائے۔ تم میرے بن جاؤ اور میں ہر ایک کا یہ اختیار سلب کر سکوں کہ وہ مجھے تم سے چھیننے

کی کوشش کرے۔“

احسن اسے غور سے دیکھنے لگا، پھر سر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ میری طرح تم بھی ساحرہ سے خائف ہو لیکن شیبہ! اگر تمہارے والد.....“

”میں نے کہا نا!“ شیبہ نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں انہیں منالوں گی۔ دوسری بات یہ کہ ہم ابھی کسی پر ظاہر نہیں کریں گے کہ ہم نے سول میرج کر لی ہے۔ ہاں اگر کوئی مجبوری سامنے آگئی.....“ شیبہ نے ساحرہ کا نام لیے بغیر کہا۔
”جب شاید وقت سے پہلے ظاہر کرنا پڑ جائے۔“

احسن بے چین سا ہو کر پھر بستر سے اٹھا اور ٹیلنے لگا۔
”میں صرف بندھن چاہتی ہوں احسن!“ شیبہ بولی۔
”گھریلو طور پر باقاعدہ شادی ہونے سے پہلے ہم صرف دوست رہیں گے۔“ شیبہ نے ”صرف دوست“ کے الفاظ پر خاصا زور دیا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے شیبہ لیکن یہ بڑا عجیب سا لگے گا۔“
”عجیب حالات میں عجیب ہی فیصلے کرنا پڑتے ہیں احسن!“ شیبہ نے کہا۔ ”جنہیں اپنے والدین کی طرف سے تو کوئی اندیشہ نہیں؟“

”ہرگز نہیں۔ امی جان تو تمہارے بارے میں کہہ بھی چکی ہیں اور ابو جان نے بھی میری کوئی خواہش نظر انداز نہیں کی۔“
”تو پھر؟“ شیبہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

”اچھا!“ احسن نے طویل سانس لی۔ ”اگر تم لڑکی ہوتے ہوئے اتنی مضبوط ہوتو میں بھی کمزور نہیں بنوں گا۔“

شیبہ کا چہرہ کھل اٹھا۔
”تو تیار ہو جاؤ!“ وہ بولی۔ ”پہلے تو ہمیں کسی وکیل کے پاس جانا پڑے گا۔“

احسن نے اپنے کپڑوں کی الماری کی طرف دیکھا۔
تھوڑی ہی دیر بعد وہ شیبہ کی کار میں تھا اور شیبہ اسے خاصی تیز رفتاری سے چلا رہی تھی۔

”آج دن میں ہی خواب دیکھ رہا ہوں۔“ احسن زیر لب بڑبڑایا۔

اس دن جو کچھ وہ اپنے تصور میں بھی نہیں لاسکا تھا، حقیقت میں ڈھل رہا تھا۔ جب وہ دونوں عدالت سے لوٹ رہے تھے تو میاں بیوی بن چکے تھے۔ شیبہ سیدھی احسن ہی کے گھر پہنچی۔

”اب تو بھوک سے بہت برا حال ہو گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”تم کپڑے تبدیل کرو، میں روٹی پکاتی ہوں۔“ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اچھوتی محبت

”اب تصدیق ہو گئی ہے کہ مسافر طیارے کا کوئی مسافر زندہ نہیں بچا۔“

♥♥♥

ساحرہ کو اس طیارے کی تباہی اور تمام مسافروں کی ہلاکت کا علم سوات جانے والے راستے میں ایک جگہ رکنے پر ہوا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ ان مسافروں میں احسن کے والدین بھی تھے۔

رات کو وہ اور آغا نصیر سوات ہوٹل میں تھے۔ ساحرہ بہت خوش تھی کہ آغا نصیر اس کا دیوانہ ہو گیا تھا اور اس کی دیوانگی ہی ساحرہ کو بھی سرشار کر رہی تھی۔ اسے گمان تھا کہ شادی کے بعد اس کے اندر بھری ہوئی آگ پر پانی کے چھینٹے پڑ جائیں گے لیکن ہوا یہ کہ وہ اسے پیٹرول کے چھینٹے محسوس ہوئے۔ آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اس کی وحشت ہی نے آغا نصیر کو اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ اسے ایک پل کے لیے بھی ساحرہ سے دور رہنا گوارا نہیں تھا۔ اس نے اپنا موبائل تو بند کر ہی دیا تھا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے مگر ساتھ ہی اس نے ساحرہ کا موبائل بھی بند کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

”جب تک ہم یہاں ہیں، کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کر سکے۔“ اس نے کہا تھا۔

ساحرہ کی خواہش تھی کہ وہ کسی وقت احسن سے بات کرے لیکن موبائل آغا نصیر کے پاس ہونے کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکی لیکن سوات میں گزارے جانے والے دس دنوں میں ایک دن بھی ایسا نہ تھا کہ اسے احسن کا خیال نہ آیا ہو۔ اس کے دل میں ہو کہ سی اٹھتی رہی تھی کہ کاش آغا نصیر کی جگہ احسن ہوتا۔

دس دن بعد وہ سوات سے لوٹے۔ ساحرہ کو اس کا موبائل واپس مل گیا۔ صبح آغا نصیر کے دفتر جانے کے بعد اس نے اپنے موبائل سے احسن کے موبائل پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف کھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسپونڈ نہیں کی گئی۔

ایسی تھیں، اس نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اپنا موبائل بند کرتے ہوئے سوچا، میں خود جا کر ملتی ہوں اس سے!..... بھلا کوئی تک ہے! شادی کر لی میں نے تو کیا فرق پڑ گیا، میرے دل سے اس کی محبت تو ختم نہیں ہوئی، بے وقافتہ نہیں ہوں میں۔

عجیب ہی انداز فکر تھا ساحرہ کا! وہ نئی کار میں بیٹھ کر احسن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ کار اسے آغا نصیر نے دی تھی اور ڈرائیونگ اس نے کالج کے زمانے میں شیبہ سے سیکھ لی تھی۔ بس شوق تھا اسے کہ

سارا دن اس نے احسن کے ساتھ ہی گزارا۔ ان میں بس ایسی باتیں ہوتی رہیں جو دوستوں میں ہوتی ہیں۔ اس نے احسن کو رات کا کھانا بھی کھلایا اور اس کے بعد رخصت ہو گئی۔

رات کو بستر پر لیٹتے وقت بھی احسن کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شیبہ کی آمد سے اب تک جیسے کوئی خواب دیکھتا رہا تھا۔ رات گئے اس کی آنکھ لگی۔ پھر اس کے جاگنے کا سبب کال بیل کی آواز تھی۔

آنے والی شیبہ تھی۔ وہ اندر آتے ہی بولی۔ ”تم شاور لے لو! میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔“

”جو حکم بیگم صاحبہ!“
تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ناشتا کر رہے تھے۔

”ابو جان اور امی جان اب روانہ ہونے والے ہوں گے اسلام آباد سے۔“ شیبہ بولی۔ ”ایک گھنٹے بعد ہم دونوں ہی انہیں لینے کے لیے ایئر پورٹ چلیں گے۔“ وہ اتنی ہی خوش نظر آ رہی تھی جتنی خوش کوئی اچھی بہو اپنے ساس سر کے آنے پر ہو سکتی ہے۔

مگر یہ خوشی برقرار نہیں رہ سکی، جب روانگی کے لیے تیار ہونے سے قبل شیبہ نے خبریں سننے کے لیے ٹی وی کھولا۔ ٹی وی کی بریکنگ نیوز یہ تھی کہ پکاس منٹ پہلے اسلام آباد سے کراچی روانہ ہونے والا طیارہ کرائش ہو گیا تھا اور غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق اس بد قسمت طیارے کا ایک مسافر بھی زندہ نہیں بچا تھا۔

”جنہیں۔“ احسن چیخ پڑا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ وہ ایئر پورٹ فون کر کے انکوائری سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ طیارہ لیٹ تو نہیں ہے؟

لیکن طیارہ تو ہمیشہ کے لیے لیٹ ہو چکا تھا۔

احسن نے دیوانگی کی کیفیت میں چیختے ہوئے اپنا موبائل فون ٹی وی کی اسکرین پر دے مارا تھا۔

شیبہ اس طرح ہنسی رہ گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ ٹی وی سے بریکنگ نیوز بار بار دہرائی جا رہی تھی۔

شیبہ سکتے کے عالم سے باہر آئی اور دھیرے دھیرے احسن کی قریب آگئی۔ ”یہ کیا ہو گیا احسن!“ اس کی آواز رعدی ہوئی تھی۔

احسن نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے ان میں نمی تر آئی ہو۔ اس کا سارا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے اسے شدید کوشش کرنا پڑ رہی ہو۔ شیبہ کے کانوں میں بریکنگ نیوز کا ایک اور جملہ کڑکا۔

ڈرائیونگ سکھ لے۔ اس وقت اسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ کبھی خود اس کے پاس کار ہوگی۔

وہ احسن کے گھر پہنچ گئی لیکن احسن سے نہیں مل سکی۔ گھر مقفل تھا۔ ساحرہ کو تعجب ہوا۔ احسن کی والدہ تو گھر میں رہتی تھیں۔ اس نے قریب ہی کے گھر میں رہنے والی ایک معمر خاتون سے اس بارے میں پوچھا تو طیارے کے حادثے میں احسن کے والدین کی ہلاکت کا علم ہوا۔

”لاشیں کیا.....“ ناکھل لاشوں کے ٹکڑوں کی تدفین ہوئی تھی۔“ پڑوس کی خاتون نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”بے چارے احسن پر قیامت گزر گئی۔ اکیلا رہ گیا دنیا میں.....! اس کی ایک دوست آتی رہی ان دنوں میں۔ اسی نے کسی طرح سنبھالا ہوگا اسے۔“

احسن کے والدین کی حادثے میں ہلاکت، ساحرہ کے لیے بھی افسوس ناک تھی لیکن اس بات نے اسے چونکا یا بھی کہ کوئی لڑکی ان دنوں میں احسن کے پاس آتی رہی تھی۔

مزید پوچھ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی نیلے رنگ کی کار میں آیا کرتی تھی۔ ”نیلے رنگ“ کی بات نے ساحرہ کو اور چونکا دیا۔ نیلا رنگ شیا کی کار کا تھا۔ پھر پڑوس ہی کے کسی شخص نے اسے کار کا نمبر بھی بتا دیا۔ اس کے بعد کسی شے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

”لیکن گھر کیوں مقفل ہے؟“ ساحرہ نے پوچھا۔

”احسن صاحب کل صبح یہاں سے کہیں اور مقفل ہو گئے۔“ اسی شخص نے بتایا۔ ”کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ گھر چھ دیں گے۔“

ساحرہ کو اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ وہاں سے لوٹی، راہ میں اس نے اپنے والدین سے ملنا ضروری سمجھا۔ اسے آغا نصیر نے بتا دیا تھا کہ ان لوگوں کو کس عمارت میں قلیٹ دلایا گیا تھا۔

بوجان کی خوشی کا یہ عالم تھا کہ اس نے ساحرہ کو جھنجھوڑ دینے کی حد تک خوشی سے لپٹائے رکھا۔ سرکار احمد نے بھی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ اپنے بدلے ہوئے حالات سے بہت خوش تو نہیں مگر ناخوش بھی نہیں تھا۔

بوجان کی خواہش کے خلاف ساحرہ نے ماں باپ کے ساتھ کم ہی وقت گزارا اور وہاں سے روانہ ہو گئی۔ وہ شیا سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ یہ اس کے لیے حیران کن تھا کہ اتنی جلدی، بلکہ چانک احسن سے شیا کے تعلقات اتنے زیادہ کیسے بڑھ گئے۔

ساحرہ کے ان خیالات میں حسد، جلن جیسے جذبے کی

رمت بھی نہیں تھی۔ اس کا انداز فکر ہی ایسا تھا کہ احسن کا کسی بھی لڑکی سے ملنا اس کے لیے کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔

اسے شیا کی وجہ سے صرف تعجب تھا۔

جب وہ گھر پہنچی تو شیا کہیں جا چکی تھی۔ ساحرہ نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کیا۔ ”کہاں ہو جانی؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک دوست کے پاس ہوں۔“ شیا نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

ساحرہ کو فوراً احسن کا خیال آیا۔ اس کی دانست میں شیا کو احسن کی نئی قیام گاہ کا علم ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے فون پر یہ بات چھپنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”کب آؤ گی؟“ اس نے پوچھا۔

”دو ڈھائی بجے تک۔“

”میں انتظار کروں گی۔“

”کوئی خاص بات؟“

”آؤ گی تو بتاؤں گی۔“

ساحرہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ یہ باتیں اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کی تھیں۔ اسے بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ شیا احسن ہی کے ساتھ ہوگی۔

کیا وہ احسن کے ساتھ شادی کر سکتی ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرا۔ اس کے خیال میں اگر ایسا ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔

دو ڈھائی بجے کے درمیان شیا آگئی۔ ساحرہ نے اسے بہت سنجیدہ پایا۔

”میں احسن کے گھر گئی تھی۔“ ساحرہ نے کہا۔ ”وہاں مجھے ان سب باتوں کا علم ہوا جن سے تم بھی واقف ہوگی۔“

شیا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

ساحرہ نے کہا۔ ”مجھے اس کے والدین کا سن کر بہت افسوس ہوا جو ہونا ہی چاہیے تھا لیکن اس پر تعجب ہوا کہ اس دوران میں تم احسن کے گھر جاتی رہی ہو۔ وہاں کسی نے مجھے تمہاری کار کا نمبر بتایا تھا۔ یقیناً جانو، مجھے تمہارا وہاں جانا قطعی برا نہیں لگا ہے۔“

شیا بہ دستور سنجیدگی سے بولی۔ ”تم تو سوات جا چکی تھیں۔ تمہاری شادی کے بعد والدین کی وفات احسن کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا اور اس وقت اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔“

”تمہارا شہارا اس نے بہ خوشی قبول کر لیا؟“ ساحرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

شیا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”یہ اچھا ہوا۔“ ساحرہ بھی مسکرائی۔ ”لیکن اس نے اپنا گھر کیوں چھوڑ دیا؟“

”میں نے ہی اصرار کر کے اس کا گھر بدلوا دیا ہے۔ وہ وہاں رہتا تو والدین کی یاد اسے تڑپاتی رہتی۔ گھر کا ایک ایک گوشہ اسے ان کی یاد دلاتا۔“

”یہ تو تم نے بہت اچھا کیا، لیکن ایک بات سچ سچ بتاؤ!“

شیا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ساحرہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے صرف ہمدردی میں اسے سہارا دینا ضروری سمجھا تھا یا..... اتنے دن اس کے قریب رہ کر تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی اور جذبہ بھی پیدا ہو گیا ہے؟“

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ شیا کا ایک مضطربانہ انداز میں کھڑی ہوئی اور سامنے کے دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کا یہ سارا عمل قطعی غیر ارادی تھا۔

چہرے پر سوچ بچار کے تاثرات تھے۔ ساحرہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ شیا کی نظریں جو فرش کی طرف تھیں، یکایک ساحرہ کی طرف اٹھیں۔ جیسے اس نے کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”تم نے پوچھا تھا ساحرہ کہ میرے دل میں کوئی اور جذبہ تو پیدا نہیں ہو گیا..... اب میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ وہ جذبہ جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے، وہ تو بہت پہلے سے میرے دل میں تھا۔ اس وقت سے جب میں نے کالج میں اسے پہلی بار دیکھا تھا۔“

ساحرہ صوفے سے اچک جانے کی حد تک چونک گئی تھی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ہے ساحرہ!“ شیا نے سنجیدگی سے کہا اور احسن سے اپنی محبت کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو وہ احسن کو بھی بتا چکی تھی۔

ساحرہ چند لمحے اس کا منہ دیکھتی رہی، پھر مسکراتے ہوئے تیزی سے اٹھی اور سامنے کے صوفے پر جا کے والہانہ انداز میں شیا سے لپٹ گئی۔

”جانی!..... میری جان!..... تم نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی؟“

”میں لفظ قربانی تو اپنی زبان پر نہیں لاسکتی لیکن جب میں نے اسے تمہاری طرف متوجہ دیکھ لیا تھا تو پھر یہ بالکل

مناسب نہیں تھا کہ میں تم دونوں کے بیچ میں آتی۔“

”تم گریٹ ہو جانی!..... لیکن اب..... میرا مطلب ہے..... کیا تم نے احسن کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کر دیا ہے؟“

”جب ڈیڈی سے تمہاری شادی طے پا چکی تھی، تبھی میں نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت اس کی ضرورت بھی تھی۔ احسن تمہاری شادی سے بہت ادا تھا۔ میں اس کے زخم مندمل کرنا چاہتی تھی۔“

”تمہیں اس میں کامیابی ہوئی؟“ ساحرہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”اپنی تو قہیات سے بڑھ کر.....“ جواب دیتے ہوئے شیا سوچ بھی رہی تھی۔ وہ قدر سے تذبذب کے عالم میں بولی۔ ”جس دن تم سوات گئی تھیں، اسی روز میں نے اور..... احسن نے..... مطلب یہ کہ..... ہم نے سول میرج کر لی تھی۔“

ساحرہ چونکی اور ایک بار پھر شیا سے لپٹ گئی۔

”شاعرار!..... بہت شاعرار!..... تم نے تو مجھے خوش کر دیا جانی!..... احسن تو محبت کے معاملے میں بے نیکی سوچ رکھتا تھا لیکن میں فیصلہ کر چکی تھی کہ کسی لڑکی سے اس کی شادی کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ میری بیاری دوست ہی اس کی بیوی بن گئی۔“

”عملاً بیوی نہیں بنی ہوں ابھی۔“ شیا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم میں طے پایا تھا کہ باقاعدہ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کے دوست رہیں گے۔ سول میرج میں جلدی تو میں نے اس لیے کی تھی کہ اس پر حق جتا سکوں ورنہ میں گھر چھوڑنے کے لیے بھی اس سے اصرار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو کھانا پینا بھی بھول گیا تھا۔ میں ہی جا کر اسے زبردستی کھلاتی پلاتی رہی ہوں۔ ابھی اسے کھانا کھلا کر ہی آئی ہوں۔“

ساحرہ اس کا منہ نکلتے ہوئے سب کچھ سنتی رہی تھی لیکن خوش نظر آ رہی تھی۔

”اب میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوں کہ ڈیڈی سے شادی کی بات کس طرح کروں۔“ شیا بولی۔ ”کیا تم میری خاطر ڈیڈی سے بات کر سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں!“ ساحرہ جلدی سے بولی۔ ”احسن کی خوشی کے لیے، تمہاری خوشی کے لیے میں کیا نہیں کر سکتی جانی!“

”آج ہی بات کرنا۔“

”آج ہی کروں گی۔“ ساحرہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

پھر اس کا وقت سوچ بچار میں گزرنے لگا۔ یہ اس کے

دیا۔

”صدمہ پہنچا ہے مجھے!“ ساحرہ نے سسکی لی۔

مرتبہ آپ سے کوئی بات منوانا چاہی جس میں میری اپنی کوئی

غرض بھی نہیں، لیکن آپ میری یہ پہلی بات بھی نہیں مان رہے

ہیں۔“

”اچھا تم میرے قریب تو آؤ۔“ آغا نصیر نے

مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ہونٹوں سے تمہارے آنسو تو

پی لوں۔“

ساحرہ نے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور خود ہی اپنے

آنسو پونچھتے ہوئے، بستر پر آغا نصیر کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا

منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔

آغا نصیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تو وہ کسمساتے

ہوئے بولی۔ ”اب آپ مجھ سے دور ہی رہے۔ مجھے شیا سے

بھی شرمندہ ہونا پڑے گا اب! آپ کی محبت پر ناز تھا اس

لیے اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ آپ کو آمادہ کر لوں گی۔“

آغا نصیر نے زبردستی اسے اپنے قریب کھینچ لیا اور

اس کی ہانگی ہوئی سی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

”رہنے دیں یہ دکھاوے کی محبت!“ ساحرہ نے اس

کی آغوش سے لٹکنا چاہا۔

”دکھاوا نہیں ہے۔ دل و جان سے چاہنے لگا ہوں

تمہیں! چلو ٹھیک ہے۔ شیا کی شادی اسی سے کر دی جائے گی

جس سے وہ چاہتی ہے لیکن تمہاری بات ٹھیک ہے۔ احسن کو

یہاں آکر رہنا پڑے گا۔“

”کئی بات؟“ ساحرہ نے مسکرا کر آغا نصیر کے ہاتھ پر

ہاتھ رکھا۔

”بالکل سچی۔“ آغا نصیر نے کہا۔ ”لیکن چند دن تو

رکنا پڑے گا۔ شہر یار تو آجائے۔“

شہر یار، شیا کے بڑے بھائی کا نام تھا۔

ساحرہ بولی۔ ”آپ نے بتایا تھا کہ ہم سوات سے

لوٹیں گے تو دو چار دن میں شہر یار آجائے گا۔“

”ہاں کہا تو تھا لیکن کسی وجہ سے کچھ دن اور لگیں گے۔

آج شہر یار کا فون پھر آیا تھا۔ اسے آنے میں دس پندرہ دن

بھی لگ سکتے ہیں۔“

”اتنے دن شیا انتظار نہیں کر سکتی۔“

”اس کا مطلب ہے.....“ آغا نصیر سوچے ہوئے

بولا۔ ”غلطی ہو چکی ہے شیا سے! تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔“

”آپ شیا سے کوئی بات نہیں کیجئے گا۔“ ساحرہ نے

کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ آغا نصیر اس ٹک میں جتنا رہے۔

جب آغا نصیر نے تیسرا پیگ شروع کیا، ساحرہ دوسرا پیگ تھوڑا سا ہی پی سکی تھی۔ اس دوران میں آغا نصیر ساحرہ کی پرجوش رفاقت کے تذکرے کر کے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ شیا کے بارے میں اس نے کوئی بات ہی نہیں کی۔ پھر جب اس نے شراب سے بخور ہو جانے کے بعد ساحرہ کو اپنی آغوش میں لینا چاہا تو وہ تیزی سے اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کی یہ حرکت آغا نصیر کے لیے ایک نئی بات تھی۔ وہ حیرت سے ساحرہ کی طرف دیکھنے لگا جواب نہ پھلائے ہوئے تھی۔

”میں نے جو بات کی تھی، وہ آپ کی بیٹی کی بھلائی کے لیے کی تھی۔ اگر آپ میری وہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تو پھر کیا مجھے برا نہیں لگے گا؟“

”مگر جان من.....“

”کوئی جان من نہیں آپ کا!“ ساحرہ اپنی آنکھوں میں آنسو لے آئی جو مصنوعی تھے۔ ”آپ نے ہمیشہ صرف اپنے جذبات کی آسودگی کے راستے تلاش کیے ہیں۔ آپ کو شاید احساس ہی نہیں کہ آپ کی بیٹی جوان ہے، اس کے بھی جذبات ہوں گے۔ وہ ایک خوب صورت لوجوان سے محبت کرتی ہے۔ کسی وقت ان دونوں کے قدم بھی اگلا سکتے ہیں۔“

آغا نصیر ہکا۔ ”اگلا سکتے ہیں یا اگلا چکے ہیں؟ شیا نے تمہیں سال سال کچھ بتایا ہے؟“

”اس نے مجھے صرف اپنی محبت اور شادی کی خواہش سے آگاہ کیا ہے۔ یہ تو بس میرا اندازہ ہے کہ جب دو جوانوں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

نئے نئے ہونے کے باوجود آغا نصیر کے چہرے سے تشویش کا اظہار ہونے لگا۔

گرم لوہے پر ساحرہ نے ایک اور چوٹ لگائی۔

”کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے آپ ایہ کام ایسا ہے جو جلد از جلد ہو جانا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سوچی ہے۔ آپ یہ شرط رکھ دیجیے کہ شادی کے بعد احسن کو ہمارے ہی گھر میں رہنا ہوگا۔ وہ یہاں رہے گا تو کبھی سرائی خانے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔“ ساحرہ نے احسن کو اپنے قریب کرنے کی یہی ایک تدبیر سوچی تھی۔

”میں شیا سے بات کروں گا۔“ آغا نصیر نے سوچے ہوئے کہا۔

”وہ آپ سے بات کر سکتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی اور مجھ سے نہ کہتی۔ میں پھر کہوں گی کہ اس معاملے میں آپ کو جلدی کرنا چاہیے۔“

”اچھا خیر! سوچوں گا۔ یہ تم نے رونا کیوں شروع کر

”تم اب مجھ سے کبھی نہیں ملنا چاہتے؟“ ساحرہ مسکرائی۔

”تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔

اتنی بے رخی؟ ساحرہ مسکرائی۔ ”نہیں احسن! تمہیں تو اب میں اپنی دسترس کے بہت قریب لے آؤں گی۔“

رات کو اس نے آغا نصیر سے شیا کا ذکر پھینکا۔

”اب اس کی شادی ہو جانا چاہیے آغا صاحب!“

”کوئی رشتہ تو آئے!“

ساحرہ نے اسے احسن اور شیا کی محبت کے بارے میں بتایا مگر اس میں اپنا نام نہیں آنے دیا۔

”کون ہے یہ احسن!“ آغا نصیر نے چونک کر پوچھا۔

ساحرہ نے اسے احسن کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

آغا نصیر کا منہ بن گیا۔ ”یہ لڑکیاں اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہیں۔ بس محبت، محبت! یہ نہیں سوچیں کہ ان کا مستقبل کیسے گزرے گا جو ملازمت کی تلاش میں ہو، کیا وہ شیا کے اخراجات پورے کر سکتا ہے؟ وہ کہیں ملازم ہو بھی گیا تو اس کی آدمی تنخواہ شیا کی کار کے بیٹرول میں خرچ ہو جائے گی۔“

”کیا آپ نے ایک غریب لڑکی سے شادی نہیں کی؟“

”لیکن اب وہ لڑکی غریب نہیں ہے۔“ آغا نصیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے والدین بھی ایک اچھے فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ کچھ ہی دن بعد وہ ایک اچھے اسکول کے مالک ہوں گے۔“

”احسن کے لیے بھی آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اسے اپنی کسی شوگرل کا نمبر بنا دیجیے گا۔“

”کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے؟“

”تموڑی سی ٹریننگ دلوا دیجیے گا۔ وہ بہت ذہین ہے۔“

آغا نصیر کوئی جواب دیے بغیر اٹھا اور کپ پورڈ سے شراب نکالنے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ساحرہ کی بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو۔ وہ دو پیگ بنانے لگا۔ ایک اپنے لیے اور ایک ساحرہ کے لیے۔ سوات میں وہ شیا کو اس راہ پر لے آیا تھا۔

ساحرہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ مرد سے کوئی عورت اپنی بات کن لحاظ میں منوا سکتی ہے۔

لیے خوشی کی بات تھی کہ احسن شادی کر چکا تھا لیکن وہ فکر مند تھی کہ شیا کی موجودگی میں وہ احسن کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کر سکتی تھی۔ شیا کی عدم موجودگی میں احسن خود بھی گھر پر نہیں رہتا۔ وہ اس سے ناراض تھا اور اس سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ساحرہ اسے اسی صورت میں مناسکتی تھی جب وہ اس سے ملنا مگر اب تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ احسن نے اس کی کال ہی ریسیو کرنا چھوڑ دی تھی۔

سوچے سوچے ساحرہ کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوئی جیسے اسے کوئی تدبیر سوچھ گئی ہو۔ وہ مسکرا دی۔ وہ اس وقت اگلی ہی تھی۔ شیا اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

ساحرہ کو اچانک ایک خیال اور بھی آیا۔ اگر وہ کسی دوسرے نمبر پر احسن کو رنگ کرتی تو قوی امکان تھا کہ وہ کال ریسیو کر لے۔

آغا نصیر نے ساحرہ کو ایک خوب صورت موبائل فون پشاور سے دلایا تھا جو اس نے ابھی تک استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنی خواب گاہ کی طرف لپکی۔ اس نے سامان میں سے وہ موبائل نکالا جو آغا نصیر نے اسے ایکٹیویٹ کر کے دیا تھا۔ ساحرہ نے اس پر احسن کے نمبر ملائے۔

”ہیلو!“ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ آواز احسن کی تھی۔

”سب سے پہلے تو میں ابو جان اور امی جان کی رحلت پر افسوس کا اظہار کروں گی احسن!“ ساحرہ نے کہا۔

دوسری طرف سے ایسی آواز آئی جیسے طویل سانس لی گئی ہو۔

”پلیز احسن!“ ساحرہ پھر جلدی سے بولی۔ ”فون بند نہ کرنا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم مجھ سے کتنے ناراض ہو، تم نے شاید اپنا گھر بھی اس لیے چھوڑا ہے کہ میں تم سے ملنے وہاں نہ آ جاؤں۔“

”اب کیا چاہتی ہو ساحرہ!“ احسن کی آواز بے جان سی تھی۔

”تم سے ملنے کے علاوہ میں اور کیا چاہ سکتی ہوں؟“

”اب تم کسی کی بیوی بن چکی ہو۔“

لفظ ”کسی“ سے ساحرہ نے ایک نتیجہ اخذ کر لیا۔ احسن کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کی بیوی بنی تھی۔ شیا نے اسے اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔

”بیوی بن گئی ہوں تو کیا ہوا؟“ ساحرہ بولی۔ ”میں تمہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر چکی تھی۔“

”مگر میں ان خیالات سے متفق نہیں ہوں۔“

کر بستر پر لیٹ چکا تھا۔

”آؤ!“ شیا اس صوفہ میٹ کی طرف بڑھی جو ایک گوشے میں لگایا گیا تھا۔ اس نے ٹرے سینئر نیل پر رکھ دی۔ ”یہ آج اتنا کچھ کیوں بنالیا؟“ احسن نے قریب آتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس کا انداز گفتگو عموماً ایسا ہی رہنے لگا تھا جیسے کوئی مشین بول رہی ہو۔

شیا نے کہا۔ ”اتنے دن سے میں چپ ہوں۔ تم نہ تو کھانا ٹھیک سے کھاتے ہو، نہ ہی ناشتا ٹھیک سے کرتے ہو۔ اب واضح طور پر نظر آنے لگا ہے کہ اس سے تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔“ پھر وہ افس کر بولی۔ ”اگر آج بھی تم نے ٹھیک سے ناشتا نہیں کیا تو میں بھوک ہڑتال شروع کر دوں گی۔“

”میری صحت خراب ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے شیا! زندگی سے اب مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔“

”اب تمہاری زندگی صرف تمہاری نہیں رہی۔ میرا بھی حق ہے اس پر!“ شیا جذباتی ہو گئی۔ ”تمہیں میری خاطر جینے کی امنگ پیدا کرنا ہوگی خود میں!“

”میں اندر سے بالکل ویران ہو چکا ہوں شیا!“

”چلو ناشتا کرو۔ باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“ اسی روز شیا نے شدید اصرار کر کے احسن کو معمول سے زیادہ ناشتا کرایا۔ وہ خود گھر سے صرف چائے پی کے آیا کرتی تھی اور ناشتا احسن کے ساتھ کرتی تھی۔

ناشتے کے بعد شیا برتن مچن میں رکھ آئی اور بستر پر احسن کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کب تک سوگ مناتے رہو گے احسن!“

”سوگ منایا نہیں جاتا شیا! سوگ تو ہوتا ہے۔ میری زندگی میں اگر کچھ تھا تو وہ میرے ماں باپ ہی تھے۔ ویسے تو اولاد ہی ماں باپ کا سرمایہ ہوتی ہے لیکن میرا سرمایہ میرے والدین تھے۔“

”میرا خیال تھا کہ گھر کی تبدیلی سے تم پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”گھر۔۔۔“ احسن بولا۔ ”یہ لفظ اب میرے لیے بے معنی ہو چکا ہے۔ کوئی محل ہو یا جنگل، کوئی اہمیت نہیں میرے لیے۔“

”میں تمہیں جہاں چاہوں لے جاؤں؟“ شیا نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔ ”تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟“

”کیوں اعتراض ہوگا مجھے! تم مجھے کہیں بھی لے جاؤ۔ میرے لیے ایک سی بات ہوگی۔“

شیا گھر سے روانہ ہوئی۔ کار چلاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، کیا احسن مان جائے گا کہ وہ اس کے گھر میں آکر رہے؟ شیا کو یہ معاملہ خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہتی تھی کہ احسن کو اس پر کس طرح آمادہ کیا جائے؟ ذہن میں بہت سی تدبیریں ابھریں تو سبھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ ان میں سے کوئی بھی تیرہ ہدف کے نسخے کے مصداق نہیں تھی۔

کار اس نے اپارٹمنٹس کی ایک عمارت کے احاطے میں پارک کی۔ دوسری منزل کا ایک اپارٹمنٹ فوری طور پر کرائے پر مل گیا تھا۔ دوسرا مکان خریدنے سے پہلے احسن کا پہلا مکان بکنا ضروری تھا۔ وہ شیا نے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔

دوسری منزل کے اپارٹمنٹ کا لاک شیا نے چابی سے کھولا۔ خود احسن ہی کی خواہش تھی کہ شیا اپارٹمنٹ لاک کر کے جا پا کرے۔ وہ بہت پر مردہ تھا اور اپارٹمنٹ سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اپارٹمنٹ کی دوسری چابی شیا نے احسن کے پرس میں رکھ دی تھی کہ شاید اسے کسی دقت باہر نکلنے کی ضرورت پڑ جائے۔

شیا اس کمرے میں داخل ہوئی جسے خواب گاہ کے فرنیچر سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس نے احسن کو بستر پر نیم دراز دیکھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر احسن نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ اس کا شیوہ صابڑھا ہوا تھا۔

”اب آج تو شیوہ بنا لو احسن!۔۔۔ میں اتنی دیر میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔“

”کچھ زیادہ تو نہیں بڑھا!“ احسن نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”تم کو تو کسی بات کا احساس ہی نہیں رہا ہے۔ کل تک شیوہ اتنا بڑھ جائے گا کہ ڈاڑھی کا گمان ہونے لگے گا۔ پلیز! آج شیوہ کر لو!“

”اچھا!“ احسن نے طویل سانس لی اور بستر سے اٹھنے لگا۔ شیا کے اصرار پر ہی وہ شیوہ بنایا کرتا تھا۔ اسے اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ کپڑے بھی وہ شیا کے اصرار پر ہی تبدیل کرتا تھا۔ شیا کی عدم موجودگی میں اس کے بال بھی بکھرے رہتے تھے اور اس وقت بھی بکھرے ہوئے تھے۔

شیا ہی اس کے بالوں میں برش کیا کرتی تھی۔ شیا نے ناشتا خانے سے تیار کیا۔ جب وہ ٹرے لے کر احسن کے کمرے میں داخل ہوئی تو احسن شیوہ بنا

”تو پھر یہ شادی دو تین دن میں ہی ہو جانا چاہیے۔“

ساحرہ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ احسن جلد از جلد اس کے قریب آجائے۔ ”بس۔“ آغا نصیر بولا۔ ”وہ کسی طرح بھی احسن کو یہاں رہنے پر آمادہ کر لے۔“

”میں اس سے کہہ دوں گی۔ پوری کوشش کروں گی کہ ایسا ہی ہو۔“

”اب تو دور نہ رہو مجھ سے!“ آغا نصیر نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ اس مرتبہ ساحرہ نے اس سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے جو چاہا تھا وہ ہو گیا تھا۔

دوسرے دن ساحرہ نے صبح ہی صبح مسکرا کر شیا سے کہا۔ ”آغا صاحب سے منوالی ہے میں نے بات! احسن سے تمہاری شادی دو تین دن میں ہو جائے گی۔ شادی کی تیاریوں کی ساری ذمہ داری آغا صاحب نے مجھے ہی سونپ دی ہے۔“

خوشی سے شیا کا چہرہ کھل اٹھا۔

”لیکن ایک شرط ہے آغا صاحب کی۔“ ساحرہ نے کہا۔ ”وہ احسن کو اپنی ایک شوگرمل کا منیجر تو بنادیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ احسن کو ہمیں آکر رہنا پڑے گا۔“

شیا کے چہرے سے خوشی رخصت ہو گئی۔ اس نے پریشانی سے کہا۔ ”احسن شاید یہاں رہنا پسند نہ کرے۔“

”اگر اسے تم سے محبت ہے تو وہ سب کچھ مانے گا۔ آغا صاحب تو یہ شادی دس پندرہ دن بعد کرنا چاہتے تھے کیونکہ تمہارا بھائی شہر یار دس پندرہ دن بعد ہی آئے گا لیکن میں نے آغا صاحب کو جلدی کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔“

”بھائی جان تو دو تین دن میں آنے والے ہیں۔“

”نہیں۔“ ساحرہ نے جواب دیا اور اسے جو کچھ آغا نصیر سے معلوم ہوا تھا، وہ اس نے شیا کو بتا دیا۔

شیا اپنی الجھن کے باوجود خفیف سا مسکرا دی۔ ”میرا خیال ہے کہ بھائی جان دو تین روز میں ہی آجائیں گے۔ انہیں سر پر اثر دینے کی عادت سی ہے۔“

”آجائے ہیں تو اچھا ہے۔ تم احسن کو جلد از جلد تیار کرو۔“

”میں اسی کے پاس جا رہی ہوں۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہوگا، مجھے ہی اس کی ہر بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”تو جاؤ!“ ساحرہ نے مسکرا کر شیا کا گال تھپکا۔

”بیٹ آف لک!“



سہی! لیکن وہ خلش..... میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ یہ تو تم بھی کہہ چکی ہو اور میں بھی سوہنہ رہا ہوں کہ ساحرہ سے شادی کا نتیجہ میرے لیے بہت کرب ناک ہوتا۔ میں بھول جاؤں گا اسے!"

شیبا سرابی۔ وہ خوش ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ابھی تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں کہیں بھی لے جاؤں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تمہارے لیے۔"

"ہاں۔" احسن نے کہا۔ "کسی جگہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں کسی محل میں بھی رہوں تو بس ایک کمرہ ہی تو ہوگا میرے لیے سب کچھ۔"

"تو پھر۔" شیبا نے ہمت کر کے کہا۔ "شادی کے بعد تم میرے ساتھ میرے گھر میں رہو گے۔"

"تمہارا گھر؟" پہلی مرتبہ احسن کا لہجہ ساٹ نہیں تھا اور اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات بھی نظر آئے تھے۔

"ہاں، میرا گھر۔" شیبا کے دل کی دھڑکن تیز تھی۔ "جہاں میں پیدا ہوئی تھی۔ میرے ماں باپ کا گھر۔"

"گو یا..... گھر داماد!"

"تم وہاں رہ کر ایسی کوئی بات محسوس نہیں کرو گے۔"

شیبا نے جلدی سے کہا۔ "ابھی بات ہو چکی ہے نا! تم تو بس ایک کمرے میں رہو گے۔ میرے علاوہ تمہیں کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"احسن! شیبا کے منہ سے نکلا۔ وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ بے اختیار ہو کر اٹھی اور احسن سے لپٹ گئی لیکن پھر دوسرے ہی لمحے چوکی اور احسن سے الگ ہو گئی۔ اسے یہ عہد یاد آ گیا تھا کہ فی الحال وہ صرف دوست رہیں گے۔ ان میں کسی قسم کی قربت نہیں رہے گی۔"

شیبا کی اس حرکت کے باوجود احسن کا چہرہ بے تاثر رہا۔

احسن کو دوپہر کا کھانا کھلانے کے بعد شیبا نے کہا۔

"شادی کے بعد تمہیں ایک ایسی بات معلوم ہوگی احسن جو میں نے تمہیں اب تک نہیں بتائی۔ کیا میں امید کروں کہ وہ بات معلوم ہونے پر تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آئے گا؟"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"ابھی نہیں بتانا چاہتی۔"

"اچھا۔" احسن اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

لے اس نے سوچے سمجھے بغیر شیبا کے گھر میں رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

"وعدہ کر رہے ہوتا؟" شیبا نے پوچھا۔

"کس بات کا؟"

"بعد میں تم مجھ پر غصہ نہیں کرو گے۔"

"ٹھیک ہے، نہیں کروں گا۔ جو چاہو، وہ کرو شیبا!..... ہاں شیبا!..... اب مجھے صرف تمہارے لیے ہی تو زندہ رہنا ہے۔"

شیبا کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ شادی کے بعد احسن کو معلوم ہوتا کہ آغا نصیر کی چوتھی بیوی ساحرہ تھی تو وہ یقیناً چونک جاتا لیکن شیبا نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ چراغ پائیں ہوگا۔ اس پر غصہ نہیں کرے گا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں" شیبا بولی۔ "تیسرے پہر کو آؤں گی۔"

شیبا کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ گھر سے اس کی عدم موجودگی کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا تھا۔

جب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو بہت خوش تھی۔ وہ تو احسن کو اپنے گھر میں لانے کے لیے تدبیریں سوچتی رہی تھی لیکن معاملہ کسی خاص تدبیر پر عمل کرنے کے بجائے بڑی آسانی سے طے پا گیا تھا جس کی وجہ شیبا نے سمجھ لی تھی۔ احسن ان دنوں بالکل خالی الذہن رہنے لگا تھا۔ گھر پہنچ کر وہ فوراً ساحرہ سے ملی۔

"آگئیں احسن سے مل کر؟" ساحرہ مسکرائی۔

"ہاں۔" شیبا نے خوشی سے کہا۔ "میں نے اسے تیار کر لیا ہے۔ وہ شادی کے بعد یہیں رہے گا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا جانی! اب میں تمہارے ڈیڈی کو بتا دوں گی کہ احسن نے ان کی شرط مان لی ہے۔"

"لیکن ایک مشکل اب بھی باقی ہے ساحرہ!"

"وہ کیا؟"

"شادی کے موقع پر اگر اس نے تمہیں یہاں دیکھ لیا اور یہ بھی جان لیا کہ تم یہاں کس حیثیت سے ہو تو اس کا رد عمل نہ جانے کیا ہوگا!"

"اس کی فکر نہ کرو، میں کوئی ایسی تدبیر سوچ لوں گی کہ شادی سے پہلے اس کے سامنے نہ آؤں۔ بس اب تم شادیاں بجاؤ خوشی کے۔"

شیبا کو خوب اندازہ تھا کہ ساحرہ کے دل میں کیا تھا لیکن وہ مطمئن تھی، اس کا خیال تھا کہ احسن یہاں رہے گا تو وہ اس کی حفاظت آسانی سے کر سکے گی اور اسے ساحرہ سے بچا

کر رکھنے میں کامیاب رہے گی۔ اگر اس کے برخلاف ہوتا تو اس کے خیال میں مشکل پیش آسکتی تھی۔ احسن ساری زندگی تو اس طرح خالی الذہن نہیں رہتا۔ ماں باپ کا صدمہ دیر سے دیر سے کسی لیکن کم ہوتا رہے گا اور کم ہوتا رہے گا تو ختم بھی ہو جائے گا۔ وہ اس کی نظروں سے دور رہتا اور اس دوری سے ساحرہ قائمہ اٹھانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اس کے برخلاف ایک گھر میں رہنے کے باعث شیبا کے لیے احسن کا خیال رکھنا آسان ہوتا۔ کم از کم وہ یہی سمجھ رہی تھی۔

دوسری طرف ساحرہ بھی بہت خوش تھی اور اب اسے احسن کا قرب حاصل کرنے کی کوششوں کے زیادہ مواقع مل سکتے تھے۔

اسی دن عشرت اعوان نے آغا نصیر کی ہدایت پر شیبا اور احسن کی شادی کی تیاریاں شروع کروادیں۔

انسان دولت مند ہو تو بیشتر کام محنتوں کے بجائے ہفتوں میں اور ہفتوں کے کام دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ اس شادی کی مکمل تیاری میں بھی تین دن سے زیادہ نہیں لگے اور چوتھے دن شادی کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے آغا نصیر کے مہمانوں کا ہجوم ہو گیا۔

احسن دلہا کی حیثیت سے وہاں موجود تھا لیکن ایسی ذہنی کیفیت میں جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کہاں ہے۔ اسی لیے وہ یہ اندازہ بھی نہیں لگا سکا کہ آغا نصیر اس دوران میں افراتفری کا شکار کیوں تھا۔ وہ نکاح تک اور نکاح کے بعد کھانے کے خاتمے تک گھر کے بھی کچھ لگا چکا تھا۔ جب وہاں موجود ہوتا تو بھی بار بار موبائل پر کسی نہ کسی سے بات کرتا رہتا تھا۔

صرف شیبا ہی جانتی تھی کہ تقریب میں شریک نہ ہونے کے لیے ساحرہ نے پیٹ کی شدید تکلیف کا بہانہ بنایا تھا۔ آغا نصیر کی وجہ سے کئی ڈاکٹر آغا نصیر کے گھر پہنچے رہے۔ تکلیف کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ابتدائی میں کسی ڈاکٹر نے رائے دی تھی کہ ساحرہ کو کسی اسپتال لے جایا جائے جہاں پیٹ کی تکلیف سے متعلق تمام ٹیسٹ کیے جاسکتے تھے لیکن ساحرہ نے ضد کا مظاہرہ کیا تھا کہ وہ اسپتال نہیں جائے گی چنانچہ ڈاکٹر زاپس کے مشورے سے مختلف دوائیں آزماتے رہے۔ آخر ساحرہ نے تکلیف بتدریج کم ہونے کا اظہار اس وقت شروع کیا جب تقریب ختم ہونے میں ایک گھنٹہ گزرا تھا اور وہ اس وقت خود کو بالکل ٹھیک ظاہر کرنے لگی جب شیبا اور احسن کمرے میں جا چکے تھے۔

اگرچہ شادی کے بعد وہ پہلی رات تھی لیکن سول میرج

سسپینس ڈائجسٹ

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

اچھوتی محبت

ہوئے اتنے دن گزر چکے تھے کہ شیبا پہلی رات کی دلہن کی طرح شرمائی ہوئی نہیں تھی۔ "بہت ٹھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔" اس نے احسن سے کہا۔ "کچھ دیر آرام کر لو۔"

احسن پہلے ہی بستر پر لیٹ چکا تھا۔ شیبا اس کے برابر میں لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں ماضی کے واقعات کسی کتاب کے اوراق کی طرح پھڑپھڑانے لگے تھے۔ جب اس نے کالج میں احسن کو دیکھا تھا، پھر اس کا اور ساحرہ کا تعلق سمجھنے کے بعد اس نے خود کو ان دونوں کے درمیان آنے سے روک لیا تھا۔ اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب وہ بیوی کی حیثیت سے احسن کے برابر میں لیٹی ہوگی۔

لیکن برابر لینے کا یہ دورانیہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ شیبا نے تو سوچا تھا کہ احسن بس آدھے پون گھنٹے آرام کر لے گا لیکن دو گھنٹے گزر گئے۔ احسن اگرچہ اب بھی جاگ رہا تھا لیکن کبھی کروٹ لے لیتا تھا کبھی چٹ لیٹ کر چھت کو ٹکھنے لگتا تھا۔

اب شیبا کو جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی۔ بستر سے اٹھ کر اس نے اپنے زیورات اتار کر رکھے اور جو پڑے وہ دلہن کی حیثیت سے پہنے رہی تھی، وہ اتار کر اس نے ایک باریک ناکی پہن لی تھی۔ وہ پہن کر اس کے جسم کا ہر عضو بڑی حد تک نمایاں نظر آ رہا تھا۔ اب جو احسن نے اسے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر نظریں ہٹائیں لیکن دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

شیبا دبی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پہلو میں اس سے لپٹ کر لیٹ گئی۔

یہ سنسنی خیز قرب احسن کو زیادہ دیر تک خالی الذہن نہیں رکھ سکا۔ دیر سے دیر سے احساسات کی بے داری شروع ہوئی اور جب احساسات پوری طرح بیدار ہو گئے تو وہ بھونچال بھی آیا جو شادی کی پہلی رات کا خاصہ ہوتا ہے۔

اس رات شیبا نہ تو خود سوئی تھی، نہ اس نے احسن کو سونے دیا تھا۔

"ڈیڈی نے کہا تھا کہ ناشتا ہم دونوں ان کے ساتھ ہی کریں۔" شیبا نے احسن سے کہا۔ "وہ آٹھ بجے ناشتے کی میز پر ہوتے ہیں۔ ہمیں اب تیار ہو جانا چاہیے۔"

"ہوں۔" احسن خفیف سا مسکرایا۔

شیبا خوش ہو گئی۔ گزشتہ دنوں میں اس نے احسن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رت بھی نہیں دیکھی تھی۔ گزری ہوئی رات نے احسن کے دل و دماغ پر یقیناً کچھ مثبت اثرات

سسپینس ڈائجسٹ

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

2012

”یہ تو تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ احسن قدرے توقف سے بولا۔ ”یہ جاننے کے بعد اس گھر میں آنا.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نفی میں سر ہلایا، اس کے بعد پھر کچھ رک کر بولا۔ ”لیکن تم یہ کیوں چاہتی تھیں شیدا کہ میں یہاں آ کر رہوں؟“

”صرف اس لیے احسن کہ میں تمہیں ساحرہ سے بچانا چاہتی ہوں۔“

”ساحرہ کے قریب لا کر؟“

”اپنے قریب رکھ کر۔“ شیدا نے جواب دیا۔ ”اب تم ہر وقت میری نظر میں رہو گے، جبکہ یہاں نہ رہتے تو.....“ پھر اس نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس نے سوچا تھا۔

احسن خاموش رہا۔

شیدا کچھ رک کر پھر بولی۔ ”کیا میری یہ سوچ غلط ہے؟“

”یہ تو میں ابھی نہیں کہہ سکتا شیدا!“ احسن نے کہا۔ ”یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ تم نے سچ سوچا تھا یا غلط، لیکن اس بات سے یہ ضرور اندازہ ہوا ہے کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتی ہو۔“ وہ شیدا کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

شیدا نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر احسن کے قریب آ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ احسن کی گردن میں ڈال دیے اور اس کے سینے سے لگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم میری روح بن چکے ہو اب، اور روح کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔“

احسن نے محبت سے اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اپنی زندگی کی ایک اہم رات گزارنے کے بعد اس کی خالی الذہنی کی کیفیت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ معمول کے مطابق نظر آنے لگا تھا۔ یکا یک اس نے شیدا کو گود میں اٹھایا اور اسے لے جا کر بستر پر ڈال دیا۔ پھر بستر پر بیٹھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”اور تم میری زندگی بن چکی ہو۔ زندگی..... جس کے بغیر روح آدمی ہو جاتی ہے، لیکن میری یہ فکر مندی اپنی جگہ ہے شیدا کہ ساحرہ کی موجودگی میں ہم سکون سے زندگی گزار سکیں گے؟“

”بالکل گزار سکیں گے۔“ شیدا نے مسکرا کر کہا۔ ”ساحرہ کے خیالات کچھ بھی ہوں، میں جانتی ہوں کہ تم اس کے سامنے پکھل نہیں سکتے اور میں جو ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ساحرہ کو ایسا موقع ہی نہیں مل سکے گا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق کوشش بھی کر سکے۔ گھر میں تو میں تمہارے ساتھ رہوں گی ہی، لیکن جب تم شوگر مل کے شجر بن جاؤ گے تو

”ڈیڈی!“ شیدا بولی۔ ”شجر کا کوئی سیکر ٹری بھی ہوتا ہوگا!“

”اشیو ہوتا ہے۔“

”سیکر ٹری کی جگہ نکالی تو جاسکتی ہے۔ آپ مجھے احسن کی سیکر ٹری بنا دیجیے گا۔“

اس وقت ساحرہ نے معنی خیز نظروں سے شیدا کی طرف دیکھا۔

شیدا بولتی رہی۔ ”اس طرح میں گھر میں اکیلی پڑی بور ہونے سے بچ جاؤں گی۔“

”اچھا!“ آغا نصیر ہنسا۔ ”اگر تم چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔“

کیونکہ ساحرہ نے اسے بتایا تھا کہ شیدا کو احسن سے بے پناہ محبت ہے اس لیے اس نے یہی سوچا ہوگا کہ شیدا محبت ہی کی وجہ سے ہر وقت احسن کے قریب رہنا چاہتی ہے۔ ناشتا کر چکنے کے بعد شیدا احسن کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹی تو وہ کسی قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ احسن کا رد عمل جانے کیا ہو!

کمرے میں داخل ہو کر احسن ٹہلے لگا۔ شیدا نے بستر کے قریب جا کر سائنڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔ وہ اس وقت چوری بن گئی تھی۔ ”یہ بات ایسی نہ تھی شیدا جو تم مجھے پہلے نہ بتا سکیں۔“

احسن بولا۔

”تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا احسن!“ شیدا نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔ ”تم مجھ پر ناراض نہیں ہو گے، تمہیں مجھ پر غصہ نہیں آئے گا۔“

”میں ناراض کب ہو رہا ہوں شیدا!“ احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ ”نہ میں نے غصے کا اظہار کیا ہے۔ میں تو بس یہ جانتا چاہتا ہوں کہ یہ بات تم مجھے پہلے کیوں نہیں بتا سکتی تھیں؟“

”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی احسن!“ شیدا کی آواز بھرا گئی۔ ”پہلے تو ایک مرتبہ میں خود ہی تم سے دور ہو گئی تھی، اب دوبارہ تم سے دور ہو جاتی تو شاید خود کو سنبھال نہیں پاتی۔“

”یہ بتا دیتیں تو مجھ سے دور کیسے ہو جاتیں؟ ہم سول میرج تو کر ہی چکے تھے۔“

”لیکن تم شاید اس گھر میں رہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جہاں ساحرہ ہو۔“

احسن فوراً کچھ نہیں بولا، ٹھہرا رہا۔ اس کے انداز سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ شیدا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”یہ..... یہ..... یہ تم نے.....“

احسن اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ اندر سے آغا نصیر کی آواز آئی۔ ”وہاں کیوں رک گئے تم دونوں.....؟ آؤ نا!“

”آؤ۔“ شیدا نے احسن کا ہاتھ پکڑ کر اندر قدم رکھا۔ احسن کی اس وقت عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ اس کی ہاتھیں سنسانے لگی تھیں۔

”آؤ بیٹے!“ آغا نصیر نے اس سے کہا۔ ”تم میرے برابر میں آ کر بیٹھو! شیدا ساحرہ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ جائے گی۔“

آغا نصیر ڈائننگ ٹیبل کے سرے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بائیں جانب ساحرہ بیٹھی تھی۔ احسن اسی کرسی پر بیٹھا جس کی طرف آغا نصیر نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح احسن اور ساحرہ بالکل آمنے سامنے ہو گئے۔ ساحرہ کے برابر میں شیدا بیٹھی۔ وہ کچھ پریشان نظروں سے احسن کی طرف دیکھ رہی تھی جس کے چہرے کی کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے بار بار رنگ بدل رہا ہو۔

”کیسے ہوا احسن!“ ساحرہ نے چپکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ آغا نصیر کو بتا چکی تھی کہ وہ اور شیدا اسی کالج میں پڑھا کرتے تھے جہاں احسن زیر تعلیم رہا تھا۔

احسن کے ہونٹ ہلے لیکن وہ ساحرہ کو جواب نہیں دے سکا۔ الفاظ اس کے حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

ساحرہ پھر بولی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم دونوں کی شادی میں شریک نہیں ہو سکی۔ کل رات میرے پیٹ میں جانے کیوں بڑی شدید تکلیف ہو گئی تھی۔ آدمی رات کے بعد ٹھیک ہوئی ہوں۔ اس کے بعد بھی بہت دیر تک نڈھال پڑی رہی۔ یہ تو جانتے ہیں۔“ اس کا اشارہ آغا نصیر کی طرف تھا۔

”ہاں احسن میاں!“ آغا نصیر نے کہا۔ ”بہت بری حالت ہو گئی تھی ان کی۔ خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ناشتا شروع کرو۔“

احسن جیسے تیسے ناشتا کر سکا۔ شیدا اس کی حالت کا جائزہ لیتی رہی۔ اس دوران میں ساحرہ چپکتی رہی۔ اس نے کالج کے زمانے کی باتیں چھیڑ دی تھیں۔ سچ میں ایک جگہ اسے روک کر آغا نصیر نے احسن سے کہا کہ وہ اسے اپنی ایک شوگر مل کا فیجر بنا دے گا۔ جواب میں احسن نے کہا تھا کہ اس میں اس قسم کی ذمہ داری سنبھالنے کی اہلیت نہیں۔

”دو تین ماہ کی ٹریننگ سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ آغا نصیر نے کہا۔

مرتب کے تھے۔

لیکن اب کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم کی طرف جاتے وقت شیدا پر یہ ہول سوار ہوا کہ ڈائننگ روم میں آغا نصیر کے ساتھ ساحرہ بھی ہوگی۔

”احسن؟“ وہ دھیرے سے بولی۔

”ہوں۔“ احسن نے اس کی طرف دیکھا۔

شیدا تذبذب کا شکار تھی۔

”بولو شیدا! کیا کہنا چاہتی ہو؟“ احسن نے پوچھا۔ اس کا یہ سوال بھی اس کی واضح ذہنی تبدیلی کی طرف اشارہ تھا، ورنہ تو شیدا اگر اپنی کوئی بات ادھوری چھوڑ دیتی تو وہ بھی خاموش ہو جاتا تھا، کبھی استفسار نہیں کرتا تھا۔

ڈائننگ روم قریب آتا جا رہا تھا۔ شیدا جلدی سے بولی۔ ”شادی سے پہلے، میں نے تم سے کہا تھا کہ..... ایک بات..... شادی کے بعد بتاؤں گی۔“

”مجھے یاد ہے۔“ احسن نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”تم نے مجھ سے وعدہ بھی لیا تھا کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا، تم پر غصہ بھی نہیں کروں گا۔“

”وہی بات..... میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں اب۔“ شیدا کی سانسیں ناہموار ہو گئی تھیں۔

”تو بتاؤ!“

”وہ..... وہ میں نے تمہیں ڈیڈی کی..... چوتھی شادی کے بارے میں بتایا تھا؟“ شیدا رک رک کر بول رہی تھی۔ جملے اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے۔

”ہاں ہاں بتایا تھا!..... پھر.....؟“

”وہ شادی.....“

”ہوں.....“

”ڈیڈی کی وہ شادی.....“

”گھبرا کیوں رہی ہو شیدا!“ احسن نے کہا۔ ”بتا بھی چکو۔“

ڈائننگ روم کا دروازہ اب دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ شیدا نے جلدی سے کہا۔ ”ساحرہ سے ہوئی تھی۔“

”کیا!“ احسن ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے..... ساحرہ نے تمہارے ڈیڈی سے شادی کی ہے؟“

اس وقت وہ دونوں ڈائننگ روم کے دروازے پر رکے ہوئے تھے جو بند نہیں تھا۔ پردے کے بجائے اس میں رنگارنگ موتیوں کی جھالریں لگی ہوئی تھیں۔

”ہاں احسن!“ شیدا نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ڈائننگ روم میں وہ بھی ہوگی۔“

مشکل

مہمان نے میزبان کے ہاتھ سے پوچھا: بیٹے، کیا تم رات کو سونے سے پہلے خدا کا شکر ادا کرتے ہو؟
بچے نے جواب دیا: "ہاں تو نہیں البتہ میری اتنی ضرورت ادا کرتی ہیں۔"
مہمان نے کہا: کیا کہتی ہیں؟
بچہ بولا: "خدا کا شکر ادا کرتی ہیں کہ میں شکرگیا ہوں۔"

ہی نہیں کرنا چاہیے تھی اور اب شادی کر لی ہے تو اسے اپنی جاگیر نہ بھجو۔

"اگر تمہارے یہ خیالات ڈیڈی کو معلوم ہو جائیں تو؟" شیا کے لہجے میں تکی آئی۔

ساحرہ چند لمحے اسے گھورتی رہی، پھر اس نے کہا۔

"میں خوب جانتی ہوں کہ اس سوسائٹی میں کیا ہوتا ہے جہاں

میں ایک انٹرا مارٹن شخص کی بیوی ہوں۔ اس سوسائٹی کے

مرد اپنی بیویوں کے علاوہ دوسری عورتوں سے بھی تعلقات

رکھتے ہیں۔ مرد ہی نہیں، عورتیں بھی رکھتی ہیں۔ بس معاشرتی

جبر کی وجہ سے مردوں کو ذرا کم لیکن عورتوں کو یہ سب کچھ بہت

زیادہ چھپ کے کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ بھی

کبھی یہ بات میاں بیوی پر مکمل بھی جانی ہے لیکن وہ ایک

دوسرے کی ان باتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتے ہیں جیسے

انہیں کچھ معلوم ہی نہ ہوا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہی میرے اور

آغا صاحب کے معاملے میں بھی ہو سکتا ہے لیکن تم سے مجھے یہ

توقع نہیں کہ تم انہیں میرے خیالات سے آگاہ کر دو گی۔ تم

میری بہت اچھی دوست ہو۔"

شیا نے یہ تقریر بڑے تحمل سے سنی ورنہ وہ ایک مواقع

پر اس کا جی چاہا تھا کہ کچھ بول پڑے۔

"میں یقیناً ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ سنجیدگی

سے بولی۔ "یہ ان کا معاملہ ہے، وہی جانتیں..... شاید ہر ایک

کو اپنے طرز کی زندگی گزارنے کا حق ہے لیکن اسے یہ بھی

سوچنا چاہیے کہ کون سا طرز زندگی اس معاشرے کی تباہی کا

سبب نہیں بنے گا۔"

"انسان کے فطری اعمال معاشرے کو تباہ نہیں

کرتے۔"

"ضروری نہیں کہ میں تمہارے اس خیال سے بھی

اتفاق کروں۔ میں بس یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرا شمار تم اس

سوسائٹی کی ان بعض عورتوں میں نہ کرو جنہیں اس معاشرے

کی تباہی کا خیال نہیں ہوتا۔"

"تو تم؟" ساحرہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"احسن کو اپنی ملکیت بنائے رکھنا چاہتی ہو؟"

"بنانا کیا مطلب! وہ میری ملکیت ہے۔" شیا نے

زور دے کر کہا۔ "اور میں اس کی ملکیت ہوں۔"

ساحرہ تکی سے ہنسی۔ "میں نہیں جانتی کہ تم اس کی

ملکیت رہ سکو گی یا نہیں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ تمہاری ملکیت

نہیں رہ سکے گا۔ جب اس نے مجھ سے گریز کیا، اس وقت وہ

نہیں جانتا تھا کہ عورت کا قرب کیا ہوتا ہے لیکن اب..... تم

میں بڑی سنجیدگی تھی۔

شیا نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھتے ہوئے بولی۔

"دیکھتی ہوں، کیا کہتی ہے وہ!"

اپنے کمرے سے نکل کر شیا ساحرہ کے کمرے میں

پہنچی اور جاتے ہی مسکراتے ہوئے بولی۔ "کوئی خاص بات

ہے کیا ساحرہ، اور....." اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "ڈیڈی

نہیں ہیں؟"

"وہ کسی کاروباری میٹنگ میں گئے ہیں۔" ساحرہ

بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ "اور تم سے مجھے کسی تمہید کے بغیر

ایک سوال کرنا ہے۔"

"کرو۔" شیا مسکراتی رہی۔ اگرچہ اسے کچھ کھٹکا ہو گیا

تھا لیکن وہ اس نے اپنی مسکراہٹ میں چھپالیا۔

ساحرہ بولی۔ "تم احسن کی بیوی بنی ہو یا اس کی

پہرے دار؟"

"میں اس سے محبت کرتی ہوں ساحرہ!" شیا نے کہا۔

"اور تم خوب جانتی ہو کہ میری محبت سچی نہیں! میرا دل چاہتا

ہے کہ ایک لمبے کے لیے بھی احسن سے دور نہ رہوں۔"

"تمہاری محبت قطعی خود غرضانہ ہے۔" ساحرہ نے

بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم جانتی ہو کہ میں بھی اس سے

محبت کرتی ہوں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے اس سے

تمہائی میں بات کرنے کا موقع تک نہیں دینا چاہتی ہو۔ یہ خود

غرضانہ محبت نہیں تو اور کیا ہے۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ

مجھے بھی اس سے محبت ہے۔"

"لیکن اب تم ڈیڈی سے شادی کر چکی ہو۔" شیا اب

سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"شادی اور محبت، دو الگ الگ باتیں ہیں۔" ساحرہ

بولی۔ "کیا میں نے یہ بات تم سے پہلے نہیں کہی؟"

"کبھی تھی۔" شیا ٹپکتے ہوئے کھڑکی تک چلی گئی اور

ساحرہ کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ "لیکن..... اگر احسن کی

شادی کسی اور لڑکی سے ہوتی تو تم کچھ بھی کرتیں، میں اس میں

داخل انداز ہی نہیں کرتی۔ اب تمہیں سوچنا چاہیے کہ وہ کسی اور

کا نہیں، تمہاری دوست کا شوہر ہے۔"

"دوستوں کی ہر چیز ایک دوسرے کی ہوتی ہے،

مشترک ہوتی ہے۔"

شیا تیزی سے اس کی طرف گھومی۔ "شوہر بھی مشترک

نہیں ہوتے۔"

"تم میرے خیالات سے واقف نہیں شیا!..... اگر تم

میرے خیالات کی مخالف تھیں یا ہو، تو تمہیں احسن سے شادی

میں تمہاری سکرٹری کی حیثیت سے وہاں بھی تمہارے ساتھ

رہوں گی۔ تمہیں ڈیڈی کی پیشکش منظور ہے نا؟"

"منظور تو کرنا ہی پڑے گی۔" احسن نے سنجیدگی سے

کہا۔ "میں اس گھر میں آ تو گیا ہوں لیکن میں یہ پسند نہیں

کروں گا کہ میرا اور میری بیوی کے اخراجات کا بوجھ

تمہارے ڈیڈی ہی اٹھاتے رہیں۔"

"میں خوش ہوئی تمہارے جواب سے۔"

"لیکن مجھے شجر بننے سے پہلے کچھ عرصے تربیت بھی تو

حاصل کرنا ہے۔ اس وقت تو تم میرے ساتھ نہیں رہو گی۔"

"کیوں نہیں رہوں گی۔" شیا مسکرائی۔ "مجھے بھی تو

تربیت حاصل کرنا پڑے گی کہ سکرٹری کی ذمہ داریاں کیا

ہوتی ہیں۔"

احسن ہنس پڑا۔ "تم نے سب کچھ سوچ لیا ہے لیکن مجھ پر

تمہاری یہ پہرے داری ساحرہ کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر سکتی ہے۔"

"اس کی جھنجھلاہٹ سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑ سکتا

ہے؟"

"تم دونوں اب تک دوست بنی رہی ہو لیکن پھر شاید

ایسا نہ رہ سکے۔ وہ تمہیں اپنا رقیب محسوس کرنے لگے گی۔"

"میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ تم کسی اور

لڑکی کے نہیں، اس کی دوست کے شوہر بنے ہو اس لیے اسے

اب تمہارے بارے میں سوچنا چھوڑ دینا چاہیے۔ مجھے امید

ہے کہ وہ بات سمجھ لے گی۔"

لیکن شیا کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ کچھ دن بعد وہ

دونوں تربیت کے لیے ساتھ ساتھ جانے لگے اور گھر میں بھی

شیا ہر لمبے احسن کے ساتھ رہنے لگی تو ساحرہ نے اسے کبھی

نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ تبدیلی شیا نے بھی

محسوس کر لی اور احسن نے بھی۔

"سکسل اچھا نہیں مل رہا ہے شیا! ایک روز احسن

نے کہا۔

شیا اس کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔ "دیکھا جائے گا۔"

ان دونوں میں جس دن یہ بات ہوئی تھی، اسی رات کو

شیا نے کمرے میں اپنے موبائل پر ساحرہ کی کال ریسیو کی۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں شیا! وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا تم ذرا دیر کے لیے میرے پاس آؤ گی؟"

"آتی ہوں۔" شیا نے آہستہ سے کہا۔

احسن اس کے اتنے قریب تھا کہ اس نے ساحرہ کی آواز

سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار پیدا ہوئے۔

"کیوں بلا رہی ہے وہ تمہیں! وہ بولا۔ اس کے لہجے

ہے وہ بھی میرے قرب کی وجہ سے۔“
”یہ فضول باتیں کرنے کے لیے فون کیا ہے تم نے مجھے!“ احسن نے ناگواری سے کہا۔

”نہیں احسن! یہ تو بات سے بات نکلی ہے۔ ویسے بھی بات بھی ہے احسن کہ... میرا مطلب ہے... اگرچہ آغا صاحب کی عمر بہت زیادہ نہیں لیکن ساٹھ سال بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ اس عمر میں ہائی بلڈ پریشر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں مانتی ہوں کہ شیا مجھ سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے مگر انڈی ہوئی جوانی اس نے نہیں پائی۔“

احسن نے کچھ غصے سے کہا۔ ”تم نے یہ بے ہودہ باتیں اگر میرے جذبات بھڑکانے کے لیے کی ہیں تو یقین کر لو کہ تمہیں ناکامی ہوئی ہے۔“

”ہوسکتا ہے۔“ ساحرہ بڑے مزے سے بات کر رہی تھی۔ ”لیکن عملاً یہ صورت حال سامنے آئے گی تو تم بے بس ہو جاؤ گے۔“

”میری قوت ارادی بہت مضبوط ہے۔“
”سب دھری رہ جائے گی۔“
”مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد تم بہت جنونی ہو گئی ہو۔“

”مجھ کہہ رہے ہو۔ پہلے کبھی نہیں تھی؟“
”میں تمہیں نصیحت ہی کر سکتا ہوں کہ اپنے جنون پر قابو پا لو تو اچھا ہوگا۔“

”میں تم سے ملنا چاہتی ہوں احسن! بس! بس! اور کچھ نہیں سنتا مجھے! اگر سیدھی انگلیوں سے کھی نہیں لکھتا تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں۔“

احسن نے جھنجھلا کر رابطہ منقطع کر دیا اور یہ شاید اس نے اچھا ہی کیا۔ اس نے ایسی آواز سنی تھی جیسے باہر سے دروازے کا لاک کھولا گیا ہو۔

آنے والی ظاہر ہے کہ شیا ہی ہونا چاہیے تھی۔ احسن نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔

”خیریت؟“ احسن نے پوچھا اور لیٹے لیٹے موبائل کے ریکارڈ سے وہ کال ختم کر دی جو ساحرہ نے کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیا کی نظر اس پر پڑ جائے۔ احسن اسے اس کال کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کال کے بارے میں بتاتا تو ساری باتیں بھی بتانا پڑتیں۔ وہ زیادہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور سچ بتاتا تو شیا، یقیناً ممکن تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو جاتی۔

”کیا کر رہے ہو؟“ شیا کی نظر اس کے موبائل پر تھی۔

”شکر ہے تم نے کال ریسیو کی!“ ساحرہ کے لہجے میں چپکار تھی۔ ”خوشی ہے یہ میرے لیے کہ میرا نام اب بھی تمہارے موبائل میں محفوظ ہے۔ یقیناً تمہارے دل میں بھی ہونا چاہیے۔“

”ساحرہ!“ احسن نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں واقعی تمہیں بھول نہیں سکا ہوں، اگرچہ بھلانے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔“

ساحرہ ہنسی۔ ”بھلا بھی نہیں سکو گے۔“
”کہاں سے بول رہی ہو؟“

”میں لان میں ہوں۔ شیا کو آغا صاحب نے بلایا تھا۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے کھسک آئی۔ یقیناً تو نہیں تھا کہ تم میری کال ریسیو کرو گے لیکن میں نے ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ احسن! اگر تم اب بھی مجھے نہیں بھلا سکتے تو ملاقات کی کوئی سبیل نکالو۔ شیا سے پیچھا چھڑاؤ کسی وقت۔“

”میں شیا کو دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ساحرہ! غلطی ہوئی مجھ سے بے اختیار کہ میں تم سے سچ بات کہہ بیٹھا۔ میرا خیال اب اپنے دل سے نکال دو۔“

”تم بھی نہیں نکال سکتے ہو مجھے اپنے دل سے۔“
”لیکن میں کوشش کر رہا ہوں۔“
”میں کوشش نہیں کروں گی۔“ ساحرہ پھر ہنسی۔

”کیوں کروں کوشش! محبت جب کسی سے ہوتی ہے، تو بس ہو جاتی ہے۔“
”لیکن اب تم شادی کر چکی ہو۔“

”پھر وہی بے نکی بات! شادی کا محبت سے کیا تعلق.....! آغا صاحب نے اگر میرے جسم کی پکار سنی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے ان سے محبت ہو جائے گی۔ محبت مجھے صرف تم سے ہے۔ کاش تم نے ہی میرے جسم کی پکار سنی ہوئی۔“

ساحرہ کو بے بابا کا نہ باتوں کی طرف آتے دیکھ کر احسن گھبرایا اور جلدی سے بولا۔ ”تمہیں اب ہر وقت آغا صاحب کا خیال رہنا چاہیے۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض بننے جا رہے ہیں۔ دس بارہ دنوں میں دو مرتبہ ڈاکٹر گھر آچکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ چند گھنٹوں کے لیے ہسپتالز بھی ہو چکے ہیں۔“

”بتا رہے تھے وہ مجھے!“ ساحرہ نے خوش کوار لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے شادی کرنے کے بعد ہی انہیں یہ مرض لاحق ہوا ہے۔ میں نے ان کے سامنے تو اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن تم سے کہہ رہی ہوں کہ کسی دن ان کا ہارٹ ٹیکل بھی ہو سکتا

احسن ضرور کوشش کرتا تھا کہ اس کے انداز میں ایسی تبدیلی نہ آئے جو آغا نصیر کو محسوس ہو اور وہ شیا کو بھی سمجھاتا تھا کہ وہ اپنا رویہ معمول کے مطابق رکھے لیکن شیا نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ خود پر مصنوعی خول نہیں چڑھا سکتی۔

ساحرہ کا سارا وقت سیر سپاٹے، شاپنگ اور بیوٹی پارلر میں گزرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے والدین سے ملنے بھی چلی جاتی تھی۔ مگر کے معاملات سے اس نے کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔ ان سب باتوں کو عشرت اعوان دیکھتی تھی یا شیا تھوڑا بہت خیال رکھتی تھی۔ کبھی کبھی ملازم کے معاملے میں یا کسی اور مسئلے میں کچھ سمجھتا آجاتی تھی تو عشرت اعوان وہ بات آغا نصیر تک پہنچا دیتی تھی۔ ایسے مواقع پر آغا نصیر کبھی کبھی شیا کو بلا کر مشورہ کر لیا کرتا تھا۔ احسن کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اس صورت میں شیا اس کے کمرے کا دروازہ مقفل کر کے جایا کرتی تھی تاکہ باہر سے کوئی اور اس کے کمرے میں داخل نہ ہو سکے۔ دوسری چابی وہ احسن کے پاس رہنے دیتی تھی تاکہ وہ خود کو قید میں نہ سمجھے لیکن وہ احسن کو تاکید کر کے جاتی تھی کہ اس کی واپسی تک احسن کمرے سے نہ نکلے تو بہتر ہے۔

یہ صورت حال احسن کو ذہنی طور پر بوجھل کرنے لگی تھی لیکن وہ شیا کو اس پر آمادہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان دونوں کو اپنے رہنے کے لیے کوئی قلیٹ لے لینا چاہیے۔

ایک رات نہ جانے کیا مسئلہ تھا کہ آغا نصیر نے شیا کو بلوایا۔ معمول کے مطابق شیا کمرہ مقفل کر کے گئی۔

احسن ایسے مواقع پر زیادہ الجھ جاتا تھا اور اس معاملے پر غور کرنے لگتا تھا۔

شیا کو گئے ہوئے مشکل سے دو تین منٹ گزرے تھے کہ احسن کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ اسے توقع تھی کہ شاید شیا ہی نے کسی وجہ سے کال کی ہو لیکن اسکرین پر ساحرہ کا نام چمک رہا تھا۔ احسن نے ابھی تک اس کا نام اور اس کا موبائل نمبر ختم نہیں کیا تھا۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھوں سے ساحرہ کا نام مٹا دے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اب بھی اپنے دل میں ساحرہ کے لیے کوئی نرم گوشہ رکھتا تھا۔

شادی کے بعد اس کے لیے یہ ساحرہ کی پہلی کال تھی۔ احسن نے فوری طور پر کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایک بار وہ بھی ساحرہ کو سمجھانے کی کوشش کرے۔

”ہاں ساحرہ!“ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے طویل سانس لینے کے ساتھ کہا تھا۔

جو ساحرہ سے ہوئی تھی۔ احسن نے سب کچھ من کر سر جھکا لیا۔ وہ اس دوران میں بستر کے قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

شیا بھی خاموش ہو جانے کے بعد کچھ سوچنے لگی۔ اس کے دماغ میں ساحرہ کی یہ بات بگولے کی طرح چکرار ہی تھی کہ احسن نے جب اس سے گریز کیا تھا، اس وقت وہ عورت کے قرب سے نا آشنا تھا لیکن اب شادی کے بعد وہ اس خواہش کا طالع ہوگا جو پیٹ کی بھوک سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور اس معاملے میں شروع پسندی ایک فطری بات ہے۔

ان خیالات کی گونج میں اس نے احسن کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا، احسن ایسا نہیں ہوگا۔

احسن اب بھی نظریں جھکائے ہوئے تھا۔

”کچھ سوچ رہے ہو؟“ شیا بولی۔

”ہاں۔“ احسن نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”مناسب بھی ہوگا شیا کہ ہم اس گھر میں نہ رہیں۔ کیوں یہاں کی فضا میں تناؤ پیدا کیا جائے۔ ساحرہ اب کھل کر سامنے آگئی ہے۔“

”تو میں بھی اب کھل کر اس کا سامنا کروں گی۔“ شیا کے لہجے میں مزید تھی۔ ”اب میں بھول جاؤں گی کہ وہ میری دوست تھی۔ مجھے خود پر بھی اعتماد ہے اور تم پر بھی۔۔۔۔۔! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنا چاہے اور ڈاکے کے خواہش مند کو دوست سمجھا جائے۔“

”تم نے تو کہا تھا کہ اسے سمجھاؤ گی۔“
”اس نے اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی۔“

احسن چپ ہو گیا۔

شادی کو آٹھ دن گزر چکے تھے۔ اس دوران میں گھر کا ماحول پرسکون رہا تھا لیکن اس کے بعد تناؤ کی فضا کم از کم احسن نے محسوس کر لی۔ پہلے تو وہ سب فی وی لاؤج میں یا لان میں ٹہلتے ہوئے بھی کپ شپ کیا کرتے تھے۔ ان اوقات میں بھی آغا نصیر نہیں بھی ہوتا تھا لیکن اس دن کے بعد صورت حال بدل گئی۔ ان کا آتنا سامنا صرف ناشتے یا کھانے کی میز پر ہی ہونے لگا۔ اگر شیا کھانے پینے کا اہتمام اپنے کمرے ہی میں کرنے لگتی تو یہ آغا نصیر کو چونکا لے والی بات ہوتی اس لیے مجبوراً ڈائننگ ٹیبل پر تو یک جا ہونا ہی پڑتا تھا۔

ساحرہ کے رویے میں اس کے بعد بھی کوئی ظاہری تبدیلی نہیں آئی۔ وہ یہ دستور نہیں نہیں کر اسی طرح باتیں کرتی جیسے پہلے کرتی تھی لیکن شیا سنجیدہ ہی رہنے لگی تھی۔

ڈال دیے اور اس کے سینے سے لگ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شیا کی وجہ سے مجھے ایسے موقعے بار بار نہیں مل سکتے۔ آغا صاحب کو گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں عشرت احوان کے ساتھ مل کی ادائیگی کے لیے کمرے سے نکل آئی تھی۔ پھر عشرت احوان کو چھوڑ کر کار میں تیزی سے یہاں پہنچی ہوں۔ شیا آغا صاحب کے کمرے میں تھی لیکن اب تک اسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ میں اسپتال سے جا چکی ہوں۔ وہ میری وجہ سے پریشان رہنے لگی ہے۔ وہ جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ یوں سمجھ لو کہ بس پندرہ منٹ ہیں میرے پاس!“ وہ برق رفتاری سے بولتی چلی گئی تھی اور پھر اس کا ایک ہاتھ احسن کی گردن سے ہٹ کر اس کی ٹھیک کے ٹن تک پہنچا۔

احسن نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے بولا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”شیا سے شادی ہو چکی ہے تمہاری۔ یہ اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔“

احسن نے اسے ٹھیک کا ٹن نہیں کھولنے دیا اور کوشش کی کہ اسے دھکیل دے لیکن ساحرہ کا ایک ہاتھ بڑی مضبوطی سے اس کی گردن کے گرد جما ہوا تھا۔ خود احسن اپنے ٹخنے کی تکلیف کے باعث زیادہ طاقت صرف نہیں کر سکا۔

”تم مجھے کیوں دور کرنا چاہتے ہو احسن!“ ساحرہ کے حنسن کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ ”کیا میرا بس تمہارے جسم میں بجلیاں نہیں بھر سکتا؟“

احسن کا جسم سننا تو اٹھا تھا۔ شیا اس کے سینے سے بالکل چپکی ہوئی تھی۔

”تم جو کچھ چاہتی ہو، وہ کبھی نہیں ہوگا۔“ احسن نے کہا۔ اس کی سانس پھولنے لگی تھی اور وہ اب بھی کوشش کر رہا تھا کہ شیا کو خود سے الگ کر دے۔

”میں تم سے محبت کرتی ہوں احسن!“ اس مرتبہ ساحرہ کا اعزاز ایسا تھا جیسے رو پڑے گی۔ ”تمہیں حاصل کرنا تو میری زندگی کی تمنا ہی ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ تم صرف شیا کی ملکیت بنے رہو۔“

”تم جسے محبت کہہ رہی ہو، یہ ہوس ہے ساحرہ!“

”یہ انسان کی فطرت ہے۔“

”انسان کی نہیں، جانور کی فطرت ہے۔ اس جنون نے تمہیں جانور بنا دیا ہے لیکن میں جانور نہیں ہوں۔“

ساحرہ ایک جھجکے سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے سے وحشت چٹکنے لگی تھی۔ اس نے احسن کو گھورتے

کئی تھی۔ سوانو بچے اس نے ملازم سے کمرے ہی میں کھانا منگوا کر کھایا۔

سوانو بچے وہ بستر پر لیٹا ہی تھا کہ شیا کا فون پھر آیا۔

”کھانا کھالیا؟“

”کھالیا بھی!“ احسن نے مسکرا کر کہا۔ ”تم ڈیڈی کی فکر کرو۔“

”ان کی طبیعت اب بالکل ٹھیک معلوم ہو رہی ہے۔ میں، ساحرہ اور عشرت احوان انہی کے کمرے میں بیٹھے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر چیک اپ کے لیے آئے گا۔ امکان یہی ہے کہ ڈیڈی کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ ہم لوگ، میرا خیال ہے کہ گیارہ بجے تک تو آہی جائیں گے۔ تمہیں اگر نیند آئے تو سو جانا۔“

”ہاں، سو جاؤں گا۔“

احسن نے یہ کہہ کر دیا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے نیند نہیں آئے گی۔ وہ تم ہی دنوں میں شیا کی موجودگی کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے بغیر اسے مشکل ہی سے نیند آ سکتی تھی۔

گیارہ بجتے میں دس منٹ باقی تھے جب احسن نے گھڑی دیکھی اور پھر کسی قسم کی آواز سے چونکا۔

بلکی سی آواز دوبارہ آئی تو احسن کی نظریں بائیں جانب کی کھڑکی کی طرف گئیں جس پر پردے پڑے پڑے ہوئے تھے۔ وہ پردے ہلنے دیکھ کر چونک پڑا۔ ایک تو وہ کھڑکی ہوا کے رخ پر نہیں تھی، دوسرے بند بھی تھی۔ پھر پردے پر ایسا دباؤ پڑتا نظر آیا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہو۔

”کون ہے؟“ احسن بے اختیار زور سے بول پڑا۔

اب پردہ پوری طرح ہٹا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی ساحرہ کود کر کمرے میں آ گئی۔ وہ جینز اور کمرنگ کی بنیان میں تھی۔

”تم!“ احسن گھبرا کے بستر سے اٹھا۔ اسے ٹخنے کی تکلیف کا دھیان نہیں رہا تھا لیکن جب اس نے سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کی تو درد کے باعث دم سے بستر پر بیٹھ گیا۔

”احسن! میری جان!“ ساحرہ تیزی سے اس کی طرف آئی۔

احسن پھر جلدی سے اٹھا۔ اس مرتبہ اس نے بائیں ہر پردہ ہٹا دیا تھا جس کے ٹخنے میں تکلیف تھی۔ اس نے ٹھوس کیا تھا کہ ساحرہ اس سے لپٹ جائے گی۔

”رک جاؤ ساحرہ!“ احسن نے سخت لہجے میں کہا۔

”آج میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی احسن!“

ساحرہ نے اس کے قریب آ کر دونوں ہاتھ اس کی گردن میں

کے ساتھ چلتے ہوئے احسن کا ایک ہر بے دھیانی میں ایک گیلے سے ٹکرا گیا۔ ٹخنے میں خاصی چوٹ آئی۔ وہ لنگڑانے لگا تھا۔ احسن کمر میں موجود بام سے کام نکالنا چاہتا تھا لیکن شیا اسے اسپتال لے گئی۔ اس کے ٹخنے کا ایکسرے کروایا گیا لیکن اس سے کوئی تشویشناک بات سامنے نہیں آئی۔ ڈاکٹر نے ایک کپسول اپنے سامنے کھلایا اور ایک کمریم دے کر رخصت کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں ٹخنے کا درد بالکل اتر جائے گا اور وہ آرام سے چلنے پھرنے لگے گا۔

اسی شام دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ آغا نصیر کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ عشرت احوان نے ان کا ہلڈ پریش چیک کیا۔ وہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ عشرت احوان نے فوری طور پر انہیں کوئی دوا کھلائی لیکن یہ ضروری سمجھا کہ انہیں فوراً اسپتال لے جایا جائے۔

افرا تفری سی سچ گئی۔ لنگڑانے کے باوجود احسن بھی سب کے ساتھ تھا لیکن جب آغا نصیر کو اسپتال لے جایا جانے لگا تو شیا کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ لنگڑاتا ہوا ساتھ جائے۔ کیونکہ آغا نصیر کو اسپتال لے جانے میں شیا اور عشرت احوان کے ساتھ ساحرہ بھی تھی اس لیے شیا نے احسن کو گھر پر اکیلا چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ احسن اپنے کمرے میں رہ گیا۔ شیا اس ہنگامی صورت حال میں بھی اس کا کمرہ منتقل کرنا نہیں بھولی تھی۔

آٹھ بجے آغا نصیر کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ نو بجے شیا نے مضطرب احسن کو اطلاع دی کہ اب معاملہ ڈاکٹروں کے قابو میں آچکا ہے لیکن اسپتال سے ڈسچارج کرنے کا فیصلہ وہ ساڑھے دس بجے کے چیک اپ کے بعد کریں گے۔

ہمیشہ کی طرح آغا نصیر نے ڈاکٹروں کا یہ مشورہ رد کر دیا تھا کہ وہ دو ایک دن اسپتال ہی میں رہے اور مکمل آرام کرے۔ ”وحشت ہوئی ہے مجھے اسپتال کے بستر سے۔“ آغا نصیر کا کہنا تھا۔

شیا نے اسپتال سے اطلاع دینے کے بعد احسن سے کہا۔ ”عشرت احوان نے ایک ملازم کو فون کر کے ہدایات دے دی ہیں، وہ تیس چالیس منٹ میں ہم لوگوں کا کھانا لے کر آہی جائے گا۔ آج تم اکیلے ہی کھالینا۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا ہے یہ کہتے ہوئے لیکن۔“

”تم اطمینان سے وہاں رکو اور ڈیڈی کو لے کر آؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ مجھے جب بھی بھوک لگے گی، کھالوں گا۔“

ان دونوں میں مختصر گفتگو ہوئی۔

شادی کے بعد احسن کو نو بجے کھانا کھانے کی عادت پڑ

احسن نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”وقت گزاری کے لیے ایک گیم کھیلنے لگا تھا۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ ڈیڈی نے کیوں بلوایا تھا؟“

”میں ان کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔“ شیا نے بستر کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”دو ملازموں میں کچھ تنازعہ ہو گیا تھا بلکہ بڑھ گیا تھا۔ عشرت احوان اس معاملے کو سنبھال نہیں سکی تھی اس لیے ڈیڈی کے پاس پہنچ گئی تھی۔ ڈیڈی نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ میں معاملہ رفع دفع کروانے میں عشرت احوان کی مدد کروں۔ میں پریشان تو اس لیے ہوئی کہ ساحرہ وہاں سے کھسک لی تھی۔ مجھے ڈر ہوا تھا کہ وہ ادھر نہ آئی ہو۔“

”ادھر آئی بھی تو کیا فرق پڑتا۔“ احسن خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”میں اس کے لیے دروازہ تو نہیں کھول دیتا۔“

”ہاں۔ میں شاید بلا وجہ ہی پریشان ہوئی تھی۔“ شیا نے بستر پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

احسن کو ایک ڈر یہ بھی لگا ہوا تھا کہ ساحرہ پھر فون نہ کر بیٹھے مگر جب اتنی دیر تک گھنٹی نہیں بجی تو اسے اطمینان ہوا۔ ”چلو اب لیٹو، آرام کرو۔“

”نو بجتے والے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب لیٹ کے کیا کرنا۔ تم بھی اٹھو ڈانٹنگ روم میں چلنے کے لیے!“

”ہاں۔“ احسن اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ابھی کچھ زیادہ بھوک نہیں تھی اس لیے خیال ہی نہیں رہا۔“

”یہ ساحرہ۔“ شیا سوچتے ہوئے بولی۔ ”میرے اعصاب پر سوار ہوتی جا رہی ہے۔“

”ارے دفع کرو۔“ احسن نے کہا، پھر اس کا دھیان بنانے کے لیے بولا۔ ”پرسوں تمہاری سالگرہ بھی تو ہے۔ تم نے آج تک اس کی کوئی تیاری ہی نہیں کی۔ کل شاپنگ کے لیے چلو۔“

”اس مرتبہ چند دن کی تاخیر سے منالوں گی۔ بھائی جان کے آنے کے بعد۔۔۔۔۔۔“

”ہاں! وہ شاید دو چار دن میں آنے والے ہیں مگر انہیں تو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ تم کہہ رہی تھیں کہ انہیں سر پر اندر دینے کا بہت شوق ہے۔“

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈانٹنگ روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

شیا بولی۔ ”ضروری نہیں کہ وہ اس مرتبہ بھی اپنی آمد کا سر پر اندر دیں، ہاں البتہ کل شاپنگ تو کر ہی لوں گی۔“

لیکن دوسرے دن ایسا ہونے لگا۔ صبح لان میں شیا

ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ سے کبھی محبت نہیں رہی۔ جھوٹ بولتے رہے ہو تم مجھ سے!“ ساحرہ کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔

احسن نے کہا۔ ”محبت کا اس وحشت سے کوئی تعلق نہیں جو اس وقت تم پر طاری ہے۔“

”میں یہ وحشت تم پر طاری کر دوں گی۔ ابھی تم نے دیکھا نہیں ہے کہ میں کیا ہوں۔“ ساحرہ نے کہتے ہوئے اپنی گردن کے قریب سے اپنی بنیان پکڑی اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ جھرجھرا کر اتنی پھٹ گئی کہ اس کا جسم کسی سرکش موج کی طرح اٹھنا دکھائی دیا۔ احسن نے گھبرا کر اس کی طرف سے نظریں ہٹالیں۔

”میری طرف دیکھو احسن!“ ساحرہ ہانپنے سی لگی تھی۔

”شیبا میں یہ سب کچھ ایسا نہیں ہوگا۔“

”چلی جاؤ ساحرہ!“ احسن نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

لیکن ساحرہ کسی پاگل بلی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔ اس نے احسن کا ہاتھ پکڑ کر کوشش کی کہ وہ اس کے جسم کا لمس محسوس کر لے۔

احسن نے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کی۔ ٹخنے کی تکلیف کے باعث وہ بستر پر گر پڑا۔ ساحرہ اسے بستر پر پوری طرح گراتے ہوئے اس پر چھانگئی۔

احسن کا ایک ہاتھ اب ساحرہ کی خواہش پوری کر رہا تھا لیکن دوسرا ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے ساحرہ کے بال پیچھے سے پکڑ کر انہیں اس طرح کھینچا کہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھا۔ احسن کا وہ ہاتھ آزاد ہو گیا جو شیبا کے ہاتھ میں دبا ہوا اس کے جسم پر تھا۔ اب احسن نے دھکیل کر ساحرہ کو اپنے اوپر سے ہٹایا اور تیزی سے بستر کی دوسری جانب اتر گیا۔ اگر اس کے ٹخنے میں تکلیف نہ ہوتی تو وہ ساحرہ کو اتنا بے قابو ہونے سے باز رکھ لیتا۔

ساحرہ بستر کی دوسری جانب اتر گئی اور احسن کو گھورتے ہوئے بولی۔ ”کچھ بھی ہو جائے احسن! آج میں تمہارے کمرے سے پیاسی نہیں لوٹوں گی۔“

احسن اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے اس کا قفل کھولنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

”نہیں کھلے گا۔“ ساحرہ دیوانگی سے ہنسی۔ ”میں نے اسپتال جانے سے پہلے ہی اس میں ایٹمی ڈال دی تھی۔“

”کون ہے اندر؟“ باہر سے شیبا کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔ ”احسن! کیا ساحرہ ہے؟“

”ہاں۔“ ساحرہ نے بلند آواز اور جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں ہی ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ آج تم مجھے بھول جاؤ ورنہ شاید بہت برا ہو، آج میں یہاں سے ناکام نہیں جاؤں گی۔“

”یہ چاہی کیوں نہیں لگ رہی ہے احسن!“ شیبا کی گھبراہٹ ہوئی آواز آئی۔

”اسپتال جانے سے پہلے ہی بے کار کر دیا تھا میں نے لاک۔“ ساحرہ حقارت سے مسکرائی۔ ”آج کی رات اس کمرے میں قدم رکھنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔ آج یہاں میری حکومت رہے گی۔“

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر احسن کی طرف متوجہ ہوئی اور تیزی سے بستر کے گرد گھوم کر احسن کی طرف بڑھی۔

احسن نے بھی تیزی سے بستر کے گرد گھوم کر ساحرہ سے دور رہنے کی کوشش کی۔ ٹخنے کی تکلیف کے باوجود وہ ساحرہ سے بچنے میں کامیاب رہا تھا۔ گھبراہٹ، پریشانی اور ساحرہ پر غصے کے باوجود اسے اس وقت اپنی حالت معکھ خیز محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ایک لڑکی سے بھاگتا پڑ رہا تھا۔ اگر اس کے ٹخنے میں تکلیف نہ ہوتی تو وہ ساحرہ کو بے بس کر سکتا تھا۔

باہر اب شور ہونے لگا تھا۔ شیبا اب ملازموں کو پکار رہی تھی۔

”یہ اتنی جلدی کیسے آگئی!“ ساحرہ کے انداز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

احسن بستر کی دوسری جانب تھا۔ اس نے کھڑکی کی جانب بڑھنا چاہا۔ اسے خیال ہوگا کہ جس طرح ساحرہ ادھر سے آگئی تھی، اسی طرح وہ بھی ادھر سے نکل سکتا ہے۔

اس مرتبہ ساحرہ نے بستر کے گرد چکر نہیں لگایا۔ وہ بستر پر چڑھ کر احسن کی طرف چھٹی اور اسے کمرے سے پکڑ لیا۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے بستر کے قریب لے گئی۔ احسن کے ٹخنے کی تکلیف اب بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ خود کو ساحرہ کے سامنے بے بس محسوس کر رہا تھا۔

باہر سے دروازے کو دھکے مارے جانے لگے۔ دھکے مارنے والے ملازم ہی ہو سکتے تھے اور دروازہ توڑنے کی ہدایت انہیں شیبا ہی سے ملی ہوگی۔

”اندر کیا ہو رہا ہے احسن؟“ شیبا نے چیخ کر پوچھا۔

”گھبرانا مت شیبا!“ احسن نے بھی چیخ کر کہا۔

”میرے ٹخنے کی تکلیف مجھے بے بس کر رہی ہے لیکن میں

ساحرہ کا کہنا ڈانٹا مقصد پورا نہیں ہونے دوں گا۔
 "دروازہ بہت مضبوط ہے۔" ساحرہ احسن کو بستر پر گراتے ہوئی بڑبڑائی۔ "دیر لگے گی اسے ٹوٹنے میں۔" لیکن اپنے اس خیال کے باوجود وہ دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے چیختی۔ "اگر کوئی اندر داخل ہوا شیبا تو قیامت آجائے گی آج۔۔۔۔۔! اگر میری آگ نہ بجھی تو میں اس گھر میں آگ لگا دوں گی۔"
 "یہ اندر کیسے پہنچ گئی؟" یہ عشرت اعوان کی آواز تھی۔ اسے دروازے پر دھکے لگنے والے شور کے باعث زور سے بولنا پڑا تھا۔
 "یہ بھی آگئی۔" ساحرہ بڑبڑائی اور پھر احسن کی طرف متوجہ ہوئی۔ احسن اب بستر پر بیٹھ گیا تھا اور کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساحرہ نے پھر اسے دھکیل دیا اور خود بھی اس پر چھا گئی۔ اس نے احسن کے کالر کے اندر ہاتھ ڈال کر زور سے جھٹکا دیا۔ "میں بہت مضبوط کپڑے کی تھی۔ وہ پھٹ تو نہیں سکی لیکن اوپر کے دو بٹن ٹوٹ گئے۔"
 احسن کے ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے بڑی زور سے ساحرہ کے گال پر چھڑ رسید کر دیا۔
 ساحرہ یک لخت خود ہی اس سے الگ ہو گئی اور اس طرح احسن کی طرف دیکھنے لگی جیسے اسے سکتے ہو گیا ہو۔
 "تم نے مجھے مارا احسن!" ساحرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اپنی ساحرہ کو ملنا چاہتا رہا؟"
 احسن کو بستر سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔
 ایک لخت ساحرہ دیوانوں کی طرح ہنس پڑی۔ "لیکن تم نے مجھے لڑت سے نہیں مارا ہوگا۔ مجھے یقین ہے تمہارے دل میں میری محبت اب بھی ہے۔ تم نے یہ چھڑ میری وحشت کو مارا ہے۔ ابکہ شیبا سے شادی کے بعد تمہیں اس سے آشنا ہو جانا چاہیے تھا۔"
 اس وقت احسن نے دوبارہ کھڑکی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ساحرہ کی طرف دیکھ رہا تھا اس وقت اسے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ ساحرہ کی امان اس حد تک پھٹی ہوئی تھی کہ وہ تقریباً بے لباس نظر آ رہی تھی۔
 دروازہ دھڑام سے چوکھٹ سے نکل کر اندر آگرا۔
 ساحرہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا کہ دروازہ ٹوٹنے میں زیادہ دیر لگے گی۔ وہ چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔
 "ہمارا دروازہ کو پھلانگتے ہوئے اندر آگئی۔ ملازمین اندر نہیں آئے۔ غالباً شیبا ہی نے انہیں روک دیا ہوگا۔ احسن

اب لنگڑاتا ہوا پیچھے ہٹا تا کہ شیبا کے قریب پہنچ جائے۔
 "میں نے کہا تھا تم سے کہ اندر نہ آنا۔" ساحرہ نے دانت پیسے۔ اس وقت اس کے بال بالکل بکھر گئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے پاگل خانے سے کوئی دیوانی لڑکی بھاگ نکلی ہو۔ شیبا کا چہرہ سفید ہوا جا رہا تھا لیکن وہ غصے سے بولی۔
 "بس اب یہاں سے چلی جاؤ ساحرہ! اس سے پہلے کہ ڈیڑی کو سب کچھ معلوم ہو جائے، یہاں سے چلی جاؤ۔ میرا وعدہ ہے کہ میں زبان بند رکھوں گی اور اب احسن کی بات بھی مان لوں گی۔ ہم اس گھر سے کہیں چلے جائیں گے۔"
 "میں جانے دوں گی، تب نا!" ساحرہ نے پھر دانت پیسے اور اپنا دایاں ہاتھ اپنی پشت پر لے لی۔ جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں پستول تھا۔ غالباً وہ چھوٹا سا پستول اس نے پیٹھ کی طرف اپنی جینز میں اڑس رکھا تھا۔
 "میں ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار ہو کر آئی تھی شیبا!" ساحرہ نے خوں خوار لہجے میں کہا۔ "میں نے آغا صاحب سے نشانہ بازی بھی سیکھی ہے اور دو دن پہلے یہ پستول بھی خرید لائی تھی۔ اس وقت مجھے خیال نہیں تھا کہ یہ مجھے کن حالات میں استعمال کرنا پڑے گا۔ چلی جاؤ تم یہاں سے۔ احسن کی ٹھیکے دار مت بنو۔"
 "ٹھیکے دار تو میں ہوں احسن کی!" شیبا نے پستول سے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔
 اسی وقت ایک نوجوان تیزی سے کمرے میں آیا اور پھر ٹھنک گیا۔ ساحرہ نے تیزی سے اپنے پستول کی نال اس کی طرف کر دی تھی۔
 "بھائی جان!" نوجوان کو دیکھتے ہی شیبا کے منہ سے نکلا۔ ایک غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے اس کے لہجے میں خوشی کی وہ لہر نہیں تھی جو بھائی کو دیکھ کر ہونا چاہیے تھی۔
 "کیا ہے یہ سب!" نوجوان کے لہجے میں حیرت تھی، پریشانی بھی اور تناؤ کی کیفیت بھی!
 "تم بھی چلے جاؤ یہاں سے!" ساحرہ فریادیں پھر شیبا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "احسن کو یہاں چھوڑ کر تم بھی چلی جاؤ ورنہ تم دیکھ رہی ہو کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے، کچھ بھی ہو جائے گا شیبا! کچھ بھی!"
 "کون ہو تم؟" شیبا کے بھائی نے ساحرہ کو گھورتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ خاصا ٹھیکھا تھا۔
 شیبا کھٹی سے بول پڑی۔ "یہ ہماری گیسو تیلی ماں ہے بھائی جان اور یہ۔۔۔۔۔" وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے رک گئی۔
 "چلی جاؤ شیبا!" ساحرہ پھر کھانے والے انداز

میں بولی۔
 "میں احسن کو ساتھ لے کر ہی یہاں سے جا سکتی ہوں۔"
 "احسن نہیں جائے گا۔" ساحرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اور اگر جائے گی تو اس کی لاش جائے گی۔ اسے گولی مار کر میں خود کو بھی ختم کر لوں گی۔ اگر احسن میرا نہیں ہو سکتا تو پھر کسی کا بھی نہیں ہوگا۔"
 اس صورت حال میں بہتر یہی تھا کہ ساحرہ پسائی اختیار کر لیتی مگر وہ شاید اس وقت پاگل ہو چکی تھی۔ اس کی سوچتے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔
 شیبا جلدی سے احسن کے سامنے آگئی اور ساحرہ کو گھورتے ہوئے بولی۔ "احسن سے پہلے تمہیں مجھے گولی مارنا پڑے گی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ "میں احسن کو اپنے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"
 احسن نے شیبا کو اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ "معدہ پاگل ہو رہی ہے۔"
 "اس کے پاگل پن کا نشانہ پہلے میں بنوں گی۔"
 "چلو تو ایسا ہی سہی!" ساحرہ نے دانت پیسے۔ اس وقت اس کی توجہ شیبا کے بھائی کی طرف سے کم ہو گئی تھی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ دھیرے دھیرے ساحرہ کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔
 "خدا حافظ شیبا!" ساحرہ نے کہا۔
 اور پھر کوئی چلی۔۔۔۔۔ شیبا کا بھائی ابھی ساحرہ سے کچھ دور ہی تھا۔
 ساحرہ کے منہ سے کراہ نکلی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کے سینے سے خون ابل پڑا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگاتی اور گر پڑی۔
 احسن، شیبا اور اس کے بھائی کو سکتے سا ہو گیا۔ وہ اس آواز سے چونکے جو کھڑکی کی طرف سے آئی تھی۔ انہوں نے عشرت اعوان کو دیکھا جو کود کر کمرے میں آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالتور دبا ہوا تھا۔ وہ بڑی نفرت سے ساحرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔
 "پولیس کو فون کرے کوئی۔" احسن بوکھلا کر بولا۔
 "نہیں۔" عشرت اعوان سخت لہجے میں بولی۔ "میں نے اس طرح گولی ماری ہے کہ اس کا دل زد پر نہ آئے۔ اس کا خون بہنے دو۔ اسے تڑپ تڑپ کر ہی مرنا چاہیے۔ پولیس آئے گی تو ایسپوٹنس بھی آئے گی اور اسپتال میں اسے شاید بچا لیا جائے۔"
 ساحرہ تڑپ رہی تھی۔ احسن سے اس کی یہ حالت

دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ عشرت اعوان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ پڑا۔ "کیا پاگل ہو گئی ہو تم!"
 "کوئی فون نہیں کرے گا۔" عشرت اعوان نے سفاک لہجے میں کہا اور گولی چھت کی طرف چلا کر ان لوگوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔
 کمرے کے باہر سے ملازمین کی بلند آوازیں آنے لگی تھیں۔
 احسن فرش کے قریب پڑی ساحرہ کے قریب پہنچ کر بیٹھا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔
 ایک لخت ساحرہ کے چہرے سے اذیت کے آثار ختم ہو گئے۔ وہ مسکرا اٹھی۔ اس کا خون آلود ہاتھ احسن کے چہرے پر گیا اور وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "میں نے کہا تھا نا! اب بھی محبت کرتے ہو تم مجھ سے!"
 اسی وقت پریشان حال آغا نصیر تیزی سے کمرے میں آیا۔ اسے ملازمین سے صورت حال کا علم ہو گیا ہوگا لیکن اس کے ادھر آنے کا سبب گولیاں چلنے کی آوازیں ہی ہو سکتی تھیں۔
 "کیا ہوا ہے یہ!" وہ ایک ایک کا منہ تکتے ہوئے بولا۔ اس نے خون آلود ساحرہ کا سر احسن کی گود میں دیکھا تھا لیکن اس کی نظریں عشرت اعوان پر جم گئیں۔ "یہ تم نے کیا کیا؟" وہ چیخ پڑا۔
 "میں نے وہی کیا ہے جو پہلے کرتی رہی ہوں۔" عشرت اعوان نے سرد لہجے میں کہا۔ "تمہاری دوسری اور تیسری بیوی کو بھی میں نے ہی مارا تھا۔ اب اسے بھی گولی مار دی ہے۔ جلد ہی یہ بھی مرنے والی ہے۔"
 "یہ کیوں کیا تھا تم نے!" آغا نصیر پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔
 "تم نے مجھے ذلیل کیا تھا آغا!" عشرت اعوان نے آغا نصیر کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے محبت کا جھانسا دے کر میری دوشیزگی ختم کی تھی اور پھر شیبا کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ مجھے بتایا تھا کہ تم نے اپنے والد کے جبر کی وجہ سے وہ شادی کی تھی۔ پھر جب تمہارے والد کا انتقال ہو گیا تو تم نے مجھے بہلا پھلا کر اپنی سیکرٹری بنا لیا، لیکن شیبا کی ماں کے انتقال کے بعد بھی تم نے مجھ سے شادی نہیں کی۔"
 کمرے میں موجود سبھی لوگ حیرت سے عشرت اعوان کی باتیں سن رہے تھے مگر احسن ان سے بے خبر، ساحرہ کو اپنی

آغوش میں سینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کپڑے بھی ساحرہ کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔

”بہت خوش قسمت ہوں میں!“ ساحرہ ڈوبتی ہوئی سی آواز میں بولی۔ ”مرتے وقت ہی سہی!..... مجھے کم از کم تمہاری آغوش تو.....!“ اس سے مزید نہیں بولا جاسکا۔ تیزی سے بہتے ہوئے خون کے ساتھ اس کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ عشرت اعوان تلخ لہجے میں بول رہی تھی۔ ”شیبا کی ماں کے انتقال تک میری مرخصی ہو چکی تھی اس لیے اس وقت بھی تم نے مجھ سے شادی کرنے کے بجائے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر لی۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکا۔ میں نے منصوبہ بندی کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد تم نے پھر ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی۔ موقع پا کر میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔ میں تمہاری کسی نوجوان بیوی کو زندہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تم کو میں نے اس لیے نہیں مارا۔ آغا کہ تمہاری محبت تو میرے دل میں آج بھی ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ تم شادیاں کرتے رہو گے اور میں انہیں اس طرح مارتی رہوں گی کہ میں قانون کی زد پر نہ آؤں لیکن آج مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ قانون میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ گزشتہ ماہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میں کینسر کا شکار ہو گئی ہوں۔ مرنا تو اب مجھے ہے۔“

اس وقت احسن کی آغوش میں ساحرہ کا سر ڈھلک چکا تھا۔ احسن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور اس نے ساحرہ کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

شیبا کی نظریں بھی عشرت اعوان کی طرف جاری تھیں اور کبھی ساحرہ اور احسن کی طرف!.....!

شیبا کا بھائی سکتے کے سے عالم میں کھڑا ہوا تھا اور آغا نصیر کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اسے اس وقت شاید یہ خیال بھی نہ ہو کہ اس کی مقول بیوی احسن کی آغوش میں تھی۔ ورنہ جوتوں کی دھک سنائی دی۔ وہ پولیس کے آدمی تھے۔ غالباً کسی ملازم نے فون کر دیا تھا۔

تین دن گزر گئے۔ آغا نصیر کے گھر میں سناٹا چھایا رہا۔ احسن اور شیبا ایک ہی بستر پر سو رہے تھے مگر ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔

تیسری رات احسن سے خاموش نہ رہا گیا۔ ”مجھ سے ناراض ہو شیبا؟“

”نہیں احسن!“ شیبا نے طویل سانس لی۔ ”بس سوچتی رہی ہوں کہ تم سے کیا بات کروں۔ ہاں ایک بات کا

احساس مجھے بہر حال ہے..... انسان اپنی پہلی محبت بھی بھول نہیں سکتا۔“

”میں شرمندہ ہوں۔“ احسن نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے اس رات ساحرہ کو طمانچا بھی مار دیا تھا۔ میں اس کی وحشت کا نشانہ کسی قیمت پر نہیں بننا۔ مجھے اس پر شدید غصہ آتا رہا تھا لیکن جب اس کے گولی لگی، جب وہ مرنے لگی تو وہ منظر میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ مجھے خوب احساس ہے کہ جب میں نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا، اس وقت تمہارے دل پر کیا گزرنی ہوگی۔“

”میرے دل پر جو کچھ گزری، وہ تو فطری امر تھا۔“

”یقین کرو۔ میں اسے بھلانے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا لیکن اسے مرتے دیکھ کر مجھے نہ جانے کیا ہو گیا۔“

”وہی ہوا جو کسی محبت کرنے والے کو ہوتا ہے۔“ شیبا کے ہونٹوں پر چھکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”ابھی کہہ چکی ہوں میں!..... پہلی محبت شاید کبھی نہیں بھلائی جاسکتی۔“

”لیکن اب وہ اس دنیا سے جا چکی ہے۔ اب صرف تم ہو اور میرے لیے ہو اور میں تمہارے لیے!“

”بد نصیب تھی وہ۔“ شیبا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اور جیسی بھی تھی، اس کا ذمے دار کسی کو ٹھہرانا شاید ٹھیک نہ ہو لیکن کاش..... کاش والدین اپنی جوان ہوتی ہوئی بیٹی کو اپنے کمرے میں نہ سلا یا کریں۔“

”کیا مطلب؟“

”غربت..... انتہائی غربت میں زندگی گزاری تھی ساحرہ نے!..... گھر میں ایک ہی کمرہ تھا۔ والدین کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ بیچ میں پردہ ڈال لیں۔ پردہ بھی نصیب نہ ہو تو ناٹ ڈال لیا کرتے۔“

احسن چپ رہ گیا۔ غالباً بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ رشتے داری بہت دور کی سہی لیکن اسے علم تھا کہ ساحرہ اپنے والدین کے ساتھ ہی کمرے میں سویا کرتی تھی۔

”خیر!“ شیبا پھر بولی۔ ”جو ہونا تھا، ہو گیا۔ اب تو تم صرف میرے ہونا!“ اس نے احسن کی طرف کروٹ لی اور مسکرائی۔

”ہاں شیبا!..... تمہارا ہوں، صرف تمہارا۔“